



۷۸۶

۹۲۱۱۰

یا صاحب الزماں اور کئی



لبیک یا حسینؑ

نذر عباس
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABEEL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad

Sindh, Pakistan.

www.sabeelesakina.co.cc

sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL USE

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

خلافت امامت



خلافت و امامت

ملنے کا پتہ:

امامیہ فشن انا کے لاء اور

حق برادرز

jabir.abbas@yahoo.com

نعمان

عرضِ ناشر

مسند خلافت و امامت پر ۹۳ سلسلہ میں ایک ہندو ہر نام کی طرف سے
ماہنامہ نگار لکھنؤ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں
مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے ذمہ دار اہل قلم حضرات نے اپنے
اپنے نقطہ نظر کو نہایت اچھے لفظوں میں بیان کیا۔ ہمارے خیال
میں اس خاص علمی مسئلہ پر پہلی بار بڑی سنجیدگی اور متانت کیساتھ
اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تمام تحریریں گھٹیا مناظرہ سے مبرا ہیں
بہت عرصہ ہوا امامیہ مشن لکھنؤ نے ان تمام تحریروں کو چھ جلدوں
میں شائع کیا تھا جو آج کل نایاب۔ ہم ان تمام حصص کو یکجا
کر کے شائع کر رہے ہیں۔

ہمیں توقع ہے کہ ہماری یہ خدمت بھی علمی حلقوں میں پسندیدگی
کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

خلافت امامت

لکھنے والے:-

ہر نام
ابوسعید برزی ایم۔ اے
غیاث فتحپوری
فاروق کاپوری
عینی شاہ نظامی
سید جلیل الرحمن اعظمی
سید علی نقی نقوی
ذاکر حسین
احتمام حسین
م۔ ح
آزاد خیال شیعہ کے قلم سے
ابوالکلام آزاد

تہذیب

عرض ناشر

مولانا مفتی حسین صاحب

ویب سائٹ

۳

سہ نام

مسئلہ خلافت و امامت

۴۱

ابوسعید برہمی

مسئلہ خلافت و امامت

۵۷

سہ نام

مسئلہ خلافت

۷۱

نیاز فتح پوری

مسئلہ خلافت و امامت

۱۰۹

نیاز فتح پوری

مسئلہ خلافت و امامت

۱۱۳

سہ نام

خلافت و امامت

۱۲۹

مولانا فاروق کانپوری

مسئلہ خلافت و امامت

۱۷۷

علامہ عینی شاہ نظامی

بحث خلافت و امامت پر ایک نظر

۱۹۳

مولانا جلیل الرحمن اعظمی

خلافت اور جانشین رسول

۲۱۳

سید العلماء سید علی نقی نقوی

فضائل جناب امیر کے امتیازی خصوصیات

۲۳۳

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

مسئلہ خلافت و امامت

۳۰۷

سید علی نقی نقوی

قیام امامت کی ضرورت

۳۱۸

نیاز فتح پوری

نگار کا ادارتی نوٹ

۳۲۱

سید ابوسعید برہمی

مسئلہ خلافت و امامت

۳۶۹

م۔ ح کے قلم سے

مسئلہ خلافت و امامت

۴۱۷

ذکر حسین

مسئلہ خلافت و امامت

۴۷۱

سید احشام حسین

مسئلہ خلافت و امامت

۴۹۳

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

مسئلہ خلافت و امامت

۵۷۳

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

استحقاق خلافت کے شرائط کیا ہیں؟

بِسْمِ اللّٰهِ

پیش لفظ

عماد الکلام سید مرتضیٰ حسین ممد رالافاضل

علم و تحقیق کے پہلے ہوئے دادی بے آب دیکھ میں نتائج کے لطیف و شیریں فصل وہ لذت دیتے
میں تجھیں سن دسوی کے مقابلے میں کشیں کیا جاسکے تو شاید مناسب ہو انسانی تہذیب کے ابتدائی
آئندہ سے آج کے ترقیاتی مسائل فلسفہ ایک نیا آدم تحقیق کے مہارے بڑھ چکے مذاہب کا مطالعہ اور
عقیدوں کا تضاد بھی تحقیق طلب ہے اور آج کے زمانے میں خصوصیت کے ساتھ اس کی اہمیت
روز افزا رہے۔

شیعہ سنی عقیدے توحید سے سیکر قیامت تک ایک ہی بلکہ پر چلتے ہیں۔ راستے کی ناہمواریاں
مانیے یا بیچ و خم مگر اس سے انکار نہیں کہ چلتے دونوں ایک ہی ڈگر پر ہیں، دونوں ابتدائے اختلافات سے
ایک دوسرے کو اپنے پیچھے پلانے کی کوشش میں سرگرم کاوش ہیں اور بلاشبہ بہت سے لوگ ان اختلافات
کامل اور منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ دھونڈنا چاہتے ہیں۔ اس کوشش کو کامیابی تک پہنچانے کی
شرط یہ ہے کہ تعصب کو نظر انداز کر کے مزید پر کا مطالعہ کیا جائے۔ مضروفات و اشتباہات سے بچ جائے
پھر خلوص کے ساتھ غور کریں، خدا ساتھ دیگا اور مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

مسائل کے عقیدے میں سب سے بڑا اختلاف "امامت و خلافت" پر ہے۔ یہ مسئلہ اگر فقط ذہنی و
قلبی ہوتا تو شاید بہت سے مسائل کی طرح دب چکا ہوتا، مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے فیصلے پر ساری
شریعت و عمل کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ اللہ نہی اور اس کے بعد خلیفہ نبی یعنی شاہِ سنت
محافظِ شریعت و ذمہ دار اسلام کا سوال تہی ہے۔ رسول مقبول کے دینی تعلیمات کا مدرسہ کو مدینہ تھا

ان پھیلے ہوئے خمروں اور دنیا بگڑ گئے سماؤں نے تعلیمات اسلام کو اپنا یا ان پکا بند ہوئے
ہر ایک نے اپنی دسترس بھرس پر عمل کیا، لیکن یہ سب مساوی حیثیت کے مالک کیسا عقبتار
کے حامل اور برابر کے افراد تھے، ان کے اختلافات میں ایک بالا تر حاکم مسلم نبوت عالم
مشکوٰۃ نبوت سے منور تر فرد کامل کی ضرورت پڑتی ہے یہ حاکم وقاضی کون تھا؟ ابو بکرؓ یا
علیؓ بن ابی طالب۔

تائید و تشریح، اعتبار بار و فرض کے لحاظ سے کہہ لیجیے۔

"کچھ فرق نہیں ان چاروں میں"

لیکن تاریخ و حدیث، فرقان مجید اور حقائق کی روشنی میں یہ خیال کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے جن کے
بارے میں فرق کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے بیانات محفوظ ہیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن کے
ہوتے ہوئے یہ کہنا ناممکن ہے۔ یہ دو عظیم اختلافی گروہوں کے دلائل اس پر مستزاد ہیں۔
کبھی کبھی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ "ایرانیت" نے اس اختلاف کو ہوا دی ہے گویا اختلاف
مانتے ہیں مگر وسعت دامن پر اعتراض ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ "ایرانیت" کا نام لے کر
نوش ہونے والے یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ خود خالص عرب، نجیب الاصل، باطنی داموی کب میں
لکے اور مدینے کے مسلمانوں نے کون سے صحیفے لکھ کر چھوڑے جو ان مخلص حضرات کی رہنمائی
کرتے ہیں۔ شامی ثقافت اور رومی تہذیب، یہودی ماحول اور نصرانی پڑوسیوں کے تاثرات
کا انکار کرنا آسان ہے۔ ہندسی رسم و رواج، ترکی دستور و قواعد اسپینی تاثرات، افریقی
مصری خصوصیات تحقیق کسی عقیدے کی حقیقت کو عیاں نہیں کرتی، مگر عقیدہ امامت حدیث تفسیر
تاریخ و واقعات، ایرانی پیداوار کہہ کر بڑی آسانی سے مسترد کر دیے جاتے ہیں۔

مغالطہ کا یہ عنوان کچھ غلط فہمی کا باعث ہو جاتا ہے کچھ بات ختم کرنے میں آسانی پیدا
کرتی ہے محقق و باخبر آدمی کے لیے یہ بات مضحکہ خیز ہے وہ سوچتا ہے کہ رسم کتابت قرآن سے
جمع حدیث تک، تہذیب و تاریخ سے تشریح فقہ تک سب ایرانی ہے تو عربیت کہاں سے آگئی؟

ین عربی ہے۔ فقط قرآن کی حد تک صحیح ہے لیکن نہ مسلمان سب کے سب عربی۔ نہ احکام عربی۔ قرآن خود مدعی ہے کہ ادیان سابقہ اور کتب انبیاء کا جو ہر اسلام و قرآن ہے۔ یہ کتابیں اوسان کے بن ساسی اسرائیلی اور عبرانی۔ غرض خدا جانے کیا کیا تھے؟ پھر اگر یہ سب اسلام میں داخل ہو کر اسلام کو نقصان نہ پہنچا سکے تو ایران کے اسلام نے کیا قیامت ڈھادی۔ خاص صحابیوں میں نبوت کے دعویدار ہوئے۔ اسلامی علانہ عرب میں زندہ ہونے والوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ منافقین کی ریشہ دوانیوں کے ذکر سے قرآن خالی نہیں، مگر یہ کہ کوئی کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اسلام اس دھرم و غیر قریش کی روایت سے متاثر ہوا۔ یہ بات محل ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفس نفیس قبولِ ہدایت یا بانیِ ثقافت، نافع احکام الہی اور موعظ دین فتنہ جو انھوں نے فرمایا وہ حق، جو انھوں نے کیا وہ درست جو وہ کہ گئے وہ انھیں سے شروع ہوا۔ سابقہ تاریخ الگ گئی، گذشتہ روایتیں کالعدم قرار پائیں۔ دین اللہ کا مقتدا اللہ کا روایت اسلام کی۔

ایرانی وغیر ایرانی، یہودی وغیر یہودی۔ روایت کا فیصلہ کیجیے مگر مجموعی حیثیت سے ایمان دارانہ طریقہ پر پوری طرح بحث و نظر کے بعد اور یہ سوچتے سمجھتے کے بعد کہ اس فیصلہ پر کوئی غم و دل بھی ہے۔ امامت، خلافت اور نبابت رسول کا مسئلہ حل کرتے ہوئے ہماری سلسلہ حقیقت ہے کہ ایک مرتبہ الملش ہوا اور دوسری مرتبہ نامزدگی اور یہی نامزدگی جب گئی اور کسے تو قابل مضحکہ و مسخر ابرائیت ہے جب قرآن ذوی القربی کو خس دلائے تو دین جب ہم ذوی القربی کا نام میں تو خدا نمان پرستی قرار پائے۔

اسل معاملہ یہ ہے کہ مطالعہ میں ہمارے دور چکر کا داخلہ ممنوع ہے۔ اگر براہ راست ہم سے ہماری سنی جاتی تو بات یوں نہ بگڑتی، ہوتا یہ ہے کہ لوگ تاسخ مل و دخل پڑھ کر فیصلہ کر لیتے کہ بات کیا ہے حالانکہ وہ بیچارے علماء و مؤرخین فریق کی اس مجبوری سے ناواقف ہیں کہ ابن حزم ہوا شہرستانی دونوں شیعہ ہیں، اچھے عقیدہ کا بیان بڑی بصیرت و واقفیت طلب بات ہے۔ یورپ کے مستشرق اور ہند و ایران کے عرب کا نہ نظریوں سے کام کرنے والے سن و طہنورہ کی مثال بن جاتے ہیں۔

’نگار لکھنؤ کا ایک مشہور علمی مجلہ ہے اس کے مدیر نیاز فتحپوری، اندھیات کے عالم اور ادبیات میں سنی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا ماہنامہ مدقوں سے ادب اور کی نظر میں با وقعت ہے پرنکر اس رسالہ کا حلقہ مطالعہ ملا اور علماء دین کے حلقے سے الگ ہے اس لیے اس میں کبھی کبھی اگر نہ بھی مباحث چھڑ جاتے ہیں قرآن کا انداز لکھو کچھ اور ہوتا ہے وہ بھی مباحث اصطلاحی باتیں، ناراضگی اور سب سے بڑی بات یہ کہ پرانہ لفظ بحث و نظر نہیں ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں نگار نے ’امامت‘ کی بحث پر عام دعوت فکری و نظری، بنیاد پر اقلیت کے روشن خیال حضرات نے خامہ فرسائی کی علوم جدیدہ کے ماہرین اور کلام و عقائد کے واقف کار اپنا اپنا یاد بھانے کے لیے مضمون نگار نے مختلف حیثیت سے لوگوں نے مسئلہ میں دلچسپی لی اس لیے مختصر نے دلچسپی لی۔ امامیہ نے لکھنؤ نے مضامین کی افادیت کے پیش نظر جناب مولانا علی نقی صاحب کے افادات کے ساتھ شائع کیا تھا۔

اس مجموعے میں پانے مسائل و مآخذ و مباحث کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جن میں عصر جدید میں بڑے شد و مد سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ مدیر نگار، ابو سعید ربعی فاروق کانپوری، عینی شاہ نظامی، خلیل الرحمن اعظمی جیسے حضرات کے مضامین اپنے اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر احتشام حسین، ہزائم، اور مولانا علی نقی صاحب کے مضامین ان پر مبرور نظر کرتے ہیں جن سے ہر قاری کے لیے راہ فیصلہ صاف اور گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

’مکتبہ امامیہ‘ کی یہ چوتھی مقرر پیش کش لائق تحسین و داد ہے۔

”خلافت بر مقام ماگواہی است

حرام است آنچه بر ما پادشاہی است

ملوکیست ہمہ مکر است و نیزنگ

خلافت حفظ ناموس الہی است

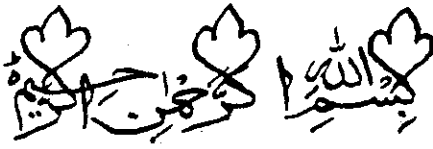
”علامہ اقبالؒ“

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

{ ایک غیر مسلم کے نقطہ نظر سے }

ہر نام



مسئلہ خلافت و امامت

(ایک غیر مسلم کے نقطہ نظر سے)

محترم مدیر نگار! میں ایک عرصہ سے تمہارا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس میں کلام نہیں کہ مذہب کے باب میں آپ کی بے لاگ تنقیدوں سے میں نے کافی استفادہ کیا، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک آپ نے اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی جو یقیناً جماعت اسلامی کے ہر فرد کی اولین توجہ چاہتا ہے۔

مجھے شیعہ سُنی کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے کیونکہ میں ایک غیر مسلم شخص ہوں لیکن میں نے ہمیشہ جماعت اسلامی کے ان دروہوں فریقوں کے اختلاف کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا ہے اور حیران ہوں کہ اس وقت تک کیوں اس تفریق کے مسئلے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مکن ہے آپ نے مسئلہ خلافت و امامت پر مروت اس لیے اظہارِ خیال نہ کیا ہو کہ یہ نزاع عرصہ سے چلی آرہی ہے اور اس کا فیصلہ دشوار ہے لیکن ریض ورنس کہ ماضی کا عقدہ لانیل مستقبلِ جمال میں بھی بدستور معتمد بنا رہے۔ بہر حال میں عرصہ سے متمسق تھا کہ آپ کے خیالات اسباب میں معلوم کروں اور اس کی تدبیر میں نے یہی مناسب سمجھی کہ خود اپنی تحقیق اس مسئلہ میں آپ کے سلسلے پیش کروں اور اگر آپ کو اس سے اختلاف یا اتفاق ہو تو ”باب المراسلۃ والمناظرۃ“ کے وساطت

کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی یعنی آپ کا مقصود صرف حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بن رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور بجائے تیغ و خنجر کے اپنی شرافت نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قائم کرے۔ اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی خلافت کے لیے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی احترام و حاشیہ حاصل نہ تھا۔ لیکن اگر رسولؐ کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی، بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آئیے واقعات تاریخی پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر فوق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ منصب نبوتؐ ملنے کے بعد آنحضرتؐ نے اول اول اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتداء کی ہوگی جن میں جناب خدیجہ اور علیؑ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور اگر اہلسنت کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیرؓ کی ذات تھی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں:-

المرجع ائمة اول من اسلمہ یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے۔

اسی کتاب کے باب الانقلاب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سابق الاسلام ہونا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اہل عرب میں سب سے پہلے اسلام لانے والا)

کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی تھی یا ایک معلم روحانی کی یعنی آپ کا مقصد صرف حکومت و سلطنت قائم کرنا تھا یا لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے بلکہ ایک قوم بننا ہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہوا اور بجائے تنبیغ و تنبیغ کے اپنی شرافت نفس سے روحانی حکومت دنیا میں قائم کرے۔ اگر آپ کی حیثیت صرف ایک دنیاوی بادشاہ کی سی ہوتی تو بیشک آپ کی خلافت کے لیے ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت کافی تھی اور جو کوئی آپ کا خلیفہ مقرر کر دیا جاتا کسی اعتراض کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی، بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اب آئیے واقعات تاریخی پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کا فیصلہ اس مسئلہ میں کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام قبول کرنے کی حیثیت سے کس کو کس پر فوق حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ منصب نبوت ملنے کے بعد آنحضرتؐ نے اول اول اپنے ہی گھر والوں سے تبلیغ کی ابتداء کی ہوگی جن میں جناب خدیجہ اور علیؑ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اور اگر اہل ہند کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا جائے تو یہ فیصلہ دشوار نہیں کہ سب سے پہلے جس انسانی ہستی نے قبول کیا وہ جناب امیرؑ کی ذات تھی۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی، "تقریب التہذیب" میں لکھتے ہیں:-

المراج اتہ اقل من اسلم "یعنی ترجیح اسی امر کو ہے کہ سب سے پہلے آپ اسلام لائے۔"

اسی کتاب کے باب الالقاب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سابق الاسلام ہونا اتنا مشہور تھا کہ آپ کا خطاب ہی "سابق العرب" (اہل عرب میں سب سے پہلے اسلام لانے والا)

قرار پایا تھا۔

واقعات سے بھی اس قل کی ترجیح ظاہر ہوتی ہے۔ عقیف کندی کی روایت ملاحظہ ہو:-
 ”میں تاجر تھا، حج کے لیے مکہ آیا تو عباس ابن عبدالمطلب کی ملاقات کو
 جایا کرتا تھا۔ ایک دن اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا ایک شخص
 پردہ سے نکلا اور پھر عبادت میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون پردہ
 سے باہر آئی اور اس شخص کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے عباس سے
 پوچھا یہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا یہ محمد ابن عبد اللہ ہیں۔ میں نے پوچھا وہ
 خاتون کون ہیں؟ کہا، اُن کی بیوی خدیجہ بنت خویلد۔ تھوڑی دیر میں ایک
 کمن نو عمر صاحبزادہ آیا اور وہ بھی اُن کے ساتھ مصروف عبادت ہو گیا
 میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ عباس نے کہا کہ یہ محمد کا چچا زاد بھائی علی ہے
 میں نے کہا یہ کرتے کیا ہیں؟ جواب ملا کہ نماز پڑھتے ہیں۔ محمد کا خیال ہے
 کہ خدا نے اُن کو پیغمبر بنایا ہے اور اس وقت تک سوائے ان کی بیوی اور
 چچا زاد بھائی کے کسی نے اُن کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے باوجود
 محمد کا خیال ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کے مالک کو فتح کریں گے۔“

عقیف نے اس واقعہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ”لو کان رزقنی
 الاسلام يومئذ كنت ثانيا مع علي ابن ابي طالب“ (یعنی اگر اُس دن مجھے اسلام
 لانے کی توفیق ہو جاتی تو علی کے بعد دوسرا میں ہوتا)

اس روایت کو علامہ ابن عبد البر قرطبی نے استیعاب میں، ابن اثیر حندی نے
 اسد الغابہ میں، ابن جریر طبری نے تاریخ کبیر میں اور ابن اثیر نے کامل میں درج کیا ہے۔
 یہ اس وقت کی بات ہے جب آنحضرت مخفی طور پر تبلیغ اسلام کر رہے تھے لیکن جب

۱۔ مطبوعہ دارۃ المعارف بیروت، جلد ۲ صفحہ ۲۲۵ ۲۔ مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۴۱۴ ۳۔ مطبوعہ مصر جلد ۲
 ۴۔ مطبوعہ مصر جلد ۲

آیت ”واذرعشیرتک الاقربین“ نازل ہوئی اور ایک محدود دائرہ کے اندر تبلیغ کا حکم نازل ہوا تو آنحضرتؐ نے اپنے اقرباء اور اولاد عبدالمطلب و ہاشم کو جمع کیا اور اس وقت جو تقریر آپؐ نے کی وہ خلافت کے مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لیے حل کر گئی۔ ارشاد ہوتا ہے :-

یا بنی عبدالمطلب انی واللہ
ما اعلم شابا فی العرب جاء
قومہ یا فضل مما قد جئتکم
اتی قد جئتکم بخیر الدنیا
والآخرة وقد امر فی اللہ تعالیٰ
ان ادعوکم الیہ فایکم یأزرنی
علی ہذا الامر علی ان یکون
اخی، ووصی وخیلی فیکم۔
اے قرظندان عبدالمطلب باور کرو
کہ میں نہیں سمجھتا عرب کے کسی جوان نے
اپنی قوم کے سامنے وہ تحفہ پیش کیا ہو جو
میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میں
دنیا و آخرت کی بہتری کا تحفہ پیش
کرتا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے
کہ میں تم کو اس کی دعوت دوں۔ پھر کون
ہے جو اس امر میں میرا ساتھ دے تاکہ
وہی میرا بھائی، میرا ولی، میرا جانشین
قرار پائے۔

یہ سن کر مجمع پر خاموشی کا عالم طاری ہو گیا اور کسی طرف سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔
آخر کار علیؑ اٹھے اور باوازی بلند کیا کہ ”اے بنی عبدالمطلب! ان اکون و زکیا علیہ“ اے
رسول اللہؐ میں آپؐ کی اطاعت و ہمدردی کے لیے آمادہ ہوں (حضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا۔
”ان ہذا اخي ووصي وخیلی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا“ (دیکھو یہی میرا
بھائی، میرا ولی، میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا
چاہیے۔)

لے تاریخ کبیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۷۔ سلو الفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۱۶۔ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۲۲۔ باب التذیل
خانان بغدادی مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۔ معالم التنزیل رجاشیہ تفسیر خازن مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۔

پہلے معاہدہ ہو گیا، قرار داد پائے تکمیل کو پہنچ گئی۔ علیؑ نے بیعت کی، رسولؐ نے بیعت لی۔ کس بات پر؟ نصرتِ اسلام پر، اعلاء کلمۃ الحق پر، اور رسولؐ نے اسی وقت اپنی خلافت و جانشینی کا مسئلہ بھی طے کر دیا۔

بے شک اگر خود علیؑ اس کے بعد اپنے فرض میں کوتاہی کرتے اپنے اقرار و قیام ثابت قدم نہ ٹھہرتے، اپنے عہد نصرت میں کمزور ثابت ہوتے تو یہ معاہدہ بھی کالعدم ہو جاتا، لیکن چونکہ آپؐ کی خدمات شروع سے اخیر تک یکساں و پراسرار طرز قائم رہتی ہیں اس لیے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ معاہدہ منسوخ ہو گیا۔

اب آئیے اس کی تحقیق بھی کر لیں کہ آپؐ نے کسی وقت کوئی کمزوری تو نہیں دکھائی۔ اعانتِ رسولؐ کے کبھی منہ تو نہیں پھیرا۔ اور جو قول و قرار ایک بار ہو چکا تھا اس سے کبھی انحراف تو نہیں کیا؟

یہ امر تاریخ اسلام کے دیکھنے والوں سے مخفی نہیں کہ جب رسولؐ نے تبلیغ مشروع کی تو کفار کی ایذا رسانیاں بڑھنے لگیں، آپؐ کے قتل کی تدبیریں ہونے لگیں اور مسلمانوں کی جماعت ہجرت پر آمادہ ہو گئی، چنانچہ حد یہ ہے کہ قبائل عرب میں سے چند لوگ اس بات پر متحمل نہ ہو سکے کہ گھر کا محاصرہ کر کے آپؐ کو قتل کر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وقت کتنا نازک تھا اور ایسے وقت میں مدد دینے والا کوئی نہیں ہوتا، لیکن رسولؐ اللہؐ جانتے تھے کہ کون کام کرنے والا ہے۔ اس لیے آپؐ نے بلا تامل مکہ سے پوشیدہ طور پر ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اور کفار کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے آپؐ نے جناب امیرؓ سے یہ خیال ظاہر کر کے کہا کہ:-

”ثم علی فراشی و اتشح ببردی الحضرمی الاخصر فتم فیہ“

(تم میرے بچپونے پر سو رہو اور میری سبز چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ)

کتنا سخت مرحلہ تھا کیسی دشوار گزار منزل تھی، مگر وہ جو ایک بار جان نثاری و وفاداری کا عہدہ بیان کر چکا تھا اپنی جان دینے کے لیے چارو تان کر صوبہ ہا اور رساتماں

تشریف لے گئے۔

قسطانی نے کہا۔

”فکان اقل من شمری نفساً“ (وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی جان بیچ ڈالی)

ام غزالی لکھتے ہیں کہ اس موقع کے لیے علیؑ کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

”ومن الناس من يشري نفسه ابتغاء مرضات الله“ (ایسے بھی لوگ

ہیں جو خدا کی مرضی پر اپنی جان بیچ ڈالتے ہیں)

اکثر مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ رسالتِ مآب اپنے بعد علیؑ کو اس لیے چھوڑ گئے تھے

کہ وہ لوگوں کی امانتیں جو رسول اللہؐ کے پاس تھیں واپس کر دیں۔

آنحضرتؐ کی معیت میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لے گئے اور غار میں پناہ لی جب کفار

قریش تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو فکر دامنگیر ہوئی، آنحضرتؐ نے

فرمایا، رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے:-

ثانی اثین اذہما فی الغار اذ وہ وقت جب ہمارا رسولؐ اپنے ایک

لیقول لصاحبه لا تحزن ان الله ساتھی کے ساتھ تھا اور دونوں غار میں

معنا، فانزل الله السکینۃ تھے، وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا اعم

علیؑ رسولہؐ نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تو خدا نے

اطمینان و سکون نازل کیا اپنے رسولؐ پر

اس واقعہ پر حضرت ابوبکرؓ کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں کہ خدائے اُمّیں ”صاحب“

کے لفظ سے یاد کیا۔ اور آنحضرتؐ نے (ان الله معنا) کہہ کر اپنے ساتھ اُن کو بھی

شامل کر لیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص کو محض لفظ ”صاحب“ یا ساتھی سے

لے سواہب لدنی جلد ۱ صفحہ ۷۸، تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۳۷۷، سلفہ ابوالفضل جلد ۱ صفحہ ۱۲۶ تا بیچ خمیس

دیار بکری جلد ۱ صفحہ ۳۶، کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۷۷، سواہب لدنی قسطانی مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ۱ صفحہ ۸۰

سے یاد کرنا جبکہ وہ واقعی ساتھ ہو کس فضیلت کو ثابت کرتا ہے۔ لفظ (صاحب) تو ایسا ہے جس میں ہر شخص شامل ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ کسی مومن و غیر مومن کی گفتگو کے سلسلہ میں لفظ (صاحب) اسی طرح نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”اذ قال لصاحبه وهو يحاذره اكفرت بالذي خلقك“

الغرض ایک ساتھی کو ساتھی کہنا کوئی ایسی بات نہیں جس سے کوئی فضیلت ظاہر ہو رہا خدا کا ساتھ ہونا، سو ظاہر ہے کہ جس جگہ رسولؐ ہوں گے وہاں خدا کی معیت بھی ہوگی۔

غار الی آیت میں سب سے زیادہ قابل غور آخری الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف اپنے نبیؐ پر اطمینان و سکون نازل کیا۔ یہاں ان کے ساتھی کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اگر جناب ابوبکرؓ کے اطمینان و سکون کو بھی ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو (علیؓ رسولؐ) کی بجائے (علیہما) ارشاد ہوتا۔

بہر حال اس واقعہ ہجرت و واقعہ غار میں حضرت علیؓ نے جس ایثار و قربانی جس دلیری بے نفسی کا ثبوت دیا وہ بجلے خود اتنا اہم ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی معیت وغیرہ کا کوئی سوال اس کے مقابلہ میں لایا ہی نہیں جاسکتا۔ اب اور آگے چلیے۔

مدینہ میں آنے کے بعد آنحضرتؐ نے مہاجرین و انصار کے درمیان دوبارہ مواخاۃ قائم کی۔ ظاہر ہے کہ بھائی چارہ انھیں دو آدمیوں میں قائم کیا جاتا ہے جو اپنی خصوصیات مزاجی و عادات و خصائل کے لحاظ سے باہم گہر بہت ملتے جلتے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ کے ساتھ بھائی چارہ قرار دیا۔ حضرت حمزہؓ کو زید بن حارثہؓ کے ساتھ، حضرت عثمانؓ کو عبد الرحمن بن عوفؓ کے ساتھ، زبیرؓ کو ابن مسعودؓ کے ساتھ، عبیدہؓ ابن حارثؓ کو بلالؓ کے ساتھ، مصعبؓ ابن عمیرؓ کو سعدؓ ابن ابی وقاصؓ کے ساتھ، ابوعبیدہؓ جراحؓ کو سالمؓ مولیٰ بن حذیفہؓ کے ساتھ اور سعیدؓ ابن زیدؓ کو طلحہؓ کے ساتھ۔ رہ گئے علیؓ، سوانؓ کا بھائی چارہ اپنے ساتھ کیا۔ چنانچہ مؤرخ ابوالفضلؒ لکھتا ہے:-

اُخیری رسول اللہ فاتخذ رسول
 اللہ علی ابن ابی طالب اخا وکان
 علی یقول علی منبر الکوفۃ ایام
 خلافتہ انا عبد اللہ و اخو
 رسول اللہ۔
 آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب میں مواخا
 قرار دی اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کے اپنا بھائی
 قرار دیا اور علیؑ اپنے زمانہ خلافت میں
 کوفہ کے منبر پر کھاکرتے تھے کہ میں خدا
 کا بندہ اور رسول خدا کا بھائی ہوں۔

ایک دوسرے موقع پر بھی رسول اللہؐ نے سب کو ایک دوسرے کے ساتھ بھائی
 بنایا تھا اور علیؑ کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ابن عبد البر نے استیعابؒ میں لکھا ہے :-

اُخیری رسول اللہ بین المهاجرین
 ثم اُخیری بین المهاجرین والانصار
 وقال فی کل واحد منهما علی
 انت اُخیری الدنیا والاخرۃ۔
 رسول اللہؐ نے ایک بار مہاجرین کے
 درمیان مواخا قائم کی اور دوسری بار
 مہاجرین و انصار کے درمیان۔ اور یہ مرتبہ
 یہی فرمایا کہ علیؑ دنیا و آخرت میں میرا بھائی
 ہے۔

اس کا تذکرہ ابن حجرؒ کی سوانح محرقہؒ اور تاریخ خمیسؒ میں بھی موجود ہے۔



مسجد نبویؐ کی صورت یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف صحابہ کے گھر تھے اور ان سب
 کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے جس سے لوگوں کی آمد و رفت صحن مسجد میں بہت تھی۔ ایک
 مرتبہ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ سب دروازے چُن دیے جائیں مگر علیؑ کے مکان کا دروازہ نہ
 چُنا جائے۔ اس حکم پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں تو حضرت نے منبر پر جا کر فرمایا کہ ”مجھے
 ہو حکم خدا کی طرف سے ہوا وہ میں نے کیا۔ میں نے اپنی مرضی سے نہ اُن دروازوں کو بند کیا۔
 نہ اس کو کھلا رکھا۔“

۱۔ مطبوعہ دارۃ المعارف حیدرآباد جلد ۲ ص ۲۴۳۔ ۲۔ مطبوعہ مصر ص ۳۹۵ جلد ۱ ص ۲۹۵۔

۳۔ خلاصۃ نسائی ص ۳۲۔ ریاض نضر جلد ۲ صفحہ ۱۹۲۔

اس واقعہ سے اور اس قسم کے بہت سے نظائر سے جن کا ذکر آگے آئے گا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسولؐ کی ان توجہات کو جو جناب علیؑ کے ساتھ تھیں اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے۔ اور جناب رسالتؐ کی موجودگی میں بھی نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے۔ اور یہ وہ جذبات تھے جن کا آہستہ آہستہ قوی ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ رسول اللہؐ کے لطافت جناب امیرؓ پر برابر بڑھتے ہی جاتے تھے۔ اور جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا حضرت علیؑ اپنی خصوصیات اخلاق کی وجہ سے رسول اللہؐ کے دل میں گھر کرتے ہی جا رہے تھے۔

سید میں اسلام کی سب سے پہلی لڑائی ہوئی جس کا نام جنگِ بدر ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ ساز و سامان بھی موجود نہ تھا۔ اور رسول اللہؐ کے لیے میدانِ جنگ سے کچھ علیحدہ ایک عرش بنا دیا گیا تھا تاکہ وہاں سے جنگ کی حالت کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے اس لڑائی میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ وہیں عرش پر بیٹھے رہے۔ حضرت عثمانؓ اپنی بیوی کی حضرات کی وجہ سے مدینہ ہی میں رہ گئے تھے۔ میدانِ جنگ اس دن چند آدمیوں کے ہاتھ رہا۔ جن میں نمایاں حصہ رسول اللہؐ کے قریب لڑوں نے لیا۔ مثلاً حضرت حمزہؓ ابن عبد المطلب، عبیدہ بن حارث اور حضرت علیؑ۔ عبیدہ شہید ہو گئے اور حضرت علیؑ کے ہاتھ سے بڑے بڑے کفار قتل ہوئے۔

اسی سال حضرت نے علیؑ ابن ابی طالب کو اپنی دامادی سے سرفراز کیا۔ اور اپنی محبوبہ صاحبزادی حضرت فاطمہؓ زہراؓ کا عقد اُن سے کر دیا۔ تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے خواستگاری کی، مگر رسول اللہؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب حضرت علیؑ نے خواہش ظاہر کی تو حضرت نے فرمایا کہ:-

سہ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰۔ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۸۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۲۷۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۹۔ سہ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۹۔ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۹۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۱۸۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۲۹۔ ابوالفداء جلد ۱ صفحہ ۱۲۹۔ سہ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۹۹۔ تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۴۱۸۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۲۹۔

قد امرنی ربی بذالک (اس کا تو مجھے خدا نے حکم دیا ہے)

جب عقد ہو چکا تو حضرتؑ نے جناب فاطمہؑ سے فرمایا:-

اما ترضین یا فاطمة ان الله
اختار من اهل الارض رجلین
جعل احدهما اباً لك والآخر
بعلاً لك
اے فاطمہ کیا تم اس بات سے خوش
نہیں ہو کہ خدا نے تمام اہل زمین میں دو
شخصوں کا انتخاب کیا جن میں سے ایک
تمہارا باپ ہے اور دوسرا شوہر۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس شادی کی بنیاد صرف ذاتی قرابت پر نہیں تھی بلکہ انتخاب
الہی اور فضیلت ذاتی پر تھی مصالح اسلامی کے لحاظ سے لڑکیاں لے لینا اور خود داماد
بن جانا دوسری بات تھی لیکن جب لڑکی دینے کا وقت آیا تو بڑے بڑے صحابہ کی
خواہش رد کر دی گئی اور حضرت علیؑ کا انتخاب کیا گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہ تھا جس کا اثر زائل
ہو جاتا، رہا اور عمر بھر رہا، چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے:-

لقد اعطی علی ثلث خصال
لان تكون لی خصلة منها
احب الی من حمر النعم فضل
ماهی قال تنویر بیج ابنتہ
علی کو تین باتیں ایسی حاصل ہوئیں کہ
اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتی
تو سرخ اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب
ہوتی۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں؟ کہا کہ ایک
تو یہی ہے کہ رسولؐ کی صاحبزادی کا عقد
اُن سے ہوا۔



۳۔ میں اُحد کی جنگ ہوئی۔ یہ وہ سخت و فیصلہ کن جنگ تھی جسے قدرت کو
مسلمانوں کے عزم و ثبات کی کسوٹی بنانا منظور تھا۔ اول اول حالات بہت امید افزا

۱۔ ریاض لغزو جلد ۲ صفحہ ۱۸۲۔ ۲۔ مواہق محرقہ صفحہ ۷۸۔ ۳۔ تاریخ الخلفاء رسیوطی صفحہ ۱۷۱۔

تھے کیونکہ لشکر کفار کے علمدار طلحہ بن عثمان کو حضرت علیؑ نے قتل کر کے دشمنوں کو شکست دے دی۔ لیکن جب کفار بجائے کھڑے ہوئے اور مسلمان مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے پس پیشی سے بے خبر ہو گئے تو خالد بن ولیدؓ نے (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) پشت کی طرف سے پھر حملہ کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اُسے شیخ عبدالحی محمدؒ دہلوی کی زبان سے سُن لیجئے۔ مدارج النبوة میں لکھتے ہیں کہ:-

”مسلمان رو بہ ہزیمت آوردند و حضرت رسولؐ را تنہا گذاشتند، حضرت در غضب آمد و عرق از پیشانی ہماؤنش متقاطر گشت، در آن حالت نظر کروا علیؑ ابن ابی طالب را کہ ز پہلوئے مبارکش ایستاده است۔ فرمود کہ تو چرا بہ برادران خود لحق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی۔ علیؑ گفت۔ اَکفر بعد الا یبدان اتالی جلیق اسوۃ۔ یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان۔ بتحقق کہ مرا بتواقت است بایادان مفروضہ سر و کار باشد۔ دیں اثنا مجھے از کفار متوجہ آنحضرتؐ شدند آنحضرتؐ فرمود اے علیؑ! مرا ازیں جمع نگذار، وہی خدمت بجا آ رہے کہ وقت نصرت است پس علیؑ متوجہ آن قوم شد۔ چنان قلع قمع نمود کہ مجھے کثیر بہ دوزخ افتادند و باقی ماناگان متفرق گشتند۔ می گویند کہ در آن روز شانزدہ زخمہا بر تن مبارک جناب امیرؑ رسیدند۔“

دل تھراتا ہے۔ قلم رزتہ ہے، جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں انہما رنج کے صفحات سے ان حروف کو پھیل کر پھینک دوں۔ کس طرح دیکھوں اور کیونکر لکھوں کہ کس کس نے فرار کیا۔ لیکن حاکم کو کیا کر دل۔ امام فخر الدین رازی، محمد ابن جریر طبری، ابن اثیر جزیری، شیخ الاسلام سیوطی، ان سب کے بیانات کو کہاں لے جاؤں۔ جدھر دیکھیے اُس طرف سے ”رو بہ ہزیمت آوردند رسول اللہؐ را تنہا گذاشتند“ کی آواز آرہی ہے اور لطف یہ کہ ایک ایک کا نام بھی لکھ دیا ہے۔

تاریخ نمیں (جلد ۵ صفحہ ۴۸) میں ہے کہ حضرت یوکر فرماتے ہیں :-
 لما صوّف الناس يوم اُحد عن رسول الله كنت اول من جاء النبي
 (یعنی) جب لوگوں نے اُحد کے دن رسول اللہ سے روگردانی کی تو میں رسالت مآب
 کے پاس سب سے پہلے واپس آیا۔

تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری (جلد ۴ صفحہ ۹۶) میں لکھا ہے :-
 ”قال عمر لما كان يوم اُحد هزمنا ففررت حتى صعدت الجبل
 فلقد رأيتني انزوكاني ارضي“
 یعنی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب اُحد کے دن لوگوں نے شکست کھائی تو میں بھاگ کر
 پہاڑ پر چڑھ گیا۔ وغیرہ وغیرہ“

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر (جلد ۲ صفحہ ۷۴) میں لکھتے ہیں :-

ومن المنهزمين عمرا لا انه لم يكن في اوائل المنهزمين
 ولم يبعد بل ثبت على الجبل الى ان صعد النبي ومنهم ايضا عثمان
 انهزم مع رجلين يقال لهما سعد وعقبة انهزموا حتى بلغوا موضعاً
 بعيد اثم رجعا بعد ثلاثة ايام فقال لهم النبي لقد ذهبتم فيها
 عريضة۔

(فراریوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے، مگر وہ سب سے پہلے فرار کرنے والوں میں نہ تھے
 اور بہت دور بھی نہ گئے تھے، بلکہ پہاڑ پر چلے گئے تھے۔ فراریوں میں سے حضرت عثمانؓ بھی
 تھے اور سعد و عقبہ کے ساتھ فرار کیا تھا۔ اور یہ لوگ بہت دور چل گئے تھے۔ اور جب تین
 دن کے بعد واپس آئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم لوگ بہت لمبے نکل گئے تھے)

حضرت عثمانؓ مقام احوص کے حدود تک پہنچ گئے تھے۔ اور جب وہاں سے تین دن
 کے بعد واپس آئے تو رسول اللہؐ نے وہ فقرہ فرمایا جس کا ذکر اوپر آیا ہے

طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۔ استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۰۲۔ تفسیر جامع البیان جلد ۴ ص ۹۶۔

خود قرآن مجید میں جو تصویر اس جنگ کی پیش کی گئی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے :-

اذ تصعدون دلا تلون علی وہ وقت جب تم پہاڑ پر چڑھے چلے
احد والہ رسول یدعوکم فی جارہے تھے اور مڑ کے بھی کسی کو نہ دیکھتے
اخراکم۔ تھے اور رسول تمہیں پیچھے سے آواز
دے رہا تھا۔

یہ تھا وہ عبرت انگیز سال اور یہ تھا وہ امتحان محبت و صداقت جس میں سوائے ایک ذاتِ علیؑ کے اور کوئی دوسرا کامیاب ثابت نہ ہوا۔
رسول اللہؐ کو اس دشمن طرزِ عمل کی وجہ سے اتنی بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی کہ آپؐ نے خاتمہ جنگ پر قتل ہو جانے والوں کے متعلق فرمایا۔ ھؤلاء اشدھ علیہم
(یہ وہ ہیں جن کے ایمان کی گواہی میں دیتا ہوں)
حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ ”یا رسول اللہؐ کیا ہم ان کے بھائی نہیں ہیں اور کیا ہم اسلام
نہیں لائے اور کیا ہم نے کبھی آپؐ کے ساتھ جہاد نہیں کیا؟“
حضرتؓ نے فرمایا۔ ”بلیٰ ولا ادری ما تحذون بعدی“ (ہاں۔ مگر کیا
معلوم میرے بعد تم لوگ کیا کرو گے)۔



شہید میں جنگ خندق واقع ہوئی۔ اُسد کے واقعہ کا حصہ دامول پر موجود تھا اور
اس کے چھڑنے کا یہ موقع اچھا تھا۔ لیکن عمرو ابن عبدود کا سا بہادر پورے جوش و خروش
سے مبارز طلبی کر رہا تھا کس کی ہمت تھی کہ موت کے منہ میں چلا جائے۔ تاریخ کا بیان ہے
کہ:- طلب المبارزۃ والاصحاب ساکنون کا نما علیؑ رُوْد سہم الطیر لا نہم

لہ موطا امام مالک مطبوعہ مطبعہ مجتہبی دہلی صفحہ ۴۷، ۱۔

کَانُوا يَعْلَمُونَ شَجَاعَتَهُ“ (اس نے مقابل طلب کیا اور اصحاب تمام غامض تھے گویا کہ اُن کے سرور پر طائر بیٹھا ہوا ہے کیونکہ وہ سب اس کی شجاعت سے آگاہ تھے) جناب امیر ہلی ہی آوازیں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر رسول اللہؐ نے اُنھیں روک دیا لیکن جب ہر طرف خاموشی چھائی رہی اور عمر ابن عبدود کی لہن ترابیاں بڑھنے لگیں تو رسول اللہؐ نے جناب امیرؓ کی اجازت دی اور آخر کار اُنھیں کی تلوار نے اس مہم کو بھی سر کیا۔



اس مہم میں صلح مدینہ واقع ہوئی۔ رسول اللہؐ بظاہر حج کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے۔ لیکن مشرکین کے سدراہ ہونے سے آپؐ نے حج کا ارادہ ترک فرمادیا۔ اور چہند شرائط کے ماتحت صلح کر لینا منظور فرمایا۔ یہ شرطیں ایسی تھیں جن سے رسول اللہؐ کی طرف ایک قسم کی کمزوری کا پہلو نمایاں تھا۔ اس صلح نامہ کے کاتب حضرت علیؓ تھے۔ لیکن دوسرے اصحاب کو اس موقع پر طرح طرح کے شکوک پیدا ہو گئے اور اس رداداری پر عجیب قسم کے غصہ و غم کی لہر دوڑ گئی۔

طبری نے لکھا ہے :-

قد کان رسول اللہؐ خروجاہم	جو نہجا بہ رسول اللہؐ کے ساتھ آئے تھے
لا یشکون فی الفتح لرؤیا راہا	اُنھیں یقین تھا کہ فتح ہوگی کیونکہ رسول اللہؐ
رسول اللہؐ فلما راہا ما راہا من	نے ایک خواب دیکھا تھا لیکن جب اُنھوں
الصلح والوجوع وما انحمل	نے دیکھا کہ حضرتؐ نے صلح کر لی ہے اور
علیہ رسول اللہؐ فی نفسہ	سخت شرائط منظور کر کے واپس جا رہے
دخل الناس من ذلک امر عظیم	ہیں تو اُن کے دلوں میں ایسی بُری باتیں
حتی کا دوا ان یہلکوا۔	پیدا ہوئیں کہ قریب تھا وہ ہلاکت یعنی گمراہی
	میں مبتلا ہو جائیں۔

۱۔ تاریخ خفیس جلد ۱ ص ۵۴۔ ۲۔ تاریخ طبری جلد ۳ ص ۴۹

حضرت عمر کا جو عالم تھا وہ خود اُن کی زبان سے سنئے :-

اثبت النبی فقلت الست
نبی اللہ قال بلی قلت السنا
علی الحق وعدونا علی الباطل
قال بلی قلت فلم نعطي الدنیه
فی دیننا اذ اقال فی رسول اللہ
ولست اعصیه وهو ناصرہ
قلت اولیس کنت تحدثنا
اناسنا فی البیت تطوف بہ
قال بلی انا خبوت اناسنا
العام قلت لا قال فانک انتہ
وتطوف بہ قال فاقیت ابابکر
فقلت یا ابابکر الیس ہذا نبی
اللہ حقا قال بلی قلت السنا
علی الحق وعدونا علی الباطل
قال بلی قلت فلم نعطي الدنیه
فی دیننا اذ اقال ایہا الرجل
انہ رسول اللہ ولیس یعصی
ربہ وهو ناصرہ فاستمسک
بغریزہ فواللہ انہ علی الحق قلت
ولیس کان یحدثنا اناسنا فی

میں رسول اللہ کے پاس آیا اور کہا،
کیا آپ رسول خدا نہیں ہیں؟ کہا، کیوں
نہیں میں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارا
دشمن ناحق پر نہیں ہے؟ فرمایا ہاں ایسا
ہی ہے۔ میں نے کہا، پھر ہم اس ذات
کو کیوں برداشت کریں۔ فرمایا میں خدا
کا رسول ہوں اور خدا کے حکم کے خلاف
نہیں کرتا۔ اور وہی میرا مددگار ہے۔
میں نے کہا، کیا آپ نے ہم سے نہیں
کہا تھا کہ ہم عنقریب خانہ کعبہ کی طرف
جائیں گے اور اُس کا طواف کریں گے
حضرت نے فرمایا کیوں نہیں۔ لیکن کیا
میں نے اسی سال کے لیے کہا تھا؟ میں
نے کہا کہ یہ تو نہیں کہا تھا۔ فرمایا پھر میں
اب بھی وہی کہتا ہوں کہ میں خانہ کعبہ
آؤں گا اور یہاں کا طواف کروں گا۔
فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں ابوبکر
کے پاس گیا اور اُن سے بھی
وہی گفتگو کی جو رسول اللہ سے
کی تھی۔

البيت فتطوف به قال بل انا خير
انك تاتيہ العام قلت لا فقال
فانك اتيہ فتطوف به

طبری کی روایت میں آپ کا پہلے حضرت ابوبکر کے پاس اور پھر آنحضرتؐ کے پاس
جہاں سوال وجواب کرنا تحریر ہے۔ تاریخ خمیس (جلد ۲ صفحہ ۲۲۷) میں ہے کہ حضرت عمر
نے کہا:-

واللہ ما شککت منذ اسلمت الا يومئذ (جب سے میں اسلام
لایا کبھی مجھے شک نہیں ہوا جیسا اُس دن ہوا)

یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر فرماتے تھے کہ میں نے اس جہاد کے کفار میں بہت
تمایزیں پڑھیں اور روزے ادا کیے۔

الغرض صلح حدیبیہ کی وجہ سے صحابہ رسول اللہؐ سے اس قدر رخصا ہو گئے تھے کہ
جب صلح کے بعد رسول اللہؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ قوموا فانحروا ثم احلوا
(اٹھو قربانیاں کرو اور سر منڈواؤ) تو ان میں سے ایک بھی آمادہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت
نے تین مرتبہ فرمایا۔ اور جب اس کے بعد بھی کسی نے تعمیل حکم نہ کی تو حضرتؐ کبیدہ خاطر
ہو کر حضرت ام سلمہؓ کے خیمہ میں تشریف لے گئے۔

جب رسول اللہؐ قربانی کرنے کے بعد سر منڈوا چکے تو لوگوں نے بادل ناخواستہ
نود بھی قربانیاں شروع کیں۔ ”بادل ناخواستہ“ کا حال ابن عباس کی روایت ذیل سے
معلوم ہو سکتا ہے:-

حلق رجال يوم الحديبية و
قصا اخر دن فقال رسول الله
کچھ لوگوں نے حدیبیہ کے دن سر منڈوایا
اور بعض نے بال ترشوالیہ۔ رسول اللہؐ

۱۔ مواہب لدنیہ قسطلانی جلد ۱ ص ۱۳۱۔ ۲۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۲۷۔ ۳۔ تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۲۲۷

یوم اللہ المخلقین قالوا والمقصودین
 یا رسول اللہ قال یوم المخلقین قالوا
 والمقصودین یا رسول اللہ قال یوم المخلقین
 قالوا یا رسول اللہ والمقصودین قالوا
 یا رسول اللہ فلم تظہرت الحکم للمخلقین
 دون المقصودین قال لانہم لم یشکوا
 نے فرمایا سرمنڈوانے والوں پر خدا رحمت
 کرے۔ لوگوں نے کہا اور بال ترشوانے
 والوں پر۔ آپ نے پھر وہی کہا۔ آخر
 تیسری مرتبہ کہا کہ بال ترشوانے والوں
 پر بھی رحمت ہو۔ لوگوں نے پوچھا کہ
 آپ نے انکو کیوں ترجیح دی۔ فرمایا کہ
 انھوں نے شک نہیں کیا تھا۔

محمد ابن سعد کا تب واقدی کی روایت ہے کہ حضرت عثمان اور ابوقادہ نے سر
 نہیں منڈوایا تھا۔



شہر میں خیر کی خیم دیکھیں ہوئی۔ اتفاق سے جناب امیر کی آنکھیں آشوب کر
 آئی تھیں۔ اور آپ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے۔ خیر کے قلعوں میں جو سب سے زیادہ مضبوط
 قلعہ تھا وہ دشمن کا مرکز تھا۔

تین روز تک متواتر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر چم اسلام لے کر تشریف لے گئے
 لیکن ہر بار ناکام واپس آئے۔

تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے حکم سن کر عمر کو دیا اور بہت سے لوگ آپ
 کے ساتھ گئے، لیکن خیبر والوں سے مقابلہ ہوا تو آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے پاؤں
 اکھڑ گئے اور سائنات کے پاس واپس آئے۔ اس سال میں کہ ساتھ والے اُن پر زدی کا
 الزام لگاتے تھے اور آپ کے ساتھیوں پر لگے۔

۱۔ تاریخ طبری جلد ۵، تاریخ خمیس جلد ۲، ۲۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ مطبوعہ ریزن صفحہ ۵۰

۳۔ تاریخ خمیس جلد ۵، السیرۃ النبویہ عبدالملک ابن ہشام پر حاشیہ روض الاف جلد ۲ صفحہ ۲۳۹

۴۔ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۴۰

جب یہ صورت دیکھی تو رسول اللہ نے فرمایا:-

اما واللہ لا اعطین الراية
عذراً رجلاً کراً غیر فرار
والا انہیں ہے جو اللہ اور رسول کو دوست
رکھتا ہے اور جسے اللہ و رسول دوست
درسولہ یفتح اللہ علی یدہ
رکھتے ہیں۔ خدا اسی کے ہاتھوں سے
فتح کرائے گا۔

بعض روایات میں کراً غیر فرار کا کرا انہیں ہے (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد ۳ ص ۳۳۲ و طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۵) لیکن اگر اس ٹکڑے کو علیحدہ کر دیا جائے تو معنی نشہ زہ جانتے ہیں۔ کیونکہ صمدت حال یہ تھی کہ براثرِ مین دن سے اصحاب کی سرگردگی میں ہمیں بھیجی جا رہی تھیں اور برابر وہ لوگ شکست کھا کر واپس آ جاتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ رسول اللہ نے یہی کہا ہوگا کہ کل میں اُس کو علمِ دول کا جو بھاگ کر واپس نہ آئے اور نہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ علاوہ اس کے اس فقرہ کو علیحدہ کر دینے سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ کل میں علم اُس کو دول کا جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور جسے خدا و رسول دوست رکھتے ہیں، گویا وہ لوگ جو اس سے قبل پرچمِ اسلام لے کر خیرِ فتح کرنے گئے تھے، وہ خدا و رسول کے دوست نہ تھے۔ اور اس صمدت میں صحابہ کی اور زیادہ تو بین ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال کراً غیر فرار کا کرا ہو یا نہ ہو، یہ امر مسلم ہے کہ رسول اللہ تین دن کی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے کسی اور شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں فرمایا۔

۱۔ تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۵۳ خصائص نسائی ص ۱۱۰ الریاض النضرہ جلد ۳ ص ۱۸۰ سیرۃ نبویہ عبد الملک
روض الالاف جلد ۲ ص ۲۳۹، استیعاب جلد ۲ ص ۴۳۳۔

اس خبر کے سننے کے بعد صحابہ پر کیا اثر ہوا؟ اس کا حال بخاری کے الفاظ میں سمیٹے:-
 فبات الناس يبدون ليلتهم تمام رات لوگوں نے چمکیں گوتوں میں بسر
 اِيَّهم يعطاه فلما اصبح الناس کردی اور جب صبح ہوئی تو ہر شخص یہ تمنا
 عددوا كلهم رجوان يعطاه لیے ہوئے تھا کہ علم اُسے ملے گا۔

طبقات ابن سعد کا تب واقدی میں ہے کہ حضرت عمر کا بیان ہے کہ مجھے کبھی اس
 دن سے پہلے سرداری کی خواہش نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس دن میں ادبچا ہو کر دیکھ رہا تھا کہ
 منظر تھا کہ علم مجھ کو دیا جائے گا۔

طبری نے لکھا ہے کہ جب دوسرا دن ہوا تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر علم کے
 واسطے گردنیں ادبچی کر رہے دیکھنے لگے۔

لیکن اس دوسرے دن صبح کو کیا ہوا؟ حضرت نے علم کو لے کر جنبش دی اور
 فرمایا کون اس کو لیتا ہے، ایک صاحب بڑے اور کمائیں۔ آپ نے فرمایا، جاؤ جاؤ
 آگے بڑھو، قسم اس خدا کی جس نے محمدؐ کے چہرہ کو عزت دی ہے میں یہ علم اس شخص کو
 دوں گا جو بھاگنے والا نہیں ہے۔ اے علیؑ، اٹھو اور علم لو۔
 چنانچہ آپ نے علم لیا، قلعہ فتح کیا اور کامران و بامداد واپس آئے۔



سہ میں مکہ معظمہ فتح ہوا اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے لیکن نبیؐ اور
 علیؑ دوسہنتیاں ایسی تھیں جو اسلام کی خدمت سے غافل نہ تھیں۔ وہ اصنام جو خانہ کعبہ
 میں نصب کر دیے گئے تھے، رسالت مآبؐ اور علیؑ ابن ابی طالب ان بتوں کو توڑنے
 کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہ بت جو سب سے بڑا تھا اور خانہ کعبہ کے اوپر
 نصب تھا اس کے توڑنے کے لیے رسول اللہؐ نے علیؑ کو اپنے کا ندھ پر بٹن دیا اور

طہ طبقات جلد ۲ صفحہ ۴۲ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۹۱، الریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۷۔

آپ نے اس کو توڑ ڈالا۔

مورخ دیار کبریٰ نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:-
طوبی لک عمل الحق وطوبی
لی احمل الحق۔
مبارک ہو تم کو کہ تم حق کے لیے کام
کر رہے ہو اور خوشحال میرا کہ میں حق
کے لیے تمہارا بار اٹھائے ہو تمہیں ہوئے۔

یہ باتیں بظاہر دیکھنے میں بہت معمولی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انہی جزئی واقعات
سے عمومی نتائج منبج مرتب ہوتی ہے۔ اور ایک مورخ انہیں واقعات سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے
میں کامیاب ہوتا ہے۔

اسی سال کے آخر میں حنین کی جنگ ہوئی۔ یہ رسول اللہؐ کی آخری لڑائی تھی۔ کیونکہ
اس کے بعد جنگ تبوک ہوئی جس میں رسول اللہؐ بغیر جنگ کیے ہوئے واپس آ گئے تھے۔
اس لڑائی کی کیفیت بڑی حسرت خیز و حیرت انگیز ہے۔ اور قرآن مجید میں اس
کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے:-

و یوم حنین اذا عجزتکم کفرتکم اور حنین کے دن کو یاد کرو جبکہ تمہاری
فلما لغن عنکم شیئاً وضاعت کثرت نے تمہیں مغرور بنا دیا تھا مگر اس نے
علیکم الارض بما رحبت ثم تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اور زمین تم پر
ولیتکم مدبرین۔ تنگ ہو گئی اور تم نے جنگ میں پیچھے دھکا

دی۔

صورت یہ ہوئی کہ دشمن کی فوج کمین گاہ میں تھی اُس نے اچانک حملہ کر دیا اور
مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، سوائے سات آٹھ آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا۔
ان آٹھ آدمیوں کی فہرست میں اکثر کتابوں میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام

۱۲۳- تاریخ تمہیں جلد ۲ ص ۹۵۔ ۱۲۴- اردش الاف سیلی جلد ۲ ص ۲۵۰ مطابقت لدریہ جلد ۱ ص ۱۲۳۔

بھی نظر آتا ہے لیکن صحیح بخاری میں البقادرہ کی روایت یہ ہے :-

تمام مسلمانوں نے راؤ فرار اخت یار کی اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا
ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ سب کے ساتھ حضرت عمر بھی ہیں میں نے
کہا یہ کیا ہوا، آپ نے فرمایا کیا تاؤل خدا کی مرضی۔ پھر اس کے بعد
رفتہ رفتہ لوگ رسالتا ب کے پاس واپس آ گئے۔
محدث ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ :-

آنحضرت کے ساتھ صرف چار آدمی رہ گئے تھے۔ تین بنی ہاشم
میں سے اور ایک اور جن کی تفصیل یہ ہے۔ علی و عباس آپ کے آگے
تھے، ابوسفیان لگام پکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں تھے اور
کوئی شخص دشمنوں میں سے حضرت کی طرف نہ بڑھتا تھا۔ مگر یہ کہ وہ قتل
ہو جاتا تھا۔

ان فرار کرنے والوں پر ایک عورت ام سلیم بنت ملحان نے انتہائی غم و غصہ کا
اظہار کیا۔ وہ رسالتا ب کے پاس سے بالکل جدا نہیں ہوئی حضرت نے پکار کر فرمایا
”ام سلیم“ اس نے کہا۔ ”جی حضور، میرے ماں باپ آپ پر نارا آخر آپ فرار ہونے
والوں کو قتل کیوں نہیں کر ڈالتے“ حضرت نے اس کے جواب میں صرف اس قدر
ارشاد فرمایا کہ ”یہ بھاگ جاتے ہیں تو کیا ہوا، خدا کا فی سئلہ“

استیعاب میں حضرت عباس کے حالات میں لکھا ہے کہ :-
”حنین کے دن آنحضرت کے پاس سے سب فرار کر گئے۔ سوا عباس
عمر علی اور ابوسفیان کے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ سات آدمی حضرت
ہی کے گھر کے رہ گئے تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ یہ سات آدمی علی

صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۳ ص ۲۴، مسابب لذیہ جلد ۱ ص ۱۲۳، سہ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔

عباس، فضل ابن عباس، الزبیر ابن العوف، جعفر بن ابی سفیان، زبیر ابن عمار
اور اسامہ بن زید میں اور ان کے علاوہ آٹھویں ایمن ابن عتبہ
بعض موزوں نے الزبیران کے بجائے حضرت عمر کا نام لیا ہے لیکن حقیقت
یہ ہے کہ الزبیران تو یقیناً حضرت کے ساتھ تھے حضرت عمر کے متعلق
بیشک اختلاف ہے۔

اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ نے طائفت کا می سر کیا، ایک نو مشرکین
وہاں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اسی دوران میں ایک دن رسول اللہ نے جناب امیر کو بلا کر نبی دیر
تک راز کی گفتگو کی۔ اس پر لوگوں میں یہ سلیکوتیاں ہونے لگیں اور کہا۔ لعلہ طال منجوا
مع ابن عمہ (آج تو رسول اللہ اپنے ابن عم سے بڑے طولانی مشورے کر رہے ہیں)
رسول اللہ نے سنا تو فرمایا۔ ما انتجبتہ ولكن الله انتجأہ (میں نے علی کو
مشورے کے لیے منتخب نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے کیا ہے) اس روایت کو حافظ ترمذی
نے مدح کیا ہے۔ اور حسن صحیح قرار دیا ہے۔



۱۔ غزوہ تبوک واقع ہوا۔ رسول اللہ کی زندگی کو صرف ایک سال باقی
تھا۔ اور یہ غزوہ آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ ہے شدت کی فصل رہی ہے۔ اور رسالت
کتاب نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے تمام اصحاب کو حکم دیا ہے لیکن حضرت علیؓ کے متعلق
ارشاد ہوتا ہے کہ تم مدینہ میں تمنا کرو اور میری جگہ رہو۔ حضرت علیؓ کبیدہ خاطر نہ کر سکتے ہیں۔
للخلفی فی الصبیان والسنہ (کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ جائیں
گے؟)

حضرت جواب دیتے ہیں۔ اما ترضی ان تكون مستی بمنزلة هارون

من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی (کیا تم اس پر افسی نہیں ہو کہ تم مجھ سے ہی نسبت رکھو جو بارون کو موسیٰ سے معنی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے)

اگر آخری جملہ لا نبی بعدی کا نہ ہوتا تو بارون کی منزلت کو صرف وقتی جانشینی اور عارضی خلافت تک محدود سمجھا جاسکتا تھا، لیکن اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی میں اور بعد وفات دونوں حالتوں میں جناب امیر کو اسی جانشینی اور خلافت کا درجہ حاصل ہے جو بارون کو موسیٰ سے بعد حاصل ہوا۔

دنیا کو معلوم ہے کہ بارون موسیٰ کے شریک کار ماموں اور وزیر و جانشین تھے اور اگر ان کی زندگی موسیٰ کے بعد باقی رہتی تو خلافت کا حق سوائے اُن کے کسی کو نہ پہنچتا بلکہ اسی طرح جناب امیر کے لیے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیات و ممات ہر حالت میں رسول اللہ کے جانشین تھے۔ اور اگر بارون سے کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ بارون نبی تھے اور رسول اللہ کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہو گیا، لیکن اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوتا تو نبی بھی سوائے حضرت علی کے دوسرا نہ ہوتا۔



اسی سال کا واقعہ ہے کہ سورۃ برأت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر ہوا تھا، اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر کو ان آیات کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان کو واپس بلا کر یہ خدمت حضرت علی کے سپرد کی۔ دوسری روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۵۲ - تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۳۸ - تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ - الاراقین انفسہ جلد ۲ صفحہ ۱۶۶ - سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۱۶ - مواہب لعدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۳ - تاریخ الخلفاء رخصیوطی ۱۶۷ و ۱۶۸۔

کہ ان کو واپس نہیں بلایا بلکہ خود حضرت علیؑ کو روانہ کیا کہ حضرت ابو بکرؓ سے وہ آیات لے کر
خود کس خدمت کو انجام دیں۔ بہر حال ان تمام روایات میں رسول اللہؐ کا یہ قول تھوڑا شریک
کے طور پر پایا جاتا ہے کہ علیؑ منی و امانہ ولا یؤدی عنی الا انا و علیؑ یعنی علیؑ
مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ادا نہیں کروں گا یا میں خود کر سکتا ہوں یا علیؑ۔ دوسری روایت میں :-
الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں: انی امرت ان ابلغہ انا اور جل من اہل بیتہ
(مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود اس کو پہنچاؤں یا ایسا شخص جو میرے اہل بیتؑ میں داخل ہو)
بہر حال حضرت ابو بکرؓ روانہ ہو چکے تھے یا نہیں وہ واپس پائے گئے یا نہیں یہ مسلم ہے
کہ آیات قرآنی کی تبلیغ کے لیے حضرت نے جناب امیرؓ کو منتخب کیا اور یہ کہ اگر کہ اس خدمت
تبلیغ کا اہل میں ہوں یا پھر وہ جو میرے اہل بیتؑ میں داخل ہو۔

ساتھ میں رسول اللہؐ نے جناب امیرؓ کو مین کی طرف تبلیغ کے لیے روانہ کیا اور اس شان سے
کہ عقد لواء و عمامہ بیداد و ادخی طرفھا من قدامہ نحو ذراع ومن خلفہ
قید مشہور حضرت نے ان کے لیے حکم تیار کیا خود اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ
باندھا اور عمامہ کا ایک سر اُگے کی طرف قریب ایک ہاتھ کے سینہ پر ڈال دیا۔ اور دوسرا
سراشت کی طرف ایک ہاتھ لٹکا دیا۔

اس ہم کی سرکردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبیلہ مہدان اور انصار اہل یمن ایک ہی دن میں
آپ کے ہاتھ پر شرف بر اسلام ہوئے اور آپ مدینہ واپس لوٹے۔ اس ہم پر پہلے خالد بن ولید
کی نامزدگی ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت علیؑ کے بھیجے جانے سے وہ معزول ہوئے۔ اس لیے
بعض حضرات کو یہ بات بہت اگوار ہوئی۔ اسی لیے اس کا انتقام لیں لیا گیا کہ چند لوگ جناب
علیؑ کی یہ شکایت لے کر مدینہ پہنچے کہ آپ نے اموال خمس میں سے ایک کثیر بغیر اجازت

۱۔ نہ تھاکہ فی مسطور ۶۴۶-۶۴۷۔ ۲۔ رضی اللہ عنہ ۳۔ طبری جلد ۲ ص ۱۵۵۔ ۴۔ تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۱۵۵۔ ۵۔ یاض لفظ ۱۶۴

۶۔ تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۱۶۷۔ ۷۔ بخاری مطبوعہ مصر جلد ۲ ص ۷۳۔

رسول تصرفت کیا۔ اس کا جواب رسول اللہ نے دیا ہے وہ کتب احادیث میں اب تک محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عمران بن حصین کی روایت ہے کہ اقبل رسول اللہ والغضب یخرج فی وجهہ فقال ما تریدون من علی ثلاثا ان علیا منی وانا منہ وهو ولی کل مومن بعدی (حضرت مخاطب ہوئے مگر اس طرح کہ غصہ آپ کے چہرے نمایاں تھا اور کہا تم لوگ علی سے کیا چاہتے ہو؟ آخر ؟ علی مجھ سے ہے میں علی سے ہوں اور وہ ہر مومن کا میرے بعد ولی ہے)۔
یہ روایت میں ہے۔

لما اتیت النبی دفعت الکتاب فقراء علیہ فرأیت الغضب فی وجهہ فقال لا تقع فی علی فانه منی وانا منہ وهو ولیکم بعدی (یعنی جب میں آیا اور حضرت کو خط دیا تو آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: علی کی بڑائی نہ کرو وہ مجھ سے ہے میں اس سے ہوں اور وہ تمہارا حاکم ہے میرے بعد)۔
علامہ ابن حجر مکی شرح قصیدہ ہمزہ میں لکھتے ہیں:-

ما صبح عندہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو اللہم وال من والاہ وعاد من عاھا ان علیا منی وانا منہ وهو ولی کل مومن بعدی۔
صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا خداوند اودست رکھ لے جو علی کو دوست رکھے اور دشمن رکھے اس کو جو علی کو دشمن رکھے اور یہ کہ علی مجھ سے ہے میں علی سے ہوں اور وہ ولی ہے ہر مومن کا میرے بعد)

۱۔ بیاض نظریہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۱، خلاصہ نسائی صفحہ ۳۳، ۳۴۔ ۲۔ استیعاب طبرہ حمید کتاب صفحہ ۴۰۔ ۳۔ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۴۔

اسی سلسلہ کے آخر میں رسالتِ نبیؐ نے آخری حج کیلئے ہے۔ جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جناب رسالتِ نبیؐ کی زندگی کا آخری زمانہ ہے اور صرف چند ماہ آپ کی بعثت کو باقی ہیں۔

جناب امیرِ زکوٰۃ و خمس لینے میں چلے گئے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کے لیے روانہ ہوئے لیکن آپ دہاں سے واپس آکر رسول اللہ ﷺ سے مل گئے تھے۔ اس موقع پر بھی جناب امیر کی دیانت و امانت سے فوج دالہ کو شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب آپ مین سے واپس ہوئے اور مکہ معظمہ کے قریب پہنچے تو آپ فوج سے علیحدہ ہو کر پہلے پہنچ گئے اور صحابہ میں سے ایک شخص کو فوج کا سردار بنا آئے۔ اس قائم مقام سردار نے تمام اسباب و اموال میں سے جو مین سے آیا تھا لباسِ فاخرہ نکلوا کر فوج کے تمام سپاہیوں کو پہنوا دیا جب فوج کا واحد ہونے لگا تو حضرت علیؓ معائنہ کے لیے گئے اور یہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور تمام لباس اترھا کر اموال میں پھر شامل کر دیا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی گئی تو آپ نے ایک عام تقریر کی اور فرمایا: لا تشکو علیا فواللہ انہ لا یستخشن فی ذات اللہ من ان یشکی یعنی علیؓ کی شکایت نہ کرو خدا کی قسم وہ اللہ کی مرضی کے لیے اتنا بے لوث ہے کہ اس کی شکایت کا موقع ہی نہیں ہے۔

یہ حج سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس تشریف لائے ہیں۔ حضرت علیؓ پہلے غایب رہے۔ پہنچے ہیں پورا قافلہ رکے دیاجاتاہے اور اعلان ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تقریر فرمائی گئے ہزاروں آدمی طلبہ نبویؐ بننے کیلئے مجتمع ہیں۔ اور آپ منبر پر تشریف لے جاتے ہیں ایک مبوط خطبہ کے ذریعہ سے اپنے قریب وفات کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اپنی خدمات و مہدایات کا ذکر فرماتے

سے سیرۃ ابن ہشام برہم شیعہ، روضہ الافئدہ جلد ۲ ص ۳۵، طبری جلد ۳ ص ۱۹۱ - استیعاب مطبوعہ حیدرآباد

صفحہ ۷۵، اسواق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔

ہیں۔ لوگوں سے اصول اسلام و ایمان کی گواہی لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کچھ فرماتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جس نے ہمیشہ کے لیے آپ کی جانشینی کے مسئلہ کو طے فرمادیا۔

اس سلسلہ میں حافظ طبرانی کی روایت جو بہ سند صحیح منقول ہے، حسب ذیل ہے:-

ایہا الناس انی یومئذ ان ادعی فاجیب وانی مسئل و انکم مسئلہ لون ضاذا انتم قائلون (مسلمانو، عنقریب تجھے بلایا جائے گا اور میں تم سے نصرت ہو جاؤں گا میں بھی جواب دہ ہوں اور تم بھی جواب دہ ہو اس لیے بتاؤ کہ سب یہ وقت آئے گا تو تم کیا کہو گے)

فقال لیس تشهدون ان لا اله الا الله وان محمد اعبدہ درسلہ وان حبتہ حق وان ناره حق وان البعث حق بعد الموت وان الساعة آتیة لا ریب فیہا وان الله یبعث من فی القبور قالوا بلی تشهد بذلک قال اللهم اشہد ثم قال یا ایہا الناس ان الله مولای وانا مولی المومنین وانا ولی بہم من انفسہم فمن کنت مولاه فهذا امولاه یعنی علیاً اللهم دال من الاء وعادہ من عاداہ (حضرت نے فرمایا کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہ دو گے کہ سوائے اللہ کے کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کا بندہ اور رسول ہے اور جنت حق ہے، جہنم حق ہے اور موت حق ہے اور زندگی بعد موت کے حق ہے اور قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اور خدا مردوں کو زندہ کرے گا۔ سب نے کہا، ہاں ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، حضرت نے فرمایا، خداوند گواہ رہنا۔ پھر فرمایا، اے لوگو خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور ان کے نفسوں کا خود ان سے زیادہ مستحق رہوں۔ اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ مولا ہے (علی کی طرف اشارہ کیا)

خداوند دوست رکھ اس کو جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھے اُس کو جو علیؑ کو دشمن رکھے
 ثم قال ايها الناس اني فرطكم وافتكم واهم دون علي الحوض واني اسئلكم
 حين تردون علي عن الثقلين فانظروني كيف تخلفون فيهما الثقل الاكبر
 كتاب الله سبب طرفه بيد الله وطرفه بايد كد فاسمكوبه لا
 تضلوا ولا تبطلوا وعترتي اهل بيته فانه قد بنا في اللطيف الحبيب
 انهما لن ينقضيا حتي يردا علي الحوض (پھر حضرت نے فرمایا اے لوگو! میں تمہارے
 آگے بتا رہا ہوں اہل علم جو علیؑ کو پیروی میں لے کر آئے ہوں گے تو میں تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے
 میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ایک ان میں سے کتاب خدا ہے جو ایک نے خیر ہے
 جس کا ایک سرخند اسے متصل اور دوسرا سرخند اسے پاس ہے اس کو پکڑے ہو، گمراہ نہ ہو
 اور اہل بدل نہ کرو۔ دوسرے میری عترت، میرے اہل بیت، خدا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ
 دونوں فناء نہ ہوں گے جب تک میرے پاس جو عترت کو پیروی وار نہ ہوں)

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر ۱۲۵۶ھ) میں اس روایت کو درج
 کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ حضرت نے تین مرتبہ صحابہ سے دریافت کیا۔ الست ادلی بکم
 من انفسکم (کیا میں تم پر تم سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا) سب نے کہا بے شک
 بیشک، بیشک اور پھر اس کے بعد رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
 کر فرمایا :-

من كنت مولاه فعلي مولاه اللهم وال من والاه وعاد من عاداه
 والصر من نصره واخذل من خذله وادراج الحق حيث دار (یعنی
 جس کا میں مولی ہوں علیؑ اس کا مولی ہے، خداوند دوست رکھ اس کو جو اُسے دوست
 رکھے اور دشمن رکھ اس کو جو اُسے دشمن رکھے، مدد کر اُس کی جو اُس کی مدد کرے ساتھ چھوڑ
 اُس کا جو اُس کا ساتھ چھوڑے اور حق کو اُس طرف گردش دے جس طرف وہ گردش کرے)

اس کے بعد اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"یہ حدیث صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، اور ترمذی، نسائی

احمد بن حنبل وغیرہ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی ہے اور اس

کے طریق و اسناد بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ ۱۶ صحابہوں نے اس کی روایت

کی ہے اور احمد بن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ۳۰ صحابہوں نے

اس کے سننے کی گواہی دی ہے۔ اور اس کے اسناد اکثر صحیح و حسن میں ہیں۔"

استیعاب ابن عبدالبر، اسد الغابہ ابن اثیر جزری میں متعدد مقام پر یہ روایت

مذکور ہے، حافظ محب طبری نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

"اس واقعہ کے بعد حضرت عمر، جناب علیؓ سے ملے اور کہا کہ

مبارک ہو آپ کو کہ آپ ہو گئے ہر مومن و مومنہ کے مولاؐ۔"



اب رسولؐ کی زندگی صرف دو ماہ چاندی کی باقی رہ گئی ہے۔ اور مسلمانوں کی شب یلدا جب باقہ کو ماتم نہ سجائی دے گا، نزدیک ہے، آئیے واقعات کا ذرا جائزہ لے لیں۔ شاید رسول اللہؐ کے بیانات سے کوئی شمع ہدایت ایسی مل جائے جو تجلیات نبویؐ کے اوجھل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے دلیل راہ بن سکے۔

گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شروع سے اخیر تک ہر موقع پر رسولؐ کے ساتھ مواسات و ہمدردی میں پیش پیش رہنے والا کسی موقع پر قدم میں نزل نہ آنے دینے والا اور سخت سے سخت وقت میں اطاعت رسولؐ سے سہرٹو

۱۔ صواعق محرقة مطبوعہ مصر صفحہ ۲۵۔ ۲۔ مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۲۷۳

۳۔ جلد ۵ صفحہ ۲۰ جلد ۳ صفحہ ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰۔ ۴۔ ریاض نفوس جلد ۲ صفحہ ۱۶۹

اعتراف نہ کرنے والا کون تھا؟ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جناب امیر کی اس اطاعت و جان نثاری کی بنا پر رسولؐ کی بارگاہ میں جو رسوخ ان کو حاصل تھا وہ دوسرے صحابہ کو گراں گزرتا تھا۔ اور وہ اپنے جذبات سے مجبور ہو کر شکوہ و شکایت بھی کر گزرتے تھے۔

مسجد نبویؐ میں صحابہ کے مکانات کے جو دروازے کھلتے تھے ان کے بند کر دیے جانے کا واقعہ طاقت میں رسولؐ اور علیؑ کی راز دارانہ گفتگو کا حال، ابراہیمہ کا واقعہ اور حجۃ الوداع سے قبل یمن سے واپسی کا واقعہ آپؐ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا اور رسالتؐ کی طرف سے جناب امیرؑ کے خلاف اعتراض یا شکوہ کا جو جواب ملتا تھا وہ بھی آپؐ نے پڑھ لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ انسیات کے لحاظ سے یہ تمام واقعات اور زیادہ صحابہ کی برہی کا باعث ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ رسالتؐ کو احساس تھا کہ جب میری زندگی میں یہ ہو رہا ہے تو بعد میں خدا جانے کیا ہو۔ اُحد میں صرف اتنی سی افواہ پر کہ رسول اللہؐ قتل ہو گئے سب کے قدم میدان سے اُٹھ گئے اور زبانوں پر یہی تھا کہ پیغمبرؐ نہ رہے تو اسلام کیا اور لڑائی کیسی۔ انس بن نضرؓ نے لوگوں سے پوچھا: ”تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟“ جواب ملا کہ ”رسولؐ تو ہیں نہیں پھر ہم کیا کریں؟“ انسؓ نے کہا: ”رسولؐ نہیں تو نہ سہی تم ان کے دین پر تو قائم ہو، اُٹھو اور جہاد کرو،“ مگر بیٹھے رہنے والے بیٹھے ہی رہے اور انسؓ نے جان دی۔ قرآن مجید کی جو آیتیں اس موقع سے تعلق رکھتی ہیں غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَئِنَّ مَاتَ أَوْ قُتِلَ
الْقَلْبُ يَتَرُّ عَلَى عِقَابٍ كَهَرٍ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا
(محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک رسولؐ، جن کے پہلے بہت رسولؐ گزر چکے تو کیا وہ مر جائیں
یا قتل ہو جائیں تو تم اسلام سے ہلٹ جاؤ گے اور جو شخص ایسا کرے گا تو خدا کو اس
سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا)

اس کے علاوہ رسالتاً نے اپنی بے اطمینانی کا جن الفاظ میں اظہار کیا وہ بھی گوش گزار ہو چکے ہیں۔ جب آپؐ نے شہد ام اُحد کے متعلق فرمایا کہ میں اُن کا گواہ ہوں تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا، کیا ہم نے کبھی ان کی طرح جہاد نہیں کیا؟ یہ سُن رسول اللہؐ نے فرمایا۔ ”ہاں مگر کسے خبر ہے تم لوگ میرے بعد کیا کرو۔“

دوسرے موقعوں پر حضرت نے اس خطرہ کے وقوع کی صریح پیشین گوئی کی ہے بخاری کی حدیث ہے کہ:-

”آنحضرتؐ نے فرمایا میں تم سے پہلے حوض کوثر پہنچوں گا کچھ لوگ تم میں سے میری طرف لائے جائیں گے اور جب میں چاہوں گا کہ انہیں اپنے قریب بلاؤں تو وہ مجھ سے جدا کر دیے جائیں گے میں کہوں گا خداوند! یہ تو میرے اصحاب ہیں! ارشاد ہو گا تمہیں معلوم نہیں انہوں نے تمہارے بعد کیا کر لیا۔“

آنحضرتؐ کو سب چیزوں کے متعلق یہ خطرہ تھا ان کو صاف طور پر حجۃ اوداع کے خطبہ میں ظاہر فرمادیا۔ جس کی اصل عبارت پہلے درج ہو چکی ہے اس میں آنحضرتؐ نے اس تمہید کے ساتھ کہ انافرطکم علی الحوض (میں حوض کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں) یہ فرمایا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں بہت گرانقدر چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتابِ خدا دوسرے اپنی عترت دابل بیت، دیکھو میرے بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟ اس طرح حضرتؐ نے اس پہلی بیعت کے موقع پر جو ”انذار عشیرتک الاقرہین“ کا حکم نافذ ہونے پر لپٹی گئی تھی، علیؓ کی وزارت و وصایت و خلافت کا اعلان فرمادیا تھا پھر اس کے بعد مختلف طرح سے علیؓ کے کمالات کو روشن کیا، علمی حیثیت سے ”انامدینۃ العلم وعلیٰ بابہا“ فرما کر یہ ثابت کیا کہ میرے علوم اگر دستیاب ہو سکتے ہیں، تو

سرت علّی کے ذریعے "اقضاکم علی" کہہ کر فصل مقدمات کا بہترین ماہر بتایا
 "علّی مثنیٰ" کہہ کر انتہائی یکاگرت و وابستگی کا اظہار فرمایا اور سب سے آخر میں غدیر خم
 کے میدان میں "من کنت مولاه فعلی مولاه" کہہ کر علی کی حکومت و ولایت کی مخالفت
 کا صریح اعلان فرمادیا۔ یہاں تک کہ صحابہ نے علی کو مبارکباد بھی دی، لیکن کہا رسول اللہ کو
 اطمینان ہو گیا تھا، ہرگز نہیں واقعات بتلاتے ہیں کہ آپ مطمئن نہ ہوئے تھے۔

حضرت اس خطبہ کے بعد غدیر خم سے روانہ ہو کر مدینہ پہنچے، محرم کے مہینہ بھر آپ
 اچھے رہے، صفر میں بیمار پڑے اور اس بیماری میں مبتلا ہوئے جو آپ کیلئے مرض الموت
 ثابت ہوئی۔ حضرت نے اس بیماری کی حالت میں تقریر کی اور فرمایا:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ يَدُ شَيْئِ انْ اِقْبِضْ قَبْضًا مِّنْ رِّعَا فَيَنْتَظِلُّ بِي وَقَدْ قَدَّمْتُ
 إِلَيْكُمْ الْقَوْلَ مَعْذِرَةً أَلَيْسَ كَلَا انِّي مَخْلَفٌ فِيكُمْ كِتَابُ رَبِّي وَعَتَقَنِي
 أَهْلُ بَيْتِي (اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا سے اٹھ جاؤں اور
 تم سے رخصت ہوں میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے اور حجت تمام کر
 دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عمرت
 اہل بیت کو چھوڑے جا رہا ہوں)

یہ کہہ کر حضرت نے جناب امیر کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بلند کر کے فرمایا:-

"هَذَا عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ لَا يَفْتَرِقَانِ حَتَّى يَرِدَا عَلِيَّ
 الْخَوْضِ فَاسْأَلْهُمَا مَا خَلَقْتَ فِيهِمَا" (علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی
 کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس خوض کوثر پہنچیں۔ میں
 ان سے دریافت کروں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا)

اب مرض کی شدت اور زیادہ بڑھ گئی۔ حضرت نے اسی عالم میں ایک علم اسماء

بلے موافق مخرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷۔

بن نید کے لیے تیار کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں جنگ کے لیے روانگی کا حکم دیا۔ تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت ابوبکر حضرت عمرؓ بھی اسامہ کے ساتھ جہانے پر مامور ہوئے تھے۔

لوگوں کو بڑا ناگوار ہوا کہ رسالتؐ نے اتنے بڑے بڑے صحابہ پر اسامہ بن زید کو حاکم بنا دیا حضرت کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور اسی حالت میں چادروٹھے سر پر ڈھال باندھے باہر آگئے اور منبر پر جا کر فرمایا:۔

”تم لوگ اسامہ کی امارت پر معترض ہو، یہ نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو۔ بخدا وہ امارت کے لائق تھا۔ اور یہ اس کا بیٹا بھی امارت کے لائق ہے۔“

مشک ان اشخاص میں جو ساتھ جانے پر مامور تھے حضرت علیؓ کا نام نظر نہیں آتا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوة میں تصریح کر دی ہے کہ:۔

”حکم حالی چنان صادر شد کہ از اعیان مجاہد و انصار مثل ابوبکر صدیق و عمر فاروق و عثمان ذی النورین و سعد بن ابی وقاص و ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہم الا علیؓ مرتضیٰ را کہ ہمراہ نہ کرد و راں لشکر ہمراہ اسامہ باشند“

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کو اپنی زندگی کے آخر ہونے کا یقین تھا وہ اپنی موت کی اطلاع رکھتے تھے اور اس کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ اس موقع پر حضرت کا خاص طور سے لشکر اسامہ کی روانگی کا حکم دینا اسی لیے تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کے وجود سے مدینہ کو خالی کر دینا چاہتے تھے۔

اگر آپ کا فشا کسی حیثیت سے یہ ہوتا کہ آپ کے بعد موصوف کی ذمہ داری ان اشخاص میں سے کسی کے سپرد ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقت آخر میں ان لوگوں کو

ملہ طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱۳۶، مطاہب لدنیہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۹، تاریخ خمیس جلد ۱ صفحہ ۱۴۱۔

شکر اسامہ کے ساتھ جانے کی تاکہ یہ نہ فرماتے۔ حضرت کو اس امر میں اتنا استہام تھا کہ شدتِ مرض میں جب آنکھ کھلتی تھی تو بار بار یہی تاکید فرماتے تھے کہ لشکر فوراً روانہ ہو جائے۔ لوگ رسولِ خدام کے اس منشاء کو سمجھتے تھے اور اسی لیے تعمیلِ حکم میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ لیکن اسامہ کا لشکر نہ جانا تھا نہ گیا۔ اور گیا اس وقت جب رسول اللہ کی وفات ہو چکی اور خلافت کا مسئلہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اب رسالتِ نبی کا مرض انتہائی شدت تک پہنچ گیا ہے۔ مگر اب بھی اگر کوئی نخیال آپ کو ہے تو صرف وہی ایک، کوئی اندیشہ ہے تو وہی ایک۔ ایک بار غش سے آنکھ کھلتی ہے تو فرماتے ہیں: ”ذرا دواتِ دقلم منگو آؤ میں تمہارے لیے ایک نوشہٴ چھوڑ جاؤں تاکہ میرے بعد تم گمراہی میں نہ مبتلا ہو۔“ مگر حضرت عمرؓ نے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ: ”پیغمبرِ پر مرض کا غلبہ ہے اور ہم کو کتابِ خدا کافی ہے“ صحیح بخاری میں متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت ابن عباس سے ہے کہ:-

ابن عباس کہتے تھے: ”میں نے نبیؐ کا دل اتم جانتے ہو کہ نبیؐ کے دن کیا ہوا، رسالتِ نبیؐ پر مرض کی شدت ہوئی، حضرتؐ نے فرمایا: ”اؤ میں تمہیں ایک نوشہٴ تحریر کر دوں۔ تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔“ لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور کہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ذرا پھر پوچھو، لوگ آپ کے قریب گئے کہ پھر آپ سے دریافت کریں۔ حضرتؐ نے فرمایا: ”جاؤ چھوڑو مجھ کو، میں جس حال میں ہوں اسی حال میں رہنے دوں۔“ دوسری روایت یہ ہے کہ:-

جب رسالتِ نبیؐ کا آخر وقت تھا، اس وقت گھر میں بہت سے آدمی موجود تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا: ”اؤ میں تمہیں ایک نوشہٴ تحریر

کردل تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ حضرت پر مرض کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس فرقان تو موجود ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو لوگ گھر میں موجود تھے ان میں اختلاف شروع ہو گیا، کچھ لوگ کہتے تھے قلم دعوات دے دو، کچھ اس کے مخالفت تھے، جب بہت شور ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اٹھ جاؤ میرے پاس سے۔“

ان دونوں روایتوں میں اختلاف کرنے والوں کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن تیسری روایت سے یہ ابہام بھی دور ہو جاتا ہے اور اس میں صاف صاف تحریر ہے کہ مخالفت کرنے والے حضرت عمرؓ تھے (ملاحظہ ہو بخاری، باب قول المريض قوموا عني)۔



رسالت مآب کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ بھی پہنچا ہو، کم ہے، چنانچہ اسی صدمہ کا نتیجہ تھا کہ آپؐ نے برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے ہٹا دیا لیکن اس منظر کی ایک آخری کڑی اور ہے جو دیکھنے کے قابل ہے، ال داستان کا ایک ٹکڑا اور ہے جو سننے کے قابل ہے اور یہ کسی اور کے منہ کی بات نہیں ہے۔ بلکہ خود جناب عائشہ کا بیان ہے :-

قالت قال رسول الله	حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ
لما حضرته الوفاة ادعوا	جب حضرت کا بالکل وقت آنے لگا
الى جيبى فدعوا له ابا بكر	تو آپؐ نے فرمایا بلاؤ میرے حبیب
فنظر اليه ثم وضع راسه	کو، کوئی جا کر حضرت ابو بکرؓ کو بلا لیا
ثم قال ادعوا الى جيبى	آپؐ نے تکیہ سے سر اٹھا کر دیکھا

لہ بخاری جلد ۵

فدعوالہ عمر فتنظیر الیہ ثم
 رضع راسہ ثم قال ادعوالی
 حبیبی فدعوالہ علیا فلما
 رآہ ادخلہ معہ فی الثوب
 الذی کان علیہ فلم یزل
 یحتضنہ حتی قبض ویدہ
 علیہ اخرجہ الرازی۔

اور پھر تکیہ پر سر رکھ دیا۔ دوبارہ فرمایا
 بلاؤ میرے حبیب کو اب جا کہ حضرت
 عمر کو بلا لائے۔ آپ نے ان کو بھی
 تکیہ کر تکیہ پر سر رکھ لیا، تیسری مرتبہ
 پھر آپ نے فرمایا کسی نے علی کو بلا
 لیا۔ جب آپ نے علی کو دیکھا تو
 انھیں اپنی چادر میں لے لیا جس کو
 آپ اڑھے ہوئے تھے، اور برابر
 اسی طرح لیے رہے۔ یہاں تک کہ
 حضرت کی روح مبارک نے جم
 سے پرواز کی تو آپ کا ہاتھ علی کے
 اوپر تھا۔



jabir.abbas@yahoo.com

مسئله خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

بنی

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

”نگار“ مارچ ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں ”خلافت و امامت“ کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کو کسی ہندو اہل قلم جناب ”ہرنام“ کی کاوش دماغی کا نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر بحثیں غیر جانبداری کے ساتھ خالص تحقیقی نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھا گیا ہو گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے شیعیت کے ساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں، تاہم اس لحاظ سے گویا ہرنام کا اہم گرامی ”ہرنام“ ہے لیکن شاید وہ اپنے اس مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علیؑ کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کر چکے ہیں۔ تحریر کا رنگ قدم قدم پر ان کی اس شکست پر غمازی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں ان کا ”دل تھرتا ہے، قلم لرزتا ہے، سنجی چاہتا ہے“۔ مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں، کس طرح دیکھیں اور کیونکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا؟ (صفحہ ۱۴) بہر حال جو کچھ بھی ہو ان کی تحقیقی کاوش کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس بحث پر مسلم ائمہ نے وقت موصوف نے واقعات پر فلسفہ تاریخ کی روشنی میں نفسیاتی

”نگار“ جولائی ۱۹۳۵ء

اعتبار سے کوئی نظر نہیں ڈالی۔ نیز فلسفہ نبوت اور عام اخلاق انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش کسی حد تک حقیقت کے پہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔

افسوس ہے کہ میں تفصیل کے ساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر جزو پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کر دل کا مادہ ایک ایسے مورخ کے اجمالی تبصرہ کے مترادف ہو گا ہو واقعات کو منطقی علل و اسناد کے ساتھ ساتھ دنیا کے علمی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہر حال میں مسلمان ہوں اور پھر اہل سنت اس لیے میں حتیٰ الوسع کوشش ضرور کر دل کا اپنی تحریر میں جذباتی رنگت آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی سبب سے راہ روی کا پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

”بڑی“

فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہو سکتے ہیں، ریاضی کے دقیق سے دقیق نظریے حل کیے جاسکتے ہیں، نظامِ اقلیموس کی جگہ نظامِ فینا غرث لے سکتا ہے۔ تموش کے نظریہ کی کشش کو انیشٹن بدل کر رکھ سکتا ہے، لیکن اگر بند نظری اور بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ یہ مسائل طے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گزرجانے کے باوجود خلافت و امامت کا مسئلہ سمجھ سکتا ہے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریم کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی مودب کی حیثیت ہے، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لیے جاسکتے کہ آپ کی اس حیثیت سے سیاست ملکی خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم داخل ہوتی ہے، لیکن رسولِ عربی کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے۔ آپ کی تعلیم کا کوئی جزو اس وقت تک حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حکومتِ سیاست کی احاطت اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی بنا پر کہتے ہوں۔ بلکہ یورپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی تائید کرتے ہیں مگر گولڈنزبر فآن کریمز نوٹ کی، دی ساسی، کاترمیر، نکلسن اور براؤن جیسے سلسلہ فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ محمدؐ کی تعلیمات میں "خبرج" اور "اشیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجئے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ نبی کریمؐ سیاست سے بالکل علیحدہ رہ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی ان سینکڑوں ہدایات کی کیا تائید کی جائے گی جن میں خالص سیاسی مسائل بیان کیے گئے ہیں مثلاً جزیہ، زکوٰۃ، حربی، بھساد، حد، زنا، سرقت وغیرہ وغیرہ۔

ایوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً۔ (سورۃ المائدہ آیت ۳) کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اگر نبی کریمؐ کے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے پروگرام میں حکومت و سیاست داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "ایوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لیے کہ اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریمؐ کی سیاسی حیثیت کا مسلم ہو جانا آپ کے درس کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "ایوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی نہیں رہتا۔

پھر اخلاقی اور معاشرتی اصلاح (موشل ریفاہم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ لکھنے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ملکی سیاست کے ارباب حل وعدہ اس میں دستگیر و معاون نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلند ترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے لیکن وہ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا ہے کہ میرا حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک

حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔
حقیقتاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اس کو سیاست سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک
نظام نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عملی پروگرام ہے جو انسان کو زندگی کے ہر
شعبہ میں صحیح مسلک پر کاربند رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اس
وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو۔

پھر اگر یہ باوجود بھی کر لیا جائے کہ نبی کریمؐ کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ
بعد کی بدعت ہے تو پھر وہ جماعت جو حضرت علیؑ کو نبی کریمؐ کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے
اس کا کیا جواب دے گی کہ خود حضرت علیؑ نے بھی مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد
اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقا
کے لیے جنگ جمل میں صف آرائی کی، طلحہ و زبر کو قتل کرایا، معاویہ کے مقابلہ کے لیے
میدان صفین میں پڑاؤ ڈالا اور پھر نہر کان میں کھدوا کر تین ہزار کلمہ گو اہل عرب کو تہ تیغ کرایا
میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر بغاوت کا الزام نہ تھا جو خالص سیاسی
الزام ہے تو پھر حضرت علیؑ کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ محتاج بیان نہیں اگر
ان کی حیثیت ایک "بڑے پیر" سے زیادہ نہ تھی تو آج کل کے مجتہد کی طرح انھوں نے
ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا۔ یا زیادہ سے زیادہ ان سے اپنی برأت کا
اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے۔

بہر حال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور سے بھی
کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریمؐ کا صحیح جانشین

سہ لفظ علامہ ابو الکامل لمبرودہ مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۱۵۱۰ فان کیرو وغیرہ تشریقین یورپے اس کتاب کو حضرت
علیؑ کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند قرار دیا ہے۔

دی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہوا اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد میں دنیا کا مہذب ترین فرماں روا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے امتبار سے صحابہ کرام کے کردہ میں سے نبی کریم کا صحیح جانشین کون ہو سکتا تھا، اگرچہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ جو شخص کسی عہد کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اسے اس عہد کا اہل سمجھا جاتا ہے اور اس لیے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی اہمیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہ چاہیے۔ جبکہ دنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی پائیدگی، سیاسی بلند نظری اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قائل ہے۔

لیکن یہاں پہنچ کر ہم کو جس پر خارا دادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہے "کیا نبی کریم حضرت علیؑ کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے؟"

حضرت علیؑ ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتداء سے آپ کے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی بن چکے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ نبی کریمؐ نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ لیکن اگر ان اوصاف کی الفاظ کی منطقی اور لغوی تحلیل کے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی کریمؐ آپ کو اپنا جانشین بنانے کے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بنیادی غلطی نہیں ہو سکتی۔ خود تو کیجیے جس شخص کو محمدؐ عربی کے الہامی نبی ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی طور پر حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ بنانے پر آمور ہو چکے تھے۔ تو پھر آپ نے علیؑ کو اس اشہاد اس کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟ جو بے خوف اور نڈر پیغمبر اپنے عزم و ثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو پسلیخ دے سکتا ہے۔ ان کے بت خافوں کو چکنا چور کر سکتا ہے، شراب کے قزاقوں کو تڑوا کر پھینکوا سکتا ہے۔ اہل عرب کے نبی فخر کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے، کیا اس کی اس

اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے بھی اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ شخص چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانثین کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا ہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کر سکتا کہ دنیا دارانہ مصلحتوں کے ماتحت ایک عظیم المرتبت نبیؐ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت کے اظہار سے جان چھڑاتا رہے؟

علاوہ انہی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریمؐ قدم قدم پر اشارۃً اودھاوا اسطو پر حضرت علیؑ کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسولؐ کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ زیادہ تو ضعیف کی محتاج نہیں ہے۔

اگر ابو بکرؓ اور عمرؓ بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتہ قرابت و عزیز داری کے صرف اس لیے رسولؐ پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا رہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسولؐ کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان نعت جگر صابز ادبوں کہ اس کے جہانگاہ اندواج میں دے دیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جان فروش کو کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ رسولؐ کی بارگاہ میں صرف اس لیے نظر دل سے گرے ہوئے ہیں کہ ان کے مقابلے میں رسولؐ کا حجیر بھائی اور اس کا داماد ہے۔ تو پھر اس کا نام متعصبانہ اعزہ پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بی رحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پامنداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟

لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

اب ہم بحث کے اس رخ کی طرف آتے ہیں جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت

علیؑ تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے، اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لیے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے نمائندگی کر سکتے ہیں:-

”حضرت علیؑ میں ایک حکمران ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں“

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز البکرو عمر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہد خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلافت کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہیے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقالہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے۔ اس لیے مؤیدین امامت نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی زرگاہ کے دو اور میدان تلاش کیے ہیں یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ نبی کریمؐ کے اقوال سے حضرت علیؑ کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرو کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ خود نبی کریمؐ کے اقوال سے حضرت عمرو البکر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ”مؤیدین امامت“ انامدینۃ العلم وعلیؑ بابہا کی حدیث کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:-

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کیے گئے جو کھڑے پھنٹے ہوئے تھے ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا کسی کا اس کے نیچے۔ پھر عمرؓ میرے سامنے لائے گئے

اُن کا کہنا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹا جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا اس کی تعبیر؟ آپؐ نے فرمایا عمر کی دین داریؓ

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپؐ نے خواب میں ایک گھاس سے کچھ دودھ پیا اور باقی حضرت عمرؓ کو دے دیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتائی۔ بلکہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن ان پر خدا کی جانب سے امام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمرؓ میںؓ

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریمؐ و ابوبکر صدیقؓ) کے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریمؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ انا و ابوبکر و عمر و فطرت انا و ابوبکر و عمر و انا و ابوبکر و عمرؓ

مکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لیے زیادہ قابل وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، لیکن دوسری حدیث کے مدعا کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابل تذکرہ ہے جس میں رسول کریمؐ سے ایک عورت نے پوچھا ہے۔ "آپؐ کے بعد میں مسائل کس سے پوچھوں گی؟" آپؐ نے فرمایا، "ابوبکرؓ"

ایک موقع پر رسول کریمؐ نے حضرت علیؓ کے متعلق یہ فرمایا تھا۔ "علیؓ دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے، اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کریمؐ اس طرح آپؐ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علیؓ واقعہً آپؐ کے بھائی تھے اور اس لیے یہ باطل ایسا ہی ہے

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان

۳۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ

۴۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ

جیسے آپ کہتے "اُمّہ دُنیَا اور اُخرت میں میری مال ہیں" یا "عبداللہ دُنیَا اور اُخرت میں میرے باپ ہیں"۔

حضرت ابوبکرؓ کی جہان فشا رانہ اور فدا کارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن میں مذکور ہے:-

"ثَانِي اَتْنِيْنَ اَذْهَابِي الْغَارَ يَقُولُ لِمَا حَبَبَهُ لَا تَحْزَنُ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکرؓ کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ بخشی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خدا بخش لائبریری پنٹہ" میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ ہے جس پر گو کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس میں دوسو تیس زیادہ ہیں جن میں سے ایک کا نام "نورین" ہے اور دوسری کا نام "دلالت" نیز سوسہ آیات بھی حسب ضرورت برہادی گئی ہیں۔ ان دونوں اور آیات کو قرآن میں برہادینے کے بعد مصنف نے شیعیت کے تمام مشتبہ مسائل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے اور اس اضافہ کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہل تشیع کی صریح حمایت میں تھے اس لیے اہل سنت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا (نعوذ باللہ)۔ بہر حال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابوبکرؓ کی مذمت میں تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے:-

"يَقُولُ لِمَا حَبَبَهُ وَحْيًا لَا تَحْزَنُ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

دُوبتاً آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علیؓ کی امامت کو ثابت کرنے کے لیے اُن کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تاہم اگر مختلف مستند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپؐ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔ بہر حال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپؐ سب سے پہلے ہی اسلام لائے

تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دے دیا جائے۔ اس لیے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپ کی عمر کیا تھی لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتائی گئی ہے وہ سولہ برس ہے اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل و شعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے۔ اور بہت جلد نئی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ اور اس لیے اگرچہ حضرت علیؑ کی مذہبی رفعت نشان اور جلال و مرتبت میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن مقابلتاً ان کے اسلام کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ جیسے پختہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابل اہمیت بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ دوسرا سبب جس کی بنا پر ان کی یہ مسابقت فی الاسلام مقابلتاً اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریمؐ کے چچیرے بھائی تھے اور اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی اس مسابقت ایمانی میں قربی عزیز ہونے کی وجہ سے "وصول الی الحق" کا وہ بے لوث جذبہ کارفرما نہیں ہو سکتا جو ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے غیر متعلق اشخاص میں پایا جاسکتا ہے۔ علاوہ انہیں رسولؐ کے بھائی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر رسولؐ کا پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہو گا۔ پھر اس کو حسن اتفاق کی مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ فخر البتہ یہ ہے کہ رسولؐ کا پیغام سنتے ہی ذرا "آمنّا" کہہ دیا جائے۔ حقیقتاً حضرت علیؑ کو یہ فخر پہنچتا ہے لیکن اس میں حضرت ابوبکرؓ بھی برابر کے شریک ہیں۔

ابتداءً اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ نے اپنے اعزاء کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے متعلق کہا تھا :-

ان هذا اخی و وصیق و خلیفتی فیکم۔

لیکن اس سے خلافت علیؑ پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔

اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار لیڈر سے زیادہ نہ تھی اور اس لیے ان جہلوں سے اس موقعہ کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جاسکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت علیؑ کی جو صلاہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریمؐ کا واحد مستند علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علیؑ کی الوہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسنؑ کی الوہی امامت کو بھی مانتا ہے اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسنؑ کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپؑ نے حضرت علیؑ کے قائل ابن ملجم سے لیا، ان کی اخلاقی فنیلیت کا کیا معیار قائم کیا جائے گا؟

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ شیعیت کی جانب سے حضرت علیؑ کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لیے جتنے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا جن کو اس وقت کامیاب بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا ہے۔

عروہوں کی فطری خاندانی عصبيت کے ماتحت نبی کریمؐ کی وفات کے بعد نبوہاشتم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک ممتاز فرد کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لیے انھوں نے حضرت علیؑ کا نام پیش کیا۔ اس میں ان کو ناکامی ہوئی پھر خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہی قسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی۔

ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے جنھوں نے ہمیشہ عروہوں کو

اپنے سے فروتر سمجھا ہے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایۂ تخت سے متعلق کر دیا، تو اہل ایران کی غیرت قومی اور محبت ملی کے لیے یہ چیز سخت ناقابل برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جو رواستبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں۔ گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے باوجود اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے موقع کے منتظر تھے۔ اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ اگرچہ عیسویں ہجری میں حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ کے برہم باغیوں سے تباہ نہ ہو چکا ہوتا۔ تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف ارتقائی دوروں سے گزرنے کے بعد آج دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ جمہوریت کے لیے بھی قابل رشک ہوتا، لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام" سے دنیا قریب قریب ناواقف تھی۔ ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ تھا۔ انھوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع دیکھا کہ حضرت علیؑ کی خلافت الہیہ کی آڑ میں خاندان انوی کے خلافت پر دو گینڈا شروع کر دیں۔ چنانچہ بالآخر ۹ جون ۶۶۱ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشے سے ابوسلم نے عباسیوں کا سیاہ بھنڈا بلند کر دیا اور وہ عباسیوں کے دورِ حکومت میں ایران پورنی طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کو دل کے پھپھوے بھونکنے کا کافی موقع ملا۔ چنانچہ خاندان صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے

سلسلہ اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے، جو بتاتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کا ذکر کرتا ہے تو کتنا "پُر شوہ" نظر آتا ہے:-

زمینِ شتر خود دن و سوسہار عرب را بجائے سید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو تلو بر تو اسے چرخِ گرداں تو

ملک کو بنوک شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا۔

یہی حال عبداللہ ابن میمون القدراس کی اس عظیم الشان تاریخی سائنڈل کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے نیچے شیعیت پر درکش پاتی رہی۔

ان مختصر واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخور اعتنا نہ کیا جاسکے۔ اور نہ ”شیعیت“ اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ فقط۔

سید الوسعید برزعی مہبواپالی

ایم۔ اے



لے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلم تیارچی مہنفہ میکڈالڈ

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت

jabir.abbas@yahoo.com

ہر نام

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اُس خالص سچے ہوئے مضمون کے جواب میں جو خلافت و امامت کے عنوان سے ”ننگار“ میں شائع ہوا تھا مضمون نگار اصحاب میری ”شخصیت“ کے متعلق بھی زور قلم ضرور صرف کریں گے۔ کوئی کچھ سمجھے، مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ یاد کرے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعہ کتب سے شیعہ مذہب کے متعلق معلومات حاصل ہوئے۔ اور میں نے محض ذوق تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اس کے بارے میں سچا جان بن کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کر لے کر میں شیعہ ہوں۔ اس کا اصل حقیقت مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کر کے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوق تحقیق اتنا کم ہو گیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کو دیکھنے کی اتنی عادی ہو گئی ہیں کہ باوجود ملک کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلغلہ بلند ہو جانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر لٹریچر والے تحقیقی حیثیت سے ان کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہوتی۔



”ننگار“ مارچ ۱۹۷۸ء میں میرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے پورے چار مہینہ کے بعد بھارتی کے پھر میں میرے ناخبرہ کرمفرما سید ابوسعید قادی صاحب بیوپاری ایم اے

کا مضمون شائع ہوا جس کے ۱۵۱ ہیں حضرت مدیر نگار کا یہ نوٹ قابلِ غماز تھا کہ ہر نام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے ان موصولہ مضامین میں سے ہم سب سے پہلے بڑی ایم۔ اے کا مضمون شائع کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کریں گے۔

اس کے بعد قدرتا مجھے انتظار پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ اور یقیناً جواب اب جواب کے لیے مجھے اس وقت تک قلم اٹھانے کا حق نہیں تھا۔ جب تک میرے مخالف مضامین کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

لیکن افسوس ہے کہ اس کے بعد نگار کے دو پرچے نکلے اور وہ بالکل اس بحث سے خالی ہیں۔ جناب نیاز کی وسیع انجیالی سے یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ اگر دوسرے مضامین ان کے معیارِ ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شائع کرتے۔ بہر حال اب میرا محورِ نظر صرف جناب بڑی کا مضمون ہے اس لیے کہ نگار کے بساطِ بحث پر مولائے اس کے کوئی نہیں آیا ہے۔



پہلی بات جسے محلِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں ”تعلیمِ اخلاق“ اور سیاستِ ملکی کا باہمی تعلق ہے۔ نہ جانے میرے کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبرِ اسلام کی زندگی سے ”سیاستِ ملک“ کو بالکل علیحدہ کر دینا چاہتا ہوں یا میں اسلام کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ نشینی میں مصروف رکھنا چاہتا ہوں۔

میرے الفاظِ خود سے دیکھ نہیں گئے کہ اگر رسولؐ کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلمِ روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی۔ تو ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی۔

اس ”صرف“ اور ”بھی“ کے نظر انداز کر دینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے نذرِ تحریر

کرنا پڑے۔ یورپ کے مستشرقین خانہ شہادت میں الگ بلائیے گئے۔ جزیہ، ذمی، حربی جہاد حد زنا وغیرہ کے ہدایات قرآنی کی دستاویزیں الگ پیش کر دی گئیں۔ اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دفتوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے ہیں۔ یعنی امام کے حقوق کو شیعہ تعلیم اخلاق اور روحانی تربیت میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اسکا لازمی جز سمجھتے ہیں اور نہ انھیں خلفائے بنی امیہ و بنی عباس وغیرہ سے یہ شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ انھوں نے صاحبان حقوق کے حق پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا سلطنت عقی۔ رہ گئی تعلیم روحانی اور ہدایت باطنی وہ کسی کے غصب کرنے کی چیز نہیں اور نہ اس پر کوئی ناجائز قبضہ کر سکتا ہے۔



لیکن اس کے ساتھ پھر بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفہ احکام اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کر دل کا کہ انحضرت کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک قوم بنانا ہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو۔ بلکہ ہر بھی الفاظ شش و پنج میں ڈالنے والے ہیں تو بیٹے۔

”دنیاوی بادشاہت“ میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف مادی اقتدار کا بڑھانا اس پاس کے نمائک پر فوج کشی کرنا اور حدود و مملکت کا وسیع کرنا، کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور اپنی طاقت کا سکہ بٹھانا مال و دولت سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت و اقتدار کی زیادتی تو وسیع حدود سلطنت اور جاہ و شہرت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے۔ جہاں نہ حق اور نہ ناحق کا سوال ہے نہ عدل و انصاف کی شرط ہے نہ اخلاق و آداب کی کوئی مراعات ہے۔

اس کا معیارِ تفوق صرف جانشیری و جہان بینی ہے اور کچھ نہیں۔



اس صرح کے برخلاف ”روحانی حکومت“ جس کے نظام و قانون کو میں ”سیاستِ اکتی“ کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریات اجتماعی، الوازم تمدنی، انتظامات ملی سب بلندی اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں، اہل اہل مقصد توسیع حدود و مملکت کا نہ ہو بلکہ قوم بنائی جا رہی ہو، انسانیت و اخلاق کے جوہرے آراستہ بے شک قوم کی تشکیل بغیر ”قوانین اجتماعی“ کے ہوتی ہی نہیں اور انہیں قوانین اجتماعی کا نام ”نظام سیاسی“ ہے لیکن یہ ”سیاست“ اس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطین دنیا کے پیش نظر ہوتی ہے۔

یہ سیاست وہ ہے جو کسی طرح تربیت انسانی سے علیحدہ جا ہی نہیں سکتی اور بالکل لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔



یہ شیعہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھیے یا بارگاہِ رسالت میں حد سے زیادہ خوش اعتمادی یا جو کچھ کہ ان کے خیال میں حضرت پیغمبرؐ جس طرح اپنے زمانہ کے خود بہترین مصلح الفردادی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس روح اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اُس کا اصلی طرہ امتیاز ہے تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کر سکتا ہے انہیں دنیا کے اس عام اصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لیے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوتا۔

ان کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں توسیع ملک، فتوحات، اجاہ و شہرت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ ملی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہو گئی اور وہ باقی نہیں رہی۔

یعنی پیغمبری کی سنت کے بدلے کسروی و قیصری سُنفتیں قائم ہو گئیں اور اس لیے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔



حضرت علیؑ کے مختصر دور حکومت کے ظاہری حیثیت سے ناما کامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ جو آنحضرتؐ کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا۔ اور اس لیے آپ اجتہادات ملکی و تمدنی میں کلیتہً اسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبرؐ کا اصلی منشا تھا مگر امت اسلامیہ کے عام افراد کی بچپن برس کی طولانی مدت میں بالکل عاداتیں اور خصلتیں تبدیل ہو چکی تھیں آپ کے دور کی پوری کامیابی اسی وقت کھل سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرمؐ کے بعد بلافاصلہ تسلیم کر لی جاتی اور آپ برسرِ اقتدار ہو جاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور "سیاست ملوکہ" و "سیاست نبویہ" میں کتنا فرق ہے۔



یہ کہنا کہ حضرت علیؑ ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریمؐ کے چچیرے بھائی تھے۔ بابت اسے آپ کے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ نبی کریمؐ نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفتیں حضرت علیؑ کی مشارکرائی گئی ہیں ان میں سے متقی، زاہد، فداکار، اور صحابی، اور رفیق و معاون، کی صفتوں میں تو

جمہوریہ اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علیؑ کا ہم پلہ یا آپ سے چند قدم آگے قرار دیے ہوئے ہے۔ پھر اب رد کیا جاتا ہے چھپرا بھائی اور داماد ہونا چھیرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیل اور جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مؤرخین اہل سنت حضرت عثمان حصہ دار تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر حضرت علیؑ ہی کے متعلق آنحضرتؐ نے ان اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرمائے۔

اس کے علاوہ کیا پیغمبر اسلامؐ صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے چھیرے بھائی اور داماد ہونے کی وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ حالانکہ دوسرے صحابہ ان اوصاف میں ان سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔

اگر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتہ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لیے رسولؐ پر جان دیتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا رہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسولؐ کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان نخت جگر صاحبزادیوں کو اس کے جلال و ذوالج میں دے دیتے ہیں۔ (بقولؒ بڑی صاحب) اس کے ایک ایک اشارہ پر کھٹ پٹیوں کی طرح ناچتے ہیں اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب موقعہ پڑتا ہے تو رسولؐ علیؑ کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان حضرات کے لیے ویسے اوصاف اور اتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے صرف اس لیے کہ ان کے مقابلہ میں رسولؐ کا بھائی اور داماد ہے تو پھر اس کا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "برحانہ جانبداری" اور غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر مٹوٹ جانتا ہے کہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں

سے بہت بلند ہے۔

میری جانب سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نبی کریمؐ قدم قدم پر اشارۃً اور تصریحاً حضرت علیؑ کو اپنا قائم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ اتنا بھی حسن ظن نہ رکھنا چاہیے کہ آپؐ کا یہ فعل کسی عذر برداری کے لحاظ اور بے جا پاسداری پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات و خصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کو آپؐ کی تعریف و توصیف پر آمادہ کرتے ہیں اور آپؐ کو اپنا قائم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اگر ایمان بالنبیؐ جو اسلام کا جزو اعظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس کلمے میں کمی کی قیاس نہیں ہے بلکہ ایسا سمجھنا ضروری ہے۔

یہ سوال کم از کم میرے سامنے عجیب و غریب ہے کہ اگر فی الواقع نبی کریمؐ حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے ہوتے تو پھر آپؐ نے علیؑ رضی اللہ عنہ اس کا اعلان کیوں نہیں کیا؟

اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں؟



یہ اسلام کا اتنا اہم داخلی مسئلہ، اس کے حل کے لیے مستشرقین یورپ کے دامن سے تسک، میری سمجھ میں تو نہیں آتا، کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کی روح کو کچھ گئے ہیں؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبرؐ کی ذات پر جو بہت اعتراضات ان کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں انھیں صحیح تسلیم کیا جائے!

میرے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل پیش ہی نہیں کیے گئے بلکہ صرف تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے جناب ترمذی صاحب نے مؤیدین امامت کی ایک دلیل پیش فرمائی ہے۔ انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا اس کے مقابلہ میں آپؐ نے

چند حدیثیں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے میرے سنی اصحاب متنا فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا یہی انداز ایک غیر جانبدار کو آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شیعہ اپنے مطلب کی متنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صغیر سطر کا حوالہ دے دے کر آپ کی کتابوں سے، آپ اس کے جواب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری بس ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں (دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب میں رسالہ "قاران" بحجور میں نکلا ہے) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری کے علاوہ کوئی تفسیر، حدیث، علم رجال، دسیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا برد کہہ دینے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روایتیں مل ہی جاتی ہیں لیکن آپ سبب شیعوں کے مقابل میں حدیثیں پیش کرنے پر رستے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ ان حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر ان روایتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

خدا بخش لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اس کے تذکرہ سے نتیجہ کیا؟ ثانی آئین اذہانی الفار کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے۔ اب، آپ بغیر اس پر کچھ نقد و تبصرہ فرمائے ہوئے یہ کہہ دیں کہ یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابو بکر کی منقبت کو طعہ ہر کرتی ہے؟ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح وقعت دی جہلنے؟

"سبق السکام" کے متعلق حضرت علی کی فضیلت کو سبک کرنے کے لیے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں "کاوش فکری" کے ساتھ "دلیدگی خیال" کا اثر نمایاں ہے۔

”نوجوانی میں انسانی دماغ غیر خستہ ہوتا ہے“ گو انسان میں ذوق تحقیق ہوتا ہے اور
 قوت خیال و سادس وادہام زیادہ پیدا کرتی ہے اس لیے ان ذہم شکوک وادہام کے مقابلہ
 میں کسی حقیقت پر تسلیم خم کر دینا کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہے۔ ”چھیڑے بھائی“ اور قریب کے
 عزیز و سرے جی موجود تھے لیکن انھیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہر حال سبقت
 ایک شرف ہے جو ”اسابقون السابقون اولئک الممقرَّبون“ میں معیارِ تقرب
 قرار دیا گیا ہے۔ اس میں عزیز اور غیر عزیز، نو عمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے لیکن ہمارا
 مضمون دیکھ لیا جائے ہم نے اس کو کوئی مستقل دلیلِ خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے
 مضمون کے سلسلہ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھ کر اس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا۔
 کہا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریمؐ نے اپنے اعزاء کے سامنے اسلام کو
 پیش کرتے ہوئے حضرت علیؑ کے متعلق کہا تھا ”ان هذالانحی ووصی وخلیفقی
 فیکم“ لیکن اس سے خلافت علیؑ پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا
 اس وقت رسول کریمؐ کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار لیڈر سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لیے
 ان مجملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔
 کہ حضرت علیؑ کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریمؐ کا واحد معتمد علیہ قرار
 دیا گیا ہے۔“

یہ الفاظ جنہیں پورا نقل کر دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک مسلمان کے قلم
 سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا نبی کریمؐ مسلمانوں کی نگاہ میں متکار لوگوں کی طرح دنیا دار حیلہ باز خود غرض
 اور ابن الوقت تھے؟ انھوں نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علیؑ کی
 حوصلہ افزائی کے لیے کہہ دیا کہ میرے وصی میں یہ میرے خلیفہ و جانشین ہیں۔ بس طرح کام
 نکال لیا اور ان مجملوں کے معنی کچھ بھی نہیں تھے؟
 میں تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی سچائی، امانت و دیانت اور بے لوث

اخلاق قوی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔



اس جگہ حضرت علیؑ کی امامت و خلافت کے تذکرہ میں بالکل بے جوڑ طریقہ سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علیؑ کو صحیح تسلیم کرے گا تو حضرت حسنؑ کو بھی مانے گا لیکن آپ نے حضرت علیؑ کے قاتل ابن ملجم سے جس طرح انتقام لیا ہے اس کو دیکھ کر اس کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قائم رہتا ہے۔

اس کے جواب میں پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے سامنے حضرت علیؑ کی خلافت کی بحث میں امام حسنؑ کی امامت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بنا پر حضرت علیؑ کی امامت کو تسلیم کرے اور حضرت حسنؑ کو تسلیم نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسنؑ کی نسبت پیش کیا جا رہا ہے اس کو شیعہ فریق فرقہ خوارج کی اختراع قرار دیتا ہے۔ لہذا قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں وہ متفقہ تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے فجاسلی کو زندہ آگ میں ڈال کر جلوا دیا۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت کی بنا پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔



مجھے بھی اب زیادہ تفصیلات بحث نہیں کرنا ہے۔ میرا گذشتہ مضمون و تحقیقت ابھی تک بالکل گواہ ہے اور اس وقت تک دست نقد و اعتراض نہیں پہنچا ہے۔ شیعیت، ایرانی، ایزد تہیت میں ایجاد ہونے کے فرضی افسانے بنانے سے حقیقت نہیں۔ بل جہت کی اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزوں سے بالکل علیحدہ ہے۔



سب سے آخر میں مجھے اس فقرہ پر یاد رک کرنا ہے کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخورِ اعتنا کہا جاسکے اور نہ شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ خلافت کو اہمیت ہے یا نہیں، اس کو تو مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس بحث کی اہمیت مسلمانوں کی عملی اخلاقی و تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایانِ دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں اسی طرح یہ فقرہ کہ ”شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ“۔

اس کا جواب شیعہ ہی دے سکتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں افتراق ایسی قسم کی تعبیری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کہیے گا ”شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں“ شیعہ کہیں گے ”سنیت اسلام کا مذہبی فرقہ نہیں“ نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہیں یکساں ہو جائے کہ سنی سب شیعہ بن جائیں یا شیعہ سب سنی بن جائیں غیر ممکن لیکن اتحاد و اتفاق کی صورت یہ ہے کہ آپ ان کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجیے اور ان کا احترام کیجیے وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کریں اور احترام کریں۔ پہلے اس طرح یہ شیرازہ مجتمع رہے گا اور ملتِ اسلامیہ کا نظام درہم برہم نہ ہوگا۔ خدا جانتا ہے کہ مسلمانوں کا خیر خواہ ہوں۔ اس لیے اتنا لکھ بھی دیا نہیں تو مجھ سے کیا مطلب۔ فقط

ہرنام



jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

نیاز فحیموری
مدینہ نگار

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت امامت

(میرے نقطہ نظر سے)

تکابر میں اس مسئلہ کی ابتداء ایک صاحب ہرنام کے مضمون سے ہوئی جنہوں نے شیعہ نقطہ نگاہ اور استنادات اہل تسنن سے وصایت و ولایت جناب امیرؑ کو ثابت کیا تھا۔ اس کے جواب میں جو مضمین اہل تسنن کی طرف سے موصول ہوئے ان میں اکثر تشنہ و نامکمل تھے۔ صرف جناب ابو سعید برقی، ایم۔ اے کا ایک مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا۔ درحالیکہ وہ بھی کوئی تابع جواب ہرنام کے مضمون کا نہ تھا اس کے بعد ہرنام صاحب کا پھر دو سرا مقالہ نمبر کے نگاہ میں جناب برقی کے جواب میں شائع ہوا اور اسی کے ساتھ میں نے وعدہ کیا کہ اب بغیر کسی مزید انتظار کے اپنی رائے اس مسئلہ میں پیش کر دوں گا۔ دمیر میں مجھے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کا موقع نہ ملا۔ جنوری میں اس بحث کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے اب فروری کی اشاعت میں اپنے اس وعدہ کا ایفا کرتا ہوں۔

ہرنام کا استدلال دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ جناب امیرؑ اپنے خصائل و عادات کے لحاظ سے مرجع حق خلافت کا رکھتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ خود رسول اللہؐ نے بھی غدیر خم میں اور اس کے قبل و بعد متعدد بار اپنے بعد ولایت و وصایت علیؑ کی صراحت فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے تمام روایات و اسناد وہی پیش کیے تھے جو اہل تسنن کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس لیے سنیوں کی طرف سے جواب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ دوسرے سے ان روایات کے وجود ہی سے انکار کریں یا یہ کہ وہ ان روایتوں کا کوئی مفہوم اور بتائیں۔ غلط ہے کہ اول صورت جواب کی اختیار نہیں کی جاسکتی کیونکہ

دو روایات تو کتا بول سے نکالی نہیں جاسکتیں۔ اس لیے عموماً دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی بعض تو ان روایتوں کو ضعیف قرار دے کر ناقابل اعتناء خیال کرتے ہیں اور بعض الزامی جواب کے انداز میں ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو فضائل جناب شیخین میں ان کے میاں پائی جاتی ہیں۔ درآ خلیکہ ان دونوں میں سے کوئی طریقہ جواب کا مفید یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ جن روایتوں کو آج ضعیف کہہ کر ناقابل استناد قرار دیا جاتا ہے وہ قدما کے نزدیک حد درجہ قابل وثوق سمجھی جاتی تھیں اور فضائل شیخین کو جناب امیر کے حق ولایت و خلافت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ایک کی فضیلت نہ دوسرے کی فضیلت سے انکار کا مادہ بنتا کرتی ہے اور نہ اس سے کسی دوسرے کا حق سمجھو سکتا ہے۔

غالباً مناسب ہوگا کہ پہلے ایک اجمالی تبصرہ اس وقت تک کے مضامین پر کر دیا جائے تا کہ جس حد تک روایتی استنادات کا اطلاق سے یہ بحث ابتداء ہی میں ختم ہو جائے۔

سب سے پہلی خصوصیت جناب امیر کی ہر نام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ ہر چند سابقیت اسلام کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو خلافت و امامت پر مؤثر ہو سکے لیکن چونکہ رسالہ فاران میں کسی صاحب (مولوی فاروق) نے ہر نام کے مضمون کا جواب لکھتے ہوئے اس کی بھی تردید کی تھی اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر اس مسئلہ پر بھی محاکمہ کیا جائے۔

مولوی فاروق صاحب نے بروایت بخاری ثابت کیا ہے کہ حضرت علیؑ کا نبی اسلام لانے والوں میں چوتھا یا نواں تھا لیکن بخاری کی جن دو روایتوں سے استناد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے ایک راوی اسماعیل بن مجاہد ہیں۔ جو نسائی کے نزدیک ضعیف اور حاکم کی رائے میں ناقابل اعتبار ہیں۔ دارقطنی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اسماعیل کے ضعف پر اجماع ہے۔ الغرض بخاری کی ایک ایسی روایت پر جو درجہ احاد سے آگے نہیں بڑھتی اور مجروح صحی ہے۔ تمام جمہور محدثین کے اس فیصلہ کو کیونکر رد کیا جاسکتا ہے۔ کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے جناب امیرؓ ہی نے اسلام قبول کیا۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؑ

ہی ایمان لائے۔ چنانچہ دارقطنی نے ابوسعید خدری سے، امام احمد نے حضرت عمر سے احکم نے معاذ سے، عقیلی نے حضرت عائشہ سے جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ نے اپنی زبان سے فرمایا کہ ”مجھ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے میں“ الغرض ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے امام بخاری کی ایک مجروح روایت کو استدلال میں پیش کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دوسرا استدلال جناب امیر کی وصایت و امامت کے ثبوت میں ہر نام صاحب نے یہ پیش کیا ہے کہ جب جناب رسول اللہ کو ”انذر عشیرتک الاقربین“ کی ہدایت ہوئی تو آپ نے اپنے اعتراف و اولاد عبدالمطلب و ہاشم کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس میں جناب امیر کو ”اسخی و وصی و خلیفہ فیکم“ (اپنا بھائی اور اپنا ولی و عہد و جانشین) ظاہر کیا۔ اس کا جواب بھی سنیوں کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ دراصل ایک مسند احمد بن حنبل، خصائص نسائی، سیرۃ ابن اسحاق، تفسیر ابن حاتم، دلائل بیہقی و ابونعیم میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ درست طریقہ سے مروی ہے محض بخاری میں نہ پایا جانا کوئی معقول وجہ اس کا کی نہیں ہو سکتی۔ رہا جناب ابوسعید بڑی کا یہ کہنا کہ رسول اللہ کا ایسا فرمان صرف حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لیے تھا۔ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ سے منسوب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

تیسری خصوصیت جناب امیر کی ہر نام صاحب نے یہ بیان کی ہے کہ جب رسول اللہ نے پرشیدہ طور پر مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنے بستر پر جناب امیر کو لٹ کر تشریف لے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علی کا رسول اللہ کے بستر پر لیٹ جانا انتہائی خطرہ کی بات تھی۔ اور آپ کا اس خطرہ کو گوارا کر لینا جان نثاری کا ایسا زبردست ثبوت ہے۔ کہ اس سے زیادہ قوی ثبوت کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ سے بھی بعض علماء اہل تسنن صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ بخاری میں کوئی ایسی روایت نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ کوئی قابل اعتبار استدلال نہیں ہے۔ کیونکہ علاوہ بخاری کے تمام کتب احادیث و تفسیر و تاریخ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مسند احمد بن حنبل، سنن امام نسائی، سنن ابن ماجہ، خصائص نسائی، سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن ہشام، تفسیر الثعلبی، تفسیر ابو حاتم رازی، تاریخ کبیر اور اسد الغابہ وغیرہ تمام کتابوں میں ہر شخص اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

چوتھی خصوصیت موصافہ کی ہر نام صاحب نے ظاہر کی ہے۔ یعنی جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لانے کے بعد مہاجرین و انصار میں بھائی چارے کی رسم قائم کی تو جناب امیرؓ کی موصافہ خود اپنی ذات سے کی اور ارشاد فرمایا: ”انت اخي في الدنيا والاخرة“ اے علیؓ تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔ اس واقعہ سے بھی اہل تسنن صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ جناب امام بخاری اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ درحالیکہ دیگر کتب احادیث میں بارہ صحابہ کی روایت سے اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

پانچویں خصوصیت ہر نام صاحب نے بی ظاہر کی ہے کہ مسجد نبویؐ کے چاروں طرف جتنے صحابہ کے گھر تھے ان سب کے دروازے رسول اللہ ﷺ کے بندہ کرادیے لیکن حضرت علیؓ کے گھر کا دروازہ محض مسجد کی طرف کا بند نہیں کرایا۔ یہ واقعہ بھی اہل تسنن کی کتب احادیث و تاریخ میں صراحتاً موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام نسائی، امام طبرانی، ترمذی، بیہقی اور ابن عساکر وغیرہ سب بالاتفاق اس واقعہ کی صحت کے شاہد ہیں۔

چھٹی خصوصیت جناب امیرؓ کی ہر نام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے داماد یعنی اس محبوب بیٹی کے شوہر تھے جس کو جناب رسالت ﷺ ”سیدۃ نساء العالمین“ سیدۃ نساء المؤمنین ”سیدۃ نساء اہل الجنتہ“ کے الفاظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ واقعہ ایسا ہے جس سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔

ساتویں خصوصیت ہر نام صاحب نے حضرت علیؑ کی یہ ظاہر کی ہے کہ جنگ بدر، جنگ اُمد اور جنگ خیبر وغیرہ میں جو کرائے نمایاں آپ نے کیے وہ دوسروں سے ظاہر نہ ہو سکے بلکہ بعض موقعوں پر تو تمام اکابر صحابہ رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے اور صرف حضرت علیؑ رہ گئے چنانچہ آپ کی انھیں خصوصیات جرأت و وفاداری کی بنا پر رسول اللہؐ نے خیبر کی مہم پر روانہ کرتے وقت آپ کو ”کرار غیر فرار“ کے الفاظ سے یاد فرمایا۔

ان تمام جنگوں میں جناب امیرؑ نے جس غیر معمولی شجاعت و ثابت قدمی سے کام لیا۔ اس کے اعتراف پر اہل تسنن بھی مجبور ہیں لیکن خیبر کی مہم روانہ کرتے وقت رسول اللہؐ کا جناب امیرؑ کو ”کرار غیر فرار“ کہنا اور جنگ اُمد و جنگ حنین میں تمام اکابر صحابہ یہاں تک کہ جناب ابوبکرؓ اور جناب عمرؓ کا بھی رسول اللہؐ کو تنہا چھوڑ کر چلا جانا ایسی باتیں ہیں جو سنیوں کے لیے نا قابل قبول ہیں۔ لیکن رسول اللہؐ کا جناب امیرؑ کو ”غیر فرار“ کے لفظ سے خطاب کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس سے قبل جو صحابہ (یعنی جناب ابوبکرؓ و جناب عمرؓ) پر چم اسلام لے کر خیبر فتح کرنے گئے۔ تھے۔ اور ناکام واپس آئے وہ بھاگ آنے والوں میں تھے، اور جنگ حنین و جنگ اُمد میں تو خیر کھلم کھلا ان حضرات پر رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ دینے کا الزام قائم کیا جاتا ہے۔

اہل تسنن بر بنائے امام بخاریؒ الفاظ ”کرار غیر فرار“ کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ابن اسحاقؒ، نسائیؒ، احمدؒ، ابن ابی شیبہؒ، ابن جریرؒ، طبرانیؒ، بیہقیؒ نے اور دارقطنیؒ خطیبؒ اور ابن عساکرؒ نے تو خود حضرت عمرؓ سے انھیں الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے علاوہ اس کے جناب ہر نام کا یہ استدلال کہ اگر ”کرار غیر فرار“ کے الفاظ نکال دیے جائیں تو مسخر ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اور زیادہ توہین و تمسخر ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت علیؑ سے قبل جو حضرات پر چم اسلام لے گئے تھے وہ خدا و رسول کے دوست بھی نہ تھے۔

روایا جنگ اُحد و جناب حسین میں تمام اکابر صحابہ کا فرار ہو جانا، سو اگر باوجود متعدد احادیث اہل تسنن کی موجودگی کے اس سے انکار بھی کر دیا جائے تو حضرت علیؑ کی عظیم الشان خدمات کو ایک مخصوص امتیاز دینا لازم ہے کیونکہ ان کے پیچھے موڑ کر چلے جانے یا رسول اللہؐ کا ساتھ چھوڑ دینے کی ایک روایت بھی کسی جگہ نہیں پائی جاتی۔

ساتویں خصوصیت ہر نام صاحب نے حدیث منزلت سے ثابت کی ہے یعنی جب غزوہ تبوک میں رسول اللہؐ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علیؑ کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں جس سے آپؐ کب سیدہ خاتون ہوئے۔ رسول اللہؐ نے آپؐ سے فرمایا ”کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو باردن کو موسیٰؑ سے حاصل تھی سو“ اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے۔“

ہو نہ یہ حدیث بخاری میں بھی موجود ہے اس لیے اہل تسنن اس واقعہ سے انکار تو نہیں کر سکتے لیکن وہ اس کو کوئی ایسا زیادہ اہم بھی نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے اختلاف جناب امیرؑ ثابت نہ ہو سکے لیکن ان کی فضیلت تمام دیگر صحابہ پر ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ امام نووی نے شرح مسلم میں بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔

آٹھویں خصوصیت ہر نام صاحب نے یہ بتائی ہے کہ جب سورہ برات نازل ہوئی، تو رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو مامور کیا کہ جا کر اہل مکہ کو اس کی تبلیغ کریں جب وہ پہلے گئے تو وحی نازل ہوئی کہ اس کی تبلیغ خود رسول اللہؐ کو کرنا چاہیے یا اپنے کسی عزیز قریب کے ذریعہ سے۔ چنانچہ آپؐ نے جناب امیرؓ کو روانہ فرمایا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ سے سورہ برات لے کر اہل مکہ کو جا کر سنائیں اور جناب امیرؓ کو یہ خدمت تفویض کرتے وقت فرمایا کہ :-

”علیٰ منی وانا منہ ولا یودی عنی الا انا وعلیٰ“ (علیؑ مجھ سے ہے

اور میں علیؑ سے ہوں اور اپنی ترجائی یا میں خود کر سکتا ہوں یا علیؑ)

یہ واقعہ بھی اہل تسنن کی تمام کتب معتبرہ احادیث و تفاسیر میں موجود ہے اور

اس سے انکار ممکن نہیں۔ بعض اہل تسنن اس کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے، درآنحالیکہ اس سے حقیقت روشن ہوگئی کہ جو خدمت خود ذات نبویؐ سے متعلق ہو سکتی تھی۔ اس کو سرف حضرت علیؑ ہی انجام دے سکتے تھے۔

نویں خصوصیت کا اظہار جناب ہر نام نے اس واقعہ کے سلسلہ میں کیا ہے جب جناب امیر تبلیغ اہل یمن کے لیے مامور کیے گئے تھے اور آپ کے خلافت چند لوگوں کی شکایت سن کر فرمایا تھا کہ ”مجھ سے علیؑ کی برائی نہ کرو“ فانہ صنی وانامندہ وھودلکھ بعدی“ وعلیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور وہ میرے بعد تھا (حاکم ہے) بعض احادیث میں اضافہ ”وھودلکھ بعدی“ کے نہیں پائے جاتے۔ اور بعض میں ”وھومولی کل مومن ومومنتہ“ پائے جاتے ہیں۔ شکایت یہ تھی کہ جناب امیرؑ نے خمس میں سے ایک لونڈی اپنے لیے منتخب کر لی۔ نام بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکایت سن کر رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ”ان لہ فی الخمس اک ثومن ذالک“ (علیؑ کا حصہ خمس میں اس سے بھی زیادہ ہے) یہ حدیث بھی اہل تسنن کی تمام معتبر کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اور اس سے جو منزلت جناب امیرؑ کی ظاہر ہوتی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ دسویں خصوصیت وہ ہے جو خطبہ حجۃ الوداع اور قدرِ ختم سے متعلق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ حضرات شیعہ کے پاس ولایت جناب امیرؑ کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے یہ واقعہ مختصر آویں ہے کہ جب حج سے فارغ ہونے کے بعد قافلہ نبویؐ غدیر خم پر پہنچا تو رسول اللہؐ نے سب کو روک کر ایک تقریر فرمائی اور اس میں اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ ”من کنت مولاه فعلی مولاه“ میں جس کا مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :-

”میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری میری عزت، میرے اہلیت اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیے۔“

بعض علماء اہل تسنن اس واقعہ سے بھی صحت اس لیے انکار کرتے ہیں کہ امام بخاری نے اس کی روایت نہیں کی ہے۔ اور ابن تیمیہ نے اس کو سبب اصل بتایا ہے۔ حالانکہ صرف بخاری کا روایت نہ کرنا یا ابن تیمیہ کا انکار ان تعدد و متواتر تصدیقوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جو اس باب میں پائی جاتی ہیں۔

امام الحدیث حافظ ابن عثمد نے ایک موصحابہ سے اس حدیث کی روایت کی ہے امام جزیری و شافعی نے اتنی صحابیوں سے، امام احمد بن حنبل نے تیس صحابیوں سے اور طبری نے پچھتر صحابیوں سے۔ علاوہ اس کے تمام اکابر اسلام مثلاً ذہبی، صنعانی اور علی القاری وغیرہ اس حدیث کو مشہور و متواتر مانتے ہیں۔

ابن ہرنام صاحب نے واقعہ قرطاس کو بھی پیش کیا ہے لیکن اس کا تعلق اول تو وصایت جناب امیر سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کا غزو قلم منگو کر کیا لکھو، چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل تسنن کے نزدیک قابل لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں سے ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں۔ جو غیر ثقہ قرار دیے گئے ہیں، دوسرے راوی قبیسہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے یونس بن یزید ہیں جن کا حافظ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے۔ چوتھے راوی علی بن عبد اللہ ہیں جن کا شمار ضعفاء میں ہے، وہ گئے۔ ایک اور راوی حضرت ابن عباس سوال کا اس وقت دہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔

دسویں خصوصیت جناب ہرنام نے یہ ظاہر کی ہے کہ رسول اللہ نے وقتِ آخر میں فرمایا کہ "بلاد میرے حبیب کو، چنانچہ پہلے حضرت ابو بکر آئے لیکن آپ نے توبہ نہیں کی اس کے بعد حضرت عمر تشریف لائے لیکن دیکھ کر ہنر تکبیر پر سر رکھ لیا۔ تیسری مرتبہ جب حضرت علی آئے تو آپ نے انہیں چادر میں سے لیا۔ اور برابر سے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔"

رحمۃً منہ خیرت و ولایت سے ہوا درست اس واقعہ کا تعلق نہیں ہے لیکن فضیلت جناب امیر ثابت کرنے کے لیے یقیناً یہ نہایت زبردست دلیل ہے۔ بعض علماء اہل تسنن اس حدیث کی صحت سے بھی منکر ہیں اور میرے نزدیک ان کا یہ انکار بھی درست نہیں۔ کیونکہ اس حدیث کو امام نسائی، امام احمد بن حنبل، واطفی، امام ربیع اور حاکم سب نے روایت کیا ہے۔

یہاں تک تو میں نے ہر نام صاحب کے تمام روایتی استدلالات کا خلاصہ پیش کر کے ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی اور اس میں شک نہیں کہ ان روایات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ جناب امیر کی غیر معمولی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ بڑی حد تک یہ بھی کہ رسول اللہ اپنے بعد آپ ہی کو جانشین بنانا چاہتے تھے۔ اہل تسنن جواب کے دو طریقے اختیار کرتے ہیں، ایک یہ کہ وہ ان میں سے بعض روایات کو صرف اس لیے غلط قرار دیتے ہیں کہ امام بخاری نے ان کو درج نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ایسا ایک نہ طریقہ و اعتراض کا ہے کہ اس کی کمزوری ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت علیؓ کے فضائل کے جواب میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے فضائل کی احادیث پیش کرنے لگتے ہیں۔ اول تو جواب کی یہ صورت اس لیے بھی بیکار ہے کہ جن احادیث کو یہ پیش کرتے ہیں وہ حضرات شیعہ کی کتابوں میں نہیں پائی جاتیں (برخلاف اہل شیعہ کے کہ وہ فضائل حضرت علیؓ کی روایات اہل تسنن کی کتابوں سے پیش کرتے ہیں) دوسرے یہ کہ اگر فضائل شیخین کی احادیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے اصل مسئلہ خلافت و امامت جناب امیر پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ جبکہ حضرت علیؓ کے مرتبہ و فضیلت سے اہل تسنن کو بھی انکار نہیں۔

الغرض جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرت شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علیؓ آپ

کے بعد جانشین قرار دیے جائیں۔ لیکن گفتگو اس میں ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ کی اس خواہش کا حالات کے اقتضا کے لحاظ سے پورا ہونا ممکن و مناسب تھا یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگر حضرت علیؑ رسول اللہ کے بعد خلیفہ قرار نہیں دیے گئے۔ تو یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذہب کا باعث ہو سکے؟

جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے اور اگر کوئی جماعت اس کی قائل ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسلام کی تعلیمات پر غور کیا ہے۔ نہ اس کے صحیح قصد کو اس نے سمجھا ہے۔ اور نہ منصب نبوت کے حقیقی مفہوم سے اُسے آگاہی حاصل ہے۔



اس سے غالباً تسلیم دستی کسی کا انکار نہیں کہ تعلیمات اسلام مذہب و سیاست دونوں پر حاوی ہیں۔ یعنی اگر رسول اللہ کو ایک طرف مبلغ احکام خداوندی کی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف آپ ایک سیاست دان فرمانروا کا منصب بھی رکھتے تھے لیکن ان دو مختلف حیثیتوں کا آپ کے منصب نبوت سے کیا تعلق تھا؟ اس کو سب نے نظر انداز کر دیا ہے اور یہی اصل سبب تمام نزاعات کا ہے۔ اس لیے آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کریں۔

نبی یا رسول کا لغوی مفہوم جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کا اصطلاحی مفہوم ہمیشہ یہی قرار دیا گیا کہ نبی وہ غیر معمولی انسان ہے جو خدا کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہو۔ جو معجزات کا حامل ہو۔ پیشین گوئیاں کرتا ہو۔ غیب کی باتیں جانتا ہو۔ بات بات میں خدا فرشتے بھیج کر اس کی مدد کرتا ہو۔ محالات کو ممکن بنا دینے پر قادر ہو۔ بالکل معصوم ہو۔ لغزش و غلطی سے مبرا ہو جس کا ہر قول و فعل ہر وقت الہام خداوندی کے ماتحت ظہور پائے جاتا ہو۔ یعنی مختصر یہ کہ اس میں عام خصوصیات انسانی بالکل نہ پائی جائیں اور وہ ایک غیر انسانی انسان ہو۔

آپ تمام مذاہبِ عالم کی تاریخ کا مطالعہ کر جائیں، بہ ادنیٰ تغیر الفاظ نبی یا رسول کا مفہوم آپ کو یہی نظر آئے گا، لیکن یہ خصوصیت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے نبی کے اس عجیب و غریب مفہوم کی تردید کی اور تمام مذاہب میں وہی ایک مذہب ایسا ہے جس نے نبوت کے اس طلسم زار کو توڑ کر اس کے حقیقی خط و خیال دنیا کے سامنے پیش کیے۔

انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اشراف المخلوقات صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے جذبات حیوانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا اگر وہ چاہے۔ بالکل اسی طرح ایک نبی، دوسرے انسانوں کے مقابل میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں جو ایک انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہیں، زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذبات حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جو حد درجہ مسکین و غریب ہے۔ جو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے اور ہم اس کی صلاحیت نفس کی تعریف کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لے کر اپنے جذبات حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتنا وہ حد درجہ جس واقعہ ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اس کو بزدل و بے غیرت کہیں گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت و پاکباز ہے۔ اور ہم اس کے ضبط نفس کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے۔ تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔

الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس

سے باز آئے۔ وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے۔ مہول سے متاثر ہو سکتا ہو، لیکن نہ ہو، اسی پر ایک نبی کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر تئیں کر لیجیے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ نبی فطرۃً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔ اگر وہ غیب کی باتیں جان لیتا ہے تو اس کی فراست و پیش بینی بے معنی ہے اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں تو اس کی کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی تو اس کی سلامت رزی بھیج ہے۔ ایک نبی کو دوسرے انسانوں کے مقابلے میں امتیاز اگر حاصل ہے تو صرف یہ کہ وہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں ان کے ضبط پر دوسرے انسانوں سے زیادہ قادر ہے، وہ دوسرے انسانوں کی طرح کوجتا ہے لیکن بہت فائز نگاہ سے، وہ مخالفت و معتابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک پہنچنے کے لیے انہیں اسبابِ دلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ الغرض وہ ہماری طرح ایک انسان ہے۔ لیکن بلند ترین سطح کا اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے لیکن بہت کم۔ وہ اپنی نیت کے لحاظ سے اپنے مقاصد کے نقطہ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے۔ لیکن اپنی تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کا ردِ بارِ عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو سن کر متعجب ہو علی الخصوص حضراتِ شیعہ جو نہ صرف رسول اللہ بلکہ اہل بیت کے تمام افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کر دلِ کلامِ پاک سے نبوت کا مفہوم میری سمجھ میں ہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر پیدا کشتی معصومیت سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصبِ نبوت کی توہین کرنا ہے۔

نبی آخر الزماں سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا۔ وہ یہ تھا کہ رسولؐ نوح انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اور اس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس کی ترویج رسول اللہؐ کی زبان سے یوں کی گئی۔

”قل لو كان في الارض ملائكة يمشون مطمئنين لنزلنا عليهم من السماء ملكا رسولا“ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶۵) یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

اسی طرح سورۃ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسول اللہؐ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:-

”قل انما انابشر مثلكم لوحي الى انما الهكم الله واحد“ (یعنی اے رسولؐ کہدے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ خدا مجھے تمہیں وحدانیت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں ”هل كنت الا بشرا رسولا“ کہہ کر اس کی اور زیادہ وضاحت کر دی جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل میں نے عرض کیا، ایک نبی کی خصوصیات میں اس کا غیب دان ہونا بھی لازمی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اسلام نے اس کی بھی نہایت پُر زور الفاظ میں تردید کی ہے۔ رسول اللہؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ تم سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ ”رَبِّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْيَدِ يَرْجِعُ الْاَمْرَ كُلَّهُ“ (یعنی آسمان و زمین کی پوشیدہ باتوں کو جاننے والا صرف خدا اور وہی سب کا مرجع حقیقی ہے۔) (آیت ۱۲۳ سورۃ ہود)

لے وما منع الناس ان يؤمنوا اذ جاءهم الهدى الا ان قالوا البعث الله نبيا رسولا (ایمان لانے جس چیز نے ان لوگوں کو باز رکھا وہ یہ تھی کہ وہ کہا کرتے تھے کیا خدا نے کسی انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے) (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۹۴)

سورہ نمل کی آیت ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے :-

”قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ“

سورہ النعام کی آیت ۵۱ میں اس کی صراحت اور زیادہ پُر زور الفاظ ہیں اس طرح کی جاتی ہے کہ :-

”قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِيَ خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ أَنِّي مَلَكٌ“

(اے رسول کہہ دیجیے کہ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں یا میں غیب کا جاننے والا ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں)

پھر سورہ اعراف میں اس کی وضاحت دوسرے طریقہ سے یوں کی گئی ہے :-

”قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ

الْغَيْبَ لَا سَتَكُنْتُ مِنَ الْخَاسِرِينَ وَمَا مَسْتَقِي السُّو“ (آیت ۱۸۸)

(یعنی مجھے اپنے نفع و نقصان پر بھی اختیار نہیں ہے اور اگر مجھے آئندہ کا حال معلوم ہوتا تو اپنے لیے سب بھلائیاں ہی بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا)

یہ ہیں وہ آیات قرآنی جن سے رسول اللہ کی حیثیت انسانی کو ظاہر کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی دوسرے انسانوں ہی کی طرح ایک انسان تھے، نہ آپ کو آئندہ کا حال معلوم تھا، نہ آپ کے پاس خزانے غیب کی کنجیاں تھیں، یہاں تک کہ جن دنیاوی ابواب کے ماتحت انسان کو نفع و ضرر پہنچا کرتا ہے۔ ان سے بھی آپ مستثنیٰ نہ تھے۔

ایک نبی کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ حامل معجزات ہو۔ اور رسول اللہ سے قبل عام طور پر خوارقِ عادات کا ظہور انباتِ نبوت کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا، لیکن کلامِ مجید نے اس مسئلہ کو بھی ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا۔

جس وقت کفار نے رسول اللہ سے کہا کہ ہم تجھ پر اس وقت ایمان لائیں گے جب تو زمین سے ہمارے لیے چشمہ جاری کر دے یا یہ کہ تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس میں بہتی ہوئی نہریں نکال دے یا یہ کہ تو آسمان کے ٹکڑے کر دے یا یہ کہ حسد آور فرشتوں کو اپنے ساتھ لے آئے وغیرہ تو اس کا جواب رسول اللہ نے صرف یہ دیا کہ ”سبحان ربی هل کنت الا بشر ارسولا“ (ملاحظہ ہو سورۃ بنی اسرائیل آیات ۹۲-۹۵) اگر رسول اللہ حامل معجزہ ہوتے یا منصب نبوت میں معجزوں کا دکھانا بھی شامل ہوتا تو اس سے زیادہ موزوں و مناسب وقت کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ کفار اس پر اصرار کر رہے تھے اور ایسے وقت میں معجزہ کا اظہار از بس و مفید و کارآمد ہوتا۔ لیکن آپ نے نہ صرف معجزہ دکھانے سے انکار کر دیا بلکہ ان کو منصب نبوت کا صحیح مفہوم بھی سمجھا دیا کہ نبی یا رسول کو انسانی ہستی سے بالاتر ہستی بخشنا غلطی ہے۔

نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے مبرا ہے۔ لیکن کلام مجید سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔ سورۃ سبا کی آیت ۹ میں رسول اللہ کے ارشاد ہوتا ہے:-

”قل ان ضللت فاعما اضل علی نفسی وان اهتدیت فبما یوحی الی ربی“

”اے سب سے قریب“

(یعنی کہہ دو کہ اگر مجھ سے کوئی غزش ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں اور اگر سیدھی

راہ اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی ہدایت ہے)

سورۃ مومن آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے کہ:-

”استغفر لذنبک وصبح بحمد ربک“ (اپنی غلطی سے توبہ کر اور

خدا کی حمد بیان کر)

سورۃ محمد آیت ۱۹ میں پھر ”واستغفر لذنبک وللمومنین والمومنات“

کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں۔

سورۃ فتح آیت ۱-۲ میں ارشاد ہوتا ہے :-

”اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ“

یہاں بھی وہی لفظ ذنب موجود ہے۔

ایک بار رسول اللہ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ پھیر لیا۔ اس پر آپ کو اس طرح تنبیہ کی گئی :-

”عَبَسَ وَتَوَلَّى اِنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی“ (سورۃ عبس آیت ۱-۲-۳)

سورۃ براۃ (آیت ۴۳) میں رسول اللہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ :-

”عَفَا اللهُ عَنْكَ لِمَ اَذْنْتَ لَهُمْ حَتّٰی يَتَّبِعُوْكَ الَّذِيْنَ

صَدَقُوْا وَتَعْلَمُ الْكَاذِبِيْنَ“

کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے بعض جنگوں میں رسول اللہ کا ساتھ نہ دیا تھا۔

لیکن رسول اللہ نے ان کو پھر شمول جنگ کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ سے کہا گیا کہ جب تک سچے چھوٹوں کی تفریق و تصدیق نہ ہوئی تھی کیوں انہیں اجازت دی گئی۔

سورۃ النعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے وہ نسیان بھی

سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ

رسول اللہ کی ذات لغزش غلطی انسیان یا بھول چوک کے مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے

یہ کہ آپ کو آئندہ کا کوئی سال معلوم نہ تھا۔ ممکن ہے بعض حضرات اسے نبوت کی توہین سمجھیں

لہٰذا اِذَا رَأٰیْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا مُعٰرِضٍ عَنْهُمْ حَتّٰی يَخُوْضُوْا

فِیْ حَدِیْثٍ غٰیْبَةٍ۔ وَاَمَّا نِیْسِیْتُكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ

الذِّکْرِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ۔

لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی عظمت و جلال صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی کھجا جائے۔

میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہاد ہی غلطی، نسیان اور معمول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ کی ذات مرکز مہدی، روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا۔ لیکن آپ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا۔ کہ آپ سے کبھی کوئی فروگزاشت ہو جائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیات سے خود میرۃ نبوی کے بعض واقعات سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ پھر جب خود ذات نبوی کے متعلق غلطی یا لغزش کا امکان تھا تو خلفاء و ائمہ یا اہل بیت کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ اگر درست ہو سکتا ہے اتنی بحث کے بعد جواب کا ایک یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے کہ اگر منجانب رسول اللہ و وصایت جناب امیر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ تو بھی اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ رسول اللہ کا یہ انتخاب موزوں نہ رہا ہو یا یہ کہ صحابہ سے آپ کو غلطی نہ بنانے میں غلطی ہوئی ہو، مگر اس غلطی سے یہ نتیجہ تو نہیں نکل سکتا کہ انھوں نے قصداً ازراہ عناد و انفاق آپ کے حقوق کو پامال کیا ہو تاہم میں جواب کے اس پہلو کو ترک کر کے ایک اور پہلو اختیار کرتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ امر تصفیہ طلب ہے کہ کیا خلافت کا مسئلہ مذہب اسلام سے تعلق رکھتا تھا یا سیاسیات اسلام سے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور نہ اصولاً ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کا تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے۔ یعنی رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا۔ اب اسی کے ساتھ واقعات حالات پر بھی ایک نگاہ ڈالیے کہ ان سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیر خلیفہ قرار دیے جائیں۔ جیسا کہ آپ نے بار بار اشارتاً و کنایتاً کیا۔ بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور وہ مسئلہ نیابت کی بنیاد و خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا عملی الخصوص اس وقت جبکہ خدا کی طرف سے بھی کوئی ہدایت نہ پہنچی تھی، کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ اور اس نامزدگی کی حیثیت نہ صرف ایک ذاتی رائے کی سی تھی جس کو وحی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بار بار رسول اللہ نے جناب امیر کو ولی، مولیٰ، وصی و خیر کے الفاظ سے یاد کیا۔ لیکن جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت کا سب سے زیادہ اہم واقعہ جس سے حضرات شیعہ خلافت جناب امیر پر استدلال کرتے ہیں، واقعہ قرطاس ہے۔ اول تو اس کے وقوع میں اشتباہ ہے لیکن اگر اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی اب یہ کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ نے خلافت و نیابت ہی کا فیصلہ کرنے کے لیے کاغذ و قلم طلب فرمایا تھا۔ بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ مقصد کچھ اور تھا یا اگر مبی تھا تو آپ نے دوبارہ غور فرمانے کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔

واقعہ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہؐ کا وصال نہیں ہوا۔ بلکہ ہوش دھواس کے عالم میں اتنا وقت آپ کو ملا کہ اگر آپ اس مسئلہ کا بحق جناب امیر فیصلہ کرنا چاہتے تو بلا کر کہہ سکتے تھے اور تمام اکابر صحابہ کو بلا کر اپنے سامنے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت لے سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اگر رسول اللہؐ کی یہ خواہش کسی وحی الہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف الفاظ میں اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلام مجید میں بھی ہوتے لیکن چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مذہب سے نہ تھا۔ بلکہ مصالح سیاست سے تھا۔ اس لیے کلام مجید میں تو اس کا ذکر ہو ہی نہ سکتا تھا اور سیاسی حیثیت سے اس کا قطعی تصفیہ رسول اللہؐ نے اس لیے نہ کیا کہ اول تو یہ اسلام کی روح دستوریت کے خلاف ہوتا اور دوسرے یہ کہ آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیر کا خلیفہ بن جانا آسان نہیں ہے۔ اور ان کے اتنے مخالفت موجود ہیں کہ اس پر اصرار کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہو گا۔

شیعی روایات کے لحاظ سے رسول اللہؐ کے وصال کے بعد حضرت علیؑ کے طرفداروں میں صرف تین شخص تھے (سلمان الصاری) ابوذر (المقداد بن الاسود الکندی) اگر واقعی تمام ماجرین و انصار و اکابر عرب میں سے صرف تین انخاص (بعض شیعی روایات کے مطابق دو پیارا اور) جناب امیرؑ کے طرفدار تھے۔ اور باقی سب مخالفت، تو یقیناً آپ خلافت کے لیے نامزد ہو ہی نہ سکتے تھے اور اگر اس کی کوشش کی جاتی تو بھی کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی۔ ممکن ہے کہ رسول اللہؐ نے انھیں حالات کو دیکھ کر آخر وقت میں سکوت فرمایا ہو۔ اور اس کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا ہو اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی خواہش کا اظہار تو اپنی زندگی میں کر دیا تھا لیکن یہ آپ کی ایک رائے معنی حکم نہ تھا۔ آپ کی ذاتی خواہش تھی۔ فرمانِ حسد اوندی نہ تھا گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ رسول اللہؐ کا حضرت علیؑ کو دلی و وحی و غیرہ کے الفاظ سے یاد کرنا صرف یہ معنی رکھتا

تھا کہ اگر ان کے بعد خلافت کے لیے انتخاب عمل میں آئے تو ان کی رائے حضرت علیؑ کے حق میں شمار کی جائے۔ پھر یہ بھی آپ کی انتہائی فراست تھی کہ وصال کے وقت آپ نے اپنی جانشینی کا مسئلہ طے نہیں فرمایا۔ ورنہ ممکن ہے وہ فتنہ و فساد جو حضرت عثمان کے بعد شروع ہوا آپ کے وصال کے بعد ہی برپا ہو جاتا اور اسلام کی عمر اور زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی۔

اب ایک صورت اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی ہے یعنی یہ کہ خود حضرت علیؑ کے طرز عمل سے ہم کو کیا بات ظاہر ہوتی ہے۔ حضرات شیعہ کا اعتقاد ہے کہ ولایت و وصایت جناب امیرؑ کا اعلان رسول اللہؐ نے حسب فرمان خداوندی کیا تھا۔ یعنی نص قطعی سے آپ کی ولایت ثابت ہوتی ہے۔ درانحالیکہ کلام مجید میں کوئی آیت اس کی تائید میں نہیں ملتی، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد ہی نص قطعی یا وحی متلو کی حیثیت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے تمام اقوال کو وحی متلو نہ سمجھا جائے۔ اور حدیث و قرآن کے امتیاز کو اٹھا دیا جائے۔ حالانکہ حضرات شیعہ بھی قرآن و حدیث میں یہی وجہ امتیاز قائم کرتے ہیں کہ ایک وحی متلو ہے اور دوسری وحی غیر متلو۔ یعنی ایک کا تعلق فرمان خداوندی سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہؐ کی ذاتی رائے سے۔ ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں کہ اس مسئلہ کا تعلق چونکہ نفس مذہب سے نہ تھا بلکہ سیاسیات سے تھا اسی لیے کوئی وحی متلو (قرآن مجید کے اندر) اس باب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو حسب ذیل باتیں معارض نظر آتی ہیں۔

۱۔ اگر خلافت جناب امیرؑ کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے کلام مجید میں ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ نہیں ہے۔

۲۔ اگر واقعی فرمان خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلام مجید میں ہوتا

رسول اللہؐ خود اپنے سلسلے ہی حضرت علیؑ کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کر کے رخصت ہوتے، حالانکہ یہ بھی تاریخ سے ثابت نہیں۔

۳۔ اگر کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ ضرور اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکام مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لیے باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی ضرورت کو پیش کرتے۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ خاموش ہو رہے ہم غمخواری دیر کے لیے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ نے خود حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔ اگر حضرت علیؑ حضرت ابوبکرؓ کو قاصد خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلافت منشا رخداوندی ہوتی تو کم از کم آپ یہ ضرور کہتے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور مراحم مولات ترک کر دیتے۔ اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا، ممکن ہے کہ آپ نے مصلحتاً اس کو اس خیال کی بنا پر گوارا کر لیا ہو کہ حضرت ابوبکرؓ ضعیف ہیں اور جب چند دن بعد ان کا انتقال ہو جائے گا تو پھر خلافت ان کو ملے ہی گی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کے بعد بھی ان کو اس کا موقعہ نہیں دیا جاتا اور وہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں بھی اسی رواداری و حوالات سے کام لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کا زمانہ آتا ہے اور حضرت علیؑ بدستور نہ صرف خاموش رہتے ہیں بلکہ ان کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت کا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسولؐ۔ لیکن حیرت ہے کہ جناب امیرؓ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں

بسر کر دیا اور انھوں نے نہ کبھی کوئی مسئلے احتجاج بلند کی اور نہ منشا خدا و رسول کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

حضرت علیؑ اپنے اخلاق کی مضبوطی، اپنی غیر معمولی شجاعت و بہادری، اپنی اسلامی محبت، اپنی جذبہ قد و دیت و قربانی کے لحاظ سے اتنے غیر معمولی انسان تھے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے متعلق یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ محض کسی دنیاوی مصلحت کی بنا پر دینی احکام کی پابندی میں انھوں نے کبھی تسامح سے کام لیا ہو۔ اس لیے حضرت علیؑ کا خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں حد درجہ اس پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اس کے اور کسی سبب کی بنا پر نہیں ہو سکتا کہ آپؑ خلافت کو خواص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لیے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔

اس سے قبل ہم خود شیعی روایات کی بنا پر یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف انگلیوں پر گنتے جانے والے چند نفوس حضرت علیؑ کے طرفداروں میں پائے جاتے تھے۔ اور چونکہ آپؐ خود بھی اس کو جانتے تھے کہ لوگ ان کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اس لیے سیاسی مصالحوں کے لحاظ سے آپؐ نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی اور رائے عامہ کے خلاف کبھی کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جو فتنہ و فساد کا باعث ہوتا۔ حضرات شیعہ جناب امیر کے اس سکوت کو جس چیز سے چاہیں تعبیر کریں لیکن میں اس کا سبب صرف یہ قرار دیتا ہوں کہ آپؐ صحیح معنی میں تعیبات اسلام کے مقصد سے واقف تھے اور روح دستوریت یا رائے عامہ کے منافی کوئی کام کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا۔ غیر خلیفہ اول کے متعلق تو یہ کہن جا سکتا ہے کہ وقت نازک تھا اور اگر رائے عامہ

حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس تعویق سے خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان کی خلافت کے وقت یہ سبب بھی پیدا نہیں تھا اور یقیناً انکی خلافت نامزدگی کی صورت سے ہوئی جو تعلیمات اسلامی کے منافی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک عربوں میں اتنی صلاحیت پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ انتخاب حکمران کے مسئلہ میں صحیح معنی میں دستوری حکومت کے نقطہ نظر کو سمجھ سکتے۔ علاوہ اس کے جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کیے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا لیکن اگر حضور ہی دیر کے لیے تسلیم کر لیا جائے کہ نتیجہ کچھ اور پیدا ہوتا تو اب اس سے بحث فضول ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق مذہب سے تھا ہی نہیں اور جو کچھ مزادہ سب سیاسی مصالح یا سیاسی اختلافات سے متعلق تھا۔ جب غیر مذہبی معاملات میں لغزش و غلطی کا امکان رسول اللہ سے بھی تھا تو خلفاء کا کیا ذکر ہے؟

اس سلسلہ میں ایک امر اور ثنابل غور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ حضرت علیؓ کے طرفدار راستے کم کیوں تھے؟ اور ان کی خلافت کی راہ میں کون سے اسباب حائل تھے؟ رسول اللہؐ کو جو تعلق جناب امیرؓ کی ذات سے تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اور جو خدمات آپؐ نے انجام دیں وہ بھی سب پر عیاں ہیں۔ رسول اللہؐ کو آپؐ سے عشق تھا اور آپؐ بھی رسول اللہؐ کے ایسے فدائی تھے کہ کوئی دوسرا اس باب میں تمہری کا دعویٰ نہیں کر سکتا چہرہ فطرت انسانی ہے کہ جب ایک محبوب کے متعدد چاہنے والے ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنا ہی دغور حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر اسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے تو دوسروں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسالتاً جب خصوصیت کا اظہار جناب امیرؓ سے کیا کرتے تھے۔ اسے غلطاً تمام صحابہ کے لیے باعث رشک ہونا چاہیے تھا۔ اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جناب امیرؓ کی رسول اللہؐ کے دل میں تھی بالکل وہی دوسروں کی نگاہ میں تھی۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ کی طرف سے ایک عام جذبہ ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاید ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ جو کچھ ہوا سب اسلامی نقطہ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اہل عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کاٹنا ان کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا۔ آپ رسول اللہؐ کے بھائی تھے، داماد تھے، لیکن عربوں کی نگاہ میں بیٹی داماد کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ رسول اللہؐ کے بعد اس کا کوئی اثر پڑ سکتا۔ بہ نسبت ایام جاہلیت کے عہد اسلام میں عورت کی معاشری سطح کافی بلند ہو گئی تھی۔ لیکن نہ اتنی کہ ایک بیوی کے ہونے ہونے بغیر کسی خدِ صحیح کے دوسری شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا یا یہ کہ طلاق دینے میں کچھ پس و پیش کیا جاتا۔ شادی کرنا اور بیوی کو چھوڑ دینا ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ اور وہ تعلقات جو نکاح کے سلسلے میں قائم ہوا کرتے تھے صرف ذمّی اہمیت رکھتے تھے اور ان کا کوئی پائدار اثر نہ ہوا کرتا تھا۔ اس لیے حضرت علیؑ کا داماد ہونا اہل عرب کے نزدیک کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا کوئی وزن ہوتا۔ وہ گیا رسول اللہؐ کا اپنی زندگی میں بار بار جناب امیرؓ کی خدمات کو غیر معمولی طور پر سراہنا اور ان کو مولیٰ، وصی یا دلی کے الفاظ سے یاد کرنا، سو اس کو کوئی مذہبی اہمیت تو دی نہیں گئی اور نہ دینا چاہیے تھی۔ اس سے الٹا نقصان اور یہ ہوا کہ لوگ آپ سے زیادہ چلنے لگے اور رسول اللہؐ کے وصال کے بعد آپ کے مخالفین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ حضراتِ شیعہ کے قول کے مطابق سولہ دو چار آدمیوں کے اور کوئی طرفدار آپ کا نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ حد درجہ دردناک واقعہ ہے کہ رسول اللہؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی آپس میں اختلافات شروع ہو گئے۔ لیکن ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ جس وقت تک رسول اللہؐ زندہ رہے اس وقت تک تو خیر کسی کو پون دوچار کا موقعہ ہی نہ تھا۔ مذہب و سیاست دونوں کی باگ آپ کے ہاتھ میں تھی لیکن آپ کے بعد ان دونوں میں

تفریق ہو جانا اور مختلف سیاسی اداروں کا قیام بالکل قدرتی امر تھا کیونکہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو باہمی اختلافات کی صورت میں کسی خدائی فیصلہ کا اعلان کر کے سب کو خاموش کر سکتا۔

اس لیے رسول اللہ کے بعد مسئلہ خلافت میں تین جماعتیں تین مختلف رائیں رکھنے والی پیدا ہو گئیں۔ ایک شیعہ جماعت جو اس بات کی قائل ہے کہ خلافت سے اولین حقدار جناب امیرؓ تھے اور اہلبیت ہی میں اس سلسلہ کو قائم رہنا چاہیے۔ یعنی سوائے آل رسول کے کوئی اور مستحق امامت و خلافت نہیں ہے۔ دوسری جماعت خارجیوں کی جو اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور ان کے نزدیک ایک عجمی غلام بھی خلیفہ ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا اہل ہے۔ تیسری جماعت سنیوں کی ہے جنہوں نے بن بن راستہ اختیار کیا۔ لیکن حقیقتاً وہ کچھ نہ تھا۔ یوں تو وہ اس امر کے قائل ہیں کہ خلافت خاندان قریش کے لیے مخصوص ہے لیکن عملاً انہوں نے ترک نماز و اول کو بھی خلیفہ تسلیم کیا جن میں قریش کیا عرب کے کسی خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

حضرات شیعہ اس باب میں جن احادیث سے استناد کرتے ہیں ان سے اہلبیت کے مرتبہ کی بندی ضرور نظر ہوتی ہے لیکن میں یہ کہیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ اسلام جس نے جمہوریت کی بنیاد دنیا میں قائم کی وہ اس قدر تنگ نظر ہو سکتا ہے کہ سیادت و قیادت ابدالابد تک صرف رسول کے خاندان کے لیے مخصوص کر دے۔ مذہب اسلام کی خصوصیت اس کا جذبہ مساوات ہے۔ یعنی وہ رنگ و نسل کا امتیاز مٹا کر تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے اور وہ سطح صرف بلندی اخلاق کی ہے۔ اس لیے امامت و خلافت کو آل رسول کے لیے مخصوص کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ رسول اللہ نے بھلائے جذبہ جمہوریت کے شخصی و استبدادی حکومت کی حمایت کی جو قطعاً روح اسلام کے منافی ہے سنیوں کا طرز عمل اس باب میں قطعاً غیر فیصلہ کن ہے۔ وہ ایک طرف شیعوں کے بھی مہنوا ہیں اور دوسری طرف خارجیوں کے بھی۔

یہاں غالباً اس بحث کا نہ موقع ہے نہ ضرورت کہ ان تینوں میں کس جماعت کی رائے جمہوریتِ اسلام کے مفہوم کے لحاظ سے زیادہ قابل قبول ہے۔ لیکن ان تینوں جماعتوں کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کس کو کب مذہبی حیثیت دی گئی اور اتحادِ اسلامی کو سب سے زیادہ نقصان کس جماعت سے پہنچا۔

جس حد تک مذہب و اتحادِ اسلامی کا تعلق ہے اہل سنت قطع نظر اس سے کہ وہ تعینِ خلافت کے مسئلہ میں حق پر ہیں یا نہیں بڑی حد تک محفوظ ہیں، کیونکہ غزنف کے مسئلہ کو سب سے پہلے اجتماعی و مذہبی حیثیت سے دیکھنے والی وہی جماعت ہے۔ رسول اللہؐ کا انتقال ہوتا ہے۔ ایک جماعت حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہے جس کے اتباع میں سب لوگ (سوائے چند افراد کے) ایک مرکز پر جمع ہو جلتے ہیں اور اس طرح اس سیاسی فیصلہ کو مذہبی حیثیت دے کر اتحادِ اجتماع کی ایک معقول صورت دے دیتے ہیں۔ ممکن ہے حضرت علیؓ نے اس کو پند نہ کیا ہو لیکن انہوں نے بھی اس اجتماعی فیصلہ کا کافی احترام کیا اور اپنے حق خلافت کو نظر انداز کر دیا۔ اس وقت ایک مختصر سی جماعت چند افراد کی ضرورت ایسی تھی جو اس فیصلہ سے خوش نہ تھی لیکن اس کو کوئی جدا گانہ مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بلکہ اسے ایک مختصر سیاسی ادارہ کہنا چاہیے۔ جس کو ممکن ہے حضرت علیؓ کی دلی حمایت حاصل رہی ہو لیکن علیؓ کی حیثیت سے آپؐ نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔

ہو سکتا ہے کہ اس جماعت نے یہ خیال کیا ہو کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد تو سوائے حضرت علیؓ کے کوئی دوسرا خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے چپ نہ دن اور انتظار کر لیا۔ لیکن اتفاق کیسے یا فریق ثانی کا حسن تدبیر کہ حضرت علیؓ کو پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی ظاہر ہے کہ اس دوبارہ ناکامی سے طرفدارانِ علیؓ کو زیادہ صدمہ پہنچا چاہیے تھا اور پہنچا لیکن حضرت علیؓ نے پھر بھی اتحادِ اسلامی کے مقصد کو سامنے رکھ کر اس جماعت کو ابھرنے کا موقع نہ

دیاتیسری بار حضرت عثمان کی نامزدگی خلافت کے وقت پھر اسی ناکامی سے سامنا ہوا اور حضرت علیؓ نے پھر اسی صبر و سکون سے کام لیا۔ الغرض تمیز و تعلق کے دور میں طرفدارانِ علیؓ کی جماعت کو صرف ایک سیاسی فریق کی حیثیت حاصل تھی اور اس نے کوئی مذہب کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ جب حضرت علیؓ کا دور خلافت آیا اور آپ کے ماتھے پر جمہور نے بیعت کی تو پھر طرفدارانِ غیر طرفدارانِ علیؓ کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا کہ اس کی بناء پر کوئی مذہبی تفریق قائم ہو سکتی۔ لیکن جس زمانہ میں آپ نے منصبِ خلافت قبول کیا وہ ایسا نازک و پر آشوب زمانہ تھا کہ مذہبی تفریق سے زیادہ خطرناک سیاسی تفریق پیدا ہو گئی تھی۔ اور حضرت عثمان کی وجہ سے جو غیر معمولی اقتدار نبو امیہ کو حاصل ہو گیا تھا اس نے بجائے مذہبِ اسلام کے حکومتِ اسلام کی بنیاد ڈال کر اتحادِ اسلامی کے شیرازہ کو منتشر کر دیا تھا۔ لیکن جہاں تک امکان میں تھا جناب امیرؓ نے اسلام کی مذہبی روح کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور شاید وہ پوری طرح اس میں کامیاب ہو جاتے اگر جنگِ ستھیں میں فریقِ ثانی کی سیاسی چال کامیاب نہ ہو جاتی۔

امیر معاویہ بظاہر بیعت سے انکار نہ کرتے تھے لیکن حقیقتاً وہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ہمانہ یہ ڈھونڈھا کہ پہلے قاتلانِ عثمان ان کے حوالہ کر دیے جائیں اس کے بعد وہ بیعت کریں گے۔ حضرت علیؓ اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتے تھے کیونکہ قاتلانِ عثمان کی تعیین اور ان کے خلاف شرعی ثبوت کی فراہمی ممکن نہ تھی۔ آخر کار اسی بات پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں جنگ ہوئی جو جنگِ صفین کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کا سلسلہ کئی مہینہ تک قائم رہا اور اس میں شک نہیں کہ حضرت علیؓ کی کامیابی کے امکانات بہت قوی تھے۔ لیکن عمرو بن العاص کے مشورہ سے امیر معاویہ نے نیزول پر کلامِ مجید بلند کر کے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی۔ اور جن لوگوں پر فیصلہ کا انحصار رکھا گیا تھا انہوں نے کھلم کھلا امیر معاویہ کا ساتھ دیکر دفعۃً

تاریخ اسلام کے رُخ کو پلٹ دیا۔ اس کا ایک خراب نتیجہ تو یہ ہوا کہ حضرت علیؑ کی فوج میں سے ایک جماعت اس گفتگو سے مصالحت سے برہم ہو کر علیؑ پر ہو گئی (جسے خوارج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اور اس نے اپنی بغاوتوں سے اتحاد اسلامی کو جس قدر نقصان پہنچایا وہ اہل تاریخ سے مخفی نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت علیؑ کی شہادت بھی اسی جماعت کے ایک فرد کے ہاتھ سے ہوئی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ امارت و حکومت خاندانِ بنی امیہ میں منتقل ہو گئی اور اسلام میں ملکیت کی بنیاد پر گئی جو قطعاً تعلیمات اسلام کے منافی تھی لیکن! اہم طرفدارانِ علیؑ نے ابھی تک کوئی علیؑ پر مذہبی حیثیت قائم نہیں کی اور یہ تمام اختلافات بدستور یہی حیثیت اختیار کیے رہے۔ اس کے بعد جب امام حسنؑ کا انتقال ہوا جس کو شہادت کہا جاتا ہے تو علویین کے جذبات اور زیادہ مشتعل ہوئے اور آخر کار جب امام حسینؑ کا مشہور واقعہ قتل کر ہوا میں پیش آیا تو صورت ناقابلِ برداشت ہو گئی، اور اس وقت کی تمام ناکامیوں کا احساس اتنا شدید ہو گیا کہ طرفدارانِ علیؑ کی سیاسی تحریک نے مذہبی صورت اختیار کر لی اور وہ مطالبات جو پہلے صرف سیاسی حیثیت رکھتے تھے انھوں نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا، اور سکہ امامت اس حد تک جزو ایمان قرار پایا کہ بے شک کوئی اسے تسلیم نہ کرے نجاتِ آخری ناممکن ہے۔ اس سے ایک نقصان تو ان کو یہ پہنچا کہ سیاسی مرکزیت ختم ہو گئی اور دوسرا یہ کہ مذہبی حیثیت سے امام و امامت کی تعبیریں اتنی مختلف کی گئیں کہ مذہبی یکجہتی بھی قائم نہ رہ سکی اور شیعہ جماعت اپنے عقائد کے لحاظ سے پارہ پارہ ہو گئی۔

ان کا ایک گردہ جو تیزی کماتا ہے وہ امام کو اس دنیا کا ایک انسان سمجھ کر اس کی رہنمائی کا قائل ہونا۔

دوسرا گردہ انہی دینی زبان سے حلول کو بھی تسلیم کرنے لگا اور تفسیرِ آگودہ بخلافہ کے نام سے موسوم ہے، کھلم کھلا امام کو خدا کا ایک جزو بلکہ عین خدا کہنے لگا۔ پھر اس کے

بعد جو اختلافات ان میں پیدا ہوئے ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بطرستان دوم میں جو ریاستیں زیدیوں کی قائم ہوئیں وہ یمن کی زیدی ریاست سے بوجہ بُعد متحد الخیال نہ ہو سکیں اور عراق کے زیدی چونکہ دارالحکومت سے قریب تر تھے اس لیے انھوں نے تقیہ یا کتمان کو بھی اپنے عقائد میں شامل کر لیا۔

غلاہ میں بہ لحاظ عقائد جو تخریق پیدا ہوئی وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرامطہ، اسماعیلی نقیری، علی الملکی سب اس اجماع کے مختلف گروہوں کے نام ہیں اور پھر ان میں سے بعض جماعتیں ایسی رونما ہوئیں جنہوں نے امامت کے لیے اہل بیت ہونا بھی ضروری قرار نہیں دیا۔ مثلاً کیسانی جو محمد بن الحنفیہ کی امامت کے قائل ہیں یا حروفی جو فضل اللہ استرکبادی کو امام مانتے ہیں۔ شیعہ اہل علی میں سب سے زیادہ اہم جماعت وہ ہے جو امامیہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن اس میں بھی وہی اختلاف خیال نظر آتا ہے۔

ابتداءً محمد اسلام یا خلفاء اربعہ کے وقت میں منصب امامت کے لیے جو قاعدہ مقرر تھا (خواہ اس کی پابندی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو) یہ تھا کہ اس کا انتخاب جمہور کی راستے سے کیا جائے (بعد کو خوارج نے بھی یہی اصول اختیار کیا) ملتے دھندگان کے لیے تین شرطیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ثقہ ہو، دوسرے یہ کہ شریعت سے آگاہ ہو، اور تیسرے یہ کہ اس کی قوت فیصلہ و انتخاب صحیح ہو۔

امیدوار امامت کے لیے حسب ذیل صفات ضروری خیال کی گئیں :-

۱، ثقہ ہو (۲) شریعت کا اجتہادی علم رکھتا ہو۔ (۳) فصیح و بلیغ ہو (۴) سادہ و بینائی اور اعصاب جسمانی میں کوئی نقص نہ ہو (۵) معاملات کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو (۶) جہاد کی ہمت و جرأت اس میں پائی جائے (۷) قریش میں سے ہو۔ صحرات شیعہ کے یہاں سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ وہ اہل بیت یعنی حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کی اولاد میں سے ہو۔

حضرت علیؑ کی امامت کو وہ "نص قطعی" کے ماتحت قرار دیتے ہیں۔ اور آپ کے بعد امام حسنؑ کی امامت کے قایل ہیں کیونکہ حضرت علیؑ کے بڑے بیٹے وہی تھے اور ان کے خیال کے مطابق جناب امیرؑ کے نامزد کیے ہوئے بھی تھے اگر جناب فاطمہؑ کے صرف ایک ہی بیٹا ہوتا تو راستہ صاف تھا لیکن چونکہ آپ کے دو صاحبزادے تھے اس لیے امام حسنؑ کے بعد اختلاف پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ کیونکہ اہل بیت ہونے کی حیثیت سے جس طرح امام حسینؑ کی اولاد مدعی امامت ہو سکتی تھی بالکل اسی طرح امام حسنؑ کی اولاد بھی لیکن ایک بڑی جماعت نے امام حسنؑ کے بعد ان کی اولاد کو اس منصب کا مستحق نہیں جانا اور امام حسینؑ کے خاندان میں اس کو مستقل کر دیا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ امام حسنؑ نے بھتی امیر معاویہؓ دعویٰ خلافت سے دستبردار ہو کر شیعانِ علی یا مخالفین بنی امیہ کی بڑی جماعت کو مجرم کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ امام حسینؑ رسول اللہؐ سے قریب تر رشتہ رکھنے کی وجہ سے زیادہ اہل امامت کے تھے اور تیسرے یہ کہ (بروایت اہل شیعہ) امام حسنؑ ان کو نامزد بھی کر گئے تھے۔ علاوہ اس کے امام حسینؑ کی زندگی میں واقعہ کربلا ایک ایسا اہم واقعہ رونما ہوا کہ اگر امام حسنؑ کی اولاد میں کوئی دعویدار خلافت و امامت ہوتا بھی تو امام حسینؑ کی اولاد کے مقابلہ میں انہیں کون پوچھتا۔ علی الخصوص ایسی حالت میں کہ ان کے بیٹے امام زین العابدینؑ یزدگرد (شاہ ایران) کی بیٹی کے بطن سے تھے اور امام حسنؑ کی کوئی بیوی اس مرتبہ کی نہ تھی۔

الغرض امامیہ جماعت کی ہتم بالشان شاخ وہی ہے جو سلسلہ امام حسینؑ کی اولاد میں سلسلہ امامت کی قائل ہے۔ اور اثنا عشری کہلاتی ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد ان کے بارہ اماموں کے نام سلسلہ وار یہ ہیں:-

۱۔ حضرت علی مرتضیٰؑ (۲) امام حسن المجتبیٰؑ (۳) امام حسینؑ الشہید (۴) امام

نہیں العابدین السجّاد (۵)، امام محمد باقر (۶)، امام جعفر صادق (۷)، امام موسیٰ کاظم (۸)، امام علی الرضا (۹)، امام محمد تقی (۱۰)، امام علی نقی (۱۱)، امام حسن العسکری (۱۲)، امام محمد المہدیؑ۔

لیکن اہل بیت میں سلسلہ امامت کی قائل جماعت بھی کسی ایک خیال پر قائم نہ رہ سکی اور متعدد مختلف خیال گروہ اس میں قائم ہو گئے۔ بعض اختلافات ذیل میں درج ہیں :-

۱۔ امام حسن العسکریؑ کا انتقال نہیں ہوا، بلکہ آپ غائب ہو گئے ہیں اور پھر ظاہر ہوں گے۔

۲۔ امام حسنؑ بغیر اولاد چھوڑے ہوئے وفات پا گئے۔ لیکن آپ پھر زندہ ہو کر ظہور کریں گے۔

۳۔ امام حسنؑ نے اپنے بعد اپنے بھائی جعفرؑ کو خلافت کے لیے نامزد کیا تھا۔ جعفرؑ نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

۵۔ حضرت علیؑ کے بعد ان کے بیٹے محمد الحنفیہ امام تھے۔

۶۔ امام حسنؑ کے ایک لڑکا آپ کی وفات سے دو سال قبل ہوا تھا جس کا نام محمد تھا۔

۷۔ امام حسنؑ کے ایک لڑکا ضرور تھا، لیکن وہ آپ کی وفات کے ۷۰ ماہ بعد پیدا ہوا۔

۸۔ امام حسنؑ چونکہ لاولد تھے اس لیے دنیا امام سے خالی ہو گئی۔

۹۔ امام حسنؑ کے ایک بیٹا تھا، لیکن اس کا حال معلوم نہیں۔

۱۰۔ امام کا پایا جانا ضروری ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ اولاد امام حسنؑ میں سے ہے یا نہیں؟

- ۱۱۔ سلسلہ امامت امام علی الرضاؑ پر ختم ہو گیا اور آخری امام کا ہنوز انتظار ہے۔
- ۱۲۔ سلسلہ امامت امام موسیٰ کاظمؑ پر ختم ہو گیا۔
- ۱۳۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد امامت آپ کے بڑے بیٹے احمد کی طرف منتقل ہوئی نہ کہ امام علی الرضاؑ کی طرف۔
- ۱۴۔ امام علی الرضاؑ کے بعد ان کے بیٹے محمد بہت چھوٹے تھے۔ اس لیے امامت کی تعلیم وہ اپنے باپ سے حاصل نہیں کر سکے۔
- ۱۵۔ امام محمد تقیؑ کے بعد بجائے علی النقیؑ کے موسیٰ اسحاقؑ خلافت تھے۔
- ۱۶۔ امام علی النقیؑ کے بعد بجائے حسن العسکریؑ کے دوسرے بیٹے جعفر کو امام ہونا چاہیے۔
- ۱۷۔ امام حسن العسکریؑ نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اس لیے امامت کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔
- ۱۸۔ امام حسن العسکریؑ کا ایک لڑکا جعفر نامی کسی کنیز سے تھا اس لیے آپ کے بعد اسے امام ہونا چاہیے۔
- یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اختلافات تھے۔ جن کی بنا پر کوئی جماعت متبعیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور کوئی قطعہ کے نام سے، کوئی واقفہ کہلائی اور کوئی حماریہ، کسی نے جعفریہ کا لقب اختیار کیا اور کسی نے اسماعیلیہ الغرض جب تک شیعہ جماعت صرف ایک سیاسی ادارہ کی حیثیت اختیار کیے رہی اس میں ایک نوع کا اتحاد بھی پایا جاتا تھا، لیکن جب حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد اس کو مذہبی رنگ پیش کیا گیا تو وہ یک جہتی بھی مفقود ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کبھی کوئی خالص شیعہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ مغرب میں فاطمی حکومت کو بھی ہم شیعہ حکومت اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ملک کے تمام افراد سنی تھے۔

بحث کے اس حصہ سے میرا مقصود یہ دکھانا تھا کہ شیعہ تحریک ابتدا میں نہ کوئی مذہبی تحریک تھی اور نہ اصولاً اسے مذہب اسلام سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے لیکن بعد کو اسے مذہب کے رنگ میں پیش کر کے محض سیاسی اغراض کی بنا پر اسلام کے دو ٹکڑے کر دیے گئے۔

اسلام نام ہے صرف اعتراف وحدانیت و اقرار نبوت کا اس میں نہ خلافت امامت شامل ہے نہ کوئی اور چیز اگر اہل سنت خلفاء کی موجودہ ترتیب کو درست و صحیح مانتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ حضرت علیؑ کے غیر معمولی فضائل اور ان کی وصایت سے منکر ہوں اور اگر حضرات اہل شیعہ خلافت کا اولین سختی حضرت علیؑ کو قرار دیتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دیگر صحابہ کو کافر و منافق قرار دیں۔

اگر سنی اسلام کی ضروری شرط یہ قرار دیتے ہیں کہ اعتراف توحید و رسالت کے ساتھ ہی ساتھ ترتیب خلافت کا بھی اقرار ضروری ہو تو میرے نزدیک وہ بھی اسلام سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اور اگر شیعہ وصایت جناب امیر اور معصومیت امام کی تصدیق جزو مذہب سمجھتے ہیں تو وہ بھی ناسلم ہیں۔



اس تمام گفتگو کے بعد حسب ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:-

۱۔ جس حد تک روایات کا تعلق ہے اخلاق و فضائل کے لحاظ سے حضرت علیؑ کا مرتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔ اور رسول اللہؐ کی روحانی خلافت کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی اور نہ تھا۔ لیکن چونکہ رسول اللہؐ کے بعد بلا فصل خود مختار اور طور پر سیاسی خدمات انجام دینے کا موقع انھیں نہیں ملا۔ اس لیے اس امر کا فیصلہ کہ رسول اللہؐ کے بعد سیاسی جانشین ہونے کی حیثیت سے بھی آپ مرجع کا حق رکھتے تھے اب ممکن نہیں۔

۲۔ رسول اللہؐ یقیناً اپنے بعد حضرت علیؑ کی خلافت کے متمنی تھے۔ اور آپؐ نے

اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا۔ لیکن آپ کی اس خواہش کا تعلق وحی یا فرمانِ خداوندی سے نہ تھا، بلکہ صرف آپ کی ذاتی رائے سے تھا اور اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر حضرت علیؓ کی خلافت کا امکان ہو یا اُن کی خلافت کا مسئلہ بحث میں آئے، تو آپ کی رائے ان کے حق میں شمار کی جائے۔

۳۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حالات حضرت علیؓ کی خلافت کے مساعد نہ تھے اور اگر آپ خلافت کے دعویدار ہوتے تو کامیاب نہ ہوتے۔ اس حقیقت سے رسول اللہؐ بھی واقف تھے اور اسی لیے آپ نے باضابطہ طور پر حکم کھلا کہ اپنی وفات کے وقت حضرت علیؓ کے ہاتھ پر لوگوں کی بیعت نہیں کی۔ اور خود حضرت علیؓ بھی جہلنہ تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے بھی نہایت خاموشی سے جمہور کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا اور کوئی مخالفت نہ اقام نہیں کیا۔

۴۔ اسلام کا مدعا چونکہ ملوکیت و تقدیم شخصی کو مٹا کر جمہوریت کی روح پیدا کرنا تھا۔ اس لیے رسول اللہؐ یوں بھی اپنے بعد کسی کو قطعی طور پر خلیفہ نامزد نہیں کر سکتے تھے چہرچاہے اپنے خاندان میں ہمیشہ کے لیے خلافت و امامت کو منحصر کر دینا کہ یہ کھلی ہوئی ملوکیت کی طرفداری تھی۔ اگر رسول اللہؐ ایسا کرتے تو ان میں اور دنیاوی فرمانرواؤں میں کوئی فرق نہ رہتا اور دنیا بھی کہتی کہ نبوت و رسالت کا یہ سارا ڈھونگ اسی لیے تھا کہ اپنے خاندان کے لیے سلطنت کی بنیاد قائم کر جائیں۔

۵۔ چونکہ رسول اللہؐ عالم الغیب نہ تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا اس لیے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیتؑ میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا۔ اور وہ حق امامت و خلافت ہوگا یا نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ آلِ رسولؐ کا اصح و مکمل انسان ہونا حتمی ثابتہ میں سے متصف ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

۶۔ چونکہ رسول اللہؐ سے (بوجود معصوم ہونے کے) امور غیر الہامی میں اجتہاد ہی غلطی

کا امکان تھا۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کا انتخاب حالات مابعد کے لحاظ سے مناسب نہ رہا ہو یا اگر مناسب بھی رہا ہو تو خلفاء نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اور یہ غلطی ایسی نہیں جس کا تعلق مذہب سے ہو۔

۷۔ حضرت علیؓ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ آپؐ کی امامت "نص قطعی" سے ثابت ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کلام مجید اس باب میں بالکل ساکت ہے اور "نص قطعی" نام ہے صرف قرآن پاک کا۔ احادیث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۸۔ شیعہ جماعت اول اول صرف ایک سیاسی جماعت تھی جس کا مدعا خلافت کو اپنے ذاتی مصلح یا خواہش نبوی کی بنا پر اہل بیتؑ میں منتقل کرنا تھا اور امام حسینؑ کی شہادت تک اس کی حیثیت صرف ایک ادارہ سیاسی کی سی رہی، لیکن واقعہ شہادت کے بعد اس جماعت نے اپنے سیاسیات کو مذہبی رنگ دینے کے لیے بعض مخصوص عقائد متعین کر لیے جن کو تعلیمات مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔

۹۔ جمعیت اسلامیہ میں سب سے پہلے انتشار مذہب شیعہ نے پیدا کیا۔ اور پھر اس میں بھی باہم گراتنے اختلافات پیدا ہو گئے کہ وہ اپنا کوئی متحدہ سیاسی محاذ بھی نہ قائم رکھ سکا۔

۱۰۔ اہل تسنن کو تسلیم کرنا چاہیے کہ رسول اللہؐ بے شک حضرت علیؓ کی خلافت کے مستحق تھے اور اہل تشیع کو ماننا چاہیے کہ رسول اللہؐ کی یہ خواہش بعض ناگزیر حالات و اسباب کے ماتحت پوری نہ ہو سکی۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ

۱۱۔ امامت و خلافت کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے حقیقتاً شیعہ سنی کی تفریق بالکل بے معنی ہے۔ اور ان دونوں کا اختلاف

صرف تاریخ و سیاست کا اختلاف ہے جو ایک علمی اختلاف تحقیق سے
آگے نہیں بڑھتا۔

نیاز فحشوری



jabir.abbas@yahoo.com

خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

نیاز فحیموری
مدیر نگار

jabir.abbas@yahoo.com

خلافت و امامت

اس مسئلہ پر پچھلے مہینے کے شمار میں جو محاکمہ میراث الخ ہوا ہے اسے خلافت توقع سنی و شیعہ دونوں جماعتوں کے آزاد خیال افراد نے بہت پسند کیا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ متشکک حضرات مطمئن نہ ہوں گے اور یہ شاید کہیں ہو سکتے ہیں۔

میں نے جن نتائج کو اپنے مضمون میں پیش کیا ہے ان میں سے بعض جو حضرات شیعہ کے لیے قابل قبول ہیں اہل تسنن کے نزدیک غلط ہیں اور جو سننوں کے موافق ہیں وہ شیعہوں کے نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہو سکتے اس لیے ضرورت ہے کہ اسی سلسلہ میں ان تمام مسائل کو بھی بے نیاز جاتے جو میرے مضمون کو پڑھنے کے بعد معرض بحث میں آ سکتے ہیں مثلاً:-

- ۱۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے۔ گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان یا اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟
- ۲۔ انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟
- ۳۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے؟ اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے؟
- ۴۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے؟ اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟

- ۵۔ وصایت جناب امیر ثابت کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں؟
- ۶۔ امامت کا بارہویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟
- ۷۔ جو سلسلہ امامت دوسرے شیعہ فرقوں کے نزدیک صحیح ہے اس کو غلط قرار دینے کے لیے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس رکھتی ہے؟
- ۸۔ امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ۔

۹۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑایا نہیں۔ اگر پڑا تو کیا؟

۱۰۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟

۱۱۔ اسلام نے بیت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے

نبات و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟

چنانچہ میں ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ نہایت سنجیدگی سے ان تمام مسائل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور بہانہ تک ممکن ہو ان روایات سے استدلال نہ کریں جن کا تعلق صرف خوش عقیدگی سے ہے اور درایتاً قابل قبول نہیں ہیں۔ میں اس بحث کے لیے زیادہ سے زیادہ اپریل سے دسمبر تک نو مہینے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے حق حاصل ہوگا کہ تمام شائع شدہ مضامین کے مباحثہ دلائل کو سامنے رکھ کر خود اپنی رائے پیش کروں اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ جنوری کا پرچہ صرف اسی موضوع کے لیے وقف ہو۔ (اگر ناظرین تجاویز اس کو پسند کیا) میں اس دوران میں ایک استفتاء بھی ہر دو مذاہب کے علماء سے کروں گا۔ اور جو جوابات مجھے موصول ہوں گے ان سے میں اپنے محاکمہ کے وقت کام لوں گا۔



خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

ہی نام

jabir.abbas@yahoo.com

خلافت و امامت

اور

محترم مدیر نگار کا محاکمہ

مارچ ہی مارچ سال بھر اور اب جولائی تک چار مہینے اتنا عرصہ ہوا جب اس مسئلہ پر میرا سب سے پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔

جو اصحاب یہ خیال رکھتے ہوں کہ میں نے نگار میں مضمون اس توقع پر لکھا تھا کہ مدیر نگار میری رائے سے حرت و برکت و موافقت ہی کر لیں گے وہ بالکل غلطی پر ہیں۔

میں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے شیعہ دینی کمی جماعت سے کوئی جانبدارانہ تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی جماعت کو میری آزادانہ تحقیق شیعہ مذہب کے موافق نظر آئی ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کبھی صحیح نہیں تھا کہ میں شیعہ ہی ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں میں "سطحیت" بہت زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کی نگاہیں کسی مطلب کی گہرائی میں جانے سے انکار کرنے لگی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سنیوں میں میرے مضمون پر شور برپا ہوا اور اخباروں کی دنیا میں غلغلہ ہو گیا لیکن مدیر نگار کے محاکمہ پر اطمینانی سکون "چھا گیا۔ گویا وہ سمجھے کہ دگرگی بالکل ہمارے موافق ملی۔

اس کے برخلاف شیعہ جماعت اس وقت تک صبر و سکون کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرتی رہی، جب تک کہ مسئلہ زیر بحث تھا۔ لیکن ادھر مدیر نگار کا محاکمہ شائع ہوا اور شیعہ جماعت میں اضطراب پیدا ہو گیا، گویا تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کوئی مجھ غریب کو

کو منے دے رہا ہے کہ اس نے نگار میں اس بحث کو شائع ہی کیوں کیا؟ کوئی نگار کے محاکمہ کا سخت سے سخت اور منظرانہ جواب دینے کو آمادہ ہے۔

مگر مجھے اس سب پر سرت ہے کہ میں نے تحقیقاتی بحث کا ایک دروازہ کھول کر علمی دنیا میں پہل پہل پیدا کر دی اور موجودہ صورت حال پر منہسی آتی ہے کہ یہ نتیجہ الٹا کیونکر ہو گیا۔

میرے خیال میں مدیر نگار نے جہاں تک میرے زاویہ بحث کا تعلق ہے، فیصلہ بالکل میرے موافق کیا ہے اور اگر میرے مضمون سے شیعہ احباب متفق تھے تو انھیں فیصلہ کے اس جزو سے بالکل مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ اور جہاں سے مدیر نگار کا فیصلہ مخالفت نظر آتا ہے وہ ایسا جزو ہے کہ اس پرستیوں کو بھی اسی حد تک برا فروختہ ہونا چاہیے تھا جس حد تک شیعہوں کو۔

میرے مضمون کی حیثیت وہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جو کسی شیعہ عالم کے قلم سے نکلے ہوئے مضمون کی جس میں مسئلہ امامت پر خلاص اعتقادی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ اسی لیے میرے مضمون میں کلامی دلائل اور عقلی براہین کا بہتہ بھی نہیں ہے۔ میں نے تو صرف تاریخی حیثیت سے واقعات کی بنا پر یہ دکھلایا تھا کہ حضرت پیغمبر کا منشا یہی تھا کہ حضرت علیؑ ان کے خلیفہ اور جانشین ہوں۔

اس صورت میں میرے خلاف فیصلہ ہونے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ ان واقعات کو صحیح نہ تسلیم کیا جاتا جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان واقعات کا نتیجہ وہ تسلیم نہ کیا جاتا جو میں نے قرار دیا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مدیر نگار کا فیصلہ ان دونوں جزوؤں میں میرے بالکل موافق ہے انھوں نے میرے پیش کردہ تمام روایات تاریخی کو تسلیم کیا ہے صرف ایک روایت واقعہ قرطاس کے متعلق شبہ کیا ہے کہ اس کا تعلق اول تو وصایت جناب

امیٹر سے ہے بھی نہیں (کیونکہ اب یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کا غزو قلم نگوا کر کیا لکھونا چاہتے تھے) اور دوسرے یہ کہ یہ حدیث اہل تسنن کے نزدیک قابلِ لحاظ بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے خاص راویوں میں ایک یحییٰ بن سلیمان ہیں جو غیر ثقہ قرار دیے گئے ہیں دوسرے راوی قبیبہ ہیں جو بہت غلط گو سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے یونس بن زید ہیں جن کا حافظہ بھی ضعیف تھا اور جو غلط گو بھی تھے، چوتھے راوی علی بن عبد اللہ ہیں جن کا شمار ضعیف میں ہے۔ رد گئے ایک اور راوی حضرت ابن عباسؓ۔ سوال کا اس وقت دہاں موجود ہونا ثابت نہیں۔“

مجھے بہر حال مدبر نگار کی آزاد رائے کا احترام ہے۔ لیکن اتنا کمنا ضروری ہے کہ افضل نے جو کچھ اس روایت میں تشکیک ظاہر کیے ہیں وہ عام اہل سنت کی جانب سے پیش نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ ان کے قواعد کی بنا پر روایت کا صحیح بخاری کے اندر متعدد طریق سے ہونا ہی اس کی صحت و وثاقت کے لیے کافی ہے۔ جس کے بعد راویوں کی جانچ پڑتال کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر اگر ہر ایک سنید میں کوئی ایک راوی مجروح مان لیا جائے تو آخرین چار الگ الگ راویوں کے طریق سے روایت کا دار دہونا بھی تو ایک قابلِ لحاظ چیز ہے اور پھر جبکہ اس روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو غلط طور سے بیان کرنے کی کوئی مخصوص غرض ہو سکے جبکہ اس کے راویوں میں کوئی ضعیف ہو، غیر ثقہ ہو، غلط گو ہو مگر رافضی“ کوئی ایک بھی نہیں ہے۔ تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ صرف حضرت عمرؓ پر رسولؐ کی بارگاہ میں بے ادبی کا الزام لگانے کے لیے یہ روایت ایجاد کی گئی ہے۔ وہ گیا یہ امر کہ رسولؐ آخر لکھنا کیا چاہتے تھے؟ اس کو صراحت کے ساتھ تو میں بیشک نہیں دکھلا سکتا جبکہ وہ لکھا ہی نہیں گیا لیکن میں نے جن ترتیب کے ساتھ اس واقعہ کو اپنے مضمون میں درج کیا ہے اس سے حقیقت کا انکشاف ضرور ہوتا ہے۔ پھر جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ میغمبرؐ اپنی تقریر میں ”من کنت مولاه فعلی“

مولاؑ کہہ کر یہ فقرہ کہہ چکے تھے کہ :- ”انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عتوقی اہل بیعتی ما ان تمسکتہ بہما لن تضلوا بعدی“۔

اور اس کے بعد دو اہم قلم بانگتے وقت آپ فرماتے ہیں :- ”اكتب لکم کتابا لن تضلوا بعدی“ اس سے مزور پتہ چلتا ہے کہ تحریر بھی اسی کے متعلق ہو نیوالی تھی جس کے متعلق تقریر تھی۔ نیز حضرت عمر کا انکار کہ ”ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے اور کوئی ضرورت نہیں“ جبکہ مدیر ہجرا اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسولؐ کا منشا یہی تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ ہوں اور نیز یہ کہ دوسرے صحابہ کو یہ منظور نہیں تھا اور یہ بھی کہ دوسرے صحابہ حضرت علیؑ سے رشک کرتے تھے۔

بہر حال اس روایت سے قطع نظر کرتے ہوئے دوسری تمام روایات کو مدیر ہجرا نے تسلیم کیا ہے۔ اور آخر میں یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ :-

”جس حد تک روایات کا تعلق ہے میرے نزدیک حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہؐ کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت علیؑ آپ کے بعد جانشین قرار دیے جائیں“۔

بس میں تو سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے مضمون کا تعلق تھا بحث یہاں پر ختم ہو گئی حضرت رسولؐ کی دلی خواہش یہی تھی اور حضرت نے صحابہ کے لیے اس خواہش کو پورے طور پر ظاہر بھی کیا ایتسیناؑ اور اگر ظاہر نہیں کیا تو ہم کو اور محترم مدیر ہجرا کو اس کی خبر کیوں کر ہوئی؟

اب یہ کہ آپؐ کی خواہش صحیح تھی یا غلط اور یہ کہ آپؐ کی خواہش کا پورا ہونا ممکن تھا یا نہیں؟

یہ تنقیحیں میں جواب قائم کی گئی ہیں اور نیز یہ کہ اگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو کیا یہ کوئی مسئلہ ایسا اہم تھا جو تفریق مذاہب کا باعث ہو سکے؟

یہ چیزیں میری بحث سے خارج ہیں اور یقیناً اب یہ اعتقاد ہی چیزیں ہیں جن پر ایک غیر مسلم شخص کو بحث کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔
 میں جہاں تک سمجھتا ہوں مسلمانوں کا عقیدہ رسولؐ کی نسبت یہ رہا ہے کہ آپؐ کا کوئی حکم اور کوئی امر حکم خدا کے خلاف نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ آپؐ کی ہستی غلطی سے بالکل بلند ہے۔

اب اگر نادر نگار اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں تو یہ ویسے بہت سے مسائل میں داخل ہے۔ جو عام مسلمانوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن نادر نگار کو اپنی "حریت رائے" کی بنا پر ان سے اختلاف ہے جیسے بہشت و دوزخ، ملائکہ، معجزات انبیاء وغیرہ وغیرہ۔

غالباً شیعہ اصحاب کا بھی یہ خیال ہے کہ مسئلہ امامت اور نبوت کا چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی اگر نبوت میں وہی معیاری حیثیت مسلم رہی جس پر شیعوں کا عقیدہ ہے اور جو ایک حد تک دوسرے مسلمانوں میں بھی متفق ہے تو امامت کے مسئلہ کا شیعوں کے حسب دعوایہ طے ہونا ضروری ہے۔ بے شک اگر اصطلاحی نبوت ہی کے معنی میں تبدیلی ہو جائے اور عقیدہ رسالت ہی اس شان پر باقی نہ رہے تو امامت بھی ختم ہے۔ اور شاید شیعوں کی جانب سے امامت کو "اصول دین" میں داخل کرنے کا بھی یہی منشا ہے یعنی وہ اس کو نبوت کا ایک جزو لاینفک سمجھتے ہیں اور ایمان بالنبیؐ کے تحت میں اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔



یہ امر کہ مسئلہ امامت کا تعلق مذہب سے ہونا چاہیے یا نہیں؟ میرے طے کرنے کا نہیں ہے لیکن جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے جبکہ محترم مدیر کا حضرت پیغمبرؐ کی دو حیثیتیں تسلیم کرتے ہیں ایک معلم مذہب ہونے کی اور دوسرے

حاکم و منظم ہونے کی تو اس مسئلہ کا تعلق مذہب کے ساتھ اسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جانشینی کو صرف دوسرے جزو کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے جس کے بعد خلیفہ کی حیثیت سوائے بادشاہ کے کچھ نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر فرماں روا جس سے انتظام ملک ہو جائے وہ خلیفہ رسولؐ سمجھا جاتا چاہیے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حضرت ملک معظم تاجدارِ برطانیہ اس وقت سب سے بڑے خلیفہ المسلمین ہیں۔ اس واسطے کہ عالمِ اسلامی کا زیادہ حصہ ان کے زیرِ سلطنت و حمایت ہے اور امن و امان سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن اگر خلافت کا تعلق پہلے جُز سے بھی ہے۔ جیسا کہ اب تک مسلمانوں کا خیال رہا ہے۔ چنانچہ خلافت کی قرہیت ہی یہ کی گئی ہے کہ: ”النبیۃ عن النبی فی امور الدین والدنیا“ تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔

اگر اس میں یہ مذہبی پیشوائی کی حیثیت قائم نہ رکھی جائے اور حضراتِ خلفاء کی حیثیت وہی رہ جائے جو اس وقت بادشاہِ عراق یا ایران یا حجاز وغیرہ کی ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ شیعہ اور سنی کا اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حضراتِ اہل سنت اس کو گوارا نہیں کریں گے۔ وہ حضراتِ خلفاء کو مذہبی پیشوا بھی تسلیم کرانا چاہتے ہیں اور ہمیں سے شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یہ استدلال کہ رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا، ممکن ہے کہ درست ہو مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ اصحابِ وحی کی ہدایت کو اس باب میں قرآن مجید سے بہت شدد و د کے ساتھ ثابت کرتے ہیں اور علمائے اہل سنت ہی کے روایات سے اس کی تفسیر بھی پیش کرتے ہیں۔

کاٹھ اس مسئلہ پر اب کسی شیعہ عالم کی طرف سے بھی اظہارِ خیال کیا جائے جسے میرے خیال میں مدیرِ نگار بخوشی شائع کریں گے تاکہ بحث کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔



مجھے بے شک صرف اپنی اتنی ہی ریسرچ کی بنا پر جسے میں نے اپنے گزشتہ مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ اور جس پر مجھے خوشی ہے کہ محترم مدیرِ نگار نے ہر تصدیق بھی ثبت کر دی ہے۔ تھوڑا سا اختلاف محترم مدیر کے اس فیصلہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ چاہتے ضرور تھے کہ جناب امیرِ خلیفہ قرار پائیں مگر آپ نے اس کا اعلان نہیں کیا اور اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہیں لی۔

جبکہ ہمارے سامنے ہے یہ واقعہ کہ بیعتِ عیشیہ میں رسول نے اعلان کیا: ”نا یکم یوازر فی علیٰ هذا الامر علیٰ ان یکون اخي ووصی و خلیفتی فیکم“ ”گوں تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے اس شرط پر کہ وہی میرا بھائی، میرا ولی، میرا جانشین قرار پائے۔“ علیؑ اٹھے اور کہا کہ میں آمادہ ہوں۔ حضرت نے یہ سن کر فرمایا کہ: ”دیکھو یہ ہے میرا بھائی، میرا وصی اور جانشین۔“

اب بتلائیے کہ اگر روحِ جمہوریت اسی کی مقتضی تھی کہ رسولؐ اس معاملہ کو اپنے ذمہ نہ رکھیں اور عام مسلمانوں پر چھوڑ دیں تو آپ کو خواہ مخواہ یہ سب باخ دکھا کر اپنی نصرت کا وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی اور یہ معاہدہ کرنے کا حق کونسا تھا؟

اب سوائے اس کے کہ ”برہنہ صاحب“ کی طرح اس کو صرف ”توصلہ افزائی“ پر مبنی قرار دیا جائے اور کیا چارہ کار ہے؟ مگر اس معاملہ میں مدیرِ نگار فرما چکے ہیں۔ کہ ”یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر نہ کوئی ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ جسے رسول اللہ ﷺ سے منسوب کرنا صحیح ہوتا ہے۔“

یہ ابتدائے رسالت کا قصہ تھا اور انتہائے رسالت میں خطبہ حجۃ الوداع (جس میں محترم مدیر نگار کے الفاظ میں) رسول اللہ نے اپنے وصال کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ ”من کنت مولاه فعلی مولاه“ میں جس کا مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے“ اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد دو چیزیں چھوڑے جاؤں ایک کتاب اللہ اور دوسرے میری عنترت میرے اہل بیتؑ اور انھیں دونوں کی پیروی کرنا چاہیئے“ اب آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ اعلان نہیں تو اور کیا ہے یہ آخری تقریر ہے، جو رسول اللہ نے اتنے بڑے مجمع میں کی۔ اس کے بعد آپ دو مہینہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ رسول اللہ نے جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس باب میں خاموشی اختیار کر لی“ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اور زیادہ قریب زمانہ میں بھی رسول نے سکوت نہیں کیا۔ اس وقت جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ جبکہ آپ کے وصال میں صرف چند روز باقی تھے، اس موقع پر بھی آپ نے تقریر کی اور فرمایا:۔ ”اے لوگو بہت قریب ہے وہ وقت کہ میں دنیا سے اٹھ جاؤں اور تم سے رخصت ہوں میں نے اس سے قبل تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے اور حجت تمام کر دی ہے۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عنترت اہل بیتؑ کو چھوڑے جاتا ہوں“ یہ کہہ کر حضرت نے جناب امیرؑ کا ہاتھ پکڑا اور اسے بلند کر کے فرمایا:۔

”علیٰ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ، یہ دونوں جدا نہ ہوں

گے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔ میں ان سے دریافت کر دوں گا کہ تم نے ان سے میرے بعد کیا سلوک کیا“

(صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷)

دیکھ جائیں یہ الفاظ کہ:۔۔۔ قد قدمت اليكما القول معذرتا اليكما

”میں تم سے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ اور حجت تمام کر دی ہے۔“
 اس کے بعد پھر بھی کہا جاتا ہے کہ رسولؐ نے اعلان کیوں نہ کر دیا۔ بے شک
 اس کے بعد صرف ایک ہی چیز باقی تھی اور وہ تحریر۔ اس کا رسولؐ نے بندوبست
 کرنا چاہا جس کا صحیح بخاری میں واقعہ قرطاس کی صورت میں تذکرہ ہے۔
 کہا جاتا ہے کہ کیا معلوم حضرت کیا لکھنے والے تھے؟ بیشک کیا معلوم
 لیکن اگر لکھنے دیا گیا ہوتا آپ کو جو کچھ لکھنا چاہتے تھے تو کیوں کسی کو یہ کہنے کا موقع
 ملتا۔ کہ آپ خلافت ہی کے لیے لکھنا چاہتے تھے۔

حضرت رسول اکرمؐ کے بار بار وہ الفاظ کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں
 جن سے تم تک کی صورت میں تم گمراہ نہ ہو گے۔ اور پھر آپ کا یہ کہنا کہ ”ایسا نوشتہ
 لکھ دو جس پر عمل کرنے سے تم گمراہ نہ ہو“ اور پھر حضرت عمر کا یہ فقرہ کہ ”ہم کو بس
 کتابِ خدا کافی ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں“ کیا اس کے یہی معنی پیدا نہیں ہوتے
 کہ حضرت عمر کو اپنی فراست کی بنا پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ آپ وہی لکھنے والے ہیں
 جو آپ بہت دفعہ کہہ چکے ہیں۔ جس میں آپ نے کتابِ خدا کے ساتھ اپنی عمرت اور
 اہل بیتؑ کو ضم کیا ہے۔ اور ان دونوں کی پیروی کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے۔ اور اس
 کی بنا پر آپ نے یہ کہا کہ ہمارے لیے تو بس کتابِ خدا کافی ہے۔ یعنی کسی دوسرے جُز
 کی ہم کو ضرورت نہیں ہے۔

یقیناً ایک غیر متعلق اور بے غرض انسان مذکورہ صورتِ حال اور حضرت عمر
 کے اس فقرہ پر غور کرنے سے سوائے اس نتیجے کے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

بے شک واقعہ قرطاس کے بعد فوراً رسول اللہؐ کا وصال نہیں ہوا بلکہ ہوش و
 حواس کے عالم میں اتنا وقت ملا کہ آپ اس کی تکمیل کر سکتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے جن
 مدبرانہ الفاظ کے ساتھ اختلاف فرمایا تھا۔ (جن کا صحیح بخاری میں تذکرہ موجود ہے)

ان کے بعد کوئی محل آپ کو اپنی خواہش کے پورا کرنے کا باقی نہ رہا تھا۔
وہ یہ کہ آپ نے فرمایا تھا کہ رسول پر مرض کا غلبہ ہے جس سے آپ کے
ہوش و حواس جا چکے ہیں۔“

بعض روایات میں یہ فقرہ ہے کہ ”ان الرجل لیجھم“ آپ پر ہدیان کی
کیفیت ہے۔“ آپ کے اس فقرہ کا حاضرین پر بھی یہ اثر پڑ گیا تھا کہ بعض لوگ
کہتے تھے کہ رسولؐ جو کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ قدم دوات حاضر کردوا بعض لوگ کہتے
تھے کہ نہیں بات وہی ہے جو حضرت عمرؓ نے ارشاد کی، یعنی واقعی رسولؐ کے ہوش و
حواس درست نہیں رہے۔ اب آپ فرمائیے کہ اس کے بعد رسولؐ کو کب موقع تھا
کہ کچھ تحریر کرتے اور اگر کچھ لکھواتے بھی تو وہ مستند کتب صحابہ تا جب کہ بخمال حضرات
”بحالت صحت نفس و ثبات عقل“ کی شرط ہی مفقود تھی۔

میں اپنے مسلمان اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ سنی احباب سے معذرت
چاہتا ہوں۔ میں تو تاریخی واقعات سے دیکھ رہا ہوں کہ غدیر خم کے واقعہ کے بعد
ایک مکمل سازش ہو گئی تھی کہ رسولؐ کا مقصد کامیاب نہ ہونے دیا جائے اور اس سازش
کے ارکان اتنے اندرونی تھے کہ رسولؐ اپنے بستر بیماری پر بھی ان کے درمیان گھرے
ہوئے تھے۔ اور خود حضرت کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی سازش
کے توڑنے کے لیے آپؐ نے لشکرِ اسامہ کے بھیجنے کا بندوبست کیا تھا اور نام بنام تمام
مضر عناصر سے چاہا تھا کہ فضا کو صاف کر دیں۔ اور اس کے لیے اتنے تاکیدی احکام نافذ
کیے تھے کہ ”خدا کی لعنت ہے اس پر جو لشکرِ اسامہ میں نہ جائے۔“ مگر آپؐ کی حکم عدولی
کی گئی جس کے بعد آپؐ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

محترم مدیرِ نگار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ بشیر صحابہ کو حضرت علیؓ سے
رشتہ و رقابت اعداد و امتی اور مختلف وجوہ کی بنا پر آپؐ کے خلاف متفق تھے۔

اس صورتِ حال میں وہ فرماتے ہیں کہ علیؑ کا خلیفہ قرار پانا غیر ممکن تھا۔ بیشک غیر ممکن تھا لیکن اس سے تمام اصحاب الزام سے بری تو نہیں ہو جاتے۔ -
 فرض کیا جائے کہ ایک بادشاہ، رئیس، امیر کبیر کے تمام ملازمین اس کے فرزند کے قتل کرنے پر متفق ہو جائیں یقیناً اس کا قتل ہو جانا اس صورت میں ناگزیر ہے لیکن کیا اس بنا پر قاتل بالکل بری قرار پائیں گے؟

اس صورت میں کیا جماعتِ مسلمین اعتقیدتِ مندانِ رسولؐ کو آزادانہ طور پر واقعات کی جانچ کرنے کے بعد اس کا اقرار نہیں کرنا چاہیے تھا کہ جو کچھ ہوا وہ رسولؐ کی مرضی کے خلاف ایک متفقہ بندوبست کا نتیجہ تھا۔ جو قابلِ افسوس ہے۔ نہ یہ کہ اس کے برخلاف "اصحابہ کلہم عدول" صحابہ سب کے سب عادل ہیں کے کلیے بتائیے جائیں اور غزوہ بدر، بیعتِ شجرہ وغیرہ کے پیمانوں کو بلا استثنا سب کے سنگار نیکو کار ہونے کی قطعی سند قرار دے لیا جائے اور "اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم" کی سی روایتوں کو رسولؐ کی زبانی بیان کر کے ہر ایک کی پیروی کو ذریعہ نجات سمجھ لیا جائے۔ محترم مدیرِ نثار کو یہ تسلیم ہے کہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا مسئلہ رائے عامہ حاصل کرنے کے بعد طے نہیں کیا گیا، لیکن جن ذاتی اثرات کے ماتحت یہ حضرات خلیفہ تسلیم کیے گئے وہ غالباً ایسے تھے کہ اگر رائے عامہ حاصل کی جاتی تو بھی شاید نتیجہ یہی نکلتا۔ "

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ "ذاتی اثرات" رسولؐ کے فشار کی موافقت میں کام نہیں آ سکتے تھے۔ اور جب ایسا نہیں ہوا تو مخالفتِ رسولؐ کی ذمہ داری کیا اب انہی "ذاتی اثرات" والی سبکیوں پر عاید نہیں رہ جاتی؟ اور کیا اس صورت میں ان لوگوں کے اظہارِ اختلاف صرف رسولؐ کے ساتھ بجا (یا بیجا) عقیدت کا نتیجہ قرار نہیں پاتا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ یعنی حضرات اہل سنت و جماعت رسول اللہؐ کے تنہا دعوے دار بن گئے اور شیعہ جماعت کے متعلق یہ خیال قرار دے دیا گیا کہ ان

کو رسول اللہ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

پھر جب کہ پیغمبر نے اپنے انہی اقدامات میں (جنہیں محترم مدیر نگار بھی اعلان نہیں لیکن اظہار رائے کی حد تک صحیح سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کا منشا یہ تھا کہ اگر انتخاب کی نوبت آئے تو رسول کا دھڑ علی کے حق میں بھاجائے) اس مسئلہ کو کسی خالص دنیاوی پہلو کے اعتبار سے نہیں پیش کیا بلکہ اسے گمراہی سے بچنے کا وسیلہ اور نجات کا ذریعہ بتایا تھا۔ جیسا کہ (لسن تضللو) کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ”میں روزِ قیامت دریافت کر دوں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟“

تو اب بتائیے کہ اس چیز کو مذہب سے الگ اور اخروی جزا و سزا سے غیر متعلق کیونکر قرار دیا جائے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے اپنے دوسرے مضمون میں تحریر کیا ہے اس وقت مسلمانوں کے لیے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایانِ دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں۔

اگر یہ مسئلہ اس وقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت سے عزتِ رسول کی مذہبی پیشوائی کو قبول کر لیں۔ اور احکام و تعلیمات مذہبی میں انہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ خلافت یعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آئینہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر حضراتِ خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے ان کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے۔ تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس لیے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔ خدا کرے مدیر نگار کی کوشش کا میاب ہو اور مسلمانوں کی یہ باہمی تفریق دور ہو کر ایک مذہب قرار پائے جس کو کہا جاسکے ”حقیقی اسلام“

بس مجھے اب اس سلسلہ میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ مدبر نگار نے جو تفصیلات قائم کیے ہیں ان پر اہل سنت اور شیعہ مذہب کے علماء کو بحث کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ نادانہ بحث اب ایسے نقطہ پر پہنچ گیا ہے۔ جو ایک ”ہندو“ کے دسترس سے باہر ہے۔

”ہر نام“

(نگار) گذشتہ فروری کے شمار میں مسئلہ خلافت و امامت پر میرے محاکمہ کی اشاعت کے بعد اس وقت تک متعدد مضمین شیعہ و سنی حضرات کے موصول ہوئے لیکن ان کو شائع نہیں کیا گیا کیونکہ جو طریق استدلال ان میں اختیار کیا گیا ہے وہ یا تو یکسر مجادلانہ ہے یا پھر اس انداز کا جو اس سے قبل بار بار استعمال ہو چکا ہے اور ناکام ثابت ہوا ہے۔

جس حد تک روایات کا تعلق ہے قطعیہً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہ جناب امیر کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا آپ نے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہل سنت دیگر خلفاء کے صرف فضائل بیان کر کے اس حقیقت کے مٹنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا ساسی کے ساتھ اہل سنت کا مناظرانہ پہلو اس لیے اور بھی زیادہ مکرور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کر سکتے اور شیعہ حضرات خود اہل سنت کی روایات سے حضرت علیؑ کی وصایت و خلافت کو ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اس لیے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا کہ رسول اللہ حضرت علیؑ کو اپنا جانشین و خلیفہ بنانا چاہتے تھے یا نہیں، بیکار ہے

منزوت اس امر کی ہے کہ (اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد) نفس منکرات پر گفتگو کی جائے یعنی یہ کہ اس کی اہمیت مذہب اسلام میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کہ کیا جناب امیرؒ کی امارت واقعی منصوص تھی یا نہیں۔ اسی لیے میں نے ماہ مارچ ۱۳۳۸ء کے شمارے میں چند مباحث متبعین کر دیے تھے اور چاہتا تھا کہ شیعہ علماء اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں لیکن انہوں نے اس وقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

اب جناب ہرنام کا (جو اس تحریک کے بانی ہیں) یہ دوسرا مقالہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ بھی بہر حال مکملہ دیکھتے کے بعد اب اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پہلے شیعہ علماء سے درخواست کروں گا کہ وہ ان تمام مباحث کو سامنے رکھ کر جو ماہ مارچ ۱۳۳۸ء کے شمارے میں درج کیے گئے ہیں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور اس کے بعد سنی علماء کو متوجہ کروں گا کہ وہ جواب دیں۔ لیکن دونوں فریق سے میری التجا یہی ہے کہ جو کچھ وہ لکھیں اس میں کوئی محاذ لانہ پہلو نہ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ روایتی استدلال میں وہ صرف فریق مخالفت کی کتابوں کو سامنے رکھیں۔ ورنہ یوں تو اپنی اپنی روایات کو سامنے رکھ کر ہمیشہ سبھی نے بحث کی ہے اور اسی لیے معقول نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔



خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

مولانا فاروق کانپوری

علیؑ تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے، اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لیے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے نمائندگی کر سکتے ہیں:-

”حضرت علیؑ میں ایک حکمران ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں“

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز البکرو عمر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہد خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلافت کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہیے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقالہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے۔ اس لیے مؤیدین امامت نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی زرگاہ کے دو اور میدان تلاش کیے ہیں یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ نبی کریمؐ کے اقوال سے حضرت علیؑ کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرو کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ خود نبی کریمؐ کے اقوال سے حضرت عمرو البکر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ”مؤیدین امامت“ انامدینۃ العلم وعلیؑ بابہا کی حدیث کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:-

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کیے گئے جو کھڑے پھنٹے ہوئے تھے ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا کسی کا اس کے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے

۱۔ لڑی ہری آف عرب معتقد نکلسن صفحہ ۱۹۱

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

مکرمی - السلام علیکم ورحمۃ اللہ !

معزز و سالار لکھنؤ میں کسی ہر نام صاحب نے جن کے نام کی ہیئت ترکیبی ہر نام کو اپنے اندر پناہ دے رہی ہے بحیثیت ایک غیر مسلم کے مسئلہ خلافت پر روشنی ڈالی ہے اور اخیر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خلافت کا مسئلہ تو رسول اللہ کے زمانہ سے طے تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اہتمام ہی سے ولی سہد تھے، پھر مسلمانوں کو اس میں اس قدر ٹوٹنے اور باہمی بحث و مباحثہ کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی؟ صاحب مضمون کے چہرہ پر اگر ”لغیہ“ کا کوئی حجاب نہیں ہے تو یقیناً مجھ کو ان سے سہد دی ہے کہ خالص ہندو ہو کر ایک غمیٹ اسلامی مسئلہ کے حل پر وہ کس طرح تیار ہو گئے اور پھر کتنی محنت اور وقت سے ان حوالوں کو یکجا کیا۔ جو مختلف ضخیم ماخذ دل میں جا بجا پھیلے پڑے ہیں۔ اس علم دوستی اور ذوق تحقیق کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ہر نام صاحب نے مضمون لکھنے کو تو لکھا اور بڑی محنت سے لکھا، لیکن وہ جستجو اور تلاش کے سلسلہ میں ”اسلامی فن روایت“ اور اس کے اصول و مروج کو باطل نظر انداز کر گئے۔ جس کی وجہ سے ان کو اپنے ہر دعوے میں جگہ جگہ ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ یہ سچ ہے کہ اصول نے تقریب التہذیب، استیعاب، اسد الغابہ، تاریخ کبیر، تاریخ کامل، تاریخ ابوالفتح و باب القادیل، معالم التنزیل، موابہب لدنیہ، تاریخ خمیس

لے رسالہ قارئان مجوزہ اپریل ۱۹۳۵ء

عنوانی محققہ شخصائے ریاض النضرہ، طبقات کبری، تاریخ الخلفاء، مدارج النبوة جامع البیان، تفسیر کبیر، موطا، سیرۃ ابن ہشام، ردّ الفتن وغیرہ سے استناد کیا ہے۔ جو رجال، سیر، تاریخ اور تفسیر کی مشہور کتابیں ہیں اور مشہور علماء اسلام کی کہنی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ایک واقعہ ہے کہ ان کتابوں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف روایتیں موجود ہیں، جن پر اہم مسائل کے فیصلہ میں اعتما دینیں کیا جاسکتے خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ ان میں سے ہر کتاب میں ایک ایک مسئلہ کے متعلق مختلف اقوال درج ہیں، اور ایک گفتے والے کو اس کا توجہ دیتے ہیں کہ ان میں سے جو قول چاہے لے لے لے لیں کو چاہے قبول کر دے مثلاً یہی مسئلہ کہ سب سے پہلے آنحضرتؐ پر کون ایمان آیا ہے کتابوں سے طے نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے متعلق مختلف روایات میں بعض روایتوں میں حضرت ابو بکر کا نام ہے، بعض میں حضرت خدیجہ کا، بعض میں حضرت علیؑ کا، اور بعض میں حضرت زید بن حارثہ کا، سبھی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا وہ اس مسئلہ کو آج تک طے نہ کر سکے اس کے برخلاف اگر تحقیق سے کام لیا جاتا اور روایات جانچ لی جاتیں تو یہ مسئلہ نہایت آسانی سے طے ہو سکتا تھا۔

معائنہ کیجیے گا، ہمارے علماء کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ان کتابوں کے حقیقتیں کے ناموں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور تحقیق کی باطن پر ادھن نہیں کرتے۔ اسی لیے سیکڑوں مسائل آج تک غیر منفصل میں۔ اور اگر یہی ذہنیت رہی تو ہمیشہ غیر منفصل رہیں گے۔ حالانکہ محدثین کرام نے فن رجال کی کتاب میں اسی لیے مدون کی تھیں کہ روایات مکابہ سے پایاں اور لغو وغیرہ چھانٹ دیا جائے۔ جس کی وجہ سے سدا اختلافات مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ اکابر محدثین نے تو احادیث کے جانچنے میں کم و بیش فن رجال کے اصول سے کام لیا۔ لیکن تاریخ وغیرہ میں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور آج تک ہمارے علماء ان کی طرف سے بے نیاز نظر آ رہے ہیں۔

مسلمانوں کو فن رجال کی بدولت اپنی صحیح تاریخ مرتب کرنے کے جو مواقع میسر ہیں اور محدثین نے اس کے اصول سے کام لے کر روایات کا جس قدر صحیح ذخیرہ مرتب کر دیا ہے دنیا کی دوسری قومیں اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کیونکہ مسلمانوں کے علاوہ ساری دنیا ایسے وسائل و ذرائع سے محروم ہے لیکن مجاہد ہو کر یا پرستی کا جس نے ہر محقق کی زبان اور قلم کو بے کار کر رکھا ہے۔ اور علماء صرف اس ذہنیت کے باقی رہ گئے ہیں کہ جو کچھ طب و طب و بائیں واقعات قدامت کی کتابوں میں پائے جائیں ان پر بلا نقد و جرح آمنا قبول کر لیں، اور جو ایسا نہ کرے وہ ملحد و زندقہ، کافر بے ادب اور خدا جاننے کیا کیا ہے؟

بہر حال آپ مجھے خارجی، تجھیں یا بالکل دائرہ شریعت ہی سے نکال دیں لیکن میں بالا اعلان یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق جو روایات ہر نام صاحب نے لکھی ہیں ان کا اکثر حصہ غلط ہے۔ اور ان ہی کے مقابل روایات بالکل اسی قسم کی ان ہی محولہ کتابوں میں دوسرے صحابہ کے متعلق موجود ہیں، جن کو نہ معلوم کیوں قلم انداز کیا گیا ہے؛ اور جب کہ وہی فضائل جو حضرت علیؑ کے متعلق مذکور ہیں ان ہی حوالوں سے دوسرے بزرگوں کے لیے بھی ثابت ہیں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فیصلہ کیوں کر کر لیا گیا کہ فضائل علیؑ تو صحیح ہیں اور دوسروں کے فضائل غلط؛ کیا یہ ایک طرفہ فیصلہ نہیں ہے؟

اس قسم کے مباحث کے طے ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ صحیح روایات لے کر غیر صحیح روایات یک قلم ترک کر دی جائیں۔ اسی سے مسلمانوں کی موجودہ بے راہ روی دور ہو سکتی ہے اور اسی سے دوسری قوموں کی پریشانی خیالی کو ہم دور کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہر نام صاحب نے اپنے مضمون میں جن کتابوں کے نام لکھے ہیں وہ سب علماء اہل سنت کی ہیں، لیکن وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اہلسنت کے نزدیک ان میں سے ہر کتاب درجہ میں برابر نہیں ہے۔ بلکہ بعض کتابیں معتبر ہیں بعض

غیر معتبر۔ اور یہ تفریق مراتب صرف روایات کی نوعیت کی بنا پر پیدا ہوئی ہے، تاریخ وغیرہ کو چھوڑ کر خود احادیث کی کتابوں کو لے لیجیے تو وہاں بھی یہ فرق مراتب کام کرتا نظر آئے گا، صحاح ستہ حدیث کی دوسری کتابوں سے کیوں افضل ہیں؟ محض روایات کے لحاظ سے صحاح ستہ میں نسائی اور ابن ماجہ کیوں کم ترتیب میں؟ اس لیے کہ ان کی روایات بقیہ چار کتب کے مقابلہ میں کمزور ہیں، یا یہ کہ ان میں نسبتاً ضعیف احادیث کا زیادہ ذخیرہ ہے، صحیح مسلم، ترمذی اور ابوداؤد پر کیوں ترجیح رکھتی ہے؟ اس لیے کہ اس میں روایات اور سند پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم سے کیوں بہتر ہے؟ اس لیے کہ اس میں روایات اور راویوں کی جانچ پڑتال پر جو توجہ کی گئی ہے وہ صحیح مسلم میں نظر نہیں آتی اور نہ دنیا کی کسی کتاب میں تصحیح کا وہ معیار راجح تک پیش کیا گیا ہے!

پس جب خدا کے فضل سے اہل سنت کے پاس روایات کا اس معتبر ذخیرہ موجود ہے جس کی نظیر سے ساری دنیا خالی ہے تو پھر آئیے ہم اسی کو اپنا ماخذ کیوں نہ قرار دیں۔ اور ہر اختلافی مسئلہ کی نسبت اسی کی طرف کیوں نہ رجوع کریں، میں بڑے ادب کے ساتھ ہر نام صاحب سے عرض کر دں گا کہ وہ جہاں اتنی زحمت اپنے اس مضمون کے لیے اٹھا چکے ہیں وہاں میری خاطر سے غلطی سی تکلیف اور برداشت کر کے روایات کے سب سے مستند ذخیرہ پر ایک فائر نظر ڈال جائیں اور دیکھیں کہ انھوں نے فضائل علی کے متعلق جو واقعات درج کیے ہیں ان کا سراغ صحیح بخاری سے بھی لگتا ہے یا نہیں؟ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ تمام مزخرفات ان کو صحیح بخاری میں نظر نہیں آئیں گے۔ اور میں سے حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جب سب سے زیادہ صحیح کتاب ان روایات کے ذکر سے خاموش ہے تو مہجران پر استدلال کی بنیاد کیونکر رکھی جاسکتی ہے؟ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو صحیح کیونکر سمجھا جاتا ہے؟

اب آئیے اس مضبوط ماخذ کی رہنمائی میں ہم ہر نام صاحب کے دعویٰ

پر توجہ کریں۔

مضمون نگار کا خیال ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؑ نے اسلام قبول کیا۔ لیکن صحیح بخاری سے حضرت ابوبکرؓ حضرت خدیجہؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اسامہ مبارک قبول اسلام کے سلسلہ میں سب سے مقدم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ایک اور روایت کی ارد سے پانچ غلام (حضرت خدیجہؓ کو ملا کر) دو عورتیں اور حضرت ابوبکرؓ سابقین اسلام میں ہیں۔ حضرت علیؑ کا اب تک کہیں پتہ نہیں ہے زیادہ سے زیادہ سعد بن ابی وقاصؓ کے بعد ان کو چوتھا نمبر دیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ صحیح بخاری کی کوئی روایت اشارتاً یا تصریحاً اس کی تائید کرے۔ دوسری روایت کو پیش نظر رکھ کر نواں نمبر بھی شاید ہو سکے۔

اس سلسلہ میں ابن حجر وغیرہ کے جو اقوال میں ان صحیح روایات کے مقابل میں لغو ہوں گے۔

انذر عشیرتک الا قربین کا واقعہ نہایت معمولی کتابوں میں ہے اور بخاری میں قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے حضرت علیؑ کی ولیعہدی کی بنیاد یہیں سے گٹ جاتی ہے اور مضمون نگار کا سب سے بڑا حرج اسی جگہ سے بے کار ہو جاتا ہے۔ ہجرت کا واقعہ خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور لفظ "صاحب" کی تشریح میں متعدد صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کا نام لیا ہے۔ اور یہ سب دعائیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ لیکن حضرت علیؑ کا بستر پر سونا، بخاری میں نہیں ہے۔ اس لیے ہجرت کے سلسلہ میں اس کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ صحیح نہیں ہے۔ اس موقع پر ہر نام صاحب نے قصداً حضرت ابوبکرؓ کی تنقیص کا پہلو اختیار کیا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہؐ کے قتل کا اشتہار تھا اور متعدد اشخاص آپؐ کی تلاش میں گھوم رہے تھے، جو کہ سے مدینہ تک تعاقب کرتے ہوئے گئے۔ ایسی حالت میں اس

شخص کی خدمت زیادہ وزن دار ہوگی جو اپنی جان کو مقصیل پر رکھ کر رسول اللہ کے ساتھ ساتھ مگسوم رہا تھا۔ یا وہ قابل ستائش ہوگا جو رات بھر گھر کے احاطہ کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں بہ آرام سوتا رہا۔ کیونکہ حضرت سودہؓ حرم نبوت کی موجودگی کی وجہ سے یہ اطمینان تھا کہ مشرکین مکان کے اندر نہیں آ سکتے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو رسول اللہ کی موجودگی ہی میں گھر کے اندر دروازہ توڑ کر یا دیواروں پر چڑھ کر آ سکتے تھے ساری رات باہر کیوں گھڑے رہتے؟

یہ کون دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ پر اطمینان نازل ہوا؟ اطمینان رسول اللہ پر نازل ہوا اور آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی تنہائی کی، لیکن بائیں ہمہ حضرت ابوبکرؓ کے انتشار خیال کو کمزوری پر محمول نہیں کیا جاسکتا، وہ انسان کی ایک فطرت ہے حضرت ابوبکرؓ غار کے دلہنہ پر کفار کو دیکھ رہے تھے اس لیے اگر رسول اللہ سے انھوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ لوگ اگر اپنے قدموں پر نظر کریں تو ہم کو دیکھ لیں گے تو اس میں کمزوری کی کیا بات ہوئی؟ حضرت ابوبکرؓ اگر سرفروشی کے لیے تیار نہ تھے تو ہجرت کی رفاقت کیونکر گوارا کی؟ یہ سب واقعات کمزوری پر دلالت کرتے ہیں؟ البتہ کمزوری یہ تھی کہ حضرت علیؓ آرام سے ساری رات گھر کے اندر لیٹ کر سو رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے پیرو کر دیا کہ جہاں مزاج چاہے تشریف لے جائیں اگر زندگی باقی ہے تو آئندہ ملاقات ہو جائے گی! کیا یہ اطمینان حضرت ابوبکرؓ نے بھی ظاہر کیا؟ مجھے حیرت ہے کہ ہر نام صاحب کے قلم میں رعشہ کیوں نہ پیدا ہوا؟ ان کو حق و صداقت کے چھپاتے وقت خدا کا خوف کیوں نہ معلوم ہوا؟ کیا رسول اللہ کے سب سے بڑے جان نثار کے حق میں ایسے جھلے لکھنا سچائی کے گلے پر چھری پھیرنا نہیں ہے؟ کیا حضرت علیؓ نے کبھی اس طرح آنحضرتؐ کو کفار کے حملہ سے بچایا ہے؟ صرف ایک ہی واقعہ صحیح بخاری

سے پیش کر دیا جائے! کیا کسی صحابی نے اس زمانہ میں جب کہ رسول اللہؐ کا کوئی یارِ مددگار نہ تھا، فدائیت اور جہانِ شاری کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں؟ کیا رسول اللہؐ کا حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ دامنِ درمے، قدمے، سخننے کسی نے ساتھ دیا ہے؟ اور کیا ان کے برابر کوئی رسول اللہؐ کے واقعات میں بھی شریک بھی رہا ہے؟ اور ان سے زیادہ رسول اللہؐ کے کوئی کام بھی آیا ہے؟ ہجرت سے پہلے جب عقیقہ نے آپؐ کی گردن مبارک میں لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچا تھا، اس وقت آپؐ کے بچانے کے لیے حضرت علیؓ گئے تھے؟ بلکہ اُحد، تمام معرکوں میں رسول اللہؐ کی حفاظت کیا حضرت علیؓ نے کی تھی؟

مواخاۃ کے واقعہ میں صحیح بخاری، النکل ناموش ہے۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کی کن نزگوں سے مواخات ہوئی تھی۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو دوبارہ حضرت علیؓ سے اپنا اسلامی بھائی فرمایا ہے۔ ایک تو حضرت عائشہؓ سے نسبت کے وقت، اور دوسرے آخری خطبہ میں جو وفات سے قبل ارشاد فرمایا۔ تعجب ہے کہ ابوالفضلؓ، صواعق اور خمیس کا حوالہ اس سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے اور صحیح کی دائرہ سے آنکھ بند کر لی گئی ہے۔ مسجد نبویؐ کے اندر حضرت حفصہؓ ابوبکرؓ کے مکان کا دروازہ باقی رکھا گیا تھا اور تمام دوسرے دروازے آنحضرتؐ سے بند کر دیے تھے۔ اس کا ذکر بھی آپؐ کے آخری خطبہ میں ہے۔ جو بخاری میں موجود ہے۔ حیرت ہے کہ لوگوں نے ان روایات کو سامنے رکھ کر حضرت علیؓ کے متعلق بالکل اسی قسم کی روایات وضع کیں، اور مضمون نگار نے صحیح روایت کو چھوڑ کر غلط روایتوں کو قبول کر لیا، کیا یہی انصاف و صداقت ہے؟

بلکہ کے واقعہ میں حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ سب سے بڑا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی حفاظت کے لیے خود ان کے پاس موجود تھے، کیونکہ ان کی حیثیت سب سے بڑے

رفیق کی محیٰ اور ظاہر ہے کہ جو شخص ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے وقت رسول اللہ کی معیت سے مشرف رہا تھا اس سے بڑھ کر قابلِ اطمینان آدمی کون ہو سکتا تھا؟ رہے حضرت عثمان تو وہ رسول اللہ کی صاحبزادی کی عیال کی وجہ سے غزوہ میں شریک نہ ہو سکے، لیکن رسول اللہ نے ان کو شریک سمجھا، اور ان کا مالی غنیمت میں حصہ لگایا۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ کی خدمات سے کس کو انکار ہے؟ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ بزرگوار سپاہی تھے، اور حضرت ابوبکرؓ وزیر اور ظاہر ہے کہ وزیر اور سپاہی کی ذمہ داریوں اور کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے!

حضرت فاطمہؓ کی شادی کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کے پیغامات صحیح بخاری سے دکھانے چاہئیں، پھر مضمون نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس اضافی خوبی سے ان بزرگوں کے مابین کیا ترقی ہو سکتی تھی جن کی صاحبزادیاں جناب رسالت پناہ کی زوجیت سے مشرف ہو کر تمام مسلمانوں اور خود حضرت علیؓ کی بھی ماں بن چکی تھیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی دوسرے درجہ کی چیز تھی، اس لیے دوسرے درجہ کے لوگ اس سے مشرف ہو سکتے تھے، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوالعاصؓ کے لیے البتہ یہ قابلِ فخر چیز ہو سکتی تھی۔

غزوہٴ اُحُد کے ذکر میں مضمون نگار کا دل تھرا آیا ہے۔ اور فہم لرز گیا ہے۔ لیکن اس نے صحیح کی وہ روایت نظر انداز کر دی، جس میں حضرت ابوبکرؓ اور منعمہؓ کی مہر دہی اور ثبات قدمی درج ہے حضرت عمرؓ کا فرار بھی مضمون نگار ثابت نہ کر سکے، شاید ان کو اس جواب و سوال کی خبر نہیں جو ابوسفیانؓ اور حضرت عمرؓ میں ہوا تھا، اور رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق حضرت عمرؓ ابوسفیانؓ کو جواب دے رہے تھے۔ یہ واقعات بخاری میں موجود ہیں۔ رہے حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ کرام جنہوں نے فرار اختیار کیا تھا تو جب قرآن مجید نے ان کی یہ لغزش قابلِ مواخذہ نہیں سمجھی تو آج

کسی کو کیا حق ہے کہ ان پر اعتراض کرے، موطا کی جو روایت اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہے اس کا صحیح میں کہیں پتہ نہیں۔

جنگ خندق کا کارنامہ ایک سپاہیانہ کارنامہ ہے، اس لیے اس کو حضرت علیؓ نے انجام دیا۔ رہے وزرا و وہ آنحضرتؐ کے پاس رہے اس میں منقصت کی کیا بات ہے؟ صلح حدیبیہ میں معاہدہ کے کاتب بلاشبہ حضرت علیؓ تھے۔ اس لیے بحیثیت کاتب کے جو فرض ان پر عائد تھا انھوں نے ادا کیا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ ارشاد فرمائے ان کو بحضرت علیؓ نے لکھ دیا۔ اور یہی کام ایک امین کاتب کا ہو سکتا ہے بلکہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی حیثیت میں فرق تھا، وہ رسول اللہؐ کے وزیر تھے، اس لیے ان کو معاہدہ کی بعض شرطوں میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور اسی لیے وہ آپؐ کی خدمت اقدس میں بڑی کدو کاؤش کے ساتھ اپنی درخواست پیش کر رہے تھے حضرت علیؓ کا یہ منصب نہ تھا اور نہ تعلقات کے لحاظ سے اتنی جرأت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہؐ سے دو بہ دو سیاست کے متعلق ایسی گفتگو کر سکیں۔ رہا کفارہ اور روزہ کا قصہ تو اس کا سبب خود باندہ یہ نہ تھا کہ حضرت عمرؓ اس گفتگو میں اپنے کو سرکش یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مد مقابل سمجھ رہے تھے بلکہ یہ سبب تھا کہ شاید سوالات کی تلخی رسول اللہؐ کے لیے باعث تکلیف ہوئی ہو۔ یہ تو حضرت عمرؓ کی اسلام پرستی اور حب رسولؐ کی بڑی نشاندہ اور ناقابل تردید دلیل ہے کہ ایسے نازک پہلوؤں کو بھی انھوں نے فراموش نہیں فرمایا۔

اس واقعہ میں صحابہ کے قربانی میں تامل کرنے کو مضمون نگار نے خفگی سے تعبیر کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کی شرائط کی نرمی اور کمزوری کی وجہ سے ایسا سہمہ تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ پر ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ خفگی کا لفظ لکھنا انسانی سائیکا لوجی سے کس قدر بے خبری ظاہر کر رہا ہے! حضرت عثمانؓ کا بال نہ منڈانا اولا تو غماری سے نہایت کیجیے، پھر جب یہ بھی جائز تھا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟

غزوہٴ عیر میں جو الفاظ حضرت علیؑ کے متعلق صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہیں، بلاشبہ صحیح ہیں۔ ان سے حضرت علیؑ کی مدح نکلتی ہے۔ اگر بخاری میں کرار غیر فرار کا ٹکڑا نہیں ہے تو یہ مضمون نگار کو کیوں کھٹکتا ہے؟ جب مستند راویوں سے کوئی جملہ مروی نہ ہو تو کیا یہ بھی کسی محدث کا کام ہے کہ وہ قیاسات کی بنا پر اپنی طرف سے جملے بڑھا دے! اس غزوہ میں حضرت ابوبکر و عمر کا فوجیں لے کر جانا اور ناکام واپس آنا صحیح سے ثابت کیجیے، اور اگر بفرض محال ایسا ہو بھی تو اس میں سبکی کی کیا بات ہے؟ کیا حضرت علیؑ کو جنگ صغین میں شکست نہیں ہوئی؟ یہی حضرت علیؑ کی کراری اور غیر فزاری تو اس کا یہ کتنا نمایاں ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ نے کبھی ان کو پوری فوج کا سپہ سالار نہیں بنایا۔ بلکہ ہمیشہ ایک سپاہی یا معمولی حیثیت کے افسر کے طور پر رکھا۔ بخلاف اس کے حضرت ابوبکر اور حضرت زید بن حارثہ اکثر سرایا کے امیر رہے۔

فتح مکہ کی دوئل نشینی صحیح بخاری سے ثابت کیجیے۔

حنین کے مفردین میں حضرت ابوبکر کا نام کہیں نہیں ہے، حضرت عمر کی میدان جنگ میں موجودگی بخاری سے ثابت ہے۔ لیکن حضرت علیؑ کا بھی تو صحیح روایت میں پتہ نہیں چلتا، البتہ حضرت عباس اور ابوسفیان بن حارث کی پامردی ایک ناقابل انکار واقعہ ہے۔

محاصرہ طائف کے زمانہ میں آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ کی ایک پُر امر گفتگو مضمون نگار ذکر فرماتے ہیں، لیکن کس کے حوالہ سے؟ الریاض النضرہ!

تبوک میں جو حدیث ارشاد فرمائی ہے وہ بخاری میں منکوحہ ہے۔ اور لے دے کے یہی ایک حدیث صحیح حضرت علیؑ کے فضائل میں سب سے نمایاں ہے۔ لیکن لابی بعدی کے بعد اس میں کیا خصوصیت رہ جاتی ہے؟ صرف اہل دعیال کی نگرانی! جو ظاہر ہے کہ کوئی شرت نہیں، اس سے بڑا شرف تو ان بزرگ کو ملا جو مدینہ منورہ پر

خلیفہ بنائے گئے تھے؛ مضمون نگار کا یہ لکھنا بھی غلط اور محض تیاس آرائی ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو حضرت علیؑ نبی ہوتے، اس مضمون کی حدیث حضرت عمرؓ کے متعلق ہے۔ سورہ برأت کے اعلان کے سلسلہ میں مضمون نگار سے لغزش ہوئی ہے، ماضی نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؑ کی پوزیشن میں فرق نہیں سمجھا، حضرت ابو بکرؓ امیر المومنین تھے اور اس لیے خود رسول اللہؐ کے قائم مقام تھے۔ حضرت علیؑ اور منادی کرنے والوں کی طرح احکام کی منادی کر رہے تھے۔ جن کے نام صحیح کی روایات میں آئے ہیں۔

یمن کی امارت کے واقعہ میں کوئی خاص پہلو نہیں، حضرت علیؑ کی طرح بہت سے صحابہ مختلف مسابوں میں گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے، لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ صحیح روایات کے مطابق لوگوں کو ان سے شکایت پیدا ہوئی، جس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا اور یہ حضرت علیؑ کی انتظامی قابلیت میں کمی ظاہر ہونے کا پہلا واقعہ تھا۔ جو عہد نبوت میں منظر عام پر آیا، اس سلسلہ میں جو حدیث لکھی ہے اس کا بخاری میں سرے سے ذکر ہی نہیں اور اس لیے وہ غلط ہے۔

حجۃ الوداع کے ذکر میں پہلی حدیث بے اصل اور غدیر خم والی حدیث اس سے زیادہ بے اصل ہے، حالت یہ ہے کہ جس قدر ضعیف روایات ہیں، سب میں حضرت علیؑ کی فضیلت کے الفاظ بڑھتے جاتے ہیں، صحیح مسلم میں حضرت علیؑ کے متعلق ایک فقرہ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ غدیر خم کا نام اور اہل بیتؑ کی فضیلت مختصر لفظوں میں ملتی ہے۔ اور صحیح بخاری میں غدیر خم اور اس کے واقعہ کا نشان تک نہیں ہے، خدا ان جھوٹے راویوں سے کچھ جنہوں نے اپنی طبیعت سے ایک مستقل اور عظیم واقعہ بنا کر کھڑا کر لیا۔ یہاں پہنچ کر مضمون نگار نے خطیب کی حیثیت اختیار کر لی ہے، ہم خاموشی سے ان کی گفتگو سن کر صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ صاحبِ کلامؑ اگر رسول کینغزہ اُحد میں نازل ہوئی تھی؟ اس کو شانِ نزول کی کسی کتاب کے بجائے جامع صحیح سے

تحریر فرمائیے۔ تاکہ صحابہ کرام پر جو آپ نے عموماً ساتھ چھوڑنے کا الزام رکھ دیا ہے وہ صحیح روایت سے ثابت ہو جائے۔ بخاری کی پیشین گوئی کا اگر وہ مطلب لیا جائے جو مضمون نگار سمجھ رہے ہیں تو میرے خیال میں حضرت ابو بکر و عمر و عثمان سے زیادہ قابل الزام حضرت علیؓ قرار پائیں گے، کیونکہ اول تو تین بزرگوں نے تو رسول اللہؐ کے بعد اسلام کو ترقی دی اور آپ کے مشن کو پورا کیا اور حضرت علیؓ تو سوائے مسلمانوں کے کشت و خون کے اور کچھ نہ کر سکے۔ اس لیے گل کھلانے کا لفظ سچ سچ کیسے کس پر چسپاں ہوتا ہے؟ اس کے بعد مضمون نگار نے فضائل علیؓ کی حدیثیں شروع کی ہیں۔ ان میں مدینۃ العلم کی حدیث غلط، اقتضا والی حدیث صحیح، علیؓ منی غلط اور من کنت مولاه سب سے لغو۔

مدینہ کی واپسی پر جو خطبہ حضورؐ کا نقل کیا ہے، محدثانہ تنقید کے اعتبار سے بالکل لغو ہے۔

جیش اسامہ میں اگر حضرت ابو بکر و عمر و فوجیوں میں نامزد تھے تو حضرت علیؓ کب مدینہ میں روکے گئے تھے؟ اس کے بے صحیح سے کوئی روایت پیش کیجیے! مدارج النبوة قابل سند نہیں۔ تعجب ہے کہ کوئی عربی کی پرانی کتاب آپ کو حوالہ کے لیے یہاں پر نہ مل سکی۔ بے شک اگر رسول اللہؐ اپنی وفات کے وقت حضرت ابو بکر و عمر کو مدینہ سے باہر کر دینا چاہتے تھے تو ان بے چاروں کو شام چلے جانے میں کیا عذر ہو سکتا تھا؟ لیکن ہجرت ہے کہ رسول اللہؐ نے بادل ناخواستہ ان لوگوں کی موجودگی کو افرامانی اور نفوذ بائندان کے خوف کی وجہ سے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ نہ بنا سکے۔ کیا اس اخلاقی کمزوری کے اندلختیہ تو مضمون نگار نے لاقوۃ الا بالعدۃ۔ قربان جائیے اس اندھی حمایت کے کہ حضرت علیؓ کے پیچھے خود رسول اللہؐ پر الزام لگا رہے ہیں۔

قلم دوات کے واقعہ سے خلافت علیؑ کیسے معلوم ہو سکتی ہے؛ کیا معلوم کہ آپؑ کیا لکھواتے؛ حضرت عمرؓ کا قلم دوات لانے سے روکنا صحیح بخاری میں نہیں ہے۔ پھر اگر بخاری کی شدت کا حال دیکھ کر کسی نے منع کیا ہو تو کیا بے جا کیا؛ اگر کوئی پھیر بانی نہ گئی تھی تو آئندہ بھی آنحضرتؐ لکھوا سکتے تھے، کیونکہ قلم دوات مانگنے کا واقعہ جمعرات کا ہے، اور آپؐ کا انتقال دو شنبہ کے دن ہوا جس میں بسا اوقات آپؐ بالکل تندرست معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ خود دو شنبہ کے دن بھی صبح کے وقت صحیح و لباش تھے جس سے خود حضرت علیؑ کا خیال تھا کہ آپؐ کو افادہ ہو جائے گا کیا پانچ دن کے اندر کسی چیز کے لکھوانے کا موقع نہیں ملا۔ قوموا احسنی کا فقرہ اظہار ناراضگی پر دلالت نہیں کرتا؛ بلکہ جس طرح عام طور پر مریض کو زیادہ بات چیت ناگوار ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح آنحضرتؐ نے بھی مرض کی زیادتی کی وجہ سے صحابہ کی باہم گفتگو کو ناپسند فرمایا۔

انتقال کے وقت حضرت علیؑ کی موجودگی اور دست مبارک کا ان کے اوپر ہونا ریاض النضرہ کی جھوٹی روایت ہے جو حضرت عائشہؓ کے پُر فخر صحیح واقعہ کے جوڑ پر تراشی گئی ہے، صحیح روایات سے اس وقت حضرت علیؑ کا کاشانہ نبویؐ میں ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا۔

ناظرین! آپؐ نے دیکھا کہ کس طرح غلط اور موضوع روایات لکھ کر مضمون نگار نے حضرت علیؑ کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اور کس طرح حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بلکہ اکثر صحابہ کرامؓ کو مورد الزامات قرار دیا ہے۔ لیکن الحق یعلو ولا یعلیٰ؛ مضمون نگار اگر میرے بیان کردہ واقعات کو جامع صحیح میں تلاش کریں گے تو امید ہے کہ ان پر تحقیق کا نیا دروازہ کھلے گا۔ اور ان کو خلافت کا صحیح حل معلوم ہو گا۔ اس معیار پر واقعات کو دیکھنے کے بعد میں تو یہاں تک کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ حضرت علیؑ کو اسلام میں جو چوتھا درجہ دیا جاتا ہے یہ بھی محض ان کے خلیفہ منتخب ہو جانے کی وجہ سے ہے ورنہ

جامع صحیح کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر کو سمجھتے تھے۔ پھر حضرت عمر کو، پھر حضرت عثمان کو اور ان کے بعد پھر سب کو برابر سمجھتے تھے۔ اور یہ خیال عہد نبوت سے لے کر حضرت عمر کی وفات کے وقت تک قائم رہا۔ چنانچہ حضرت عثمان سے جو بیعت ہوئی اس کا سبب یہی تھا کہ مدینہ کی اکثریت ان ہی کی طرف تھی۔ اور اس کو حضرت عبدالرحمن بن عوف نے برملا منبر پر حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے کہہ دیا تھا یہ دونوں روایتیں بھی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ان واقعات کی موجودگی میں کیا یہ کہنا انصاف حقیقت نہیں ہے کہ حضرت علیؑ پر زیادتی کی گئی اور ان کا حق خلافت غصب کیا گیا؟ حضرت علیؑ کی حمایت میں دانستہ یا غلطی سے روایات اور فضائل کا جو بے پایاں ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے اس کی موجودگی میں جو کچھ چاہیے کیے لیکن اگر تلاش حقیقت مقصود ہو تو بارگاہ حق سے وہی فیصلہ ہو گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی وفات کے بعد ہو چکا، اور اب اس کو کوئی بڑے سے بڑا ذخیرہ روایات بھی متزلزل نہیں کر سکتا۔

مولانا! میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن ڈرتا ہوں کہ آپ مجھے جوش غضب میں آکر "خارجی" نہ کہہ دیں۔ لیکن اگر حقیقت کوئی چیز ہے اور اگر حق کسی اچھے خلق کا نام ہے۔ تو میں اپنے ضمیر کے اس بے باکانہ اقدام پر نہایت مسرور ہوں کہ میں نے بلا لومہ لائیم اظہار حق کیا ہے؟ آخر میں عرض ہے کہ آپ ان چند سطور کو شائع فرمادیں۔ تاکہ دنیا مضمون نگار کی حق طلبی آخری نظارہ بھی دیکھے۔

قاروق کا پیورہ

قاران:-

آپ کے خیالات میں بحسنہ شائع کیے دیتا ہوں۔ ان پر وہ صاحب
 خور کریں گے جن کو آپ نے مخاطب فرمایا ہے۔ لیکن اتنا میں بھی
 کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کے تمام لٹریچر میں قرآن
 مجید کے بعد صحیح بخاری سے زیادہ کیا معنی اس کے برابر کی بھی کوئی
 کتاب موجود نہیں ہے اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ لیکن آخر روایت کی یہ تمام
 کتابیں بھی تو بے کار نہیں ہیں اور ان سے بھی تو علمائے اسلام نے
 اجتہاد و استنباط مسائل میں کام لیا ہے۔ کیا یہ اتنا بڑا ذخیرہ بالکل لغو
 اور لاطائل ہے؟ البتہ اگر آپ کا یہ منشا ہے کہ اختلافی مسائل میں سے
 وہ چیزیں جن کا تعلق فضائل صحابہ یا مشاہیرات قرن اول سے ہے۔ ان
 میں صحیح بخاری کو حکم مان کر کم درجہ کی روایات ترک کر دی جائیں اور
 ان کو بحث میں نہ لایا جائے تاکہ فرقی اختلافات دور ہو جائیں، تو
 آپ کی خوش نیتی میں مجھے بھی کلام نہیں۔ بشرطیکہ تمام
 فرق اسلامیہ اس پر تیار ہوں۔ اور آپ کے مانعہ کو وہ بھی اتنا ہی
 مستند تسلیم کریں۔ جتنا آپ تسلیم کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ
 مشکل نہ ہو تو یہ ساری بحثیں بے کار ہیں۔ کیونکہ ان کا حاصل
 نہ اب تک کچھ نکلا ہے نہ آئندہ نکلنے کی امید ہے۔ سمجھ
 میں نہیں آتا کہ ”گرفنار“ ابو بکر و علیؓ کی یہ خانہ جنگیاں کب ختم

ہوں گی۔ اور کب اصلی اور بنیادی کام مسلمانوں کے سامنے آئیں گے! آپ نے کئی جگہ مجھ کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ آپ کو کہیں "خارجی" نہ کہہ دوں۔ اہل قیلہ کی تکفیر میرا مسلک نہیں ہے اور میں ایسے فتوؤں سے اپنے کو علیحدہ رکھتا ہوں۔ آپ کم از کم میرے فتوے سے مطمئن رہیں۔



jabir.abbas@yahoo.com

۱۴۶

بحث خلافت و امامت پرایک نظر

jabir.abbas@yahoo.com

علامہ عینی شاہ نظامی
حیدرآبادی
خلیفہ
حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب

jabir.abbas@yahoo.com

بحث ”خلافت و امامت“ پر ایک نظر



مؤقر سالہ فاران میں بعنوان خلافت و امامت بجواب پنڈت ہرنام جی صاحب مولانا فاروق صاحب کی جوابی تحریر دیکھی اور انھیں کی زبانی ہرنام جی کی داستان بھی سنی۔ یہ بحث بجٹی فضول اور اس کا نتیجہ بے حصول ہے۔ رہیں طنزیہ تحریریں۔ اس سے نہ حضرت ابوبکر قولہ بھگٹ سکتے ہیں اور نہ جناب امیر رتی بھگرم ہوتے ہیں۔ نہ موطا حضرت ابوبکر کی تنقیص کر سکتی ہے اور نہ بخاری جناب امیر کی عظمت کو کم کر سکتی ہے۔ ہمارے غنڈیہ میں پنڈت جی کی وسعت تحقیق مسلم اور مولانا کا امام بخاری سے بے حد خلوص بے کیفیت و کم۔

بخاری کا اصح کتب ہونا امام ابوبکر بن ختمیہ تلمیذ امام بخاری کا عقیدہ تھا نظریہ ہے۔ جو ایک حلقہ میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا امام شافعی کے عقیدہ اصح الکتب تحت ادیم السماء بعد کتاب اللہ الموطا سے شروع ہوئی اور بوعلی نیشاپوری کے جذبہ ماتحت ادیم السماء اصح من کتاب مسلم القرآن پر ختم ہوئی۔ یہ اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ اس پر دوسرے کا بس نہیں۔ اس کو عقیدہ کی حد تک رکھا جائے تو مناسب ہے۔

قرآن و حدیث | ہم مسلمان قرآن مجید کے لفظ لفظ اور آیت آیت کو وحی ربانی اور کلام حقانی مانتے ہیں۔ اور ان ازل

لہ اخبار منادی دہلی ۵ و ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء

تا ابد اس کو واجب التعمیل اور قابل احترام جانتے ہیں۔ یہی حدیث یہ بھی اگر باللفظ اور بالتواتر مروی ہے تو بعد کلام باری سرانکھوں پر اور یہی ہے مسلک امام ابو حنیفہ۔

ما جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الراس والعين سلف اور خلف اس پر متفق ہیں کہ ہماری ساری مرویات بالمعنی ہیں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا اور کہا اس کا خلاصہ صحابہ نے اپنے لفظوں میں تابعین کو اور تابعین نے جو سنا اس کا مفہوم اپنے لفظوں میں تبع تابعین کو سنایا اور انھوں نے ان لفظوں کو مطالب کے ساتھ محفوظ کر لیا اور روایت کی

۹۵ حصہ سے ابو حنیفہؒ نے روایت بالمعنی کی ردک تمام کرتے ہوئے روایت باللفظ پر زور دیا اور علی الاعلان فرمایا۔ لا حجة الا فيما رواه الراوى من حفظه وقت ذکر کا (ابن الصلاح) مگر سنے کون؟ کثرت روایت کا اس درجہ شوق تھا کہ ہزاروں حدیثیں بالمعنی مروی ہو گئیں۔ جس کا خمیازہ آج امت اٹھا رہی ہے علامہ ابن البرکتاب الکفی میں لکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ کی نہ سن کر ارباب روایت نے بڑی غلطی کی۔ جیسے دم تک امام صاحب اس کے پابند رہے۔ مگر ہزاروں بالمعنی روایات کو روک نہ سکے۔ مگر پھر بھی ان پر چپ نہ قیود عائد فرما گئے، راوی میں ثقاہت عدالت اور صداقت کے علاوہ فتاہت بھی رہے (۲) کوئی بھی حدیث شواہد کے بغیر قبول نہ ہو۔ (۳) کوئی حدیث خلاف قرآن، منافی وقار نبوت، معارض واقعہ مشہورہ یا مخالفت اصول جمع علیہا مروی نہ ہونے پائے۔ مگر ارباب روایت نے اس پر شور و غل مچایا اور امام صاحب کو اہل الرائے قرار دیا۔

احادیث بخاری کی ہوں کہ طبری کی، مسلم کی ہوں کہ طبرانی کی، سب کی سب بالمعنی مروی از قسم احاد اور منیع ظن ہیں۔ یہ قطعی الثبوت والدالہ نہیں۔ ہمارے محدثین نے جمع احادیث میں بڑی بڑی کڑیاں بھیلیں اور ہمارے لیے ایک بڑا ذخیرہ

رکھ چھوڑا۔ مگر سب کا دار مدار راوی کے معتد اور غیر معتد سمجھنے پر رہا۔ جس کو معتبر جانا اس سے حدیث لی۔ جس کو معتبر نہ جانا اس کی روایت چھوڑ دی۔ یہاں پر دیکھنا یہ ہے کہ احمد ہوں یا بخاری، ان بزرگوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک تین چار واسطے ضرور ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے استاد کے سوا اوپر کے کسی راوی کو دیکھا نہ سنا، ہمارا یہ کلیہ کہ چونکہ یہ بڑے ائمہ ہیں ان کے کل راوی ثقہ و صدوق ہوں گے محض حسن ظن ہے۔ جب حسن ظن پر بات ٹھہری یہ مخصوص بالبخاری کیوں؟ دوسرے اس سے محروم کیوں؟ اور اگر چھان بین کی ٹھہری تو بخاری اس سے مستثنیٰ کیوں؟

کہتے ہیں کہ کتب رجال اوپر کے راویوں کے حالات کا آئینہ ہیں۔ یہ ایمان بالغیب ہے اور شاہدہ اس کے خلاف ہے۔ کتب رجال بھی کتب الناسانی ہیں۔ ایک کتاب میں ایک کو ثقہ اور دوسری میں غیر ثقہ لکھا ہے۔ بلکہ ایک ہی میں ایک ہی کو ثقہ و غیر ثقہ لکھا ہے۔ بعض جگہ ایک امام فن نے ایک کو ثقہ اور دوسرے نے غیر ثقہ لکھا ہے اور نیز ایک ہی امام نے ایک ہی کو ثقہ اور متروک بھی فرمایا ہے۔ بعض جگہ ایک راوی کو ایک جماعت کذاب متروک ناقابل روایت سارق حدیث و مضارع و دجال کہتی ہے مگر صرف ایک امام فن اس کو ثقہ تسلیم کرتا اور اس سے حدیث روایت کرتا ہے۔ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ (ستیدین زید الجہال سے) جس کو ایک جماعت نے متروک کر دیا امام فن بخاری اس سے اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں۔ بعض وقت ایک جماعت ایک شخص کو ثقہ و صدوق حجت اور امام کہتی ہے۔ مگر ایک امام وقت اس راوی کو ناقابل حجت کہتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ امام حنفی صادق جن کو تمام محدثین مانتے ہیں بخاری انھیں ناقابل روایت سمجھتے ہیں۔

مولانا کی طرح جامع بخاری کو ہی مضبوط ماخذ روایات ماننے پر نہ ہم آمادہ ہیں اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بخاری کے سوا ہماری اور ساری تفسیر و حدیث کی کتابیں جو عبد الرزاق ابن ابی شیبہ، ابو حنیفہ، شافعی، احمد ابن راہویہ، ابو یعلیٰ، عبد بن حمید، ابن منصور، نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، دارمی، بیہقی، ابن عساکر، ابوحاتم، ابن خزیمہ، طحاوی، ابن حبان، حاکم، ضیاء مقدسی، طبرانی، طبری، ابن اسحاق، ابن مہاشم، احلبی، ابن عبد البر، ابن سعد، ابن عساکر، خطیب، ابن مرد دہیہ، ابن مغازلی، ویلی، عاصمی، ابوالحسن الملا، تعلبی، واحدی، ابن ابی حاتم، امام ہاشمی اور بخاری سے منسوب ہیں۔ تودہ خرافات اور مجموعہ موضوعات و ضعیفات ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے سلف صالحین اور علمائے عظامین مثل علامہ عینی، نووی، ابن حجر، سبکی، ذہبی، قسطلانی، زرکانی، شوکانی، قاری، متقی، سیوطی، ابن حجر مکی، شیخ دہلوی اور شاہ ولی اللہ نے ان ہی کتب سے ان گنت روایتیں اپنی تصنیفوں میں لی ہیں اور ان کتب کو مستند اور قابل استناد تسلیم کیا ہے۔

امام بخاری فن حدیث کے بڑے امام اپنی آپ نظیر اور خاص شان کے محدث ہیں مگر محضوم اور محفوظ عن الخطا نہیں۔ ان سے پہلے بھی اور ان سے بعد بھی صد ہا جلیل القدر ائمہ فن گزرے ہیں اور اپنی صد ہا تصنیفیں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ ہم اور ہمارے سلف ان سب کو ماننے میں اور سب کی روایتیں لیا کرتے ہیں۔ خود بخاری و مسلم بھی تو عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ و امام احمد کی کتابوں سے برسوں متمتع ہوئے ہیں۔ سو دوسو کتب حدیث میں ایک بخاری کی صحیح بھی ہے۔ ہر کتاب قابل احتجاج اور ہر کتاب مستند ہے ہر کتاب میں صحیح، حسن، ضعیف و مستقیم روایتیں ہیں۔ کہیں کم کہیں زیادہ نہ ہم اس کے

قابل کہ بخاری میں جو بھی ہے وہ سب صحیح ہے۔ اور نہ ہم اس کے معتقد کہ اس سے باہر جو ہے وہ غیر مستند، ناقابلِ حجت یا ہمیشہ سوختنی ہے۔ یہی ہمارا مسلک ہے اور یہی ہمارے ائمہ حنفیہ کا طرز ہے۔

پہنچنے شیخ عبدالحق محدث دہلوی جو حنفیہ کے مستند عالم اور محدث ہیں۔ شرح سفر السعادت میں رقمطراز ہیں :-

۱) صحیح مسلم و بخاری منحصر نیست از غیر انہما ہم حدیث صحیح را اندزواں کردہ۔
 (۲) احادیث صحیحہ منحصر نیست در صحیحین بخاری و مسلم و ایشاں استیعاب نہ کردہ اند،
 جمیع صحاح را کہ نزد ایشاں بود بر شرط ایشاں چہ جلدے مطلق صحیح (۳) کتب ستہ
 کہ مشہور اند در اسلام گفتہ اند کہ در اینجا اقسام حدیث از صحیح و حسان و ضعات
 ہمہ موجود است (۴) یہ تحقیق روایت کردہ است امام مسلم در کتاب خود از بسیار
 از رواۃ کہ سالم نیستند از غوائل جرح و مچنین در کتاب خود بخاری از جماعت روایت
 کردہ کہ تکلم کردہ شدہ است در ایشاں (۵) در کتب نسائی و ابن ماجہ و ابو داؤد
 و احمد و طبرانی و عبد اللہ بن احمد و عبد الرزاق و ابن منصور و ابن ابی شیبہ و ابو یعلیٰ
 و حاکم و طبرانی و دارقطنی و ابو نعیم و بیہقی صحیح و حسن و ضعیف ہمہ اقسام حدیث نمایاں
 اماں ہر چہ در سند امام احمد است ہمہ مقبول است و ضعیف وے نیز قریب حسن
 است۔

امام ابن حجر عسقلانی قول مسدو میں اور علامہ ابن ہمام بھی فتح القدیر میں قریب قریب یہی فرما رہے ہیں۔

عقیدت اور بات ہے، واقعہ اور چیز ہے، عقیدت سے واقعہ کا کوئی تعلق نہیں
 عقیدت منوائی نہیں جاتی، واقعہ اپنے آپ کو منوا کر رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ
 بخاری میں بھی صحاح و حسان، ضعات و منکر مرفوعات اور تعلیقات ہیں شانی

کنیتوں اور ناموں کا اختلاط آج بھی لائیں ہے۔ رغزوات خطبات اور بعض واقعات کی ناقابل بیان قطع و برید و جہ اختصار پسندی ہو گئی ہے جو بخاری سے باہر باسناد بحید تفصیل سے ملتے ہیں۔ تعلیقات کی بھرمار نے آپ کے معاصر امام ابوحنیفہ کبیر کو آپ کا مخالف کر دیا۔ اور بعد والوں میں ابن حزم مدینی مسہیوں کو اس کتاب پر جرح کا کافی موقع دیا۔ ان کے علاوہ فرقہ ہائے ابا ضیہ، خارجیہ، ناصبیہ، رافضیہ، جہمیہ مرجیہ و قدسیہ کی ان گنتی روایتیں اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ ابن حجر جیسے بخاری پرست محدث بھی نخبہ میں لکھتا ہے :-

ان الرجال الذین لکلم فیہم من رجال مسلم اکثر عددًا من رجال البخاری۔

اور علی القاری شرح نخبہ میں فرماتے ہیں :-

وان الذین انفرد بہم البخاری اربع مائۃ و خمس و ثلاثون رجلًا و املتکلم فیہم باضعف نحو من ثمانین و الذین انفرد بہم مسلم نحو ستمائۃ و عشرون و املتکلم فیہم بالضعف مائۃ وستون کما ذکرہ السخاوی فی شرحہ علی لفتۃ الممالک

مختصر یہ کہ بخاری میں چار سو پینتیس حدیثیں منفرد ہیں جن میں انتہی ضعیف ہیں اور مسلم میں چھ سو بیس حدیثیں منفرد ہیں جن میں ایک سو ساٹھ ضعیف ہیں۔

بخاری کے چند ضعیف راویوں کے نام

۱۔ سید بن زید الجہال ابو محمد کوئی، کذاب و متروک۔ ابن معین نے کہا کذاب ہے نسائی و احمد نے کہا متروک ہے، ابن حجر نے کہا کہ کسی کے نزدیک بخاری پر ثقہ نہیں۔

۲۔ عبد الرحمن بن عبد اللہ بن دینار۔ ابن معین نے کہا ضعیف ہے، ابو حاتم نے کہا ناقابلِ روایت ہے، احمدی نے کہا ناقابلِ حجت ہے، دارقطنی نے کہا اس سے روایت کرنا بخاری کے لیے عجیب ہے۔

۳۔ اسحق بن محمد بن اسماعیل الفزوی۔ مرہ نے کہا مضطرب ہے، عقیلی نے کہا وہابی ہے، نسائی نے کہا ثقہ نہیں، دارقطنی نے کہا ضعیف ہے۔ ابو داؤد نے کہا راوی منکرات ہے۔

۴۔ اسماعیل بن ادیس۔ نسائی نے کہا ضعیف ہے۔ ابن معین نے کہا چور ہے، دارقطنی نے کہا کذاب ہے، ابن عدی نے کہا سابقِ حدیث ہے۔

۵۔ ذکریا بن یحییٰ طائی۔ دارقطنی نے کہا ضعیف ہے۔ یحییٰ نے کہا راوی منکرات ہے۔ حاکم نے کہا کثیر الاغلاط ہے اور ابو داؤد نے منکر الحدیث ہے

۶۔ عبد العزیز دراوردی۔ احمد نے کہا وہابی اور کثیر الاغلاط ہے۔ ابو ذرعه نے کہا سخی الحفظ ہے۔ نسائی نے کہا منکر الحدیث ہے۔ ابو حاتم نے کہا ناقابلِ احتجاج ہے۔

۷۔ محمد بن طلحہ بن مصروف کوئی۔ ابن سعد نے کہا راوی منکرات ہے، عفان نے کہا کذاب ہے، ابو داؤد نے کہا کثیر الخطا ہے، نسائی نے کہا ضعیف ہے۔ ابو کامل نے کہا لا یجوز فیہ الحدیث۔

۸۔ محمد بن یزید کوئی۔ ابو حاتم نے کہا خطی ہے۔ ابو ذرعه نے کہا چور ہے، اور خود بخاری نے کہا ضعیف ہے۔

۹۔ معلى بن منصور رازی۔ احمد نے کہا کثیر الخطا ہے، ابو حاتم نے کہا کذاب ہے۔ یحییٰ نے کہا ثقہ نہیں۔

۱۰۔ یحییٰ بن ذکریا غسانی۔ ابو داؤد نے کہا ضعیف ہے۔ ابن معین نے

کما مجہول ہے۔ ابن حبان نے کہا لا یجوز اعنہ الروایۃ۔ یحییٰ نے کہا کذاب ہے، دجال ہے، حدیثیں بنایا کرتا ہے۔

۱۱۔ عتاب بن بشیر جزری۔ احمد نے کہا ضعیف ہے۔ نسائی نے کہا قوی نہیں، ابن ہمدی نے کہا مسترک ہے۔

۱۲۔ فلیح بن سلیمان۔ یحییٰ و ابو حاتم و ابو داؤد نے کہا ناقابل احتجاج ہے۔ ابن معین و نسائی و ابو حاتم نے کہا قوی نہیں، ثقہ نہیں، ابو داؤد نے کہا کچھ بھی نہیں، نسائی نے کہا بے اتہا ضعیف ہے۔ سعید بن منصور نے کہا کثیر الخطا ہے، ابن عدی نے کہا رادئی غرائب ہے۔

۱۳۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس۔ یحییٰ بن سعید نے کہا جھوٹا ہے۔ مالک نے کہا ناقابل اعتبار ہے۔ علی بن عبد اللہ بن عباس نے کہا کذاب ہے غلیظ ہے میرے باپ کے نام سے جھوٹی روایتیں کرتا ہے۔ سعید بن سید نے کہا کذاب ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا جھوٹا ہے۔ ابن سیرین نے کہا کذاب ہے۔ ابن ابی ذئب نے کہا ثقہ نہیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا دروغ بات ابن سعد نے کہا اس کی روایتیں ناقابل اعتبار ہیں۔

۱۴۔ مرفان بن حکم بن عاص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعنت کردہ ملعون بن ملعون۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم بن العاص و مروان فی صلبہ۔ جھوٹا فاسق، قابل طعمہ، دشمن آل نبی۔ اس کی بھی روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔

صحیح بخاری ہو کہ صحیح مسلم آخر انسانی کتاب میں ہیں۔ ان میں غلطیوں کا رہ جانا کوئی بات نہیں۔ امام صاحبوں نے اپنے امکان تک جانچ پڑتال کی اور لاکھ دولاکھ

کے ذخیرہ سے جوکل کے کل آپ دونوں کے عندیہ میں صحیح تھے کاٹ چھانٹ کر یہ دو کتابیں ہمارے لیے چھوڑیں۔ انہی یا انہی سے بڑھ کر ضعیف حدیثوں کا اس میں پایا جانا کوئی بات نہیں۔ مگر ان میں اردوں کی بہ نظر صحیح کی مقدار زیادہ ہے۔ رہا یہ عقیدہ کہ جو کچھ بخاری میں ہے وہ سب صحیح ہے۔ یا بخاری میں جو بات نہیں وہ غلط ہے محض عقیدت ہے۔ اور واقعہ اس کے برعکس ہے۔ بخاری نے ایک لاکھ صحیح حدیثیں جو اپنی شرط پر تھیں حفظ کیں اور ان میں سے صرف چار ہزار اس کتاب میں درج کیں اور بقیہ ۹۶ ہزار صحیح حدیثوں کو بخیر طوالت کتاب ترک کر دیا۔ پھر ایسی کتاب ساری صحیح حدیثوں کا کیونکر مجموعہ ہو سکتی ہے۔

مولانا کا یہ تحقیق کہ جناب امیر کا ممبر اسلام میں چوتھا بلکہ

سابقیت اسلام

نقلاً درست ہے اور نہ عقلاً صحیح ہے۔ آپ کے مضبوط ماخذ یعنی بخاری کی ہر دو روایتیں معلول اور مستقیم ہیں۔ ہر دو میں ایک مشترک راوی اسمعیل بن ماجہ ہے جو ضعیف ناقابل اعتبار اور بے انتہا ستیم ہے۔ نسائی کہتے ہیں بے انتہا ضعیف ہے۔ حاکم کہتے ہیں ناقابل اعتبار ہے، دارقطنی کہتے ہیں بالاجماع ضعیف ہے۔ سعدی کہتے ہیں نامحمود شخص ہے۔ ابو ذر کہتے ہیں نہ ادھر ہے نہ ادھر ہے۔

اس ناقابل قبول روایت کو لیے ہوئے جمہور کے برخلاف جو جناب امیر کو بعد حضرت خدیجہ سابق الاسلام ملتے ہیں، بخاری کھڑے ہوئے ہیں روایت بھی وہ جس میں پانچ گنا غلاموں کا اسلام میں سابق ہونا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب امیر کا بعد حضرت خدیجہ کے سابق الاسلام ہونا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں مجھ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے علی ہیں اس کی روایت امام احمد نے سیدنا عمر سے، اطہرانی نے حضرت سلمان سے

بزار نے حضرت ابو ذرؓ سے، عقیلی نے برابر بن عاذب سے، امام احمد و طبرانی نے
 معقل بن یسار سے، دارقطنی نے ابوسعید خدریؓ سے، دیلمی نے حضرت سعد
 ابوسعیدؓ و ام سلمہ و جابر و اسماء بنت عیسٰی سے، حاکم نے معاذ سے، عقیلی
 نے حضرت عائشہؓ سے، حاکم ابن عدی، خطیب اور ابن اسامہ نے سلمان سے
 بزار نے حضرت علیؓ سے، حاکم نے ابولعلیؓ سے، ابونعیم نے حضرت معاذ اور
 ابوسعید رضی اللہ عنہم سے کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے
 بعد کسی اور کی شہادت ناقابل قبول ہے۔ مگر مزید قوتِ روایت کے لیے صحابہ کی
 شہادتیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ امام احمد نسائی و ترمذی و حاکم و طبرانی نے حضرت زیدؓ
 بن ارقم سے، ترمذی و بغوی نے حضرت انسؓ سے، طبرانی و احمد نے حضرت جابرؓ
 و ابو رافعؓ سے، طبرانی و حاکم نے حضرت انسؓ سے، ترمذی و طبرانی و حاکم و ابن
 جریر نے ابن عباسؓ سے، طبرانی نے حضرت جابرؓ سے، ابن عبد البر نے حضرات
 ابن عباسؓ، سلمانؓ، ابو ذرؓ، خطابؓ، مقدادؓ، زید بن ارقمؓ، جابرؓ، ابوسعید خدریؓ
 حضرت عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے، حاکم نے ابوموسیٰؓ و زید بن ارقمؓ سے، امام
 شافعی، طحاوی، ابن ابی شیبہ، امام احمد و ترمذی، حاکم و بیہقی و ابن عبد البر و
 ابن ابی خثیمہ نے زید بن ارقمؓ سے، طبرانی و ابن عبد البر و عبد الرزاق و حاکم و
 ابن سعد نے ابن عباسؓ سے، امام ابو حنیفہ، احمد و نسائی و حاکم و بزار و ابولعلیؓ
 نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے، کہ بعد حضرت خدیجہؓ کے علیؓ ابن ابی طالب
 سابق الاسلام ہیں۔ محمد ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں اور ابن عبد البر نے استیعاب
 میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جناب امیرؓ کے سابق الاسلام بعد خدیجہؓ ہونے پر صحابہ
 کا اجماع ہے۔

ان روایات کو ترمذی و حاکم و ابن عبد البر اور ابوجعفر طبری و ابویوسف مقدسی

اور ابن حجر نے صحیح مانا ہے۔ اور عقیق کندی والی روایت کہ نئے دین پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خدیجہ و جناب امیرؓ کے سوا کوئی چوتھا روئے زمین پر نہ تھا، اسی دن میں نے اسلام قبول کر لیا ہوتا تو میرا نمبر چوتھا ہوتا، اس کی روایت خود بخاری نے تاریخ میں 'ابن اسحق و امام احمد و طبرانی و ابویعلیٰ و حاکم و بغوی و ابن عبد البر و نسائی نے اپنی تصنیفوں میں کی ہے اور یہ حدیث ترمذی ابن عبد البر ابو جعفر طبری، ابن حجر و سیوطی کے عندیہ میں درجہ صحیح کی ہے۔ اتنی زبردست شہادتوں کے مواجہ میں تنہا بخاری کی روایت وہ بھی معلول اور سقیم کس کام کی؟

ہجرت کا واقعہ | جیسے حضرت ابوبکر کا واقعہ قرآن میں و ثانی اثنین اذھا فی الغار سے مفہوم ہے، ایسے ہی حضرت

علیؓ کا بستر رسولؐ پر آپ کی چادر اور سے سونا آیت و من الناس من یشہی نفسه ابتغاء مرضات الله والله مرؤف بالعباد سے مترشح ہے جیسے "صاحب" کی تشریح میں متعدد صحابہ نے حضرت ابوبکر کا نام لیا ہے اسی طرح تفسیر من یشہی نفسه میں کئی صحابہ نے جناب امیرؓ کا نام لیا ہے اگر اس کو امام بخاری نے بقول علامہ ابن رحمہ اندلسی بدآئینا آوردہ مسلم لاندہ آوردہ بکمالہ و قطعہ البخاری واسقط فیہ علی عادتہ

کمانی و هو مما عیب علیہ فی تصنیفہ علی ماجری ولا میما اسقاطہ لذكر علی ابن ابی طالب۔ محض نام علیؓ آنے کی وجہ سے ساقط فرما دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ جب کہ ۹۶ ہزار صحیح حدیثیں اس کتاب سے غائب ہیں وہاں ایک کا کیا ذکر۔ مگر امام ابن اسحق کی سیرت میں، سیرت ابن ہشام میں، تاریخ طبری میں، صحیح حاکم میں مسند طیالسی میں، مسند احمد و سنن ابوعوانہ و سنن نسائی و خصائص میں، تفسیر ابوجاہم و تفسیر

تعلیمی و واحدی و اسد الغابہ وغیرہم جیسی مستند کتب میں یہ واقعہ تہامہ موجود ہے۔ اور شاہ ولی اللہ ہمارے شیخ الشیوخ بھی ازالۃ الخفا میں اس کو لکھتے ہیں اور ذہبی جیسے مشہد اس کو حدیث صحیح فرماتے ہیں (مستدرک ص ۱۳۳ ج ۱) اور حاکم جیسے امام فن بخاری کو اس کے ترک کا طعنہ دیتے ہیں اور مولانا شبلی جیسے بخاری پرست نے سیرت جلد اول ص ۱۹ میں لکھا ہے۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا جناب امیر کو معلوم تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا، پنڈت ہر نام صاحب کے اور مولانا فاروق صاحب کے معرکہ توہن صحابہ سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا تو یہ مقولہ ہے، کہ جناب امیرؑ نے جانیا زنی کی انتہا کر دی اور جناب ابو بکرؓ نے جان نثاری کی حد کر دی رضی اللہ عنہما۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائی علیؑ | مواخات نبیؐ و علیؑ کا تذکرہ بخاری میں نہیں نہ سہی۔ مگر

واقعہ سچا اور مستند شہادتوں سے ثابت ہے۔ ترمذی، حاکم، بغوی نے حضرت ابن عمرؓ سے امام احمد نے زید بن ابی اوفیٰ یعلیٰ بن مرہ، عمرو بن العاص ابن عباس اور حذیفہ رضی اللہ عنہم سے۔ ابن مردویہ نے حضرت زید بن ارقم سے، عبد اللہ بن احمد نے ابن عمرؓ سے، طبرانی نے ابو رافع و ابن عباس سے، ابن عساکر نے ابو امامہ سے، نسائی نے حضرت ابن عباس اور زید بن ارقم سے، ابن عبد البر نے ابو الطفیل سے، ابن مردویہ نے حذیفہ بن یمان سے، ابو الحسن ابن المغازلی نے حضرت انس سے روایت کی کہ مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات قائم کرنے کے بعد حضرت علیؑ سے فرمایا کہ تم دنیا میں بھی ہمارے بھائی ہو اور آخرت میں بھی ہمارے بھائی ہو۔ سولہ محدثین عظام اور بارہ صحابہ کرام کی زبردست شہادت سے

یہ واقعہ ثابت ہے۔ اس کا انکار ممکن نہیں۔

سَدِّ ابواب کا تذکرہ | حدیث سَدِّ ابواب

عَلٰی کی روایت نہ صرف ثابت اور صحیح ہے بلکہ کبار محدثین کے پاس متواترات سے ہے۔ ثلوث صحابیوں سے تیرہ محدثین نے باسناد جمید من وعن روایتیں کی ہیں۔ امام احمد نے سند اور مناقب میں حضرت زید بن ارقم و براہ بن عازب و سیدنا عمرو ابو ہریرہ و ابن عمر و سعد رضی اللہ عنہم سے، امام نسائی نے حضرت ابن عباس و ابن عمر و حرب بن مالک و زید بن ارقم و سعد بن مالک و براہ بن عازب سے، حاکم نے مستدرک میں حضرت زید بن ارقم و براہ سے طبرانی نے سعد و ابن عباس و جابر بن عمر و ناصح بن عبداللہ اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے، ابن سمان نے حضرت ابو ہریرہ سے ابن المغازی نے حضرت سعد سے، بیہقی نے حضرت ام سلمہ سے، ابوبکر بزار نے عمرو بن سہیل سے، ابن مردویہ نے حضرت علی سے، ابن عساکر نے عثمان بن عبداللہ سے اور ابوسعید نے شرف النبوة میں حضرات سعد و جابر بن عبداللہ سے اس سَدِّ ابواب والی حدیث کی روایت کی ہے۔

تنقید حدیث | علامہ ابن حجر فتح الباری شرح بخاری میں الابواب

عَلٰی کی نسبت لکھتے ہیں کہ امام احمد و نسائی کی حدیث سعد کے سارے طرق قوی اور ثابت ہیں۔ طبرانی نے بھی اس کی ثقہ راویوں سے روایت کی ہے۔ دوسری حدیث زید بن ارقم مرویہ احمد و نسائی کا ہر طریقہ قوی اور ان کے سارے رجال ثقہ و صدوق ہیں۔ تیسری حدیث جابر بن عمر مرویہ طبرانی اور چوتھی حدیث ابن عمر مرویہ امام احمد کے کل راوی درجہ حسن کے ہیں۔ پانچویں حدیث ابن عمر مرویہ نسائی میں علامہ ابن عساکر کے علاوہ (جو ابن معین اور

احمد کے نزدیک ثقہ مگر اور دل کے نزدیک ثقہ نہیں، باقی سارے راوی ثقہ و صدوق ہیں جو امام احمد کے پاس حدیث صحیح ہے ترک بھی کر دیا جائے تو احادیث سعد و زید بن ارقم مرویہ احمد و نسائی سب کے پاس صحیح ہیں اور احادیث جابر بن سمروہ مرویہ طبرانی اور حدیث ابن عمر مرویہ امام احمد حدیث حسن ہے اور ثبوت کے لیے یہ بہت ہیں۔

مطابقت روایات

حافظ احمد بن عمر عبد الخالق صاحب مسند و تلمیذ خاص امام بخاری نے اپنی سندیں اور امام طحاوی حنفی نے مشکل الآثار میں ان دونوں روایتوں کی یوں تطبیق کی ہے کہ باب علی کے سوا سارے دروازے بند ہونے کا حکم ہوا تو سب دروازے بند کیے گئے سوائے دروازہ علی کے۔ مگر ان صحابہ نے جن کے مکان مسجد کے ارد گرد تھے نماز کے اوقات کی آگاہی کے لیے جانب مسجد کھڑکیاں رکھ لیں۔ جس پر دوبارہ ان کے بند کرنے کا حکم ہوا اور حضرت ابو بکر کی کھڑکی کھلی رکھی گئی۔

محمّد بن جریر نسبت حدیث
نوخہ حضرت ابو بکر

ابن عمر مرویہ احمد عند الجمهور صحیح و ثابت ہیں۔ امام بخاری کی روایت میں اضطراب ہے۔ کہیں نوخہ کا لفظ ہے اور کہیں باب کا اور دونوں کے معنی جدا جدا ہیں۔ اس کے راوی فلج بن سلیمان بن ابی مغیرہ جو حضرت ابو سعید سے تفسیر سے ہیں مجروح اور ضعیف ہیں۔ ابو حاتم نے بروایت معاویہ بن صالح نقاد بن جحش بن معین سے فلج کا غیر ثقہ ہونا نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے توان کو لیس لشیعہ لا یجوز عند الروایۃ لکھا ہے۔ نسائی کہتے ہیں کہ یہ وہی اور بے اہم ضعیف ہیں۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ یہ راوی غرائب و مناکیر ہیں اور سعید بن منصور کا

قول ہے کہ یہ کثیر الخطا ہیں۔ (وتمہذیب التہذیب ابن حجر جلد ۸ ص ۳۰۴) دوسری روایت ابن عباس مرویہ بخاری خود ان صحیح روایات ابن عباس مرویہ احمد و ترمذی و نسائی متعلقہ باب علیؑ کے مخالف ہے۔ چنانچہ یہ بھی ائمہ محدثین کے نزدیک صحت کے معیار سے گری ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا راوی عکرمہ غلام ابن عباس ہے جو سخت خارجی اور ناصبی ہونے کے علاوہ کذاب اور حدیث وضع کرنے والا ہے۔ یحییٰ ابن سعید کا قول ہے عکرمہ کذاب ہے۔ امام مالک کا بیان ہے کہ وہ ناقابل اعتبار ہے۔ حضرت ابن عباس کے فرزند علی کا کہنا ہے کہ عکرمہ کذاب ہے، خبیث ہے اور دجال ہے، میرے باپ کے نام سے حدیث بنانا کر روایت کرتا ہے۔ قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق کہتے ہیں، کہ عکرمہ جھوٹا ہے۔ سعید بن مسیب خیر التابعین کا قول ہے کہ عکرمہ کذاب ہے۔ عطاء بن رباح اہل تابعی کا قول ہے کہ عکرمہ کذاب ہے اور ابن عباس کی طرف سے حدیث بنانا کر روایت کرتا ہے۔ علامہ ابن سیرین کا بیان ہے کہ عکرمہ کذاب ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں عکرمہ کذاب ہے۔ ابن ابی ذئب نے کہا ثقہ نہیں ہے۔ ابن سعد نے کہا لا یجوز عنہ الروایت۔ علی المدینی عطاء بن ابی رباح تابعی جلیل، خیر التابعین سعید بن المسیب، یحییٰ بن کبیر اور مصعب بن زبیر کہتے ہیں کہ عکرمہ سخت خارجی ہے لوگوں نے اس کے جنازہ کی نماز تک نہ پڑھی۔ غور کا مقام ہے کہ یہ روایت جس میں عکرمہ ہو کس حیثیت کی ہو سکتی ہے۔

یہ کسے بغیر مانہیں جاتا کہ جامع بخاری عکرمہ جیسے جھوٹے اور واضح ہدایت کی روایتوں سے اور مروان بن عیین بن عیین جیسی شخصیت کی روایتوں سے تو لامال ہے مگر سیدنا عیین بن عیین اوّل قرنی اور امام الصادقین امام جعفر علیہ السلام کی

روایتوں سے معریٰ ہے، مروان اور حکمرانہ تو بخاری کے نزدیک مقبول گزراؤں قرنی اور جعفر صادق نامقبول۔ اے سبحان اللہ۔

علامہ ابن جریر طبری اور عینی شارح بخاری کا کہنا یہ ہے کہ مسجد نبوی سے ملحق سیدنا ابوبکر کا کوئی مکان نہ تھا۔ ہجرت پر آپ بنی عبدعوف میں مقیم رہے اور اسی مکان میں حضرت عائشہ کا زفاف بھی ہوا (بخاری) اور یہیں عبداللہ بن زبیر آپ کے نواسے پیدا ہوئے۔ یہاں سے مسجد تک تقریباً میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ تھا، (عمدة القاری شرح بخاری جلد ہفتم ص ۶) ایام علالت نبوی میں آپ مقام سخ میں جو حوالی مدینہ سے ہے رہتے تھے۔ بوقت رحلت رسالت آپ اور کمئ دن بعد رحلت بھی یہیں مقیم تھے۔ امام بخاری نے کتاب الصلوٰۃ کتاب المناقب اور کتاب الجنائز میں بھی لکھا ہے۔ اقبل ابوبکر علی فرسہ من مسکنہ بالسخ۔ خود حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر خلیفہ ہونے کے چھ مہینے بعد تک بھی اپنے مکان مقام سخ میں رہتے تھے۔ وہاں سے علی الصبح مدینہ منورہ کبھی پیدل کبھی گھوڑے پر آیا کرتے تھے، اشعار کی نماز پڑھ کر پھر واپس جاتے تھے۔ آپ کبھی نہ آتے تھے تو آپ کی جگہ عمر بن الخطاب نماز پڑھا دیا کرتے تھے (تاریخ طبری ص ۲۱۴)

مولانا فاروق کا یہ ذمہ آمیز کلام، کہ یہ بزرگوار سپاہی تھے اور حضرت ابوبکر وزیر اور ظاہر ہے کہ وزیر اور سپاہی کی ذمہ داریوں اور کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے، یقیناً قابلِ استحسان ہیں۔ تحقیق تو یہ ہے کہ حضرت حمزہ بنی ہاشم فرزند عبدالمطلب، عم رسول اللہ اور شیر خدا اور شیر رسول خدا تھے۔ حضرت عبیدہ رسول اللہ کے چچا زاد بھائی اور حضور کے فدائی تھے، رہے حضرت علی آپ آنحضرت کے دین و دنیا میں بھائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے اور خدا کے محبوب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جان نثار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر اور شیخین کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر اور خلیفہ تھے (بخاری و مسلم، ترمذی و نسائی) حدیث یا علی انت اخي وصاحبی و وزیري مرویہ احمد و طبرانی وابن ابی شیبہ از سلمان بن ابی الدرداء اور حدیث انت مستی بمنزلة هارون من موسى اس پر دو ثقہ شاہد ہیں۔ جناب ابوبکر ہوں کہ جناب عمر، جناب علی ہوں کہ جناب حمزہ، ہر فرد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بار، جان نثار، حقیقی مشیر و وزیر، باندہ و رفیق تھا اسی جنگ میں حضور نے مع احد کما جبرئیل ومع الآخر میکائیل مرویہ احمد و نسائی وابن ابی شیبہ حضرات علی و ابوبکر کی نسبت فرمایا۔ اور اسد اللہ، واسد رسولہ حضرت حمزہ کے متعلق فرمایا تھا۔ جس کے ذمہ جو کام سپرد ہوا اس کو اس نے جان نثاری سے انجام دیا۔ جناب امیر آپ کی نگاہوں میں ایک معمولی سپاہی نظر آئیں تو کوئی حرج نہیں۔ مگر نگاہ رسالت مآب میں علی فاتح بدر و حنین اور خببر و اُحد کے ہیرو تھے۔ پناہ علامہ شبلی سیرت النبی جلد اول صفحہ ۲۵ میں فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے راوی غزوہ بدر کے ہیرو اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب ہیں۔

شرف و وجہیت فاطمہ الزہراء | یہ وہ عظیم بالشان افتخار اور سرفراز وقار تھا کہ آپ کے بقول ان دونوں بزرگواروں نے بھی جن کی صاحبزادیاں مسلمانوں کی مائیں بن چکی تھیں اس اعزاز خصوصی کے حصول میں سعی کی تھی، ملاحظہ ہوں۔ احادیث مرویہ احمد و ابوحاتم و نسائی و عبد الرزاق و غیرہم و روایات ابن حجر فی اصحابہ و ابن سعد فی الطبقات و ابن اثیر فی اسد الغابہ و ابوسعید خدری تہذیب الآثار و مواہب عسقلانی جو کہ

تزویدج فاطمہ بروحی آسمانی تھی، ارشاد ہوا، مجھے وحی کا انتظار ہے (امام احمد، ابوحاتم، ابن ابی شیبہ و حاکمی) اتنے میں وحی نازل ہوتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ خدا نے فاطمہ کا عقد علیؑ سے کر دینے کا امر فرمایا ہے۔ احمد و ابو جعفر و طبری و طبرانی و ابن شاذان و ابن السمان و بیہقی و خطیب و ابن عساکر و حاکم از حضرات انس و جابر و ابن عباس۔

مولانا کے اس جملہ کا (بلکہ خود حضرت علیؑ کی مائیں بن چکی تھیں) حضرت ابو بکر و عمرؓ کی مائیں بھی تو ہو چکی تھیں، کافی جواب ہے۔ آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں کہ دامادی دوسرے درجہ کی چیز تھی، اس لیے دوسرے درجہ کے لوگ اس سے شرف ہو سکتے تھے، یہ کلمہ صداقت و ادب سے گواہ ہے۔ دامادی رسولؐ تو ایک مختص شرف ہے۔ مگر زوجیت فاطمہ الزہراءؑ اس مختص شرف میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ ہے۔ یہ وہ شرف ہے جس کی تمنا کا نظارہ بزرگ نبیؐ فرمایا کرتے تھے جن کی صاحبزادیاں مسلمانوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ امام احمد ابن ابی شیبہ، ابن مندہ، ابویعلیٰ حاکم و ابن نجار سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جناب امیرؓ کے مین شرف سے ایک بھی مجھے حاصل ہوتا تو مجھے حُر لغم سے بھی محبوب تر ہوتا، ایک نو فاطمہ جیسی بی بی کا علیؑ کو ملنا، مسجد میں صرف ان کا دروازہ کھلا رہنا اور یوم خیر کو رایت کا ملنا، یہ وہ شرف و افتخار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ یا علیؑ اذیت ثلاثا لسم یوت احد ولا انا اذیت صہراً مثلی ولما اوت انا مثلی واذیت صدیقہ مثلی بنتی ولما اوت مثلاً واذیت الحسن والحسین من صلبک ولما اوت من صلبی مثلاً و لکن کرمی وانا منکم (اس کی روایت دیلمی نے ابن حجر عسقلانی نے ابوسعید نے شرف نبوت میں اور امام

علی رضائے اپنی مسند میں اور ابوالحسن نے سیرت میں کی ہے یعنی لے علیؑ
 تم کو تین باتیں ایسی حاصل ہیں جو مجھے بھی حاصل نہیں اور نہ کسی کو حاصل ہیں۔ تم
 کو مجھ جیسا خسر ملا، مجھ کو تجھ جیسا خسر نہ ملا۔ تم کو میری بیٹی جیسی صدیقی ملی، مجھ کو
 ایسی نہ ملی۔ تم کو سنیں جیسے بچے ملے مجھ کو ان جیسے بچے نہ ملے۔ مگر تم سب
 میرے اور میں تمہارا ہوں۔ یہ وہ شرف ہے جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم یوں فرماتے ہیں:۔ لولم یخلق علی ما کان لفاطمة کفو۔ جانی نے
 اس کا ترجمہ خوب فرمایا ہے

گر علیؑ خود بخود شرفِ مخلوق

ہم بھی داشتِ فاطمہؑ ہم سر

حضورؐ نے ارشاد فرمایا: فاطمة بنت محمد سیدۃ النساء العالمین
 سیدۃ النساء المؤمنین سیدۃ النساء اہل الجنة (امام احمد از حضرت
 عائشہ) اور فرمایا، یا فاطمة الاترضیین ان تکونی سیدۃ النساء العالمین
 وسیدۃ النساء المؤمنین وسیدۃ النساء ہذہ الامۃ (از حضرت
 عائشہ ذہبی نے تلخیص میں کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے مستدرک جلد ۲ ص ۱۵۷) سیدۃ
 النساء العالمین وسیدۃ نساء امت وسیدۃ نساء اہل جنت کے شوہر بننے کا شرف
 اسی کا حصہ تھا۔ جو زبان رسالت سے امیر المؤمنین سید المسلمین (حاکم ابن ابی
 مردویہ، ابوالعیم) سید داریں (احمد و حاکم) نبیوں اور رسولوں کے سوا باقی
 ساری اولاد آدم کا سردار (ابن مردویہ و خوارزمی) امام البرہہ (حاکم نفس رسول
 اللہؐ (خوارزمی ابن نجار و ابویعلیٰ) نظیر رسول اللہؐ (طبرانی، ابوجعفر، طبری
 دلمی و ابن عساکر خدا و رسول کے محبوب ترین (نسائی، حاکم، امام احمد)
 ہونے کا شرف یاب تھا۔

مولانا کے غندیہ میں جناب علیؑ درجہ دوم کے شخص ہوں گے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک آپ اعلیٰ درجہ کے انسان تھے۔ محبوب خدا و رسول م تھے۔ (بخاری و مسلم، حاکم و ترمذی نسائی، بہترین خلق تھے) (علی خیر البشر من ابی فقد کفر۔ رواہ ابن مردویہ عن حذیفہ و الحاکم عن ابن مسعود و احمد و الخطیب عن جابر و ابولعلی و الشاذان عن علی) اول یومین اعلم باللہ اور اعظم عند اللہ تھے۔ (احمد و دیلمی عن عمر بن الخطاب و الحاکم عن ابی ہریرہ) اہل بیت نبی تھے۔ نحن اهل البيت لا یقاس بنا احد رواہ ابونعیم فی الحلیۃ و ابن بخار و ابولعلی و الخطیب فی المتفق و المقترب)

انذار عشیرۃ الاقربین | جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ بعثت کے چوتھے سال و انذار عشیرۃ الاقربین نازل ہوئی اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے انذار کا آپ کو حکم ہوا۔ تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ دعوت کا سامان یعنی گوشت روٹی اور دودھ مہیا کر دو اور نبی عبدالمطلب کو دعوت دے آؤں۔ تقریباً چالیس بنی عبدالمطلب جن میں آپ کے چار چچا ابوطالب ابولہب، حمزہ اور عباس بھی تھے دعوت پر آئے۔ بعد طعام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب فرمایا، کہ خدا نے کل بنی آدم پر اور خصوصاً تم پر مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کون تم میں سے میرا شریک کار اور حامی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں میرا بھائی، میرا وزیر اور میرا خلیفہ ہوا چاہتا ہے تین مرتبہ کے بعد بھی کسی نے جواب نہ دیا تو میں نے کہا، میں سب میں کمسن، کمزور اور ناقواں ہوں، مگر میں تازسیت آپ کا ساتھ دوں گا اور آپ کا مدد و معاون رہوں گا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری پیٹھ ٹھونکی اور قوم سے فرمایا: (هَذَا اسخى ووصى ووزیرى وخليفتى فیکم فاسمعوا واطیعوا)

”یہ میرا بھائی ہے، میرا وصی، میرا وزیر اور تم میں میرا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس کی سنو اور اطاعت کرو۔“ ہماری برادری نے اس کا مضحکہ اٹایا اور میرے باپ ابو طالب سے کہا، لو اب اپنے بیٹے کی اطاعت کرتے رہو۔

تقریباً انہی لفظوں میں یا کم و بیش یہ واقعہ سند امام احمد و مناقب امام احمد مصنف ابو بکر بن ابی فیہ و خصائص نسائی و سیرت ابن اسحاق و تاریخ طبری و تہذیب آثار طبری و دلائل بیہقی و الوعیم و تاریخ ابو الفدا و تاریخ خمیس و تفسیر ابن مردویہ و داحدی و ابن ابی حاتم و معالم بغوی میں موجود ہے (ملاحظہ ہوں خصائص نسائی ص ۱۳۱ سند احمد ص ۳۶ جلد سوم کنز العمال جلد ۶ ص ۳۹۹ تفسیر معالم بغوی ص ۶۶۳ مطبوعہ ممبئی، تاریخ ابو جعفر طبری ج ۱ ص ۱۱۱ مگر مصر کی مطبوعہ تاریخ طبری جلد ۹ ص ۶۸ میں وصی و خلیفہ کے بجائے کذا و کذا درج ہیں جو موجودہ ذہنیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

امام بخاری نے تو غضب ہی کر دیا۔ سرے سے اس واقعہ کا ذکر نہ مذکور بلکہ باب نزول و انذار عشیرتک الاقربین کے تحت آپ نے خلات جمہور جو قصہ درج فرمایا ہے وہ کوئی اور ہی ہے۔ نہ اس میں کوئی دعوت کا تذکرہ ہے نہ جناب امیر کا ذکر مذکور ہے۔ اور نہ وزیر و خلیفہ کا کوئی اشارہ یا کتابہ ہے بخاری میں اس کی تین روایتیں ہیں اور تینوں میں بجائے انذار عشیرتک الاقربین کے خلات آیات قرآنی انذار قریش و قبائل بنی فہر بنی لوی و بنی عدی وغیرہم مذکور ہے۔

۱۔ دور و اوتوں کے راوی اول حضرت عبداللہ بن عباس ہیں جو بہ اتفاق ارباب سیر و تاریخ ہجرت سے تین سال پہلے مکہ میں متولد ہوئے، اور یہ واقعہ انذار عشیرت بعثت کے تین سال بعد ہوا۔ گویا حضرت عبداللہ عالم و

میں آنے کے سات سال پہلے سے ہی اس واقعہ کے شاہد یعنی رہے تھے۔
 ۲۔ ابن عباس والی روایت کی ابتداء لما نزلت وانذر عشیرتک الاقربین ورھطک منهم المخلصین سے بخاری نے کی ہے چونکہ بخاری بعضوں کے نزدیک اصح الکتاب ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ ورھطک منهم المخلصین بھی آیت قرآنی وکلام ربانی ہے جو انذر عشیرتک الاقربین کا ایک ٹکڑا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل تو ہوئی مگر بعضوں نے اس کو قرآن سے خارج کر دیا (نعوذ باللہ) بخاری کو مانیں کیوں اور ان تاویلات میں پڑیں کیوں؟

۳۔ تیسری کے راوی اول حضرت ابوہریرہ ہیں جو باتفاق سہمہ میں بہ مقام خیمہ یا دوران سفر خیمہ مسلمان ہوئے۔ اس وقت آپ کی مسین بھیگنے لگی تھیں اور آپ کا سن وفات ۵۹ھ یا ۶۰ھ ہے۔ گویا آپ بھی اہل انذار عشیرت کے وقت دو تین سال کے ماشا اللہ ہوں گے۔ اور اس عمر میں بقول بخاری آپ نے اس قصہ کا معائنہ فرمایا تھا۔

۴۔ روایت ابوہریرہ میں حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مخاطب الفاظ "اے فاطمہ اپنی آپ دیکھ لو، محمد تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے" (نعوذ باللہ) ہوئی ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ بقولے سہ سالہ و بقولے چار سالہ یا پنج سالہ لڑکی نہ اس کی مخاطب بن سکتی ہے اور نہ ان الفاظ کی وہ مستحق ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ حضرت فاطمہ یوم گویائی ہی سے کلمہ گو رہی ہیں اور یہ مخاطبت محض کفار سے تھی۔ ابن حجر جیسے سرپرست بخاری بھی فرماتے ہیں وفي مداء فاطمتہ يومئذ ايضا ما يقتضي اخر القصص لانها كانت حينئذ صغيره (فتح الباری ج ۳ ص ۳۱)

۵۔ امام بخاری نے انذارِ عشرت والے قصہ سے گریز فرمایا اور آیت انذارِ عشرت والے اقربین کے تحت نزولِ تثبت پیدا والے قصہ کو ہر صفا کو اس لیے یہاں درج فرمایا کہ جناب امیر کا کوئی ذکر مذکور نہ ہونے پائے حالانکہ نزولِ آیت وانذارِ عشرت والے اقربین کے تین سال بعد کوہ صفا والا معاملہ ہوا اور سورہ تثبت نازل ہوئی۔

۶۔ تمام مفسرین اور مورخین اہل سیر اور محدثین کا اتفاق ہے کہ نزولِ تثبت پیدا ابی لہب بعد محاصرہ شعب ابی طالب ہوا محاصرہ یکم محرم ۶۰ھ بعثت کو شروع ہوا اور تین سال رہنے کے بعد ۱۰ھ نبوی کو ختم ہوا اور انذارِ عشرت سن چار نبوی میں ہوا۔ نہ معلوم بخاری نے کس مصلحت کی بنا پر یہ واقعہ انذارِ عشرت کو حذف کر کے اس جگہ ایک چار سال بعد والے واقعہ کو ہر صفا کو آیت انذارِ عشرت کے تحت درج فرمایا۔

۷۔ معاہدہ قریش کی رو سے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب حبیب محصور ہو گئے تو ابولہب بنی عبدالمطلب سے جدا ہوا اور قریش سے جا ملا۔ فلما فعلت ذالک قریش اجتازت بنو ہاشم و بنو عبدالمطلب الی ابی طالب فدخلوا معہ فی شعبہ واجتمعوا الیہ وقتل خراج من بنی ہاشم ابولہب الی قریش (سیرۃ ابن ہشام جلد اول ص ۲۳۳ و تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۰۰)

۸۔ یہ محاصرہ ۱۰ھ نبوی سے شروع ہوا اور ۱۰ھ نبوی کے پہلے دن ختم ہوا۔
وفی التاريخ الخمس ۳۳۵ وفي السنة السابعة من النبوة
او الثامن منها على ما في المتقى تقاسمت قریش و تعاہدا
على معاداة بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب گویا نزولِ تثبت

پیدا اور واقعہ صفا بعد ارتقاع محاصرہ یعنی سلمہ نبوی میں واقع ہوا۔
 امام بخاری کی مصلحتوں کو وہی جانیں مگر آپ کے حذف واقعہ انذار عشرت
 اقربین اور اندراج واقعہ کوہ صفا و نزول ثبت پیدا اور باب انذار عشیرتک
 الاقربین سے آپ کے ہوا خواہ ابن خزیمہ و اسمعیلی بھی چکرا گئے اور آخر
 انھیں کتنا پڑا کہ انذار عشرت والا معاملہ صدر اسلام کا ہے جب کہ نہ ابن عباس
 پیدا ہوئے تھے اور نہ ابو ہریرہ سے کوئی واقف تھا۔

بخاری کی روایت انذار عشرت کی اب کیا حیثیت رہ جاتی ہے جب کہ اس کے
 ایک راوی ابن عباس اس وقت پیدا ہی نہ ہوئے تھے اور دوسرے راوی ابو ہریرہ
 بہ مشکل ڈھائی تین برس کے ہوں تو ہوں۔ انذار عشرت والی حقیقی روایت کو ترک
 کر کے کوہ صفا والی روایت کو آیت و انذار عشیرتک الاقربین کے تحت
 میں درج کرنا اور شاہد عینی جناب علیؑ سے روایت نہ لے کر ایسی ہستی سے اس کو
 مردی کرنا جو عالم وجود ہی میں نہ آئی ہو اور واقعہ کے وقت اس کے پیدا ہونے ہی میں
 سات برس اور باقی ہوں یقیناً اصح الکتاب کے شایان شان ہے۔

بخاری کے چھپائے نہ چھپنے والے واقعہ انذار عشرت کا تذکرہ تفسیر خازن
 تفسیر سراج منیر، تفسیر نعیمی، تفسیر واحدی، تفسیر ابن مردویہ، تفسیر ابن ابی حاتم
 تفسیر معالم التنزیل، امام لغوی، کنز العمال، دلائل بیہقی، دلائل الوعیم حلیۃ الاولیاء
 ذخیرۃ المآل عجلی، مختارۃ ضیاء مقصدی، تہذیب الآثار طبری، اقتدار عاصمی، کامل
 الامثیر، تاریخ البوالف، تاریخ روضۃ الصفا، تاریخ حبیب الیر معارج
 النبوة، مدارج النبوة، ازالة الخفا، شاہ ولی اللہ صاحب میں موجود ہے
 اس کا انکار اور انخفا ممکن نہیں۔

علاوہ بریں مصنفین یورپ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ:-

۱۔ جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب اپالوجی میں لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسرے اپنے مخالفین کی دعوت کی اور اپنی تقریر اس پر ختم کی کہ کون میرا ساتھ دے گا اور میرا وزیر اور میرا خلیفہ بنے گا۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ نوجوان بہادر علیؑ نے لٹکار کر کہا۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا۔ ”تو میرا بھائی میرا وزیر اور خلیفہ ہے۔“

۲۔ کارلائل اپنی کتاب ہیریز میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ مجمع جس میں علیؑ کے والد ابو طالب بھی تھے اکھٹم کھلا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ابھی تک مخالف نہ تھا مگر سب کو اس کا اچنبھا تھا کہ ایک ادھیڑ آدمی اور پندرہ سالہ لڑکا دنیا کو اپنا رام کریں گے مضحکہ خیز تھا، مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ درست تھا۔

۳۔ اول اپنی کتاب خلفائے محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوبارہ بنی ہاشم کو اپنے گھر بلایا اور انکی ضیافت کی، اور پھر کھڑے ہو کر خدا کے اہامی حکم سے انھیں نئے دین پر بلایا اور کہا۔ کون میرے اس امر میں میرا وزیر اور میرا جانشین ہوگا۔ سب تو چپ رہے مگر نوجوان علیؑ نے کہا۔ میں حاضر ہوں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی باہیں علیؑ کی گردن میں ڈال دیں اور سینہ سے لٹکایا اور بہ آواز بلند کہا۔ تم سب لوگ میرے بھائی میرے وزیر اور میرے جانشین کو دیکھ لو اور اس کی فرماں برداری کرو۔ اس پر لوگوں نے ایک قہقہہ لگایا اور اس کم سن خلیفہ کے باپ ابو طالب سے کہا۔ اب بیٹے کے سامنے جھکے رہیے۔

۴۔ لیکن اپنی تاریخ میں اس واقعہ کو تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اس مجمع میں ایک علیؑ ہی نے آپ کا ساتھ دیا، اور آپ کے وزیر اور جانشین بنے۔

بزرگ فاروق صاحب اگر پڈت جی نے تذکرہ اُحد میں حضرات شیخین کی توہین کی ہے تو واقعات مشہور کے خلاف اور منافیِ ادب ہے۔ اس کا جواب آپ کو توہینِ امیر سے دینا نہ چاہیے تھا۔ بخاری و مسلم امام احمد و ابو حاتم ابن ابی شیبہ وابن اسحاق تو یک زبان ہو کر کہیں کہ اُحد کے دن مہاجرین میں حضرات علیؑ و ابو بکر و ابن عوف و سعد و طلحہ و زبیر و ابو عبیدہ حضورؐ کے ساتھ ساتھ تھے اور انصار میں حضرات ابو دجانہ، سہل ابن حنیف، اسد بن خضیر، جناب بن منذر، سعد بن معاذ اور عاصم جے کے جے رہے۔ اس کے خلاف کوئی اگر ہزار کہے تو ماننے کو نہ رہا صحابہ کا انتشار خصوصاً بعد خبر شہادتِ ستید ابراہیمؑ ایک فطری امر تھا جب سر ہی نہ رہا تو دستار کمال: انھیں تو خداوند تعالیٰ و لفظ عفا اللہ عنہم کی تحریری معافی دے اور دوسری طرف ہم انھیں خطائی و مجرم بنائیں۔

مولانا کا بار بار یہ کہنا کہ حضرت علیؑ ایک معمولی سپاہی تھے اور شیخین وزراء تھے یقیناً ہجو ملیج ہے۔ توہینِ خلفاء اگر عادتِ ثانیہ تھی تو قلم ہی نہ اٹھاتے۔ یا ان رسولؐ کی ہجو ہی اگر مضمون نگاری ہے تو ایسی مضمون نگاری کو ہمارا دور سے سلام۔

جناب امیرؑ نہ صرف معمولی سپاہی تھے بلکہ امتِ مہر کی طرف سے آپ مجاہد تھے۔ اور کفی (کنہ المؤمنین القتال) کے مصداق تھے۔ حضرت ابن مسعود نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ ساری امت کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے جناب امیرؑ کا جہاد قبول فرمایا۔ (ابن ابی حاتم ثعلبی، واسدی، حافظ ابن عساکر خطیب و المنثور سیوطی مہبط وحی لاختی تھے۔ ابن اسحاق امام احمد اور ابو الحسن بن عرفة عن ابی رافع وابن عباس، بریدہ و جابر رضی اللہ عنہم و مردیہ قسطلانی و ذرقانی و طبری و سبط ابن جوزی و خوازمی و شیخ دہلوی و صاحب روضۃ الاحباب۔

بشارتِ یاب لہدیر جمع حتی یفتح اللہ علیہ تھے (ابن اثیر) نہ بریدہ

وابن ابی شیبہ و احمد و یزید و حاکم و نسائی و طبری از ابو ہریرہ ، وابن ابی شیبہ و حاکم و یزید و
 احمد از امام حسنؑ (۴) مخاطب کرا اور غیض فرمایا تھے ۔ (نسائی و احمد از ابن ابی ہاشم
 وابن اسحق از حضرت ام سلمہ و امام احمد وابن جریر طبری وابن ابی شیبہ از حضرت علیؑ و دلقانی
 و خطیب وابن عساکر از حضرت عمرؓ (۵) ہم رکاب جبرائیل و میکائیل تھے ۔ (احمد وابن
 ابی شیبہ و طبری و خطیب وابن عساکر از حضرات عمر و علیؓ (۶) علم برداری تھے (دھو
 الذی کان لواءاً معدنی کل زحیف) ترمذی و نسائی وابن عبدالبر و یزید وابن
 عباس (۷) حامل لوار محمد بن حشیشی ہیں (ابن حبان از جابر بن عمر خوارزمی از علیؑ
 و یحییٰ از انسؓ ۔ شاذان از علیؑ و احمد از ابن عباس وابن اثیر از ثعلبہ راوی ہیں کہ حضور
 نے فرمایا بروز قیامت علیؑ ہی حامل لوار محمد ہوگا (۸) جنگ بدر کے ہیر و تختے مدیریت
 ابن اسحق طبری اسناد احمد صحیح حاکم ابن اثیر اور سیرت النبی جلد اول ص ۲۵۷
 (۹) اُحد کے سورما تھے ۔ ابن اسحق ، حاکم ، احمد اور مدرج ، شیخ دہلوی فرماتے
 ہیں ۔ "و سے رضی اللہ عنہ حق مبارزت و محاربت و جلادت و شجاعت بجائے
 آورد و له فوق آل تصور نہ توان کرد ۔ می گویند چون علی مرتضیٰؑ ایں مردانگی کرد
 نصرت و او جبرائیل بہ آنحضرت گفت کہ ایں کمال مواسات و جواں مردی
 است کہ علی با تو می یرو ۔ آنحضرت فرمود اذہ صنی و انا منہ ۔ آل گاہ
 جبرائیل فرمود انا منکما بعد از اں آواز غیب شنیدند "لا فتی الا علی
 لا سیف الا ذو الفقار ۔ اس ندائے آسمانی کی تصدیق سیرت ابن اسحق
 میں ابن عباس سے اور مسند احمد میں بریدہ سے کامل ابن عدی میں ابورافع
 سے اور ابوجعفر کی تاریخ میں ابن عباس سے ص ۱۲۰ پر ہوتی ہے ۔ امام سیوطی
 نے حضرت علیؑ سے قسطلانی نے مواہب میں ابن عباس سے ، محب طبری نے
 ریاض میں ۔ خوارزمی نے مناقب میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ میں جمال الدین

محدث نے روضۃ الاحباب میں اور فضل اللہ روزبہاں نے کشف الغمہ میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ (۱۰) فاتح جنگ احزاب تھے۔ شیخ دہلوی مدارج میں فرماتے ہیں۔ ”القمۃ محاربہ و مقاتلہ میان دو لشکر واقع شد۔ خصوصاً از علی مرتضیٰ دریں غزوہ مبارزت با و مقاتلہ با و واقع شد از حد قیاس و عقل بیرون چنانچہ در اخبار وارد شدہ است مبارزۃ علیؑ یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامۃ یوم خندق والی علیؑ کی لطائف میری امت کے اعمال تا قیامت سے افضل ہے۔ اس کی روایت حاکم نے صحیح میں دیلمی نے فردوس میں خواندنی نے مناقب میں فخر رازی نے الربیعین میں شیرازی نے القاب میں اور جمال محدث نے روضۃ الاحباب ص ۳۲۴ میں کی ہے۔ (۱۱) قاطع باب خیبری تھے۔ جس کی روایت ابن ابی شیبہ و بہقی و ابوالنعیم و حاکم و جابر بن سمرہ سے اور محمد بن اسحق نے ابورافع سے کی اور جس کی تخریج قسطلانی نے مواہب میں۔ ابن حجر نے صواعق میں اور ابوجعفر طبری نے تاریخ کبیر میں کی ہے۔ (۱۲) وزیر رسول اللہؐ تھے۔ حدیث متواتر منزلت اور حدیث انت اخی و صاحبی دوزیری مرویہ امام احمد و نسائی و طبرانی و حاکم و ابن مردویہ اس کے دو شاہد عادل ہیں (۱۳) ”مشکل کشائے غزوہ حنین تھے“ ابن اسحق نے سیرت میں ابن ہشام نے اپنی سیرت میں حاکم نے اپنی صحیح میں امام احمد نے اپنے مسند میں حضرات جابر ابورافع سے اس کی روایت کی ہے۔ ابن قتیبہ نے معارف اور کتاب الامت سیاست میں ابن عساکر نے تاریخ میں اور ابن مندہ نے حضرت انس سے اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے بھی حضرت انس سے اس کی روایت کی کہ حضرت علیؑ کی جیداری اور بہادری سے مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور چالیس پہلوانوں کو آپ نے اس دن قتل کیا۔

تذکرہ حدیبیہ میں فاروق صاحب کایہ فقرہ "لیکن حضرت عمر اور حضرت علیؓ کی حیثیت میں فرق تھا" دل جلا فقرہ ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ بہت نہیں، حدیث نہیں جس کو مانئے۔ وزیر کی حیثیت سے ہو یا شیر کی، صحابی کی حیثیت سے ہو یا خلیفہ کی، دونوں ہم پلہ اور مساوی تھے۔ بلکہ جناب امیرؓ میں اہل بیت رسولؐ، انفس رسولؐ اور خون رسولؐ ہونے کی وجہ سے ایک خصوصی بات اور بھی تھی جس پر مرفوع شہادتیں بکثرت ہیں۔ "میرا اور علیؓ کا خون ایک ہے" مرویہ ابو نعیم وابن عساکر از ابن مسعود، ویلی و عقیلی از ابن عباس، انوار زمی و طبرانی از حضرت علیؓ، ابویعلیٰ از ام سلمہ۔ "علیؓ میرا نفس ہے" (مرویہ ابن نجار از عمرو بن العاص و نسائی و دارقطنی از حضرت علیؓ و ابویعلیٰ از عبداللہ بن عمر بن العاص و امام نظری از حضرت عائشہ و حاکم از جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم)

"میری جان کو میرے جد سے جو نسبت ہے وہی نسبت علیؓ کو مجھ سے ہے۔"

اس کی روایت ابن نجار نے اور شفقی نے حضرت ابن مسعود سے کی ہے۔ علاوہ بریں خود جناب امیرؓ فرماتے تھے۔ کانت لی منزلتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن لاحد من الخلائق (مرویہ احمد و نسائی و حاکم از حضرت علیؓ و حدیث ام سلمہؓ کان لعلی منزلتہ الخ مرویہ حاکم۔ یہ حیثیت اور منزلت فاروق صاحب سے غالباً پوشیدہ نہ ہوگی۔

حدیث خیبر میں امام بخاری نے کہا کہ غیر افراد کا ٹکڑا اگر ترک کر دیا تو کیا ہوا۔ بخاری کے سارے مسہروں بلکہ بخاری کے اساتذہ کی روایتوں میں یہ ٹکڑا جیسے کا تیسرا موجود ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق ابن ہشام اور حلبی نے سیرتوں میں حضرت ام سلمہؓ سے نسائی و احمد نے ابویعلیٰ سے مناقب میں۔ ابن ابی شیبہ و احمد و ابن جریر طبری نے حضرت علیؓ سے، دارقطنی و خطیب و ابن عساکر نے

حضرت عمر سے طبرانی و بیہقی نے حضرت جابر سے، بزار نے ابویعلیٰ سے۔ امام احمد نے بریدہ اسلمی سے، طبرانی نے ابن عمر سے اور بزار نے ابن عباس سے اسی حدیث خیبر کو "کرار غیر فرار" کے ٹکڑے کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہی خلفاء کرام کی توہین وہ بھی دونوں صاحبوں کا حصہ ہے۔

حضرت ابوبکر و عمر کا جنگ خیبر سے بے فتح کیے لوٹ آنا ان کی توہین کا باعث نہیں۔ جیت مار تو خدا کے ہاتھ ہے۔ جنگ احد کی مثال موجود ہے اور جنگ حنین کا دن یاد ہے۔ مگر مولانا نے حالت غضب میں یہ غضب کر دیا کہ صفین میں جناب امیر کی شکست بتائی۔ لہٰذا حرج حتیٰ لفتح اللہ علیٰ یدہ جس کی شان ہو اس نے کہیں نہیں، کہیں نہیں صرف صفین میں شکست اٹھائی! شکست تو امیر معاویہ نے اٹھائی اور قرآن نیز دل پر اٹھایا، تاکہ جناب امیر کا فاتح لشکر بد دل ہو۔ مگر آپ کی کمال عقیدت نے اس کو جناب امیر کی طرف پھیر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس پر یہ اضافہ: "یہی علیٰ کی کراری غیر فراری" تو اس کا کتنا نمایاں ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ نے ان کو کبھی پوری فوج کا سپہ سالار نہ بنایا، بلکہ ہمیشہ ایک سپاہی یا معمولی حیثیت کے افسر کے طور پر رکھا۔ جبے دل کا پھینچو لا ہے۔ دعویٰ تو یہ ہے کہ علیٰ کی کراری غیر فراری غلط۔ اور اس کی دلیل یہ کہ کبھی انھیں فوج کا سپہ سالار نہ بنایا۔ دعویٰ کیا؟ اور دلیل کون سی؟ سبحان اللہ۔ بتایا تو یہ ہوتا کہ علیٰ غلام فحشاں لڑائیوں سے بھاگ نکلتے تھے لہٰذا ان کی کراری غیر فراری غلط ہے۔ بخاری کی مذہبی کسی ضعیف سی روایت ہی سے یا ضعیف بھی نہ ملتی ہو تو جھوٹی اور موضوع روایت ہی سے ثابت کیا ہوتا کہ علیٰ مرتضیٰ لڑائی سے بھاگے تھے۔ مولانا آپ تو کیا ساری امت بھی اس کو بتا نہیں سکتی کہ علیٰ فراری تھے۔ بات اتنی ہے کہ علیٰ

کی کراری غیر فراری کو خولتاً و خفلاً روایتاً و درایتاً علماً و عملاً ثابت ہے اور جو
خاری کھٹکتی ہے۔ غلط ثابت کرنے کی سعی لاساصل کی گئی ہے۔ آخر علیؑ کرار
غیر فرار ہی ثابت رہے۔ صدق اللہ و رسولہ

رہی علیؑ کی سپہ سالاری۔ حضور نے تو اپنے عہد مبارک میں کسی کو بھی پوری فوج
کے سپہ سالار نہ بنایا۔ اس کی نہ کوئی مرفوع شہادت ہے نہ موقوف۔ بڑی جنگوں
میں تو خود بدولت سپہ سالار رہے۔ سر یوں میں البتہ اپنے صحابیوں کے زیرِ کمان
تین سو چار سو سپاہیوں کو مختلف مقامات پر بھیجا۔ جس میں حضرت علیؑ بھی گئے اور
حضرت عمرؓ بھی اور حضرت ابوبکرؓ بھی اور حضرت ابوعبیدہؓ بھی۔ مواہب زرقانی
ابن ہشام۔ تاریخ طبری وابن اسحاق

فع کہ کی دولتش نشینی کا تذکرہ صحیح بخاری میں نہ ہونا، نفی واقعہ کا انوکھا استدلال
ہے جس واقعہ کی روایت امام احمد ابوبکر ابن ابی شیبہ اور ابوجعفر طبری و حاکم دہلوی
و حاکمی و امام قسطلانی و زرقانی جلد دوم ص ۳۸ شرح مواہب میں کرتے ہیں۔ اس
کو نسیاً منیاً کر دینا آپؐ ہی کی جرأت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی تو ازالہ
میں اس کا ذکر کیا ہے۔

حنین میں بروایات ابن قتیبہ و حارث بن اسامہ و ابولیلی و ابن عساکر و خطیب
ابن اسحاق جناب امیر و حضرت عباس و ابوسفیان بن حارث و زبیر بن اسامہ بن زید
عقیل و عبد اللہ بن زبیر بن عبد المطلب کا آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ رہنا ثابت خصوصاً
جناب امیرؓ کی پامردی و جانبازی بروایت ابولیلی و طبرانی و ابن ابی شیبہ و زرقانی از نہیں
جابرؓ سلم اور جناب امیرؓ کا چالیس ہندوؤں کو قتل کرنا بروایت ابن ابی شیبہ حضرت
انسؓ سے منقول اور علامہ ابن عبد البرؒ کی روایت سے صرف علیؑ، عباسؓ، سفیان
اور عمرؓ کا ثبات مردی۔ مگر ابن اسحاق کی روایت سے علیؑ، عباسؓ و فضل بن عباسؓ

ابوسفیان وجعفر بن ابوسفیان و ربیع بن حارث اور اسامہ بن زید کا ثابت قدم رہنا مسطور
(استیعاب جلد ۲ صفحہ ۲۹) ابو جعفر طبری نے تاریخ کے ص ۱۶۶ پر لکھا ہے کہ آنحضرت
کے ہمراہ حنین میں صحابہ میں سے ابو بکر و عمر اور اہل بیت سے علیؑ عباسؑ فضل بن عباسؑ
ابوسفیان بن حارث ربیع بن حارث و اس بن عمیر و اسامہ بن زید ثابت قدم تھے
اور ابن ہشام نے بھی یہی نام بتائے ہیں مگر بخاری نے حضرت عمرؓ کا نام مفردین میں لکھا
ہے۔ نعوذ باللہ۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ علیؑ و عباسؑ و ابوسفیان و عقیل و عبداللہ بن زبیر
و زبیر بن العوام اور اسامہ آنحضرت کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ مگر بعد کے محقق عساکر
قسطانی نے اس کا جو بیوی لکھا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں ولم یثبت
مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یومئذ الا العباس و علی و الفضل
و ابو بکر و عمر و اسامہ بن زید فی انساب من اهل بیتہ و اصحابہ
(مواہب) جو مطابقت روایات اولین ابوسفیان و ربیع بن عقیل و عبداللہ بن زبیر
بن عبدالمطلب و زبیر بن العوام و عبداللہ بن مسعود پر مشتمل ہے۔

سرگوشی طائف | بزعم مولانا سرگوشی پر صرف ریاض نصرہ کی تنہا روایت
نہیں بلکہ ترمذی، نسائی، وطبرانی کی حدیث جابر اور ابوعلی
اور ابن ابی شیبہ و ابن حبان وانی روایت ابن عباس ہی موجود ہے عاذاً انتجیدۃ
ولکن اللہ انتجاہ۔ میں نے نہیں بلکہ میرے خدا نے علیؑ سے راز میں گفتگو کی
معتیٰ دنیا کو دکھا رہی ہے کہ علیؑ مخاطب حق سبحانہ اہل۔

حدیث منزلت | یہی ایک حدیث وہ بھی مرویہ بخاری ہونے کی وجہ سے
مولانا کے نزدیک صحیح اتری معتیٰ مگر پھر بھی مولانا سے رہا نہ گیا
فرماتے ہیں: "لانی بعدی کے بعد اس کی خصوصیت ہی کیا؟ صرف اہل و عیال
کی نگرانی جو ظاہر ہے کہ کوئی شرت نہیں۔" اے سبحان اللہ مولانا! اس حدیث

کی خصوصیت لائیبی بعدی کے بعد بھی لوگان نبی بعدی لکان عمر کے ہم پڑ ہے۔ "اگر نبوت باقی رہتی تو یہ دونوں نبی ہوتے۔ کوئی معمولی شرف نہیں؛ منزل بارونی اور اس میں آپ کی یہ آنا کافی۔ یہ حدیث کسی کو مھلی لگے یا بڑی نگر واقعہ بھی ہے کہ صلی کی منزلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بالکل وہی ہے۔ جو باران کی موسیٰ کے نزدیک محی کس کی مجال جو جناب امیر کے یا جناب صدیق کے فضائل کا اندازہ کر لے یا ان میں آنا کافی کرے۔ عزت ایک فضیلت جناب امیر سے اتنا ساٹ پٹا گئے سینے احمد حدیث آپ کی نسبت کیا کہہ رہے ہیں۔

ما جاء لاحد من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم من الفضائل بالاسانيد الحسن ما جاء لعلي بن ابي طالب (صحیح حاکم جلد ۲ ص ۱۸۱ واستيعاب جلد دوم ص ۱۸۱) یہ قول احمد بن حنبل کا ہے یہ قول امام نسائی کا ہے۔ یہ قول ابوعلی نیشاپوری کا ہے یہ قول قاضی اسماعیل مالکی کا ہے۔ یہ قول علامہ بن عبد البر کا ہے۔ یہ قول امام المحدثین ابو عبد اللہ حاکم کا ہے۔ ابن عبد البر استيعاب جلد دوم ص ۱۸۱ میں فرماتے ہیں کہ جتنی حدیثیں باسانید جید جناب امیر کی شان میں وارد ہوئی ہیں اتنی کسی بھی صحابی کی شان میں نہیں آئیں۔ اور حاکم صحیح کی جلد سوم ص ۱۸۱ میں لکھتے ہیں کہ احمد ابو یعلیٰ اور نسائی کی یہ تحقیق ہے کہ جتنی حدیثیں باسانید جید جناب امیر کی شان میں آئی ہیں اتنی کسی اور صحابی کی شان میں نہیں آئیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی امام نووی، عراقی، ابن حجر مکی، علی القاری علی متقی صاحب روضۃ الاحباب اور حضرت شاہ ولی اللہ بھی یہی فرما رہے ہیں۔ مولانا خود ہی اس کا تصفیہ فرمائیں کہ ان کی کون مٹے گا؟

راویان حدیث منزلت | صحابہ سے اس کی روایت حضرات عمر بن خطاب

علی بن ابی طالب، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ عباسی، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، جابر بن سمرہ، مالک بن حویرث، بلال بن عازب، زید بن ارقم، ابو رافع، عبداللہ بن ابی ادنیٰ، حذیفہ، انس بن مالک، بریدہ، ابوموسیٰ اشعری، ابویوسف النخعی، عقیل، حبشی بن جنادہ، معاویہ بن ابوسفیان، حضرت ام سلمہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت اسماء بنت عیس، وغیرہم نے کی۔ اور ائمہ محدثین سے امام احمد بن حنبل، بخاری، مسلم، ابن ابی شیبہ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن خزیمہ، ابن ابی خثیمہ، یزید، ابویعلیٰ، طبری، ابن عقدہ، ابوعوانہ، ابوالشیخ، طبرانی، حاکم، بیہقی، ابوالفہیم، ابن عبدالبر، ابن مرددہ، ابن ہمام، ابوسعید، لغوی، ابوالحسن ملا، ویلی و خوارزمی نے اس کو روایت کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر، امام بزرگ، ابن عبدالبر، جمال مزنی، ابن حجر، حاکم، نسائی، طبرانی، ابن تیمیہ، سیوطی، ذہبی اور شاہ ولی اللہ نے اس کو حدیث صحیح و متواتر مانا ہے۔

امام احمد نے سند و مناقب میں اس کے ذیل میں اسماء بنت عیس سے بنانا و جدید روایت کی کہ حضور نے یہ دعا بھی فرمائی۔ اللھم انی اقول کما قال اخي موسى اللھم اجعل لی وزیراً من اھلی اخي علی بن ابی طالب، اشد دبا ازدی و اشد کسہ فی امری کی تسبیح کثیراً و تذکر لک کثیراً انک کنت بنا بصیراً، خدا یا میرے بھائی موسیٰ کی طرح میں بھی ملتی ہوں کہ میرے عزیزوں میں سے میرے بھائی علی کو میرا وزیر بنا اور اس سے میری کمر کو مضبوط فرما۔ اور اس کو میرا رفیق کار بنا تاکہ ہم تیری تسبیح اور تیری یاد کثرت کریں۔ اور تو ہم کو دیکھ رہا ہے اس کی روایت طبری نے تہذیب الآثار میں، ثعلبی نے تفسیر میں، علامہ زہد و ابن السباع مالکی نے مناقب میں اور فخر الدین رازی نے تفسیر میں حضرت ابوذر اور ابن عباس سے غلیبہ دامن عساکر دابن مرددہ نے اسماء بنت عیس سے کیا ہے۔

جانی از قافلہ سالارہ رو عشق ترا !!
کہ بہ پرستند کہ آل کسیت علی گونی علی

مولانا اس کی خصوصیت اور اہمیت ہم کیا جانیں۔ امام نودی جیسا شخص ہی جان سکتا ہے۔ شرح مسلم جلد دوم صفحہ ۲۷ امام نودی فرماتے ہیں:-

فیہ اثبات فضیلة لعلی لا تعرض فیہ لكونہ افضل من غیرہ
او مثله و لیس فیہ الدلالة لاستخلاصہ۔ یعنی اس حدیث سے حضرت
علیؑ کی اس فضیلت کا ثبوت ملتا ہے جو آپ کو اپنے ماسوا اور برابر والوں یعنی دیگر صحابہ
پر بلا تعرض حاصل ہے مگر اس میں آپ کے استخلاف کی کوئی دلیل نہیں۔

سورۃ برأت مسلم کی تبلیغ | تبلیغ برأت کے سلسلہ میں مولانا کا یہ ارشاد کہ حضرت
ابوبکر اور علیؑ کی پوزیشن میں فرق تھا۔ حضرت

ابوبکر امیر راج تھے اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام تھے اور
منادی کرنے والوں میں علیؑ بھی ایک تھے۔ "اعراض عن الحق اور اعتراض علی الحق"
امیر راج تو کئی بزرگ ہوتے رہے اور ہوتے ہیں گے۔ مگر برأت کی رسالت
ایک ہی کو ملی۔ اور قیامت تک دوسرے کو مل نہیں سکتی۔ امام احمد و ابویعلیٰ
نے حضرت ابوبکر سے انسائی اور عبداللہ بن احمد نے حضرت علیؑ سے ابوبکر بن ابی
شیبہ، احمد، ترمذی، ابوداؤد و نسائی، اطحاوی، ابوالشیخ و ابن مردویہ نے حضرت
انس سے انسائی و ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید سے، احمد و ترمذی،
نسائی و طبرانی، احکام و طحاوی نے حضرت ابن عباس سے اس واقعہ کی یوں
صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کے ہمراہ سورۃ برأت
کو اہل مکہ کی تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ وحی آئی کہ یا تو آپ بغیر نفس اس
کی تبلیغ فرمائیں یا کسی اپنے عزیز سے کہوائیں۔ آپ نے سیدنا علیؑ کو اس حکم

کے ساتھ متعاقب روانہ فرمایا کہ تم ابو بکر سے سورۃ برأت لے لو اور خود اہل مکہ کو سناؤ کیونکہ یہی حکم خدا ہے کہ اس کی تبلیغ میں کروں یا تم۔ لایوڈی الاانا علی ہمارے نگاہوں میں تو دونوں حضرات دو مختلف جہات سے نابینا رسالت مآب تھے۔

امارتِ عین | اس سلسلہ میں مولانا سے کچھ اور نہ بن پڑا تو جناب امیر کی انتظامی ناقابلیت کا شکوہ کر دیا۔ طرفہ یہ ہے کہ امام یوسف جیسا امام فن فقہ اپنی کتاب الخراج میں جناب امیر کی سیاست مدک اور انتظام کی تعریفیں کرے اور آپ کی تحسین کے پل باندھے اور نقاد و حدیث تاریخ طبری آپ کی اس خصوصی خداداد قابلیت کی ثنا گوئی کرے اور دوسری طرف مولانا فاروق اس کی مذمت کریں۔

سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، شرح زرقانی، فتح الباری، عمدۃ القاری و ترمذی و ابن ابی شیبہ میں ہم نے بھی امارت عین کا قصہ پڑھا ہے کسی جگہ جناب امیر کی انتظامی ناقابلیت کا کوئی ریمارک ہمیں نظر نہ پڑا، البتہ نسائی نے اتنا لکھا ہے کہ بنی زبیدہ پر جب مسلمان فتح یاب ہوئے تو سبایا سے جناب امیر نے ایک لونڈی اپنے لیے خاص کر لی۔ جس پر حضرت خالد نے بذریعہ بریدۃ اسلمی بارگاہ نبوت میں شکایت پیش کی۔ شایکوں پر عتاب ہوا اور فرمایا ما تریبہ دن عن علی و هو مولیٰ اهل موصل و موصلہ و موصلہ و موصلہ و موصلہ فرمادی کہ خمس میں اس سے بڑھ کر علی کا حق ہے۔ فنان لدانی الخمس اکثر من ذالک (بخاری) اور جناب امیر کون ہیں دکھا دیا۔ ماستری فی راجل یحبہ اللہ و رسولہ (ترمذی و نسائی عن البراء) مولانا کو نہ معلوم آپ کی ناقابلیت کا سراغ لگا کہاں سے؟

اس تذکرہ میں مولانا فرماتے ہیں، پہلی حدیث بے اصل

اور حدیث غدیر خم اس سے زیادہ بے اصل ہے

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط

کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ بخاری میں بھی ہوتے تو ذرا جھجکتے۔ آپ کی طرح اس قدر میاں ختم نہ کہتے۔ حدیث کیا ہوئی گھر کی کھیتی ہو گئی۔

مولانا جس پہلی حدیث کو آپ نے بے اصل کہا ہے وہ حدیث ثقلین ہے جس کو بڑے بڑے ائمہ حدیث اور ثقافت فن مثل امام زہری ابن اسحاق، ابن سعد، احمد ابن ابی شیبہ، ابوشیبہ، ابن جریر طبری، عبد بن حمید، داہمی، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابویعلیٰ، دولابی، ابن خزیمہ، ابن عبدالبر، ابن عثمد، طبرانی، ابوالعیم، حاکم، خطیب، حمیدی، طبری، خوارزمی اور شاہ ولی اللہ نے روایت کیا ہے۔ اندیس کی ابن حجر، فودی، عینی، بسکی، مکی، زرقانی، شرمکانی، سیوطی، اتقی، دہلوی اور شاہ ولی اللہ نے تخریج کی۔ اور مستند کہا، بھلا آپ کے یا کسی اور کے بے اصل کہہ دینے سے بے اصل ہو سکتی ہے؟

یہ دوسری حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ جو صحیح اور مشہور و متواتر ہے۔ یہ اگر آپ کے نزدیک لا اصل نہ تصور ہو تو امام بخاری کی ۵۳۴ روایات منقولہ وضعیفہ کا کیا حشر ہو گا اور صحیح کی کیا وقعت ہو گی۔ غالباً حدیث من کنت مولاہ آپ کے نزدیک اس لیے بے اصل ٹھہری ہے کہ اس میں علی کا نام ہے کسی اور کا نام ہوتا تو اس کا ارتقاء آپ کے نزدیک آیت قرآنی تک پہنچ جاتا۔

یہ حدیث متواتر ہے | علامہ محمد بن اسماعیل صنعانی روایت میں حافظ العصر ابن عساکر روایات میں سیوطی مجمع البحار میں متادی تفسیر میں غیر از زبانی العین میں، ذخیرۃ تذکرہ صحف میں، ہندی اسی السالط میں، علی القاری مرقاۃ

میں صاحب نزہۃ الابراہیم اس تصنیف شیخ دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس کو حدیث صحیح مشہور متواتر مانتے ہیں۔ شیخ دہلوی تو لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے اس کی روایت کی اور اس کے ان گنت طریق بتائے ہیں۔ بقول سولہ صحابہ نے اور بقول امام احمد میں صحابیوں نے اس کی روایت کی ہے۔

کثرت روایات | حافظ بن عقدہ متوفی ۳۳۲ھ نے کتاب الموالاة میں یکصد و یک صحابہ سے، امام ہزری شافعی نے انہی صحابیوں سے، امام

ابو جعفر طبری نے ۵۷ صحابیوں سے، امام احمد بن حنبل نے تیس صحابیوں سے اور حافظ ابو العلاء الطہار کوئی دو سو طریقوں سے اس کی روایت کرتے ہیں۔ یہ حدیث نہ صرف صحیح و ثابت بلکہ مشہور متواتر بھی ہے۔

حدیث انامذنیۃ العلم | ذرا اور آگے چل کر فاروق صاحب ایک سانس میں حدیث "انامذنیۃ العلم غلط۔ حدیث قضا صحیح۔ حدیث

علی منی غلط اور حدیث مولانا لغو فرماتے ہیں۔ اور دوسری سانس میں سارے فضائل علی موضوع اور ان کے راویوں کو دروغ بات فرماتے ہیں۔

غالباً ہمارے مولانا کو اب چین آیا ہوگا۔ آپ کا غصہ مٹنا ہوگا۔ چلو چھٹی ہو گئی۔ نہ علیؑ ہیں اور نہ علیؑ کا نام و نشان رہے۔ مگر افسوس ہے کہ متواتر متناہی کی حد تک رہی جب تک ساری حدیث کی سیر کی تاریخ کی کتابیں دریا برد نہ کی جائیں علیؑ کی تعریفیں مناقب اور فضائل کل باقی رہیں گے۔ صرف یہ غلط وہ لغو، یہ موضوع اور وہ فضول کہنے سے کام نہ چلے گا۔ ساری کتابیں جلا دینی چاہئیں۔

امام زمہری متوفی ۲۵۵ھ سے چودھویں صدی تک نہ کوئی محدث نہ کوئی راوی مناقب جناب امیرؑ چھوٹا اور نہ کوئی حدیث فضیلت باقی رہی جس کو مولانا نے دروغ کو اور روایت موضوعہ نہ فرمایا ہو۔ ابن جوزی جیسے مشہور بھی آج ہوتے تو مولانا

کے ۲ کے کان پکڑ لیتے۔

حدیث انامدینہ العلمہ جس کو ہمارے مولانا غلط فرماتے ہیں بعضوں کے نزدیک درجہ صحیح اور بعضوں کے حذیرہ میں حدیث درجہ حسن ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو جناب امیر امام حسنؑ، امام حسینؑ، حضرت ابن عباس جابر، ابن عمر، ابن مسعود، حذیفہ اور انس رضی اللہ عنہم نے سنا اور روایت کی ہے۔ جناب امیر سے امام احمد ترمذی، شاذان، حاکم، ابن مردویہ، ابویعلیٰ، ابوالعیم ابن مغاذلی، ابن اثیر، ابن نجار، ابن حجر، سیوطی وغیرہم نے اور امام حسنؑ کے سلیمان بلخی نے، امام حسینؑ سے ابن مردویہ، ابن نجار نے حضرت ابن عباس سے امام ابن معین طبری، ابوشیخ، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی، ابن عبد البر، ابن اثیر، خطیب، امام سیوطی، ابن حجر، علی متقی، شیخ دہلوی اور شاہ ولی اللہ نے حضرت ابن عمر سے طبرانی و حاکم نے حضرت ابن مسعود سے طبرانی و ابویعلیٰ نے حضرت حذیفہ سے ابن مغازلی سے اور حضرت انس سے ہزری و سلیمان بلخی نے اپنی سندوں میں معجموں، مناقبوں میں باسانید معتمد اس کی روایتیں کی ہیں۔

صحیح حدیث | فاکمین صحیح حدیث یحییٰ بن معین ابوجعفر طبری، حاکم، محمد بن طلحہ قرشی، صلاح علانی، امام ہزری اور سیوطی وغیرہم ہیں اور اس کے درجہ حسن ہونے کے معترف ترمذی، عسقلانی، بنجادی، ازرقانی، شواکانی، منادی، ابن حجر، علی القاری اور متقی ہیں۔

رہا یہ امر کہ بخاری نے اس کو ترک کر دیا۔ جہاں ۹۶ ہزار صحیح حدیثیں غائب وہاں یہ بھی ایک سہی۔ مگر آپ کے اساتذہ اور شیوخ میں عبد الرزاق نے دو طریقوں سے دستہ لک ۳ جلد ۱۲۷ یحییٰ بن معین نے دو طریقوں سے (کنز جلد ۲ ص ۴۹) اور امام احمد نے ۸ طریقوں سے اس کی

روایت کی ہے۔ اور امام ابو عبد اللہ حاکم نے اس کو کئی طریقوں سے بونشر شیخین میں ثابت کیا ہے۔ اور امام ذہبی نے میزان حبلہ اقل صلاۃ میں بہ ترجمہ سوید بن سعید اس کی روایت بسند متصل مسلم کے شیخ سوید بن سعید کی ہے۔ اور اس مسند کو عوالی الاسناد لکھا ہے۔ اس کو غلط کہہ دینا غلطی ہے۔

حدیث علی منیٰ | ہم اہل سنت کے اجل ائمہ اور اکابر علما، مثل ترمذی، نسائی سے اور امام احمد و ابن ابی شیبہ و ابن ماجہ حبشی بن جنادہ سے اس کی مرفوع روایت کرتے ہیں اور اس کو حدیث ثابت بدرجہ حسن تسلیم کرتے ہیں۔ اس کو غلط کہہ دینا غلط تحقیق پر مبنی ہوگا۔

حدیث قرطاس مرویہ بخاری | ہے بھی بڑی مضطرب اور مضطر۔ اس کے راوی تقریباً معلول و منکر اسی کے بستے توہین علی اور ذم عمر۔ اس کے سات طریقہ ہیں۔ ہر طریقہ ضعیف اور منکر، ہر متن مضطرب مضطر کہیں غلب علیہ الوجع، کہیں ہجر، کہیں بیہجر، کہیں پر ہجر، کہیں اہجر اور کہیں اہجر اہجر۔ پانچ روایتوں میں ان بے ہودہ الفاظ کی نسبت نامعلوم صحابہ پر اور دو میں یہ نزلہ حضرت عمر کے سر۔ خلفاء کی توہین جیسے۔ مگر ثابت ہے بخاری کا اثر۔ ان ساتوں کے راوی حضرت ابن عباس چودہ سالہ عمر، صحبہات کا دن زائفے جناب امیر پر سر پیغمبر، سر ہانے حضرت عباس، مواہد میں حضرت ابوبکر اور چوکھٹ پر حضرت عمر۔ باقی تین چار سو صحابہ محاذی حجرہ پیغمبر حضور فرماتے ہیں کہ کوئی کا غذا لا دو تاکہ تمھارے لیے وہ بات لکھ دوں کہ جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو اس پر سہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ فرمایا اٹھو اب رخصت اسی پر طرفداران علی و عمر ہیں چودہ صدی سے جبکہ متواتر کبھی ادھر سے کافر کبھی اُدھر سے کافر۔

مناقب جیسے جس کے مروی ہیں۔ وہ بے کم و کاست سب قابل قبول اور ان پر سرج و اعتراض طرفدارانہ فضول اور ان میں ہماری کمی بیشی نہایت نامعقول اور ہماری رد و قدح بالکل لغو و فضول۔ ہاں اگر خلفائے پیغمبر کی توہین کہیں مروی ہو تو وہ بلا استثناء قابل قبول اور قطعاً محل و فضول ہے۔ اس پر رد و قدح ہر ممکن طور سے مقبول۔ یہی ہے مذہبِ حنفیہ کا اور عموماً اہل سنت کا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے علمائے باوجود کٹر سنی ہونے کے دوسری صدی سے لے کر صد ہا مستقل کتب میں مناقب علیؑ میں لکھیں اور آج بھی لکھتے جا رہے ہیں۔

حدیث قرطاس کا نہ تو حضرت علیؑ نے نہ حضرت عباسؑ نے نہ حضرت ابو بکرؓ نے نہ حضرت عمرؓ نے اور نہ کسی ام المومنین نے کبھی تذکرہ کیا اور نہ ہی ان پیش طلافی میں چاروں صحابیوں نے اس کا کوئی اشارہ کیا۔ لے دے کے بس ایک ابن عباسؓ ہیں جن کو ہمارے محدثین اس اہم واقعہ کا مفرد راوی قرار دیتے ہیں۔ جو اس وقت بہ شہادت معینونہ توجروں مبارکہ کے اندر قلعے اور نہ باہر دالان مسجد میں تھے۔ حافظ ابن حجر شامی بخاری نے فتح الباری باب کتاب العلم میں ابن عباسؓ کی عام موجودگی کا اثبات شواہد اذقراں سے درایت و روایت سے کر دیا ہے۔ اب اس روایت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ظاہر ہے۔

علاوہ بریں اس فرضی حکایت کے راویوں میں یحییٰ بن سلیمان ہیں۔ جن کو ابن معین و نسائی و ابوسعید غیر ثقہ اور راوی مسکرات کہتے ہیں۔ دوسرے راوی قبصیہ ہیں۔ جو امام احمد کے نزدیک کثیر الاغلاط ہیں۔ یحییٰ کے نزدیک ضعیف اور ابن قطان کے عندیہ میں وہمی اور کثیر الاغلاط ہیں۔ تیسرے راوی یونس بن یزید ہیں جو کعب کے نزدیک سیئی المحفظ اور کثیر الاغلاط۔ ابن سعد کے نزدیک ناقابل روایت اور امام احمد کے نزدیک مردود ہیں۔ چوتھے علی بن عبد اللہ ہیں جو عقیلی کے نزدیک ضعیف اور داخل

اور عقیدہً تماماً بدعتیہ۔ مسلم کے نزدیک ناقابل احتجاج اور ابو ذرؓ کے نزدیک ناقابل روایت اور ابو حاتم کے نزدیک راوی منکرات ہیں۔ دو چار کا یہ حال، باقیوں کا کتب رجال میں نہ معلوم کیا ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس پر صدیوں سے ہم مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں میں جنگ و جدل ہے۔

مولانا فاروق فرماتے ہیں "انتقال کے وقت حضرت علیؓ کی موجودگی اور دست مبارک کا ان کے اوپر ہونا۔ ریاض النضرہ کی جھوٹی روایت ہے جو حضرت عائشہ کے پُر فخر صحیح واقعہ کے جوڑ پر تراشی گئی ہے۔ صحیح روایات سے حضرت علیؓ کا کاشانہ نبوی میں موجود ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا؛"

جناب من حضرت علیؓ کا کاشانہ نبوی میں رہنا بھی اس لیے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ کا حجرہ متصل حجرہ حضرت عائشہ تھا (بخاری) ریاض النضرہ طبری ناقل روایت ہے۔ اس کے اصل راوی جنہیں آپ جھوٹا کہہ رہے ہیں وہ امام احمد بن حنبل، امام نسائی، دارقطنی و حاکم ہیں۔ آپ ان بزرگوں کو جو چاہیں کہیں۔ بخاری جو آپ کے عندیہ میں مضبوط مانا ہے اس سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ ایک دیوار کی آڑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حجرہ سے متصل رہتے تھے اور آپ کا حجرہ وسط بیوت از وارج مطہرات تھا۔ بیٹی تو باپ کے سرمانے رات دن رہے اور داماد لکھ بھائی اپنے بھائی کے آخری وقت قرب و جوار میں بھی نہ رہے۔ یہ آپ کے جذبات ہیں۔ کوئی وحی یا واقعہ نہیں۔ یہ تو تجاہل عارفانہ ہے۔ کیوں مولانا سچ سچ کہنا۔ آخر وہی علیؓ تھے ناجنہوں نے پیغمبرؐ کو نہلایا دھلایا، کفنایا اور دفنایا تھا، کیا یہاں پر بھی علیؓ کا وجود آپ کے نزدیک موجود نہ تھا؟

آپ مانیں نہ مانیں۔ حضورؐ کے آخر وقت علیؓ ہی پاس تھے حضورؐ کی

چادر میں علیؑ ہی تھے۔ دستِ مبارک علیؑ ہی کی گردن میں حائل تھا۔ اور علیؑ کے سینہ پر ہی پیغمبرؐ کا سر دقتِ آخر تھا۔ حضرت ام سلمہؓ یہی کہتی ہیں اور حضرت عائشہؓ یہی فرماتی ہیں۔ امام احمد نے اس کو حضرت ام سلمہؓ سے بطریق متعدد روایت کیا ہے اور نسائی و حاکم حضرت ام سلمہؓ سے یہی روایات ہیں۔ دارقطنی حضرت عائشہؓ سے یہی نقل کرتے ہیں اور ابن عاریؒ ابن عمرؓ سے یہی روایت کرتے ہیں۔ ابن سعد کئی طریقوں سے طبقات میں اور تخریجی ابن ربیع میں اسکا اثبات کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں آپؐ کی ہائے دائے فضول ہے۔ اگر یہ ترشی ہوئی بات ہوتی تو امام زرقانی اور شیخ دہلوی میں جمع بین الروایتین کی زحمت اور تکلیف نہ ہوتی (زرقانی وفات النبی اور مدارج جلد ۲ ص ۸۴)۔ یہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ سعادت بی بی کو بھی نصیب ہوئی اور بھائی کو بھی۔ یہی آپؐ کی اور پڑت جی کی منقصت خلفاء راشدین۔ نہ ہیں اس سے کوئی غرض نہ کوئی مطلب۔ کسی کے بھی قلم سے نکلے بری بات بُری ہی ہے۔

وَفَقْنَا لِلَّهِ دَايَاكُمْ



jabir.abbas@yahoo.com

۱۹۳

خلافت اور جانشین رسولؐ

jabir.abbas@yahoo.com

زشتہ

مولانا سید ذیل الرحمن صاحب اعظمی

jabir.abbas@yahoo.com

خلافت اور جانشین رسولؐ

کچھ روز سے رسالہ نگار میں مسئلہ خلافت پر بہت ہی دلچسپ بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہر نام صاحب اور خود جناب نیاز صاحب کے نہایت بلند پایہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مجھے نیاز صاحب کی رائے سے تقریباً اتفاق ہے مگر میرے خیال میں اب تک تاریخ دیر حدیث و تفسیر عقائد و کلام کی اوراق گردانی میں تصویر کے ایک ہی رخ پر سارا غور و غم صرف ہوا ہے۔ دوسرا رخ سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ حضرت علیؑ اور حضرت ابو بکرؓ دونوں کے متعلق ہم سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کے بارے میں منشا ربوت کیا تھا؟ دو حقیقتیں صحابہ کرام میں حضرت علیؑ اور حضرت ابو بکرؓ کی دو ایسی با اقتدار ہستیاں گزری ہیں جن کی دینی اور مذہبی جان نثاریاں دیکھ کر نہ صرف مسلمانوں بلکہ با اذقات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نرزد ہوتا تھا کہ وہ اپنا جانشین کس کو بنائیں۔ بلکہ اس ابتدائے اسلام سے لے کر وفات رسولؐ تک منافقات پر تفصیلی نظر ڈال جائیے اور غور کیجیے کہ یہ مسئلہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کس قدر دشوار تھا۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اخلاق و اعمال فضائل و مراتب کے اعتبار سے ان دونوں بزرگوں کا مرتبہ تمام صحابہ سے بہت بلند ہے مگر خود ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک گونہ اشکالِ سخانی میں

بہتر ہوگا کہ خلافت کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم ان دونوں
بزرگوں کی صحیح پوزیشن سمجھ لیں اور دیکھیں کہ اسلام کے آڑے دنوں میں انھوں
نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ یہ طویل بحث مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت
ہم کرتے ہیں:-

”قبولِ اسلام“ ”اعانتِ اسلام“ ”سنۃ امارت و خلافت“
میں انہی عنوانات کے تحت اس وقت بحث کر دیں گے۔



قبولِ اسلام | یہ مسئلہ کہ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام کون ہوا؟ نہ کوئی
اہمیت رکھتا ہے نہ مسئلہ خلافت پر اس کا کوئی خاص اثر پڑتا ہے
حضرت علیؓ سب سے پہلے ایمان لائے ہوں خواہ حضرت ابوبکرؓ اس حقیقت سے تو
شاید کسی کو انکار نہیں کہ صحابہ میں سے کوئی اور شخص ان سے پہلے ایمان نہیں لایا، امام
ابوحنیفہؒ نے اس اقلیت کے جھگڑے کو نہایت عاقلانہ طریقہ پر ختم کیا ہے اور وہی
جمہور علماء کا مسلک ہے یعنی یہ کہ:-

”ابوبکر مردوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور علیؓ نے بچوں
میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اور غدیرؓ محمدؐوں میں سب سے
پہلے ایمان لائیں“ (تاریخ الخلفاء، فصل فی اسلام ابی بکر)

اعانتِ اسلام | اس عنوان کے ماتحت مجھ سے پہلے حضرت علیؓ کے مناقب پر
روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس لیے اعادہ کی پندال ضرورت نہیں۔ تاہم
میں یہ کہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؓ نے ابتدائے اسلام سے آخر وقت
تک جو اسلام کی اعانت فرمائی ہے اس کی نظیر صحابہ کی تاریخ میں ملنا دشوار
ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق، غزوہ بنی نہضہ اور غزوہ حنین

کوئی ایسا معرکہ نہ تھا جس میں حضرت علیؑ کو نمایاں اور امتیازی خصوصیت حاصل نہ ہوئی ہو۔ ہجرت کے موقع پر بھی جو جان نثاری حضرت علیؑ نے دکھائی کسی دوسرے شخص سے مشکل تھی ایسے خطرہ کی حالت میں بستر رسولؐ پر لیٹ رہنا معمولی جان بازی کا کام نہ تھا لیکن اس سلسلہ میں بڑی نا انصافی ہو گئی اگر حضرت ابوبکرؓ کے خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے حضرت علیؑ نوجوان تھے، بہادر اور شیر دل تھے اس لیے میدان کارزار ہمیشہ ان کے ہاتھ رہا۔

حضرت ابوبکرؓ بوڑھے اور کمزور تھے۔ اس لیے گواہیں معرکہ ہائے جنگ میں کوئی طرہ امتیاز حاصل نہ تھا تاہم جو دینی اعانت ان کی طرف سے کی گئی اس کی تین بڑی یادگاریں اسلامی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔ تمام قریش کو مسلمان بنانے کی کوشش کرنا۔ اسلام کی ترقی میں روپیہ صرف کرنا۔ نو مسلم غلاموں کو آزاد کرنا۔

حضرت ابوبکرؓ نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد دوسرے مشرفاء قریش کو بھی مسلمان بنانے کی کوشش کی اور ترقی اسلام کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد بنا لیا۔ چنانچہ عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ وغیرہ حضرت ابوبکرؓ کے ذریعہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

(سیرۃ ابن ہشام باب ابتداء اقرض اللہ علی النبی من الصلوۃ)

اسی طرح ترقی اسلام پر حضرت ابوبکرؓ نے روپیہ بھی سب سے زیادہ صرف کیا۔

جس کی تصدیق رسول خدا صلعم کے اس قول سے ہوتی ہے جو آپؐ نے اپنے آخر دور حیات میں حضرت ابوبکرؓ کے متعلق فرمایا تھا۔ یعنی:۔

ما نفعنی مال احد ما نفعنی مال ابی بکر“ ابوبکر کے مال سے

جتنا فائدہ مجھے ہوا کسی دوسرے کے مال سے نہیں ہوا۔ (ترمذی باب مناقب ابی بکر)

اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ مسلمانوں کا کوئی اقتدار نہ تھا اس لیے کفار

قریش انھیں طرح طرح سے تباہ کرتے تھے خاص کر ان غریب غلاموں کو جو

ایمان لایچکے تھے، مکہ کی سنگلاخ زمین پر لٹا کر ان کے سینوں پر پتھر کی جلتی ہوئی چٹان رکھ دیتے تھے۔ بھوکا اور پیاسا رکھ کر ان کے برہنہ جسم پر کوڑے لگاتے تھے۔ آہنی سلاخیں گرم کر کے انھیں داغنے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ یا تو محمدؐ کے دین سے پھر جاؤ یا پھر اسی حالت میں مر جاؤ۔

اسلام کی اس غربت اور کفار کے اس تشدد کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے رات غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن کی تفصیل اصابع میں درج ہے ظاہر ہے کہ اس سے انسان ترسی اور رضا جوئی الہی کے علاوہ اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کفار قریش کے ہاتھوں بارہا حضرت ابوبکرؓ بھی بہت بری طرح زد و کوب کیے گئے مگر آپ اسلام اور بانی اسلام کی حمایت میں ہمیشہ سینہ سپر رہے۔

حضرت اسامہؓ کا بیان کہ ایک مرتبہ مشرکین مکہؓ میں بیٹھے ہوئے رسول خدا ﷺ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لائے۔ آپ کا دستور تھا کہ لوگ جو کچھ آپ سے دریافت کرتے تھے آپ ان سے صحیح صحیح بتا دیا کرتے تھے۔ کفار قریش نے آپ سے پوچھنا شروع کیا کہ تم ہمارے معبودوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: ہاں میں ضرور کہتا ہوں۔ یہ سنتے ہی سب کے سب آپ کے لپٹ گئے۔ ایک شخص نے آکر حضرت ابوبکرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ فوراً ہی موقع پر پہنچ گئے اور کفار کو ڈانٹ کر فرمایا: ”افسوس ہے تم پر کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے۔ حالانکہ وہ تمہارے پاس معجزات عجی لایا ہے۔“ یہ سنتے ہی کفار نے رسول خدا ﷺ کو تو چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکرؓ پر پل پڑے اور ان کو اس قدر مارا کہ جب وہ گھر واپس تشریف لائے تو سر پر جہاں بھی وہ ہاتھ رکھتے تھے بال ہاتھ کے ساتھ ہی ساتھ چلے آتے تھے مگر وہ فرماتے

جاتے تھے کہ خداوند ا تو بزرگ اور بزرگ ہے۔ (دیکھو استیعاب ذکر عبد اللہ بن ابی قحافہ) ہجرت کے موقع پر جب تمام صحابہ مدینہ چلے گئے تو آنحضرت صلعم نے اپنے خاص جان نثار اور معتمد حضرت علیؑ اور حضرت ابوبکرؓ کو روک لیا، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ آپ کی نقل و حرکت کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے خدا اور اس کے رسولؐ کو اہم ترین خدمات لینا تھیں۔ اس لیے یہ مکہ میں اس وقت تک رُکے رہے جب تک کہ آنحضرتؐ کو خدا کی طرف سے ہجرت کی اجازت نہ ملی۔ ابن اسحاق کی روایت ہے۔

”جہاں تک مجھے علم ہے رسول خدا صلعم کی روانگی کا کسی کو علم نہ تھا کہ آپ کب روانہ ہوئے، رسولؐ نے حضرت علیؑ اور حضرت ابوبکرؓ کے اور ان کی اولاد کے“
سیرۃ ابن ہشام باب ہجرة النبی صلعم

ہجرت کی اجازت ملنے پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو مکہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور ان کے سپرد وہ امانتیں لیں جو لوگوں کی آپ کے پاس رکھی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے جہاں کھانے پینے اور خبر رسائی کا انتظام پہلے سے حضرت ابوبکرؓ نے کر رکھا تھا۔ تین دن کے بعد جب خطرہ کچھ کم ہوا تو حضرت ابوبکرؓ اور آنحضرتؐ دونوں ایک ہی اونٹنی پر آگے پیچھے بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ امام بخاری نے اس مبارک سفر کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ”ابوبکرؓ شیخ یعرف نبی اللہ، شاب لا یعرف فلیقتی الرجل ابابکر فیقول یا ابابکر من ہذا الرجل بین یدیاں فیقول ہذا الرجل یھدی بنی الطریق فیجب الحاسب انہ انما یعنی بالطریق وانما یعنی سبیل الخیر“ حضرت ابوبکرؓ بوڑھے تھے جنہیں لوگ عموماً جانتے تھے، آنحضرتؐ جوان تھے جنہیں لوگ عام طور سے نہیں جانتے تھے۔ جو راستہ میں ملتا تھا وہ پوچھتا تھا کہ ابوبکرؓ یہ تمہارے آگے

کون ہے؟ حضرت ابو بکر اس سے کہہ دیتے تھے۔ یہ شخص مجھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے
سننے والا یہ خیال کرتا تھا کہ وہ اس سے ”رہبر“ مراد لیتے ہیں۔ لیکن وہ دراصل اس سے
”باوی اور مرشد“ مراد لیتے تھے (بخاری باب الحجۃ)

امارت و خلافت | اس سے پہلے کہ خلیفہ رسولؐ سب سے پہلے کس کو ہوتا
چاہیے تھا اور کیوں؟ میں چاہتا ہوں کہ خلافت اور خلیفہ
کے معنی کی تشریح کر دی جائے تاکہ آئندہ اصل مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔
خلافت کے معنی جانشینی کے ہیں۔ خلیفہ ایک مذہبی عہدہ ہے اس کا فرض ہے
کہ وہ دینی احکام کی تعلیم و تعمیل کی کوشش کرے اور مسلمانوں کی مذہبی اور اقتصادی حالات
کی اصلاح کرے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ سب سے پہلے خلیفہ کس کو ہونا چاہیے تھا اور کیوں؟ اس پر غور
کرنے سے پہلے یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ دراصل اس مسئلہ کا تعلق خدا سے ہے
یا بندوں سے؟ عقل سے ہے یا فطرت سے؟ اس کا فیصلہ ہونے کے بعد مسئلہ خود
بخود واضح ہو جاتا ہے۔ علامہ قاضی نے شرح تخریج میں اس مسئلہ پر کافی تفصیل سے بحث
کی ہے جو درج ذیل ہے:-

”لوگوں کا اس امر میں اختلاف ہے کہ فرمانبرداری ختم ہونے کے بعد کسی
خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو خدا پر ہے
یا ہم پر؟ پھر یہ وجوب عقلاً ہے یا نقلاً۔ اہل سنت کا خیال ہے کہ خلیفہ کا
تقرر ہم پر نقلاً واجب ہے۔ معتزلہ اور زیدیت کی رائے ہے کہ یہ ہم پر عقلاً
فرض ہے، فرقہ امامیہ کا خیال ہے کہ یہ خدا پر عقلاً فرض ہے اور خواصج کا
یہ عقیدہ ہے کہ یہ کسی پر بھی فرض نہیں۔“

مذہب اہل سنت کا یہ عقیدہ چند دلائل پر مبنی ہے جن میں سے پہلی اور سب سے

مہتر و اہل اجماع صحابہ ہے صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے
 حتیٰ کہ رسول خدا کی تجویز و تکفین کو بھی اس مسئلہ میں مشغولیت کی وجہ سے انھوں نے پس پشت
 ڈال دیا۔ اور اسی طرح ہر خلیفہ کے انتقال کے بعد ہوتا رہا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ شریعت
 نے حدود، سرحدوں کی ناکہ بندی اور جہاد کے لیے لشکروں کی تیاری اور بہت سی
 ایسی چیزیں کا حکم دیا ہے جس کا تعلق نظام دین کی حفاظت اور مذہب اسلام کی حفاظت
 ہی ہے جو بغیر کسی خلیفہ کے عمل میں نہیں آسکتیں اور جس چیز کے بغیر واجبات ادا نہ ہوں
 وہ جیسا کہ چکا واجب ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ خلیفہ کے تقرر میں اس قدر فوائد
 ہیں جو شمار نہیں کیے جاسکتے اور اتنے نقصانات سے حفاظت ہو جاتی ہے جو پوشیدہ
 نہیں اور جس چیز کی یہ حالت ہو وہ یقینی واجب ہے۔

(شرح التجرید المقصد الخامس فی الامامہ)

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ مسئلہ محض تاریخی اور سیاسی نہیں ہے بلکہ
 خالص مذہبی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خلیفہ کا تقرر مذہب کے اہم ترین واجبات میں سے
 ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رسول خدا کے انتقال کے بعد کیا حالات پیش آئے اور حضرت
 ابوبکر صدیق کا انتخاب کیونکر عمل میں آیا اور یہ صحیح بھی تھا یا نہیں؟

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت اسلامی سوسائٹی تین گروہوں پر منقسم تھی جن میں
 سب سے زیادہ زبردست گروہ انصار کا تھا۔ مدینہ خاص انھیں لگا کر تھا، وہی وہاں کے
 رہنے والے تھے اور انھیں کی قوت و جانناڑی سے معرکہ ہائے جنگ میں اسلام کو شاندار
 کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں، دوسرا گروہ ان مہاجرین کا تھا جن میں آنحضرت معلوم کے
 داماد حضرت علی اور چچا حضرت عباس اور پھوپھی زاد بھائی حضرت طلحہ بن عبد اللہ اور بنی امیہ
 کے سرگروہ ابو سفیان شامل تھے، یہ سب لوگ حضرت علی کے مکان میں موجود تھے اور اس
 بات پر متفق تھے کہ حضرت علی کو جانشین رسول ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ ہم میں

سب سے افضل اور رسول خدا کے ابن عم اور داماد بھی ہیں۔ دوسرے مہاجرین اس فکر میں تھے کہ خلافت کوئی موردی چیز نہیں جس کو مسلمان بالاتفاق اپنا خلیفہ تسلیم کریں بس دہی جانشین رسول مجاہدانہ پہنچیں۔ اس گروہ کے روحِ رواں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر حبشی باقتدار ہتیاں تھیں۔

سب سے پہلے خلافت کا خیال انصار کو آیا۔ اور یہ حضرات کسی ایک انصاری کو خلیفہ بنانے کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ میں جو ان کا مشہور کونسل چیمبر تھا، جمع ہوئے مسئلہ انتخاب پیش ہوا۔ اس کی خبر رفتہ رفتہ مہاجرین کو بھی ہو گئی، موقع کی نزاکت کا خیال کر کے وہ بھی فوراً پہنچ گئے، انصار کا خیال تھا کہ مدینہ منورہ میں سوائے انصار کے کوئی دوسرا فرماں روا نہیں ہو سکتا۔ مہاجرین کی رائے تھی کہ اس وقت کسی خاص شہر یا قبیلہ کی حکمرانی کا نہیں بلکہ سارے ملک عرب کی فرماں روائی کا مسئلہ درپیش ہے اور یہ بوجہ انصار کے میں کا نہیں۔ اس لیے مدینہ کے باہران کا کوئی اثر اقلیت رائے نہیں، انصار نے کہا اچھا صبر! اصیرو و صندکم اصیرو، لیکن مہاجرین اسلامی شیرازہ کو منتشر نہیں کرنا چاہتے تھے، انھوں نے انصار کو بھجایا کہ تم کو اس مسئلہ میں ہم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ ہماری مدد کرنا چاہیے۔ گو اس وقت فریقین میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر انصار کی صلح پسندی کی یہ شان اس وقت بھی نمایاں تھی کہ حضرت زید بن ثابت نے جو انصار ہی میں سے تھے نہایت ایشاد کے ساتھ فرمایا کہ رسول خدا صلعم مہاجر تھے، لہذا خلیفہ بھی مہاجر ہی ہونا چاہیے، ہم جس طرح آنحضرت صلعم کے ہمال نشانہ تھے ان کے خلیفہ کے بھی جان نشانہ رہیں گے۔ آخر انصار کو تسلیم کرنا پڑا اور مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر صدیق خلافت کے لیے منتخب ہوئے۔

اس مجلس انتخاب میں گو انصاری نمائندگی پورے طور پر ہوئی تھی لیکن بعض سربراہانِ مدینہ مہاجرین جن پر نظر انتخاب بالکل بجا طور پر پڑ سکتی تھی موجود نہ تھے اس لیے حضرت ابوبکر کا یہ انتخاب گویا ایک فوری انتظام تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے اس انتخاب کے کچھ روز

بعد فرمایا بھی تھا کہ میں وقتی انتظام کے طور پر خلافت کے لیے منتخب کیا گیا تھا، اب اطمینان کی حالت ہے مسلمان جسے پسند کریں اپنا خلیفہ بنالیں، مگر عام طور سے مسلمانوں کی نظروں میں سیاست و تدبیر کے علاوہ بعض مصالح کی بنا پر حضرت ابوبکر سے زیادہ خلافت کے لیے کوئی دوسرا موزن نہیں تھا، اس لیے انھوں نے کسی جدید انتخاب کی ضرورت نہیں سمجھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قبائل عرب سے حضرت علیؑ کے تعلقات بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے کچھ تو اس وجہ سے کہ بہت سے سرداران قبائل جنگوں میں حضرت علیؑ ہی کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر حضرت علیؑ خلیفہ ہو گئے تو پھر خلافت ایک موردنی چیز ہو کر رہ جائے گی اور یہ تمام جیسے آزاد خیال اور سادات پسند مذہب کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکہ ہو گا جو کبھی ٹٹکے نہ سنے گا۔ یہ وہ بات ہے جو حضرت عمرؓ نے بھی ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ خلافت اور نبوت دونوں تمھارے ہی خاندان میں رہیں۔ (طبری ص ۲۶۶)

آخرت صلعم بڑے زمانہ شناس تھے، موقعہ کی نزاکت کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے آپؐ نے آخر وقت تک اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ آپؐ نتیجہ سے واقف تھے۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے اس بیان میں کہ آنحضرتؐ نے کسی کو اپنا جانشین کیوں نہیں بنایا۔ حضرت مذلیفہؒ کی وہ حدیث نقل کی ہے جو سند بزاز میں پائی جاتی ہے وہ ہذا:-

”قالوا یا رسول اللہ! لم لا تستخلف علینا قال (فی) ان استخلف علیکم فتعصون خلیفتی دینزل علیکم العذاب“
”لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہم پر کسی شخص کو خلیفہ کیوں نہیں بناتے؟“

آپؐ نے فرمایا اگر میں کسی کو خلیفہ بنا لوں اور پھر تم اس کو نہ مانو تو تم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔" (تاریخ اختلفا بر بیان کو نہ مسلم لم یختلف)
 آنحضرتؐ صلعم نے گواہی اپنا منشاء حدیث منزلہ واقعہ خم غدیر اور مسئلہ تبلیغ آیات کے سلسلہ میں پوری طرح ظاہر کر دیا تھا جسے ہر شخص یہ شخص جو تعصب کی صینک لگائے ہو باسانی سمجھ سکتا ہے تاہم آپؐ ان پیچیدگیوں کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے، جو حضرت علیؑ کے خلاف پائی جاتی تھیں۔ واقعہ قرطاس اور حبشہ اسامہ کا باوجود آنحضرتؐ کے اصرار کے روانہ نہ ہونا اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ نماز کی اہمیت پر حضرت ابوبکرؓ کا مامور فرمانا اسی یاس کی ایک خنیفہ لہر کا نتیجہ تھا جو آپؐ کو حضرت علیؑ کے متعلق پیدا ہو چکی تھی۔

میں اس خیال سے بالکل مختلف ہوں کہ آنحضرتؐ کا دلی منشاء یہ تھا کہ ان کے بعد حضرت علیؑ ہی ان کے خلیفہ ہوں مگر ساتھ ہی میرا یہ بھی خیال ہے کہ رسول خدا صلعم حضرت ابوبکرؓ کو بھی اس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ حالات کو دیکھ کر جب آپؐ کو حضرت علیؑ کی طرف سے مایوسی ہوئی تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے لیے منتخب کیا۔ نماز پڑھانے والی حدیث متواتر ہے، حضرت عائشہؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، عبداللہ بن زمرہؓ، ابن سعدؓ، علیؑ، ابن ابی طالبؓ وغیرہ سے الگ الگ روایت ہے۔ ابن زمرہ کا بیان ہے جس وقت آنحضرتؐ نے یہ حکم دیا کہ ابوبکرؓ سے کہو نماز پڑھائیں، حضرت ابوبکرؓ دباں موجود نہ تھے، حضرت عمرؓ نماز پڑھانے کے لیے

لے آئے منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ الا انه لانی من بعدی (بخاری، ج ۱، ص ۱۸۸) وغیرہ
 لے من کنت مولاه فعلی مولاه اللهم وال من والاه وعاد من عاداه (استیعاب ابن ہشام، ص ۱۸۸، محرقہ صفحہ ۱۸۸)

لے انی امہت ان ابلغہ انا اور جل من اہل بیتی (خصائص نسائی، طبری وغیرہ)

آگے بڑھے مگر آنحضرتؐ نے تین مرتبہ فرمایا: "نہیں ہمیں خدا کو منظور نہیں ہے کہ ابوبکر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نماز پڑھا لے۔"

ہاں! میں اس کا بالکل قائل نہیں کہ آنحضرتؐ سے اس دلی منشاء کے اظہار میں کہ ان کے بعد حضرت علیؑ ہی ان کے خلیفہ ہوں! خطا اجتہادی کا بھی امکان ہے۔ اس لیے کہ منشاء نبوت کا تعلق محض حضرت علیؑ کی ذاتی قرابت سے نہیں تھا بلکہ حضرت علیؑ کی خدا داد قابلیت اور ان کارناموں سے تھا جن کی نظیر صحابہ کی تاریخ میں ملنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ آنحضرتؐ کو حضرت علیؑ سے بالکل ویسی ہی محبت تھی جیسی ایک شفیق باپ کو اپنے ہونہار بیٹے سے یا ایک نیک دل استاد کو اپنے لائق شاگرد سے یا ایک فاتح بادشاہ کو اپنے شیر دل سپہ سالار سے ہوتی ہے۔ اس لیے آنحضرتؐ اگر اپنے بعد حضرت علیؑ ہی کو اپنا خلیفہ بنا چاہتے تھے تو اس میں کیا گناہ تھا؟ اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی اگر تھی تو صرف ان لوگوں کی تھی جنہوں نے خواہ مخواہ "موردی خلافت" کے فرضی خیال کو ایک ہوا بنالیا تھا اور اس کی تیج میں کسی جائز اور ناجائز بات کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ حضرت علیؑ بھی ان تمام پیچیدگیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اسی وجہ سے حضرت عباسؓ نے جب انھیں مشورہ دیا کہ چلو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کے متعلق طے کر لیں تو حضرت علیؑ بذاتِ خود اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور فرمایا کہ اگر کسی وجہ سے اس وقت آنحضرتؐ نے انکار کر دیا تو آئندہ پھر کوئی امید نہیں رہے گی۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؑ اس وقت کی پیچیدگیوں سے خود بالواس تھے۔ اور اپنے متعلق خلیفہ بنائے جانے کا یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک حضرت علیؑ کی ولیعہدی یا خلافت کا اعلان

لے دیکھو استیعاب ذکر عبداللہ بن ابی قحاذہ۔

بالکل نہیں ہوا تھا، ورنہ حضرت علی اور حضرت عباس وغیرہ کو اس کا علم ضرور ہوتا، اس قسم کی جتنی روایتیں ملتی ہیں جن سے حضرت علیؑ کی ولیمہ دینی یا خلافت کا اعلان ظاہر ہوتا ہے، غلط ہیں۔ علامہ توحیدی نے اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے پچانچہ ردہ اس قسم کی لغو روایات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اگر ایسے عظیم الشان مسئلہ میں جس کا تعلق تمام لوگوں کی دینی اور دنیوی مصالح سے وابستہ ہے اس قسم کے مخصوص قطعہ پاسے بہتے تو یہ خبر ضرور متواتر ہوتی اور صحابہ میں مشہور ہوتی اور اس پر عمل پیرا ہونے میں لوگ اس کی وجہ سے توقف نہ کرتے اور نہ سقیفہ بنی ساعلہ میں جہاں لوگ نشرِ خلیفہ کے لیے جمع ہوئے کوئی ایسا اختلاف ہوتا کہ انصار کہتے کہ ایک خلیفہ ہم میں سے ہو جائے اور ایک تم میں سے، پھر ایک جماعت حضرت ابوبکر کو خلافت کے لیے موزوں سمجھتی اور ایک حضرت عباس کو اور ایک حضرت علیؑ کو اور پھر حضرت علیؑ صحابہ سے محبت کرنے اور ان سے جھگڑنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے اور نص قطعی ثبوت میں پیش کرنے سے کبھی باز نہ رہتے، بلکہ وہ ضرور اپنی بات پراڑے رہتے اور اپنے حق کا مطالبہ کرتے جیسا کہ وہ اپنے مطالبہ پر قائم رہے جب ان کی باری آئی اور جنگ بھی کی یہاں تک کہ صد ہا آدمیوں کو فنا کر ڈالا۔ حالانکہ اس وقت معاملات زیادہ پیچیدہ ہو گئے تھے، شروع میں یہ بات زیادہ آسان تھی اس لیے کہ وہ زمانہ آنحضرتؐ سے زیادہ قریب تھا۔ ان لوگوں کی بہتیں آنحضرتؐ کے احکامات کی بجا آوری کی طرف زیادہ مائل تھیں“

(شرح التجرید المقصد الخامس فی الامامة)

یہ بات یاد رکھنے کے باعث ہے کہ اگرچہ حضرت علیؓ کو اپنے خلیفہ نہ ہونے پر انہیں
 تھا اس لیے نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا بلکہ عین اس لیے
 کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ حق سمجھتے تھے مگر بایں سبہ انہوں نے محض اس وجہ
 سے کہ حضرت ابو بکرؓ بھی ہر لحاظ سے خلافت کے لیے موزوں تھے کبھی مخالفت نہیں کی
 مگر آنکہ حضرت عمرؓ کا دور آیا اور حضرت علیؓ اب بھی یہ سمجھ کر خاموش نہ رہے کہ حضرت
 عمرؓ بھی ریاست و تدبیر کے اعتبار سے اُن سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن یہ ناگواری
 اس وقت بہت زیادہ بڑھ گئی جب لوگوں نے انصاف کا خون کر کے محض اس
 خوف سے کہ خلافت کہیں موروثی چیز نہ بن جائے حضرت علیؓ کو ایک جائز حق سے
 محروم کر دیا اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت عثمانؓ کو نیک دل اور
 پرہیزگار بزرگ تھے مگر وہ علم و فضل، انجمنیت و بہادری، ریاست و تدبیر کسی اعتبار
 سے بھی حضرت علیؓ کے ہم پلہ نہیں تھے۔

حضرت علیؓ کا جامِ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ ضبط نہ کر سکے انہوں
 نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جو روضۃ الاجاب میں بالتفصیل موجود ہے۔ آپ
 نے لوگوں کو مخاطب فرما کر کہا:-

”لوگو! تم کو قسم دیتا ہوں، کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا شخص ہے
 جس سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عقدِ مواخات کے موقع پر اُنت (خنی فی
 الدنیا والآخرۃ)“ کہا ہے؟ کیا کوئی ایسا شخص ہے جس کے حق میں
 آنحضرتؐ نے ”من کنت مولاه فعلی مولاه“ کہا ہو؟ کیا میرے علاوہ
 کوئی ایسا ہے جس کو سورۃ برأت سے جانے کا امین قرار دے کر آنحضرتؐ
 نے یہ کلمات فرمائے ہوں؟ کا یوڈی عنی الا انا اور چل من عتقی“
 کیا تم میں میرے علاوہ ایسا شخص ہے کہ آنحضرتؐ نے غزوات میں جب اُسے

کہیں بھیجا ہو تو اس کو تمام ہاجرین و انصار پر امیر بنایا ہو، مگر اس پر کبھی کسی کو امیر نہ بنایا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جس کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”انما مدینۃ العلم و علی بابہا“ فرمایا ہو؟ کیا تم میں میرے سوا کوئی ایسا ہے جو خطرات کے مواقع، اعدائے نرغہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ ہمیشہ ثابت قدم رہا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو منجھو سے پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوا ہو؟ کیا تم میں کوئی ایسا ہے، جو سلسلہ نسب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ سے قریب تر ہو؟“

لوگوں نے خاموشی سے تقریبی اور ہر ایک سوال پر حضرت علیؑ کی تائید کرتے ہوئے ”کوئی نہیں“ ”کوئی نہیں“ کے نعرے لگائے۔ آخر میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ:—

”آپ نے اس وقت جو کچھ بیان فرمایا سب صحیح ہے، لیکن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے، امید ہے کہ آپ بھی اس کی موافقت کریں گے۔“

میرے نزدیک اس پارٹی کی خصوصاً حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی یہ زبردست خطائے اجتہادی حتمی جنھوں نے حضرت علیؑ کے مقابل میں ایک ایسے شخص کو ترجیح دی جو کسی طرح اس کا مستحق نہ تھا، چنانچہ بعد میں خود حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اپنی آخر عمر تک اس پر متاسف رہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی وہ تھی جس کو یاد کر کے اکثر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ آنسو بہایا کرتے تھے اور فرماتے تھے۔

”ان الزریۃ کل الزریۃ ما حال بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و بین المسلمین ان یدکت لہم ذالک الکتاب“ ”بڑی مصیبت وہ

تھی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حائل ہوئی۔ یعنی یہ کہ ان کے لیے کوئی وصیت نہ مرتب کیا جائے (بخاری کتاب المصنوع)

سید حبیب الرحمن عظمیٰ

{نگار}

اس مسئلہ پر میرے مضمون کی اشاعت کے بعد سنی و شیعہ حضرات کے مضامین بکثرت موصول ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن میں طعن و تشنیع اور مناظرہ کج بحثی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسی لیے میں نے ان کو شائع نہیں کیا۔ بعض المیہ ایسے تھے جن کی اشاعت کو گوارا کیا جاسکتا تھا اور ان میں سے ایک یہ مضمون ہے جو اس ماہ کے رسالہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے بہت سچے ہوئے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جس اصول پر میں گفتگو چاہتا ہوں اس کا لحاظ اس میں بھی نہیں رکھا گیا۔ عام طور پر مناظرہ کرنے والوں کی عادت یہ ہے کہ فریق کو مطمئن کرنے کی کوشش وہ بالکل نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کی تیج میں صرف الزامی جواب دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور اسی کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ گالی کا جواب گالی سے دینا برا نہیں، لیکن اسی وقت جب ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ سب سے پہلے جس نے گالی دی تھی اس نے کوئی اچھا کام کیا تھا۔

سنی شیعہ نزاع کا قیام آج تک صرف اسی وجہ سے قائم ہے کہ ہر فریق بجلے اس کے کہ دوسرے کو معقول دلائل سے قائل کرے، گالیوں پر اُتر آتا ہے اور ایسی تلخ گفتگو کرتا ہے کہ دوسرے فریق میں بجلے کھینے کے انتقام کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس عجز کو معقولیت سے کیا واسطہ؟

میں نے ہر نام کے مضمون کو صرف اسی لیے پسند کیا کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ نہایت سنجیدگی سے لکھا گیا تھا اور دلائل صرف وہی پیش کیے گئے تھے جن کے ماننے پر سنی جماعت کو مجبور ہونا چاہیے تھا کیونکہ تمام روایات سنیوں ہی کی معتبر کہانوں سے لی گئی تھیں۔ اب اگر کوئی صاحب اس کے جواب میں ان روایات کو پیش کریں جنہیں شیعہ حضرات تسلیم نہیں کرتے ہیں تو بالکل بے نتیجہ بات ہوگی۔

چنانچہ ہمارے دوست مولوی سید جلیل الرحمن صاحب اعظمی نے بھی اسی اوسچے حربے سے کام لیا۔ یعنی اپنے پورے مضمون میں جہاں تک روایات کا تعلق ہے کوئی ایک سند بھی ایسی پیش نہیں کی جس کے تسلیم کرنے پر شیعہ جماعت مجبور ہو۔ فریق ثانی نہایت آسانی سے اس پورے مقالہ کا جواب یہ دے سکتا ہے کہ جو روایات اس میں درج کی گئی ہیں وہ بحیر لغو و مہمل ہیں۔ بخلاف ہر نام صاحب کے مضمون کے کہ اس کا جواب سنیوں کی طرف سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ان روایات کو تسلیم نہیں کرتے۔

میں نے جو کچھ فروری کے نگار میں لکھا وہ اسی اصول کے ماتحت تھا یعنی یہ کہ امارت و وصایت جناب اسیر کے باب میں تمام روایات کو تسلیم

کرنے کے بعد ایک انتہائی آواز خیال شخص کی طرف سے اس کی تردید میں کیا
 کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے اب فضا کی وغیرہ کی بحث یا یہ کہ رسول اللہؐ نے
 جناب امیرؓ کی ولایت و امامت کا اعلان کیا یا نہیں بالکل دور از کار بات ہے
 اب تو اس امر کو اپنی جگہ مسلم قرار دے کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس
 سلسلہ میں لازماً انہیں تمام مسائل کی چھان بین کرنا پڑے گی جن کا ذکر
 میں نے اپریل کے شمارے میں کیا ہے اور جن پر اظہار خیال کی دعوت میں نے
 خصوصیت کے ساتھ شیعہ علماء کو دی ہے۔

اعظمی صاحب نے تین عنوانات سامنے رکھ کر بحث کی ہے قبول اسلام
 اعانت اسلام مسئلہ امامت و خلافت۔ اول الذکر دو عنوانات تو قطعی قابل بحث
 نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا کوئی اثر مسئلہ خلافت و امامت پر نہیں پڑتا۔ وہ کیا تیسرا
 مسئلہ۔ سوائسوس ہے کہ اس کو جیسا کہ چاہیے تھا طے نہیں کیا گیا۔

فاضل مضمون نگار نے ابتداء میں ظاہر کیا ہے کہ مسئلہ خلافت خالص مذہبی
 مسئلہ ہے لیکن آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اس کا کوئی فیصلہ
 اپنی زندگی میں نہ کیا تھا۔ حیرت ہے کہ رسول اللہؐ معمولی ہلنے دھونے
 کے معمولی مسائل تو اپنی زندگی میں لوگوں کو بتا جائیں اور خلافت ایسے اہم معاملہ
 کو جس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا غیر طے شدہ چھوڑ جائیں۔ اگر امامت و
 خلافت کا مسئلہ واقعی خالص مذہبی مسئلہ ہے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ
 رسول اللہؐ نے اس کا فیصلہ ضرور کیا اور وہ فیصلہ یقیناً حضرت علیؓ
 کے حق میں تھا جس کے بعد نہ اجماع کی کوئی اہمیت باقی رہ جاتی ہے
 نہ مصلحت وقت کی۔ اس سلسلہ میں اعظمی صاحب نے جن روایات یا
 جمع کتابوں کی مدد سے کہ فیصلہ فرمایا ہے وہ صرف یہ ہیں جو تواتر پیش

قاضی دوی راضی کی گئی تھی۔ آئی میں جینک شیعہ سنی روایا کو سامنے رکھ کر اودنی شیعہ روایات کے استناد پر گفتگو نہ کریں دوسرا فریق مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آپ لاکھ لاکھ کریں کہ رسول اللہ نے آخر وقت میں نماز کی امامت حضرت ابوبکر کے سپرد کر کے گویا خلافت کا مسئلہ بھی طے فرمادیا تھا لیکن شیعہ اس کو مانتے کب میں بات ایسی کہیے جو فریق مقابل کو مطمئن و ساکت کرے ورنہ یوں یہ جھگڑا نہ مٹا ہے نہ آئندہ مٹ سکتا ہے۔ گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ہر نام صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس پر ایک نوٹ کے ذریعہ سے میں نے شیعہ علماء کو متوجہ کیا ہے کہ وہ ان عنوانات پر اظہار خیال فرمائیں جو ماہ مارچ ۱۹۷۷ء کے نگار میں نے متعین کیے ہیں۔

امید ہے کہ جنوری ۱۹۷۸ء میں اس موضوع پر میں کوئی سبب مقالہ پیش کر سکوں گا۔ اعظمی صاحب اس کا انتظار کریں، ممکن ہے گفتگو کے لیے بعض بالکل جدید پہلو نکل آئیں اور وہ بھی سیری طرح آخر میں یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ جب تک روایات کو چھوڑ کر صرف درایت کے نقطہ نظر سے گفتگو نہ کی جائے اس کا فیصلہ دشوار ہے۔



فضائل جناب امیر کے امتیازی خصوصیات

روایت و روایت کے معیار پر اصولی بحث

(ایک وسیع انجیال غیر جانبدارانہ انسان کے نقطہ نظر سے)

از افادات

عالم جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی

صاحب قبلہ محبت العصر و الظل

jabir.abbas@yahoo.com

فضائل جناب امیر کے امتیازی خصوصیات

روایت و درایت کے معیار پر اصولی بحث

ایک وسیع الخيال غير جانبدار انسان کے نقطہ نظر سے



دنیا میں بے شمار جماعتیں ہیں اور ہر جماعت کے کچھ پیشوایان بزرگان ہیں اور ہر ایک پیشوا و بزرگ کی روحانی و اخلاقی عظمت کے متعلق رونا ہیں جو اس جماعت میں شہرت رکھتی ہیں اور اس جماعت کے افراد ان روایات کے سامنے مرتسلیم خم کرتے ہیں۔

ان قدیم مذاہب کو جانے دیجیے جن کا د جو ذرا بچ کے صفحات پر نہرا دل یا صدیوں برس کی مدت سے چلا آ رہا ہے۔ ابھی وہ جماعتیں جن کی پیدائش آنکھوں کی دیکھی بات ہے ان میں بھی اپنے رہنما یاں کے متعلق اس قسم کی روایتیں موجود ہیں اور مقبولیت رکھتی ہیں۔

کون بانی بہائی مذہب کا پیر ہو گا جو علی محمد باب کے گویوں کی بارہ سے ایک مرتبہ محفوظ رہ جانے کو ان کی عظیم طاقت روحانی کا نتیجہ نہ سمجھتا ہو گا اور مرزا حسین علی بہار مازندران کے بغیر تعلیم ظاہری عالم علم لدنی ہونے پر ایمان نہ لایا ہو گا اور کون قادیانی مذہب کا نام لیوا ہو گا جو

۱۵ سرفراز رجب ۱۳۵۵ھ

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو ان تمام کمالات کا حاصل نہ سمجھتا ہوگا جن کا وہ اپنے متعلق ادعا کر سکتے تھے اور ان کے بیان کے مطابق اس کا یقین نہ رکھتا ہوگا کہ خدائے عزوجل ان کے خواب میں آیا اور لال روشنائی سے ان کے پیش کردہ کاغذ پر دستخط کیے جس کے قطرے جو قلم سے جھٹکنے میں گرے تھے ان کے لباس پر بیداری کے بعد بھی نمایاں تھے۔

اسلامی جماعت میں بدقسمتی سے شروع ہی میں افتراق پیدا ہو گیا اور وہ مذہب جو دنیا کو امت واحدہ بنانے اور جبل الہی سے بلا افتراق وابستہ کرنے کے لیے آیا تھا اس کے ماننے والے دوچار نہیں بلکہ عہتر فرقوں میں منقسم ہو گئے جن میں سے ہر ایک نے اپنا قبیلہ مقصد اور کعبہ عقیدت الگ قرار دے لیا۔

اس صورت میں یہ امر بالکل قابل تعجب نہیں کہ خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بہ اعتبار اپنے اپنے بزرگوں کے لیے روایات شائع ہو گئے کہ اگر وہ سب یک جا کیے جائیں۔ اور ایک غیر جانبدار انسان ان کو دیکھ کر کسی ایک متفقہ نقطہ پر پہنچنا چاہے تو حیرت و سرگشتگی کی ایک ایسی بھول بھلیاں میں گرفتار ہو جائے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ہے۔

اب اگر وہ ڈاکٹر امبیڈکر کی طرح حقیقت طلبی سے کوئی فرض نہیں رکھتا اور صرف رسمی حیثیت سے مختلف مذاہب پر ایک چھپچھاتی ہوئی نگاہ ڈال کر کسی ایک پہلو کی طرف مڑ جانا چاہتا ہے جس سے اس کا دماغ نہیں، مگر دل چلے جانے

کی تحریک کر رہا ہے۔ تو وہ اسی منہکا مہ اختلافت کو پورے اسلام ہی سے کنارہ کشی کا جہانہ بنائے گا۔ اور ادھر چلا جائے گا ہمدرد جاننے کا مشتاق ہے۔

لیکن اگر وہ سچ محض نقطہ حقیقت کی تلاش میں ہے تو اسے صرف یہ کہہ کر ایک چوراہے سے ہٹ جانے کا حق نہیں ہے کہ یہاں سے تو بہت راستے گئے ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کون ٹھیک ہے۔ کیونکہ ان ہی بہت راستوں میں تو ایک وہ بھی ہے جو صحیح منزل تک پہنچانے والا ہے۔ اگر انسان "کاوش جستجو" سے بہت ہار کر اس نقطہ مشترک ہی سے ہٹ گیا تو منزل سے جتنا نزدیک ہو گیا تھا اس سے بہت زیادہ اب دور ہو جائیگا۔

یہ شخص کی یہ "کج دلی" اور "پست سمجھی" بالکل اس انسان کے مانند ہے، جو مختلف مذاہب کے عظیم اختلافی مسائل کو دیکھ کر اصل مذہب ہی سے علیحدہ ہو کر لاندہ بہت کے گوشہ میں پناہ گزین ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سے اعصار و جوارح کو زحمت طلب سے آرام مل جائے لیکن روح کو وہ سکون حاصل نہیں ہو سکتا جو کسی حقیقت کو حقیقت سمجھ کر اختیار کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ لوگوں کی یہ "دماغی کاہلی" ہندوستانی مسلمانوں اور بالخصوص شیعوں کی اس جہانی کاہلی کے مانند ہے جو اسبابِ معیشت کی گونا گونی اور نفع و نقصان کے اعتبار سے ان کی دگر گونی سے گھبرا کر ماتحت پر ماتحت رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ سببِ نجات سمجھ لیتے ہیں اور اس طرح تجارت و حرفت و صناعت سب چیزوں سے کنارہ کشی کر کے بے کاری کی زندگی گزارنا اپنے لیے سببِ اطمینان سمجھتے ہیں۔ نتیجہً یقیناً دونوں کا "فنا" ہے، بے شک ایک جگہ "دنوی" اور ایک جگہ "آخری"۔



"منزل حقیقت کا طالب" بے شک اس کا فرض ہے کہ ہر ہر جاذبہ کو سمجھے ہر راستہ کو پوچھے، ہر رنگ کو پہچانے جستجو کرے کہ اس کی منزل حقیقت اسی کہہ

میں نہ ہو جسے وہ چھوڑ کر آگے نکل گیا ہے۔



اسلامی روایتوں کے اختلاف کی صورت میں بھی جانچ پڑتال کی ضرورت ہے نقد و تبصرہ کی حاجت ہے۔ سچے بھوٹے اکھرے کھوٹے کے امتیاز کے لیے روایت و روایت کے اصول پر بحث کی ضرورت ہے تب دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ حقِ حقہ کر باطل کی آمیزشوں سے علیحدہ اور واقعیت نکھر کر انکھوں کے سامنے آجائے گی۔



پہلے سب کے اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ کون فریق ہے جس نے نقد و نظر کے دروازوں کو بند کیا ہے۔ جرح و تعدیل کے راستوں پر پرے بٹھائے ہیں اور اپنے مجوزہ ہستے کی طرف آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جانا چاہتا ہے۔

”الصحابۃ کلہم عدول“ اصحاب سب کے سب عادل ہیں اور اصحابی کا لُغوم یا بہم اقتدا یتماہتد یتحد۔ اصحاب نبی سب تاروں کے مانند ہیں جس کی بھی پیروی کی جائے (بلا استثناء) ہدایت ہی ہدایت ہے۔
ادھر کسی صحابی کے کسی طرزِ عمل پر کتنی ہی تمناں اُوب اور تہذیب کے ساتھ کیوں نہ ہوں کتنے چینی شروع ہوئی ادھر جن عقیقت پر فکس آئی چہرہ اخلاص غصہ سے تمسک گیا اور کابلِ ارادت بل کھانے لگی۔ لائیں! اصحابِ نبی کی شان میں گستاخی۔ تبرا کھلا ہوا تبرا!!

گویا ان لوگوں کے لغت میں کسی اصولی اعتراض اور آئینی اظہارِ اختلاف کا نام ہے ”تبرا“ اور اسی کی دوسری تفسیر ہے ”گالیاں دینا“ بھی تو جس صاف سادہ مسلمان سے بوجھ۔ وہ لے گا کہ گالیاں دینا شیعوں کا جزوِ مذہب ہے اور یہ شعر پڑھ دیکھا ہے

دشنام بہ مذہبہ کہ طاعت باشد

مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

پھر کچھ کتابیں ایسی مقرر کر لیں کہ دنیا بدل جائے زمین آسمان میں انقلاب آجائے ان ہی کتابوں سے ”رنگیلا رسول“ ایسی رسولؐ کے عالم کتاب تصنیف ہو جائے جس پر اس کے مصنف کو تلوار کے گھاٹ اتار کر خود سولی پر چڑھ جانا پڑے لیکن یہ زبان سے نہ نکلے گا۔ ان کتابوں کی سب روایتیں معتبر نہیں ہیں، کوئی ضعیف ہے، کوئی موضوع ہے اور کوئی غیر معتبر، بلکہ کہتے ہیں کہ ”اصح الکتاب بعد کتاب الباری“ اور یہ کہ ان کے روایات نقد و تبصرہ سے بلند و برتر ہیں۔

اگر کوئی بے چارہ اللہ کا بندہ ذوق تحقیق سے رجال بخاری“ ایسی کتاب لکھ دیگا تو اس پر اخبار اللہ کے صفحات پر وہ شور برپا کیا جائے کہ شورِ محشر بھی شرما جائے اور وہ بے چارہ ایسا دم بخود ہو کہ پھر اتنی مہمت ہی نہ کرے اور نہیں تو دھکی دی جائے کہ جو راہِ جہاں اور شردھانہ کا انجام ہوا وہی مختار اجمعی ہوگا۔



فرارِ عین یعنی مسائل شرعیہ میں اجتہاد و استنباط یعنی ذاتی غور و غوض کا دروازہ بند۔ مفتی کے چند اشخاص جو اب سے ایک ہزار سال سے زیادہ پہلے اور بغیر اکرمؐ کے عہد سے کم دیش ڈیڑھ دو سو برس بعد یعنی نہ زمانہ نزول احکام و تشریع مسائل کے وقت حاضر نہ زمانہ اجرائے حکم اور نظامِ علیؑ کے ناظر، مگر پورا دار و مدار ان ہی کی ذاتی راؤں پر اور تقلید کا پورا بار ان کے مرزہ و کوسیدہ کا مذہبوں پر قاعدہ ہے کہ جس قوت کے فرائض اُس سے الگ کر لیے جائیں وہ قوت پھر ان فرائض کے ادا کرنے سے قاصر ہی ہو جاتی ہے۔

یقیناً صدیوں کی یہ پابندی عقول و افکار میں جمود پیدا کرے تو کوئی تعجب نہیں

اصولِ مذہب میں عقلی بحث کا دروازہ اس لیے بند کہ جن وقیع عقل کوئی چیز ہی نہیں اور اچھے یا بُرے کے کوئی معنی نہیں۔

اب رہا کیا؟ آنکھیں بند کر کے کانوں پر پردے ڈال کے، دماغی طاقتوں کو بے کار معطل بنا کے جو کچھ کہا جائے اسے مان لو اور جو بتایا جائے اسے جان لو۔ سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔

ایک غیر مابند اور وسیع اخیال انسان کو اسی سے گلشنِ چاہیے اور دل میں کسنا چاہیے یا الٰہی معاملہ کیا ہے، فرامیٹن کا کارخانہ ہے؟ طلسمی قلعہ ہے؟ راہِ ظلمات ہے؟ آخر ہے کیا کہ چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ سوچنے سمجھنے کی اجازت نہیں۔ اس کا ضمیر ضرور بے اطمینانی کی کر دہش بدلتے گا اور شک و شبہ سے بچ کر تاب کھائے گا اور سمجھے گا کہ کچھ نہ کچھ ہے جس کی پردہ داری منظور ہے۔

اب اگر اس نے اس منزل سے عبور کر لیا اور ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی اور پیشوا یا ان مذہب کے مدارج و مراتب پر اس کی خصوصیت سے نگاہ گئی اور تفصیل کے خازن دامنِ اجماع کے قبل اس نے اجمال کے قادی کو طے کر لینا چاہا اور یہ دیکھا کہ آخر اصولی حیثیت سے ایک بزرگ ترین پیشوا کے لیے معیار کیا مقرر کیا گیا ہے؟

اس نے ایک طرف نگاہ ڈالی۔ ایک فریق کے نایب کو دیکھا کہ عرشِ بلندی سے سچے سچے جو سارے اطمینان و سکون کے ساتھ بلند ترین انسانی اوصاف کی ایک فہرست ہے جو سارے ہیں۔ کہیں پر آواز میں ارتعاش نہیں۔ لہجہ میں اضطراب نہیں۔ تقریر میں جھول نہیں۔ زبان میں لکنت نہیں، ہول پر خشکی نہیں، لگے میں خرخراہٹ نہیں۔ وہ کہہ رہا ہے: "پیشوائے مذہب، امامِ خلق، رسولِ کائناتیں وہ ہر سکتا ہے، جو اعلم زمانہ ہو، افضل زمانہ ہو، از بد زمانہ ہو، اور ہر "شیخ ہو، اشراف

ہو، صحیح نسب ہو، وغیرہ وغیرہ کہتے کہتے سب سے زیادہ یہ ہے کہ معصوم ہو، یعنی اپنے افعال و اعمال میں مرضی الہی کا بالکل آئینہ ہو۔ بھولے چوکے، نادانیت، جہالت اور کسی سبب سے بھی اس سے بڑھاپے جوانی بلکہ بچپن میں بھی کبھی گناہ سرزد نہ ہوا ہو اور غلطی نہ کی ہو۔ اور چونکہ اس مرتبہ کا حصول عام انسانوں کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس لیے اس کی پیشوائی و جانشینی کا اعلان خدا کی جانب سے پیغمبر کی زبانی ہو گیا ہو۔

دوسری جانب نگاہ کی تو یہ دیکھا کہ جوں جوں پیشوا کے اوصاف میں قیود عامہ ہوتے جاتے ہیں اور شرائط میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اوصاف چہروں کا رنگ اڑتا جاتا ہے۔ سر وں کا بند کرنا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، چہروں پر ہوائیوں کا چھوٹنا اور ہونٹوں پر نہ بان کا پھیرنا سب کچھ وہ کہہ رہا ہے جو دل کی گہرائیوں میں مضمر ہے اور یہ اضطراب و پریشانی کا اظہار صاف نگاہی کرتا ہے کہ اوصاف وہ سامنے آ گئے ہیں جو اپنے مشاہدہ و تجربہ نہیں بلکہ وہم و خیال سے بھی بالاتر ہیں اور اس لیے جب وہ فرستِ حق تعالیٰ اور فریقِ مقابل کے جواب کی نوبت آئی تو اس کے نمایندہ نے کھڑے ہو کر ہر صفت کے لحاظ سے نہیں نہیں کی رٹ لگائی، احکم ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں، افضل ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں، اشجع ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں، اشرف ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں معصوم ہونے کی ضرورت ہے؟ نہیں۔ یہاں جا کر بڑی بہت یہ کی گئی کہ عدالت کی شرط قرار دی، مگر یہی کہ اس میں بھی انتخاب ابتدائی کی قید لگائی یعنی شروع شروع اس کا خیال رکھنا ہے کہ عادل ہی منتخب ہو۔ لیکن اگر اتفاق سے فاسق ہی کی خلافت مسلم ہو جائے تو بہر حال وہ خلیفہ ہے۔ فسق و فجور کی وجہ سے وہ خلافت کے عہدہ سے بطرت نہیں سمجھا جائے گا۔

یقیناً ایک جانبدار انسان اگر اس میں معاملہ فہمی کی طاقت بھی موجود ہے تو اس سے یہ اندازہ کرے گا کہ پہلے فریق کو اپنے پیشواؤں کے بلند ترین اوصاف پر واقعی حیثیت سے یا کم از کم ان دستاویزوں کے لحاظ سے جو موجود ہیں اتنا اعتماد ہے کہ وہ ان تمام اوصاف کو ان پر منطبق کر سکتا ہے اور دوسرے فریق کو اپنے پیشواؤں کی نسبت ان اوصاف کے منطبق ہونے کا یقین اور گمان کیسا بلکہ زبردستی تاویل اور کج بحثی کے ذریعے سے بھی منطبق ہونے کا امکان ہی نظر نہیں آتا۔ اس لیے وہ ان قیود کے متعلق سختی سے انکار کرنے ہی میں اپنی جیت سمجھ رہا ہے۔

میرے خیال میں فضائل کی بحث کا نہیں پر فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ایک غیر جانبدار انسان کو یہ رحمت ہی برداشت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ تفصیل کے ساتھ ایک ایک کی فضیلت کا دوسرے کے ساتھ موازنہ کرے۔

لیکن ذوق طلب نے اس پر گفتگو کی اجازت نہ دی اور اس کی تحقیق کی پیاس اتنے میں نہ بجھ سکی کہ اب وہ فریقین کی کتابیں اٹھائے گا۔ احادیث و مستنیر و تواریخ سب کو اپنے سامنے رکھ کر تمام متعلقہ اشخاص بزرگان مذہب کے فضائل و حالات کی الگ الگ فہرست ان کے اسناد و روایات کے حوالے کے ساتھ مرتب کرے گا۔ اور اس کے بعد اس کی نگاہ کچھ خاص پہلوؤں کی طرف جمائے گی جو بہت حد تک واقعت کے نقطہ تک پہنچنے میں اس کی رہنمائی کریں گے۔



یقیناً اگر وہ تجبیہ و کامیاب تفتیش کے اصول سے واقف ہے تو وہ اس کی کوشش کرے گا کہ وہ ایک فریق کے ستمہ پیشوا کے خصائص و حالات مرتب کماات کی سندوں کو دوسرے فریق کے مستند کتب احادیث و تواریخ میں تلاش کرے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو مجھے گا کہ میں نے ہمت خواہ فتح کر دیں

یہ کہ کسی پیشوا سے مذہب کے فضائل و کمالات کے متعلق خود اس کو پیشوا ماننے والی جماعت میں تو ایسی حکایتیں شائع ہوتی ہی ہیں جو اس فریق میں مستم حیثیت سمجھی ہوں لیکن دوسرا فریق انہیں نہ تسلیم کرے، ایسے روایات ایک غیر جانبدار شخص کے دل و دماغ پر ہرگز کوئی نتیجہ خیز اثر نہیں ڈال سکتے۔

جب اس معیار پر پردہ جانچنے کا تو معلوم ہوگا کہ ایک فریق جو تعداد کی حیثیت سے اکثریت رکھتا ہے اور مالی و اقتداری ہر حیثیت سے غلبہ، اس کے پیشوا یا ان خاص اور بزرگ مرتبہ مقتدا یا ان کے لیے دوسرے فریق کے یہاں سوائے قدح کے کچھ ملتا ہی نہیں اور قدح بھی ہر طرح کی علمی، عملی، اخلاقی، اداسانی، نسبی جیسی لیکن دوسرے فریق کے مقتدا یا ان اور بالخصوص پیشوائے اعظم علی بن ابی طالب کے لیے اول الذکر فریق کی کتابوں میں فضائل کا اتنا ذخیرہ موجود ہے جو ان تمام شرائط و قیود کے منطبق کر دینے کے لیے کافی ہے۔ جنہیں کس فریق نے امامت و خلافت کے لیے ضروری قرار دیا تھا اور قدح کا تو نام و نشان ہی نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی ٹوٹی پھوٹی روایت کسی معمولی سی کمزوری کے متعلق لکھ بھی دی گئی ہے، جیسے حکایت حلبہ بنت ابی جہل، تو اسی کے ساتھ اسی جماعت کے بلند مرتبہ حفاظ و محدثین نے لکھ دیا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے اور اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

اسی کے اوپر وہ فضائل کی بحث کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اگر ان روایات فضائل کے پہلو بہ پہلو جناب علی ابن ابی طالب کے متعلق موجود ہیں دوسرے فریق کی نسبت اتنی ہی تعداد میں یا اس سے زیادہ فضائل کے روایات بھی موجود ہوں، لیکن پہلی قسم کے روایات حضرت علیؑ کے معتقدین خاص کے علاوہ اس جماعت کے کتب میں بھی موجود ہند تصدیق شدہ ہوں جو آپؐ کو مذہبی حیثیت سے نہ درجہ نہیں دیتی لیکن دوسرے فریق کے متعلق داد شدہ فضائل صرف ان ہی کے عقیدت مند

حلقہ کے ساتھ مخصوص ہوں تو یہیں سے ایک غیر جانبدار انسان کے نقطہ نگاہ سے محل اعتبار میں دوسرے حضرات کے فضائل حضرت علیؑ کے فضائل کے پہلو میں ہرگز نہ آسکیں گے اور پھر اس کے ساتھ جب یہ دیکھا جائے گا کہ ان حضرات کے روایات مدح کے ساتھ خود اس جماعت کے کتب میں روایات قدح بھی موجود ہیں۔ جو ان کے مخالفت فریق کی تائید کر رہے ہیں اور اس لیے یہ روایات قدح خود ان کے روایات مدح کے ساتھ معارضہ رکھتے ہیں جس کی بنا پر اگر کسی ایک کو ترجیح بھی نہ دی جائے اور دونوں کو یکساں قرار دے کر پایہ اعتبار سے حذف کر دیا جائے تو کیا ہوگا۔ دفتر فضائل میں (۱۰) اور حضرت علیؑ کے فضائل بلا معارض لائق تسلیم قرار پائیں گے۔

اس موقع پر کتنی بے بسی کا منظر ہرہ ہے یہ کہنا کہ اہل سنت کے کتب میں شیعہ لوگوں نے اپنی دسیہ کاریوں سے اس قسم کے روایات داخل کرادیے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے ایک وہ جماعت جو دولت و سلطنت کی مالک ہو جہاں علوم و حدیث و تاریخ حکومت و جہان بینی کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے ہوں جہاں کے فقہ و حدیث کے لیے درس گاہیں قائم ہوں جس کے حفاضا و محدثین کی تعداد ایک ایک زمانہ میں سینکڑوں تک پہنچی ہو وہ اپنے علم سرمایہ کے بارے میں اتنی بے بس ہو جائے کہ دوسری جماعت کے افراد اس کی معتبر ترین کتاب پر قبضہ کر کے اس میں جو چاہیں اپنے دل سے ملا دیں اور اس جماعت کو خبر بھی نہ ہو بلکہ خلفاء و محدثین اسی تحریف شدہ ذخیرہ کی حفظ میں مصروف ہو جائیں اسی کو نقل کریں اور اسی کی نشر و اشاعت میں اپنی جان کھپائیں۔

برخلاف اس کے وہ دوسری جماعت جو ہمیشہ مقہور و مغلوب رہی ہو جس کی گردنیں تلواریں کے لیے تھپتھپاؤں ہتھکڑیوں، بیڑیوں کے لیے جس کی

زندگیاں جہل خانوں کے لیے وقف رہی ہوں۔ جس کی صدیوں تک کوئی چھوٹی سے چھوٹی درسگاہ بھی نہ ہو اور جس کو اپنے کتب کی نشر و اشاعت کا موقع بھی نہ حاصل ہو۔ جس جماعت کا کسی مرتبہ قتل عام ہوا ہو وہ اپنے علمی و مذہبی سرمایہ کی اتنی حفاظت کرے کہ کسی مخالفت مذہب کو اس میں اپنے حسب و نحوہ قطع و برید اور الحاق و زیادتی کا موقع نہ ملے۔ کیا یہ عقل میں آنے کی بات ہے؟ کیا کوئی بے غرض غیر جانبدار انسان اس کی تصدیق کر سکتا ہے؟

پھر آخر کیا ہے کہ شیعوں کے موافق روایات اہل سنت کے یہاں کثرت سے مل جاتے ہیں اور اہل سنت کے موافق منشاء روایات شیعوں کے یہاں غیر ممکن۔ لڑائی نہیں ہے، سخن پروری نہیں ہے، مناظرہ نہیں ہے، دنیا جانتی ہے کہ مجھ کو مناظرہ سے نفرت ہے اور میں اس کو تحقیق حق کا ذریعہ نہیں سمجھتا ہوں، مگر حقیقتاً یہ سوال ہے اور قابل غور بات ہے جس کے اوپر ہر بے غرض انسان کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھا اگر ایسا ہی ہوتا کہ وہ روایات شیعوں نے کتابوں میں ملحق کر دیے تھے تو کم از کم جب علم رجال و روایت کی تدوین ہوئی اور نقد احادیث پر کتبیں تصنیف ہونے لگیں اور صحیح حسن، موثق، ضعیف، موضوع، الگ الگ کی جانے لگیں تو وہ روایات جو فضائل علی ابن ابی طالبؑ سے متعلق تھے موضوع یا ضعیف قرار پاتے اور روایات فضائل حضرت خلفاء صحیح حسن اور کم از کم موثق، لیکن اس کو کیا کیا سببوں کے معاملہ بالکل برعکس ہے۔

امام احمد بن حنبل اور قاضی اسمعیل بن اسحاق فرما رہے ہیں۔ لحد یسر
فی فضائل احد من الصحابة بالاسانید الحسان ماروی فی
فضائل علی بن ابی طالب۔

”صحابہ میں سے کسی بزرگ کے متعلق حسن و معتبر سندوں کے ساتھ آئے روایات

وارد نہیں ہوئے جتنے صلی بن ابی طالبؑ کے بارے میں وارد ہیں، راستی جار مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۴۷۹) حافظ نسائی اور ابوعلیٰ نمیشاپوری کا ارشاد ہے:-
 لیسرود فی حق احد من الصحابة بالاسانید الصحاح اکثر مما ورد فی حق علی۔

مکمل صحابی کے بارے میں صحیح السند طرق سے اتنے روایات وارد نہیں ہوئے ہیں جتنے حضرت علیؑ کے بارے میں ہیں، (منہج مکمل مصنف ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص ۲۳۷) پھر کیا اس سے ایک غیر جانبدار انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا نہ ہوگا کہ یہ حقیقت و واقعیت کا زور تھا۔ جس نے تمام مذہبی جذبات کے خلاف ان روایات کو مستند و معتبر راویوں کے زبان و قلم سے نکلوا دیا اور اس کے برخلاف دوسرے صحابہ کے فضائل کے متعلق چونکہ ان کی روایت صرف ان کے عقیدت مند حلقہ سے مخصوص ہے یہ شبہ پیدا ہو جائے گا کہ ان کی ساخت و پرداخت صرف ارادت و عقیدت کا نتیجہ ہے، اور اس لیے ان کی مخالف جماعت میں ان روایات کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔

بعض لوگوں نے حضرت علیؑ کے فضائل کی کثرت کی عجیب و غریب توجہ یہ کی ہے کہ چونکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیبی طریقہ پر یہ اطلاع حاصل تھی کہ حضرت علیؑ کے خلاف ایک جماعت ایسی پیدا ہوگی جو آپ کی تنقیص کرے اور آپ کی مخالفت کرے اس لیے حضرت نے آپ کے فضائل کثرت سے بیان فرمائے تاکہ لوگ آپ کے مخالفین کی باتوں میں آکر آپ سے محروم نہ ہوں، اور جادہ حق سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں۔ (صواعق محرقة مصنف ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص ۷۴) لیکن یہ تاویل عجیب و غریب ہے، رسول کو اس کا علم تھا کہ حضرت علیؑ کی تنقیص کرنے والے پیدا ہوں گے۔ کون؟ بتنی امیہ۔ اور اس لیے آپ نے ان

جناب کے فضائل زیادہ بیان فرمائے۔ لیکن آخر حضرت سرور کائناتؐ کو یہ بھی تو علم ہوگا کہ ایک جماعت ایسی موجود رہے گی جو خلفائے ثلاثہ کی مذہبی عظمت کی بالکل قائل نہ ہوگی بلکہ ان حضرات کی علمی و عملی حیثیت سے ہر طرح تنقید کرتی ہوگی۔ وہ کون؟ یہی جماعت روافض۔

پھر اگر واقعی حضرات خلفاء کے فضائل وہی سب کچھ تھے جو حضرت علیؑ کے لیے بیان ہوئے یا ان سے کچھ زیادہ تو رسول اکرمؐ نے ان کے فضائل بھی کیوں نہ بیان فرمادیے تاکہ اس جماعت کے معتقدات کا سد باب ہو اور امت محمدیہ مگر ای سے محفوظ ہو جائے۔

اگر دیکھا جائے تو حضرت علیؑ کے مخالف بھی آپ کی حکومت و سلطنت کو نہ تسلیم کرتے ہوں آپ کے اصول جہان بینی و سیاست پر اعتراض کرتے ہوں مگر آپ کے علمی و عملی کمالات کا ایک بھی مخالف نہ تھا۔ یہاں تک کہ جماعت خوارج تک جو آپ کی حد درجہ مخالفت ہے اور آپ سے برأت کو اپنا ایمان سمجھتی ہے وہ آپ کے بنیٰ ظفر علمی و عملی خصوصیات کی قائل ہے جس کے متعلق میں اپنے ایک مخصوص مقالہ میں کافی تبصرہ کرچکا ہوں جو گزشتہ زمانہ میں کسی سال کے سرفراز رجب نمبر ہی میں شائع ہوا تھا اور پھر امامیہ مشن کی جانب سے کسی سال کے ماہ رجب کے رسالہ میں وہ درج ہو کر دوبارہ بھی شائع ہوا ہے۔

اس کے برعکس جماعت روافض (فرقہ شیعہ) حضرات خلفاء کی نسبت کبھی طرح کے بھی کمال کی نسبت کو اپنے ضمیمہ کی بنا پر قبول نہیں کرتی اور اگر ان حضرات کے تذکرہ میں کسی زبان و قلم پر کوئی تعظیمی لفظ نظر آئے (جیسا کہ میں پابند ہوں) تو اس کو صرف اپنے برادرانِ ملی کی خاطر داری اور ایک اندازِ رواداری سمجھنا چاہیے۔ اور کچھ نہیں۔

پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ حضرت علیؑ کی مخالف جماعت جو کھلم کھلا اس درجہ

تک آپ کی دشمن رہی ہو جیسا کہ بنی امیہ تھے۔ اس کی عمر کتنی مختصر و کوتاہ تھی جو زیادہ سے زیادہ چند صدی میں ختم ہو گئی۔ جماعت خواجه ہر زمانہ میں موجود رہی اور اب بھی ہے۔ لیکن کچھ محدود علاقوں میں محدود تعداد میں مختصر۔ اس کے علاوہ جتنے مسلمان ہیں ہونکہ وہ حضرت علیؑ کو پہلا خلیفہ نہیں تو چوتھا خلیفہ ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے وہ حضرت علیؑ کی نسبت ہرگز کسی ایسے ائمہ کا اظہار نہیں کر سکتے جو کھلم کھلا آپ سے نفرت اور نیرازی کا ثبوت دے۔ اس لیے انہیں بھی لکھے گا تو یہ کہ شیعوں کے (مفروضہ انجم) روایات کی بنا پر حضرت علیؑ (معاذ اللہ) ایسے تھے اور ایسے تھے۔ لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تمہارے نزدیک کیسے تھے تو وہ ہرگز کسی تنقیص کی نسبت کو اپنے ذمہ عائد نہیں کرے گا۔

اخبار ”الجمعیۃ“ دہلی بھی لکھتا ہے تو یہ کہ ہم کو ایک نئے علیؑ اور حسینؑ بنا کر تبرے کا جواب تبرے سے دینا پڑے گا۔“

میں تو چونکہ مواد انسان ہوں اور ہر بات میں صلح پسندی کے پہلو کی تلاش کرتا رہتا ہوں اس لیے میرے نزدیک تو شیعی جرائد کو اس کے جواب میں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ اگر تم نئے علیؑ اور حسینؑ بنا کر تبرے کا جواب دینا چاہو گے تو نہ وہ ہمارا جواب ہو گا نہ ہمیں اس پر بگڑنے کی ضرورت۔ اس لیے کہ ہم جنہیں مانتے ہیں وہ پرانے علیؑ و حسینؑ ہیں نئے نہیں ہیں۔ اگر کسی نئے کو بنا کر تم نے تبرا کیا تو ہم سے مطلب؟

یہ مسورت تو مخالفین علیؑ کی ہے۔ لیکن دوسرے صحابہ کی مخالف جماعت (شیعہ) وہ اصول تمدن اور معاشرت اور اتحاد اسلامی کے مفاد و مقصد کی بنا پر سنجیدہ و فہم پرور علماء و وزراء کی جانب سے رد کی جائے اس سے کہ وہ طارح عالم میں ان حضرات کی نسبت اپنے خیالات کا علانیہ اظہار کرے۔ یہ اور بات ہے لیکن واقعیت و حقیقت کے لحاظ سے جو کچھ یہ جماعت سمجھتی ہے اور کہنا جائز سمجھتی ہے اس کو دنیا بانہی ہے۔ وہ کبھی ان حضرات کی نسبت کسی اپنے خیال کا اظہار کرتے وقت

یہ کہتے نہیں پھپکے گی کہ ہمارا مقصد وہی ہے اور کچھ نہیں۔ اسے نئے بنانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ ان پرانے اشخاص کی نسبت جو کچھ عقیدہ رکھتی ہے اس کا اظہار بھی بجا نہ سمجھتی ہے۔

اور یہ جماعت جب سے دنیا میں پیدا ہوئی اگرچہ اس کے فنا کی تدبیریں کوئی بھی اٹھا نہیں رکھی لگیں مگر اس کی مردم شماری میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس وقت تمام دنیا کے طول و عرض میں ہر اقلیم اور ہر ملک میں اس کے نام لیا موجود ہیں۔ اس کی سلطنتیں قائم ہوئیں، مٹیں اور پھر ان کی بنسداد پڑی اور اس وقت بھی اس کی خود مختار سلطنتیں، حکومتیں اور اجتماعی مراکز موجود ہیں۔

پھر کیا اگر اس جماعت کے وجود کی بنا پر حضرت علیؑ کے فضائل حضرت رسول اکرمؐ کو بیان کرنے کی ضرورت تھی تو اس جماعت کے وجود کی بنا پر دوسرے حضرات کے فضائل اگر ان کی کچھ اصلیت ہوتی تو اور زیادہ شد و مد کے ساتھ حضرت رسول اکرمؐ کو بیان نہ کرنا چاہیے تھے۔ اور کیا بیان نہ کرنے کی صورت میں اس جماعت کی گمراہی کی ذمہ داری حضرت کی طرف عائد نہیں ہو سکتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو جہید و تاویل بالکل پادر ہوا ہے۔ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقیقت کے ترجمان اور واقعیت کے مفسر تھے۔ انھوں نے جس کے جتنے مراتب تھے، اتنے بیان فرما دیے۔ اس میں نہ کسی حکمت عملی کا دخل تھا نہ کسی پیش بندی کا اہتمام۔

آپؐ نے تو صحابہ میں سے ایسے ایسے افراد کے فضائل بیان فرمائے جنہیں مذہبی حیثیت سے کوئی منصب و عہدہ حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ذات کسی حیثیت سے بھی متنازع فیہ ہے۔ جیسے حضرت سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، مقدادؓ، عمار بن یاسرؓ، خزیمہ بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن الیمانؓ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اگر کچھ اشخاص کے فضائل آپؐ نے بالکل بیان

۲۳۰

نہیں فرمائے تو ایک بے غرض انسان تو یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ دفترِ فضیلت سادہ تھا اور ورقِ منقبت میں کوئی حرف بھی نہ تھا، ورنہ عادل و منصف 'بے لوث' اور بے غرض پیغمبرِ اس کے انہار میں بخل ہرگز نہ کرتا۔



حضرت علیؑ کے فضائل کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب انسان اس ماثول پر نگاہ ڈالتا ہے جو ان فضائل کے بالکل فنا کر دینے کا ضامن تھا۔

دو چار برس کی مدت نہیں ایک صدی کے قریب زمانہ اس حالت میں گزرا کہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لانا جرم تھا، آپ کی فضیلت کا بیان کرنا قابلِ معافی گناہ۔ ابو الحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں اس حالت کی تصویر خوب کھینچی ہے جسے ابن ابی الحدید معتزلی نے شرح منہج البلاغہ میں درج کیا ہے۔ اور میں نے اپنے رسالہ حسینؑ اور اسلام میں اس کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام عمالِ حکومت کو قطعی حکم دے دیا گیا تھا کہ جو کوئی علیؑ کی کوئی فضیلت بیان کرے اس کا جان و مال مباح ہے۔

انتہایہ ہے کہ لوگ حضرت سے نقلِ حدیث کرتے وقت آپ کا نام لیتے ڈرتے تھے جس کا ثبوت حسن بصری کی روایت سے ملتا ہے جس میں درج ہے کہ کسی ان کے شاگردِ خاص نے ان سے پوچھا کہ آپ نے رسالتِ مآبؐ کی زیارت تو کی نہیں ہے مگر آپ احادیث میں قال رسول اللہ ﷺ تکلف کہہ دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا "م نے مجھ سے وہ بات پوچھی ہے جو آج تک کسی نے نہ پوچھی تھی اور اگر تم کو مجھ سے یہ خصوصیت نہ حاصل ہوتی تو میں ہرگز تم کو نہ بتلاتا اقی فی زمانہ کما تری کل شیء سمعتنی اقولہ قال رسول اللہ ﷺ

سے شائع کردہ امیریشن پاکستان لاہور

عن علی بن ابی طالب غیرانی فی نرمان لا استطیع ان اذکر علیا۔
 ”میں ایک ایسے زمانہ میں ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو، جو کچھ تم مجھ سے سنو کہ
 میں قال رسول اللہ کہہ کر بیان کرتا ہوں وہ درحقیقت میں نے علی ابن ابی طالب
 سے سنا ہے۔ مگر نہ مانے ایسا ہے کہ میں علی کا نام نہیں لے سکتا۔“ (لمعات فریدیہ
 مصنفہ علامہ ابراہیم راوی رفاعی مطبوعہ بغداد ص ۵۳)

اس کے برخلاف دوسرے صحابہ کے فضائل میں روایت بیان کر نیوالے
 کو انعامات دیے جاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر التعداد موضوع روایتیں
 صحابہ کے فضائل میں تصنیف ہو گئیں۔ ابوالحسن مدائنی کی محولہ بالا عبارت میں
 اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس صورت حال کی بناء پر ایک طرف تو ان حضرات
 کے فضائل کی ذرا ذہور جو روایتیں تھیں وہ بھی ایک غیر جانبدار انسان کے نقطہ نگاہ
 سے مشکوک ہو گئیں۔ کہ کہیں یہ اسی نگہ سال کی بنی ہوئی نہ ہوں جو حکومت وقت کی
 طرف سے روایتوں کے دھالنے کے لیے قائم ہوا تھا اور دوسری طرف فضائل
 حضرت علی کی امتیازی شان دو بالا ہو گئی کہ ان کے تواثر اور قطعیت کا وہ بے
 پناہ سیلاب تھا جو حکومت وقت کی انتہائی جدوجہد کے ساتھ رک نہ سکا، اور
 اس طرح دنیا میں پھیلا کہ اموی سلطنتیں اور ان کی وضع کردہ روایتیں فنا ہو گئیں
 لیکن ان فضائل سے تمام اسلامی کتب احادیث و توارخ کے دامن چھلک
 رہے ہیں۔ بے شک

کتاب فضل علی را کم است آبِ بحار
 کہ ترکمن سرانگشت و صفحہ بشمار
 بحث کے بہت سے پہلو باقی ہیں۔ جن پر تبصرہ بھر کبھی
 والسلام

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے



”کاوش تحقیق“ فطرت کا سرمایہ ہے۔ جو بعض دماغوں میں خصوصیت کے ساتھ ودیعت کر دیا گیا ہوتا ہے۔ وہ انسان کو کبھی کبھی بحث و نظر کے ایسے خشک و ناہموار راستوں پر پہنچا دیتا ہے جن کے تصور سے بھی وہ افراد جو صرف ”دماغی عیاشی“ کا ذوق رکھتے ہوں کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں۔

بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ نگار کے صفحات پر حجت نگاہ اور فردوس گوش ”مذکر“ کے بجائے ایک وقت میں مسئلہ خلافت و امامت کے سے ”دقیانوسی“ مسئلہ کو چھیڑا جائے گا۔ اور اسی لمحہ پی کے ساتھ کہ اس کا سلسلہ دو برس کے قریب عرصہ تک قائم رہے اور پھر جنوری کے مخصوص نمبر کا ایک اچھا خاصہ حصہ اس کی نذر کر دیا جائے۔

لطف یہ ہے کہ اس ”سارے آہنگ“ کے چھیڑنے والے ایک غیر متعلق شخص تنازع فیہ مسئلہ کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہ رکھنے والے کوئی ”ہزنام“ صاحب ہیں جو اقرا ری ”ہندو“ ہیں جس کے بعد ان کی نسبت کچھ اور خیال کرنے کی ضرورت نہیں اؤ جبکہ اسلام کی تعلیم بھی یہ ہے کہ ”ما قاتل“ کو دیکھو ”حسن قال“ پر نظر نہ ڈالو۔

”ہزنام“ صاحب نے شروع شروع یہ بحث صرف تاریخی حیثیت تک محدود رکھی تھی، اور اعتقادی پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں کی تھی جس کا بقول ان کے ایک

لے نگار جنوری نمبر ۹۳ء

غیر مسلم شخص کو حق بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس بحث پر شیعہ جماعت کے ذمہ دار حلقوں کی طرف سے خاموشی ہی مناسب تھی کیونکہ تاریخی بحث میں مذہبی جانبداری کا پہلو پیدا ہو جانا واقعات کی بے لاگ سراخ رسانی پر مضر اثر ڈالتا ہے۔

اس سے بڑھ کر بے لوث تحقیقات کیا ہو سکتی ہے کہ تحقیق کرنے والا ایک غیر مسلم انسان "ہندو" اور فیصلہ کرنے والی ذات مدیر نگار کی سی ہو (بقول خود) اصل مذہب کی ضرورت ہی کو مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگی ہو۔

جہاں تک تاریخی بحث کا تعلق ہے معاملہ ختم ہو گیا اور محترم مدیر نگار نے جیسا کہ ہر نام صاحب نے اپنے آخری مضمون میں نگار کے تائیدی سکوت کے ساتھ اظہار فرمایا ہے اس بحث کا آخری فیصلہ شیعوں کے حق میں کر دیا۔ یعنی انہوں نے تمام واقعات کی صحت کو تسلیم فرماتے ہوئے ان کا نتیجہ یہی قرار دیا کہ حضرت رسول اکرم حضرت علی ہی کا خلیفہ و جانشین ہونا پسند فرماتے تھے۔ اور آپ نے اس کا بار بار اظہار بھی فرمایا۔

مگر آپ نے اپنے محاکمہ کے دامن دار اطراف میں کچھ ایسے مسائل کو بھی چھیڑ دیا، جو خالص اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں اور مارچ ۱۹۷۳ء کے پیر میں اسی محاکمہ کے پیش کردہ نتائج کی روشنی میں آپ نے چند سوالات بھی مرتب فرما کر شائع کیے جن کے جواب کے لیے آپ نے ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دی۔

ہر نام صاحب نے بھی محاکمہ کو دیکھنے کے بعد اپنا آخری بیان شائع کیا، اس میدان بحث اور محاذ گفتگو بدل جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کٹارہ کشی کا اظہار کیا اور اب اس بحث کے لیے خاص شیعہ جماعت کے ارباب علم سے تحریک کی کردہ اپنے نقطہ نظر کو پیش کریں۔ جناب نیاز نے بھی اس مضمون کی تائید میں ہر دو مذاہب کے بڑے شخصیت سے شیعہ علماء کی جانب دعوت کا رخ پھیر دیا۔ اور نگار کے جنوری ۱۹۷۳ء کے اعلان میں یہ جملہ بھی شائع کر دیا کہ مسئلہ خلافت پر ایک بسیط مضمون شائع کیا

جائے گا جو شیعہ نقطہ نظر سے آخری حرف ہو گا۔“ میں نہیں کہہ سکتا کہ شیعہ علماء کے طبقہ میں اس دعوت پر توجہ کیوں نہیں کی گئی؟

ممکن ہے اس کا سبب مدیر نگار کی طرف سے ”مایوسی“ ہو جیسا کہ مدرسۃ الودعین کے اخبار الواعظ کی متعدد اشاعتوں میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدیر نگار سنی ہیں اور انہوں نے جتنے سوالات قائم کیے ہیں وہ صرف سینوں کی حمایت کے لیے۔

میں کم از کم اپنی ”وسعت خیال“ کے حدود میں جہاں تک مدیر نگار کے تعویہ پر غور کرتا ہوں مجھے اس سوچ کا ”کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو سوال کرنے والے کی نیت سے جواب دینے والے کی زبان پر تو گرہ نہیں لگ سکتی۔ اُسے بہر حال اپنے نقطہ نظر کو واضح کرنے کا موقع ہے اور سوال کو بیان حقیقت کا پیش خیمہ قرار دینے کا حق ہے۔

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ نگار میں اس مسئلہ کا اٹھایا جانا ایک تجارت ہے اور صرف پرچہ کی گرم بازاری میں اضافہ منظور ہے۔ ان اصحاب کا جواب بھی میری طرف سے یہی ہے کہ اگر کسی کی ذاتی تجارت کے سلسلہ میں کسی اہم مسئلہ کی تحقیق کا فرض انجام پا جائے تو کیا بُرا ہے؟

بہر حال یہ دیکھ کر کہ نگار کے سوالات تشنہ جوابات ہیں اور ان کی تحقیق حقیقت پرور انسان کا فرض ہے، میں نے اس مضمون کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مجھے اپنے بے نیاز القاب کرم فرما جناب یقیناً سے بھی یہ نیاز مندانہ گزارش کرتا ہے کہ جہاں تک بحث کا صرف تاریخی پہلو تھا جناب کی غیر جانبدارانہ حیثیت مستم اور آپ کا بحیثیت محکم فیصلہ قابل قبول۔ لیکن اب اس بحث نے جو صورت اختیار کر لی ہے وہ مذہبی و اعتقادی ہے جس کے دلائل و اصول کا بہت کچھ تعلق مابعد الطبیعیاتی مبادی

کے ساتھ ہے۔ جن میں آپ خود مخصوص نظریات و معتقدات کے حامل ہیں جو اکثر و بیشتر عام مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ اور ان اصول و نظریات کے ماتحت خود آپ اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان ایک محاذ اختلاف قائم ہے۔

اگر آپ نے اس بحث کا فیصلہ اپنے اصول کی بنیاد پر کرنا چاہا تو یہ ہرگز ایک غیر جانبدار و حکم کا فیصلہ قرار نہیں پاسکے گا۔ بے شک اگر اس بحث کا بحیثیت حکم فیصلہ کرنا ہے تو ضرورت ہے کہ مراحل ابتدائی میں آپ انہیں اصول کو پیش نظر رکھیے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ اور مسلمہ ہیں اور جن پر شیعہ و سنی کی تفریق نہیں ہے اور ان اصول موضوعہ کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھیے کہ کون فریق ٹھیک کہہ رہا ہے۔

در صورتیکہ آپ ان مبادی و اصول سے الگ ہو کر خود اپنے معتقدات کے ادھر بحث کرنا چاہتے ہیں تو اسے محاکمہ کا درجہ عطا نہیں کیا جاسکے گا۔ بلکہ ایک فریق بن کر دلائل کے ذریعہ سے اپنے نقطہ نظر کو پیش کرنے کا فرض ادا ہوگا جو ہر انسان کا حق ہے۔

سوالات کی تقسیم

جہاں تک سوالات کا تعلق ہے میں ان کو تین حصوں میں منقسم کر سکتا ہوں :-

۱۔ مسئلہ خلافت کے مبادی و مقدمات -

۲۔ نفس مسئلہ خلافت -

۳۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات -

پہلی قسم میں حسب ذیل سوالات مندرج ہیں :-

۱۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ و خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و لسان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے

کافی ہے تو کیوں؟

۲۔ انبیاءِ دائرہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟

ان سوالوں کو میں نے مسئلہ خلافت کے مبادی میں اس لیے قرار دیا ہے کہ درحقیقت ان سوالوں کی بنیاد یوں ہی پڑی ہے کہ خلافت جناب امیر کے متعلق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہارات و اعلانات سے استدلال پیش کیا گیا تھا جس کو اصل حقیقت کے اعتبار سے جناب مدیر نگار نے تسلیم فرمایا لیکن آنحضرتؐ کے اعلانات کو حضرت علیؑ کے ثبوت حق خلافت کے لیے کافی قرار دینے میں اس بنا پر عذر فرمایا کہ خود رسولؐ سے بھی خطا و اجتہادی ممکن ہے اور اس لیے آپؐ نے جو اعلان فرمایا ممکن ہے وہ آپؐ کی ذاتی رائے کی بنا پر ہو۔ لیکن درحقیقت مسلمانوں کے لیے مفید و نتیجہ خیز نہ ہو۔ اس لیے مسلمانوں کا اس پر عمل نہ کرنا حق و بجا قرار پائے۔

اب اگر رسولؐ سے کلیتہً یا بالخصوص اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی کا امکان غلط قرار پایا جائے تو حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل کا ثبوت بلا کسی دغدغہ کے پایہ تکمیل کو پہنچ جائیگا۔ دوسری قسم میں حسب ذیل سوالات ہیں :-

۱۔ وصایت جناب امیرؑ ثابت کرنے کے لیے حضراتِ شیعہ کیا نصوص قطعہ پیش کرتے ہیں۔

۲۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟

۳۔ اسلام نے ہئیت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟

۴۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں؟ اگر پڑا تو کیا؟
 جو تھے سوال کو لغز مسئلہ خلافت سے متعلق میں نے اس لیے قرار دیا کہ خود انہیں
 روایات میں جو مسئلہ دصایت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں یہ شبہ پیدا ہونے کا امکان
 ہے کہ ان پر سیاسی ماحول کا کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں اور اس لیے وہ معتبر سمجھی جا سکتی ہیں یا
 نہیں؟

تیسری قسم میں ذیل کے سوالات داخل ہیں :-

۱۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے۔ اگر تھے تو اس کا
 کیا ثبوت ہے؟

۲۔ پیام امامت کی ضرورت کیا ہے؟ اور صرف اہل بیت میں اس سلسلہ کا
 قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟

۳۔ امامت کے بارہویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

۴۔ جو سلسلہ امامت دوسرے شیعہ فرقوں کے نزدیک صحیح ہے اس کو غلط قرار
 دینے کے لیے اثنا عشری جماعت کیا دلائل اپنے پاس رکھتی ہے؟

۵۔ امام ستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ۔

میں نے ان سوالوں کو مسئلہ خلافت کے فروغ و جزئیات میں اس لیے مندرج
 کیا ہے کہ اصل بحث جیسا کہ ہر نام صاحب کے افتتاحی مضمون سے ظاہر ہے اور جس کا
 ”ہر نام“ نے برقی صاحب کے جواب میں صراحتہً اظہار بھی کیا ہے صرف حضرت علی علیہ السلام
 کی خلافت بلا فصل کے متعلق ہے۔ یعنی سوال یہ درپیش ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی
 اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت کا جانشین کس کو تسلیم کیا جائے؟

اور اس لیے مسئلہ خلافت و امامت ”میں درحقیقت اسی کو کیسوی کے
 ساتھ طے کرنا چاہیے۔“

حضرت علیؑ کے بعد پھر یہ سلسلہ کس طرح چلے؟ خلافت کو حسنی شاخ میں تسلیم کیا جائے یا حسینی شاخ میں؟

اس سلسلہ کو بارہ کی تعداد پر ختم ہو جانا چاہیے یا نہیں؟

وجودِ امام سے کسی زمانہ کو خالی سمجھا جائے یا نہیں؟

بارہویں نمبر پر حضرت امام مستور یا مہدی موعود کو تسلیم کیا جائے یا نہیں؟ یہ تمام باتیں خارج از بحث قرار پاتی ہیں۔

حضرت علیؑ کی خلافت کے مسئلہ میں جہاں محاذ اختلاف صرف "شیعہ اور سنی" کے درمیان ہے ایسے مباحث کا چھیڑ دیا جانا جن میں محاذ اختلاف بالکل جداگانہ ہو جاتا ہے سلسلہ گفتگو کو "ژولیدہ" اور بحث کو پریشان بنانے کا باعث ہے جو معاملہ نہیں کے خلاف ہے۔

فرض کیجئے کہ کوئی "آزاد خیال مفکر" حضرت رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل تسلیم کرتا ہے لیکن پھر بھی ان تمام معتقدات کو تسلیم نہیں کرتا جو اثنا عشری جماعت نے مذہبی حیثیت سے ضروری قرار دیے ہیں تو کیا ایسے شخص کے عقل و دماغ پر پھرہ بٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل تسلیم کرے تو بس آخر تک اس سلسلہ کو اسی طرح سے صحیح سمجھ لے جو اثنا عشری جماعت نے قائم کیا ہے جب ایسا نہیں تو حضرت علیؑ کی خلافت ایسے صاف اور واضح مسئلہ میں کیوں ان غیر متعلق بائول کو چھیڑ کر بحث کو پرانہ بنا دیا جائے؟

اس لیے میں اپنے زیرِ تحریر مقالہ میں ہرگز اس "خطا رجعتی" کے ارتکاب پر آمادہ نہیں ہوں۔ میرا جواب صرف پہلی دو قسم کے سوالات سے متعلق ہوگا۔ اور آخری قسم کے سوالات کی بحث کو اس وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے گا۔ جب حضرت علیؑ کی خلافت کا مسئلہ بالکل طے ہو جائے۔ پھر میں خود اپنے مقام پر تجویز کی کے ساتھ غور کر دوں گا۔

کہ اس سلسلہ کو آگے کس طرح بڑھایا جائے؟

پہلا سوال

عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے؟ گناہ اور خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟
اور اگر لغزش و نسیان، اجتہادی غلطی کا امکان، انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے
کے لیے کافی ہے تو کیوں؟

”عصمت“ کے لغوی معنی تو ”حفاظت“ کے ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے علم کلام
کی اصطلاح میں انبیاء و ائمہ کے لیے اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک خاص طرح کی
نفسانی کمزوریوں سے لازمی طور پر ان کے محفوظ ہونے کے معنی میں۔

چونکہ ”حفاظت“ کے معنی خود ”متعلق“ کے طالب ہیں یعنی کس شے سے حفاظت؟
اس لیے اس کے مفہوم اصطلاحی میں قیود عائد کرنا یعنی ان نفسانی کمزوریوں کی حد مقرر
کرنا جن سے انبیاء و ائمہ کو لازمی طور پر محفوظ ہونا چاہیے خود عقلی بحث کا تابع ہے
یعنی یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کون کون باتیں ایک نبی و امام کی شانِ نبوت و
امامت کے خلاف اور اس مقصد کے منافی ہیں جس کے لیے نبی و امام کا تقرر
ہوتا ہے۔ پس انہیں تمام باتوں سے حفاظت ”عصمت“ کے اس مفہوم کی تشکیل کرے
گی جو اصطلاحی حیثیت سے نبی و امام کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

”رہ گئی عفت“ اس کے معنی ”پرہیزگاری“ اور ”پارسائی“ کے ہیں اور وہ علم اخلاق کی
اصطلاح میں قوتِ شہویہ کے اعتدال کا نام ہے جو اپنے مکمل معیار کی حیثیت سے
”عصمت“ کا ایک شعبہ قرار پاسکتا ہے اس کی پوری تفسیر نہیں جیسا کہ سوال کے الفاظ
سے ظاہر ہوتا ہے۔

”گناہ اور خطا“ میں بے شک فرق ہے یعنی ”گناہ“ میں ارادہ اور ضمیر کا تعلق ضرور ہے لیکن ”خطا“ لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کو بھی کہتے ہیں مگر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ عصمت جو نبی و امام کے لیے عقلی فیصلہ کی بنا پر ضروری ہے وہ صرف ”گناہ“ سے عصمت ہے یا غلطی اور بھول چوک سے عصمت بھی ضروری ہے۔ اسی بنا پر سوال کے ان الفاظ سے مجھے اختلاف ہے کہ اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟ اس لیے کہ لغزش و نسیان صرف انبیاء و ائمہ کو نہیں بلکہ ہر شخص کو ایک حد تک غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے یعنی یہ کہ وہ ”معصوم عن الخطا“ نہیں ہیں اور ایک حد تک یقیناً غیر معصوم بنانے کے لیے نامکافی ہے۔ یعنی لغزش و نسیان کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ ”معصوم عن الذنب“ بھی نہ ہوں لہذا سوال کے الفاظ یوں ہوتے تو بہتر تھا کہ اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی سے بھی انبیاء و ائمہ کو معصوم ہونے کی ضرورت ہے تو کیوں؟ اس طرح بحث اپنے اس راستہ پر آجائے گی جو اس کے لیے ہونا چاہیئے۔

مگر اس صورت میں سوال نمبر ۲ کے ساتھ اس سوال کا کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ اور اس لیے ان دونوں سوالوں کا الگ الگ مقرر کیا جانا صرف عجیب کی نکتہ دہی کا امتحان ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

بہر حال موجودہ صورت میں جبکہ سوال نمبر ۲ بھی موجود ہے جس میں مجھ کو انبیاء و ائمہ کے غلطی یا لغزش سے پاک ہونے کے دلائل لکھنا ضروری ہیں، میں اس سوال کے جواب میں گناہ اور خطا دونوں سے انبیاء کی عصمت کے مفہوم کو واضح کرنے پر اکتفا کروں گا اور دوسرے جز کو یعنی یہ ضروری ہے تو کیوں؟ دوسرے سوال کے جواب کے لیے اٹھا رکھوں گا۔

اس کے لیے سب سے پہلے جناب نیاز کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو آپ

نے اسلام کے پیش کردہ معیارِ نبوت کے متعلق اپنے محاکمہ (نگار فروری ۱۳۸۷ء) میں تحریر فرمائی ہے۔ پھر اس پر مندرجہ تبصرہ کروں گا۔
آپ تحریر فرماتے ہیں :-

انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اثراتِ المخلوقات صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے۔ اور وہ اپنے جذباتِ حیوانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا، اگر وہ چاہے بالکل اسی طرح ایک نبی دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں جو ایک انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذباتِ حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو حد درجہ سکیں و غریب ہے، جو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا۔ جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے۔ اور ہم اکی صلاحتِ نفس کی تعریف کرتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لے کر اپنے جذباتِ حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتا وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اس کو ہزول بے غیرت کہیں گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاکباز ہے اور ہم اس کے ضبطِ نفس کی تعریف کرتے ہیں لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔ الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے وہ جھوٹ بول سکتا ہو، مین نہ بولے، وہ خستہ کر سکتا ہو، لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن

نہ ہو۔ اسی پر ایک نبی کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر قیاس کر لیجیے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ نبی فطرۃً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابلِ تعریف بات نہیں، اگر وہ غیب کی باتیں بیان لیتا ہے تو اس کی فراست پیش بینی بے معنی ہے، اگر فرشتے اس کی مدد کرتے ہیں تو اس کا میاں سبیل کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی تو اس کی سلامت ہوی ایچ ہے۔ ایک نبی کو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں امتیاز اگر حاصل ہے تو صرف یہ کہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں ان کے ضبط پر دوسرے انسانوں سے زیادہ قادر ہے۔ اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح سوچتا ہے لیکن بہت غائر نگاہ سے، وہ مخالفت اور مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی غایت تک پہنچنے کے لیے ان ہی اسباب و دلائل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

الغرض وہ ہماری طرح ایک انسان ہے۔ لیکن بلند ترین سطح کا، اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے، لیکن بہت کم۔ وہ اپنی نیت کے لحاظ سے اپنے مقاصد کے نقطہ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے لیکن اپنی تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کا ردِ بارِ عالم میں وہ کبھی کبھی اجتماعی غلطی بھی کر سکتا ہے۔ اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھ کر ہم رسول اللہ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو سن کر متعجب ہو، علی الخصوص حضراتِ شیعہ، جو نہ صرف رسول اللہ بلکہ اہل بیت کے تمام

افراد کو معصوم جلالتے ہیں لیکن کیا کر دل کلام پاک سے نبوت کا مفہوم میری سمجھ میں ہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر پیدائشی معصومیت سے نبی کو تصف کرنا میرے نزدیک منصب نبوت کی توہین کرنا ہے۔

نبی آخر الزماں سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا، وہ یہ تھا کہ رسولؐ نوع انسانی سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ اور اس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس کی تردید رسول اللہؐ کی زبان سے یوں کی گئی :-

”كُلُّ نَوْكَانٍ فِي الْأَرْضِ مَلَايَكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنُزِّلَنَّهُمْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكَاتٌ رُحُوسًا“ (سورہ نبی اسرائیل آیت ۱۹) یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

اسی طرح سورہ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسول اللہؐ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

”قُلْ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ الرُّسُلُ أَنَا هَكَذَا“ (سورہ ابراہیم آیت ۱۱) یعنی اے رسولؐ کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں، اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمہیں وحی کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورہ نبی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں ”هَلْ كُنْتَ إِلَّا بَشَرًا سَوِيًّا“ کہہ کر اس کی اور زیادہ وضاحت کر دی جاتی ہے۔

تقریباً ایک صغیر کی عبارت کے بعد جو غیب دانی کے مسئلہ سے متعلق ہے اور اس لیے ہماری بحث سے خارج، تحریر ہوتا ہے :-

نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد

نہیں ہو سکتی یا یہ کہ وہ خطا و نسیان سے مبتلا ہے لیکن کلام مجید سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔

سورہ سبا کی آیت ۴۹ میں رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے۔ ”قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي وَاِنْ اهْتَدَيْتُ فَمَا يُوجِيْهِ اِلَيَّ سِرِّيْ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ“ (یعنی کہ دو کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں، اور اگر سیدھی راہ اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی ہدایت ہے)

سورہ مومن آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے کہ ”اَسْتَغْفِرُ لَذَنبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ“ (اپنی غلطی سے توبہ کرو اور حمد کی حمد بیان کرو)

سورہ محمد آیت ۱۹ میں پھر ”اَسْتَغْفِرُ لَذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ“ کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں۔

سورہ فتح کی آیت ۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ”اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ“ یہاں بھی ہی لفظ ”ذنب“ موجود ہے۔

ایک بار رسول اللہ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ پھیر لیا اس پر آپ کو اس طرح تنبیہ کی گئی۔ ”عبس و تولیٰ“ ان جاءہ الاعمٰی“ سورہ عبس آیت ۲۱، ۲۳۔

سورہ برأت (آیت ۴۳) میں رسول اللہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ”عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لَمَ اَذْنَبْتَ لَهْمُ حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الَّذِيْنَ صَدَقُوا وَتَعْلَمُوا الْكَاذِبِيْنَ“ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے بعض

جنگوں میں رسول اللہؐ کا ساتھ نہ دیا تھا، لیکن رسول اللہؐ نے ان کو پھر شمول جنگ کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپؐ سے کہا گیا کہ جب تک سچے جھوٹوں کی تفریق نہ ہوئی تھی، کیوں انہیں اجازت دی گئی؟ سورۃ النعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ سے وہ نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

آیات مذکورہ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہؐ کی ذات لغزش، غلطی، نسیان یا مجہول ہو کر کسی مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے یہ کہ آپؐ کو آئندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا، ممکن ہے بعض حضرات اسے منصب نبوت کی توہین سمجھیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہؐ کی حقیقی عظمت و جلال صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی سمجھا جائے۔

میں کہیں اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے، کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادے اور خرابیِ ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے، ایک رسول کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہاد یا غلطی، نسیان اور مجہول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہؐ کی ذات مرکز تھی روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی بھی، یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپؐ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا، لیکن آپؐ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا کہ آپؐ سے کہیں کوئی

فرگذاشت ہو جائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔“

یہ عبارت تمام و کمال بغیر اندیشہ طول کلام کے اس لیے نقل کی گئی کہ اس کے تمام اجزاء قارئین کرام کے پیش نظر میں۔ کوئی اور ہوتا تو اسے سرخرو نگار کے لیے مضمون لکھنے کے سلسلہ میں اس امر میں پس و پیش ہوتا کہ وہ خود جناب نیاز کے فیصلہ ہی کو نخل بحث قرار دے کر نقد و تبصرہ سے کام لے لیکن چونکہ میں ممدوح کی وسیع انجیالی کا دل سے معتقد ہو چکا ہوں اور دیکھ چکا ہوں کہ انہوں نے ہر نام کے آخری مضمون کو جس میں محاکمہ کے بعض اجزاء کی تردید بھی کی گئی تھی بغیر کسی ناگواری کے جو ”تاک نطرت“ افراد کا شیوہ ہے اور بلا کسی اظہار اختلاف کے بلکہ ایک طرح کی تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا اور پھر جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ ممدوح نے محاکمہ میں ان خیالات کے اظہار کے بعد پھر اپنے سوال میں اس مسئلہ کو زیر بحث قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اہل نظر کو خود اپنے خیالات کے نقد و موازنہ کا موقع دے رہے ہیں۔ اس لیے ہرگز مجھے کوئی پس و پیش نہیں ہے۔ اس میں کہ خود جناب نیاز کے رسالہ میں ان خیالات پر بحث گرفتیں کروں کیونکہ جو شخص ایک نبی و رسول کی ذات کو خطا اجتہادی سے مستثنیٰ نہیں سمجھتا وہ اپنی ذات کے لیے اس سے مستثنیٰ ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک عبارت کے ابتدائی حصہ کا تعلق ہے، یہ کہ ”صحت“ سلب انتیارات“ کا نام نہیں ہے اور نہ قوائے معصیت کے مفقود ہونے کا، بلکہ یہی کہ باوجود تمام جذبات حیوانی کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہو۔ اور ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے۔

یہ ایسی بات ہے جس سے سنجیدہ اور محقق علمائے اسلام و متکلمین شیعہ کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور عصمت کا یہی مفہوم ہے جس کے لحاظ سے وہ ایک نبی و امام کے لیے معصوم ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کا قول ہے کہ نبی و امام فرشتوں

سے افضل ہوتا ہے۔ کہ فرشتہ (وہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو یا نہیں لیکن جو مفہوم اس کا قرار دیا گیا ہے اس کے لحاظ سے) وہ مخلوق ہے جس میں تو اسے بمعصیت خلق ہی نہیں ہوتے اس لیے وہ اگر گناہ نہیں کرتا تو کوئی قابلِ تعریف بات ہمیں، لیکن معصوم باوجود گناہ کی تمام قوتیں رکھنے کے پھر بھی گناہ نہیں کرتا اس لیے وہ فرشتہ کے درجہ سے بلند درجہ رکھتا ہے اس کا نتیجہ وہی ہوتا جو مدیون نگار نے بائیں الفاظ تحریر فرمایا ہے۔ کہ :-

”پیدائشی معصومیت سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصبِ نبوت کی توہین کرنا ہے۔“

اس خیال میں کوئی ایسی ندرت نہیں ہے جس کو سُن کر مسلمانوں کی جماعت اور علی الخصوص شیعہ متعجب ہوں۔ سند کے لیے بطور ایک ذمہ دارانہ تصدیق کے جناب سید علما مولانا سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ کی عبارت نقل کی جاتی ہے، جو ”زندگی کا حکیمانہ تصور“ شائع کردہ ”امامیڈیشن“ لکھنؤ کے صفحہ ۳۸ اور ۴۰ پر مندرج ہے اس میں صاف صاف اسی نظریہ کی تلقین موجود ہے۔

”خود اختیاری حیثیت سے علمی و عملی ترقی کرنا یہ انسان کا جو ہر خاص ہے — یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ایک طرف تو مجادات، ثباتات، یگانگات سب سے انسان کو اشرف قرار دیا۔ دوسری طرف صفتِ ملائکہ سے بڑھا دیا۔ ملائکہ وہ بے شک بلند مرتبہ ہستی ہے۔ رفیع المنزلت وجود ہے مہلک یا حق مجھ کو کہ میں ملائکہ کی منزل کو پست کہوں، عالم بالکے رہنے والے سندھ پر منزل رکھنے والے، جو ار حضرت احدیت میں بنے والے، ان کی منزلت کو میں پست کہوں یہ ناممکن ہے، بہت بلند، بہت رفیع المرتبہ بہت اعلیٰ منزلت، مگر میں نے عرض کیا، خود اختیاری ترقی کی صلاحیت“

لے یہ کتاب ہم سب شائع کر رہے ہیں، (ناشر)

اختیار کے معنی ہمیشہ دو پہلوؤں کے طالب، وجود اور عدم، ہست و نیست، فصل و ترک، ملائکہ بہت بلند ہیں۔ لیکن ان کی بلندی عمل مرتبہ منزل کی رفعت ظاہری اعتبار سے ہمارے لیے ویسی ہی ہے جیسے معمار نے یہ عمارت بنائی۔ اس کا کنگرہ دہاں رکھا، اینٹیں یہاں رکھیں، بے ضرر وہ کنگرہ بلند مگر معمار نے دہاں رکھا ہے۔ وہ ہے بلند، لیکن تعریف ویسی ہی کر دوں گا، جیسی موتی کی آب و تاب کی بطور ثناء و ستائش کے میں کمال کا اعتراف کروں۔ یہ ناممکن ہے اس لیے کہ بنانے والے نے بلندی رکھا اختیار حیثیت سے بلند ہوتا تب میں تعریف کرتا۔ دہاں کی یہ بلندی رمز ہے انسان سے اس کے پست درجہ پر ہونے کی اس کی پاک و مقدس ذات ہے، اس کی ذات میں عصیاں کا وجود نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوت عصیاں خلق ہی نہیں ہوئی۔ طاقت گناہ پیدا ہی نہیں کی گئی۔ صاف و شفاف جس کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں، بالکل پاک و منزہ، لیکن انسان کے مقابلہ میں ملک ناز کر سکے؟ ناممکن ہے۔ تمام ملائکہ بے شک بہت بڑے درجہ پر، بہت منزہ اور معصوم لیکن ان کی عصمت خود اختیاری نہیں ہے پیدا کیے گئے ہیں معصوم، ہیں معصوم۔ مگر انسان متحارب قوتوں کا مالک ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیا کے جسم انسانی میں برپا رہتی ہے۔ ایک طرف نفسِ امّارہ کی طاقتیں ہیں۔ وہ اپنی طرف لے جانا چاہتی ہیں ایک طرف عقل کا لشکر ہے وہ اپنی سی چاہتا ہے کہ کر کے رہے۔ یہ تصادم ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں انسان دکھا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کر کے ساتھ دے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب طاقتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا ساتھ دیا، دوسرے سے بیزاری اختیار کی تو کیا کھانا

پھر تو رابطہ کر فتح کرنے والا ظفر باب مجاہد ہے۔ راستہ چلتے کوئی مال دولت ہاتھ نہیں آگیا ہے، بلکہ اپنی قوت بازو سے جنگ کر کے فتح و ظفر حاصل کر کے ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے۔ یہ انسان ہے۔ یہ ملک کے سامنے آتا ہے، فتح مندی کا نشان سر پر لہراتا ہوا آتا ہے۔ ملک سے کہتا ہے: ہو ملک تم کو دیا گیا تھا بغیر اسے بھڑے ہوئے صرت عطیہ کے طور پر اس کو میں نے لا بھڑ کر فتح کیا۔ وہ ملک عصمت ہے اور انسان کی طاعت ہے۔

نبی و رسول کے متعلق ہرگز یہ خیال درست نہیں کہ اس میں خصوصیات انسانی کو مفقود ہونا چاہیے، بلکہ حقیقت اس میں خصوصیات انسانی کو پایہ تکمیل پر ہونا چاہیے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ انسان کامل کے جانے کا مستحق ہو اور مدینہ نگار کے الفاظ میں وہ ہماری طرح ایک انسان ہو لیکن بلند ترین سطح کا۔

مگر خصوصیات انسانی کی تعبیر میں اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

پست درجہ کے افراد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں واقفیت ہے تو اس کے ساتھ اس کے ساتھ بہت سی باتوں سے ناواقفیت، سلامت لڑی ہے تو اس کے ساتھ کج روی، تحفظ و تذکر ہے تو اس کے ساتھ سہو و نسیان۔ اصابت لڑے ہے تو اس کے ساتھ غلطی۔ یعنی محاسن کے ساتھ معائب کی شرکت اور کمالات کے ساتھ نقائص کی آمیزش ہے۔

”خصوصیات انسانی“ کے تحت میں اگر نقائص کا شمار کیا گیا جن کے ساتھ ان محاسن کا دامن آلودہ ہے تو ”خصوصیت انسانی“ کے پایہ تکمیل پر ہونے یا انسان کامل کے مفہوم پیدا ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ سب سے زیادہ جاہل سب سے زیادہ کج رویا سب سے زیادہ جھلکڑ اور سب سے زیادہ غلطی کرنے والا ہو۔

لیکن خصوصیات انسانی اگر نام ہے اس کمال کے پہلو کا جو پست افراد میں ان

نقائص کے ساتھ سمیختہ ہے تو خصوصیات انسانی کی تکمیل اور انسان کامل کی امتیازی حیثیت یہ ہوگی کہ زائد سے زائد واقف کار زائد سے زائد سلامت روزائد سے زائد باہوش اور زائد سے زائد صائب الرائے ہو۔

غالباً انسانی کمال کی بلند حیثیت کو کوئی شخص پہلی صورت کے ساتھ وابستہ نہیں قرار دیتا اسامی لیے جناب نیا بھی باوجود اس کہنے کے کہ ایک نبی کی شان یہ ہے کہ اس میں انسانی قوتیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہوں اور یہ کہ وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا "نبی کے لیے اس کی ضرورت قرار دیتے ہیں کہ وہ تمام دوسرے انسانوں سے زیادہ ضبط نفس پر قادر ہے سب سے زیادہ غائر نگاہ سے سوچتا ہے بہت کم مخالفت و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے اور غلطی بہت کم کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی خصوصیات کا کمال ان ہی محاسن کی تکمیل کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ نقائص "انسانی خصوصیات" کا جزو نہیں بلکہ ان کے ساتھ ایک متضاد حیثیت رکھتے ہیں جو ان خصوصیات کے پست اور ناقص درجہ میں ہونے کی بنا پر کسی حد تک پائے جلتے ہیں اور بعضی خصوصیات انسانی کی تکمیل زیادہ ہواتے ہی یہ نقائص گھٹتے چلے جاتے ہیں پھر اگر کوئی ایسی ہستی فرض کی جائے جس میں یہ نقائص موجود ہی نہ ہوں تو وہ ایک "غیر انسانی ہستی" یا انسانی خصوصیات سے معرا ذات کیونکر قرار پائے گی بلکہ نتیجہ یہی قرار پائے گا کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس میں خصوصیات انسانی اپنے پورے درجہ کمال پر پائے جاتے ہیں اس لیے وہ نقائص بالکل فنا ہو گئے ہیں اور دوسرے لفظوں میں وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا۔ اس کے بعد پھر آخر انسانیت کا لازمہ یہ کیوں قرار دیا جائے کہ اسے غلطی ضرور کرنا چاہیے اسے بے راہ روی میں ضرور مبتلا ہونا چاہیے۔ اسے اپنی خواہشوں کی رو میں کبھی کبھی ضرور ہٹنا چاہیے ورنہ وہ انسان نہیں سمجھا جائے گا۔

پھر یہ دیکھیے کہ جذبات کی پیروی کرنا جس کا نام ہے گناہ، محفوظ و تذکرین کو تاہی ہونا جس کا نام ہے سہو و نسیان، غور و خوض میں صحیح نتیجہ پر نہ پہنچنا جس کا نام ہے غلطی اور خطر، اجتہادی یہ سب ایک ہی سطح کے نقائص ہیں جنہیں "انسانی کمزوری" کے نام سے یاد کر کے عام طور سے انسانیت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر "انسانیت" ان ہی نقائص کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ان کی پٹ انسان میں ضرور ہونا چاہئے ورنہ وہ انسانیت سے خارج ہے تو پھر ان میں تفریق کیوں کہ بعض تو نبی میں بالکل مفقود فرض کی جاتیں۔ اور بعض کو کم درجہ پر تسلیم کیا جائے۔

آخر یہ کس لیے کہ گناہ تو رسول سے بالکل نہیں ہوتا اور غلطی یا لغزش جو انسانی فراست سے اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے ممکن ہے لیکن بہت کم۔

اگر یہ دونوں ہی انسانی کمزوریاں ہیں اور ان کو ایک انسان میں ہونا چاہیے تو گناہ کو بھی یہ کہا جائے کہ وہ رسول سے ہو سکتا ہے مگر دوسروں کی بہ نسبت کم اور غلطی یا لغزش بھی ہو سکتی ہے مگر دوسروں کے لحاظ سے کم۔ اور اگر گناہ ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتا ہے اور اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی نیت کے لحاظ سے "اپنے مقاصد کے نقطہ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے" تو غلطی بھی ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ "لیکن اپنے تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کا دوبارہ عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے"۔

اگر یہ کہا جائے کہ "اجتہادی غلطی" درحقیقت ایک انسان کے لیے کسی طرح کا نقص اور عیب ہے ہی نہیں۔ تو پھر آخر رسول میں جسے کہا گیا ہے کہ وہ بند ترین سطح کا انسان ہے غلطی کو دوسرے تمام افراد کی بہ نسبت بہت کم قرار دینے کی کیا ضرورت محسوس ہوتی؟

اس کو دوسروں کی بنسبت رسول میں کم قرار دینا ہی صاف غماری کر رہا ہے کہ یہ ایک حصہ ضرور ہے جو انسانیت کے دامن پر بدنامی ثبت رکھتا ہے۔ پھر ایک ایسی ہستی کے لیے جو بقول آپ کے ایک بلند ترین سطح سے تعلق رکھتی ہے اسے بالکل مفقود مان لیا جائے تو کیا گناہ ہے؟ اس صورت میں وہ انسانیت سے خارج کیونکر ہوگا جبکہ اس دجے کے کم ہونے سے اس کی انسانیت کی کمی نہیں ثابت ہوئی بلکہ انسانیت میں بلندی پیدا ہوئی تو اس کے معدوم ہو جانے سے انسانیت مفقود کیونکر ہوگی بلکہ وہ بلند ترین سطح پر پہنچ جائے گی جو حقیقتاً نبوت کا اصلی معیار ہے۔



”خدا کرنے“ اور ”نہ کر سکنے“ کے لفظی اکٹ پھر دوں سے حقیقت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ”عصمت“ بایں معنی کسی نہ کسی درجہ تک دنیا کے ہر شعبہ میں کار فرما ہے۔

یونیورسٹی اور کالجوں کے امتحانات میں ایک لڑکا بہت غلطیاں کرتا ہے۔ فیل ہو جاتا ہے۔ ایک ذہین ذکی لڑکا ہر درجہ میں کبھی فرسٹ ڈویژن سے کم معیار کے نمبر پاتا ہی نہیں، بے شک کہا جائے گا کہ یہ ذہین لڑکا کبھی فیل نہیں ہو سکتا اور کبھی غلط درجہ نہیں لکھو سکتا۔

ایک حادثہ طیب کبھی نسخہ غلط نہیں لکھ سکتا۔ ایک ماہر وکیل کبھی بحث میں غلطی نہیں کر سکتا، ایک کامل قانون دان کبھی فیصلہ غلط نہیں کر سکتا، ایک کامل زباں دان کبھی محاورہ کی غلطی نہیں کر سکتا۔

وہ لڑکا جب غلطی کرے گا اس کی ذہانت و محنت کی کمی سمجھی جائے گی۔ وہ جب نسخہ غلط لکھے گا عداوت کے نقص کا نتیجہ ہوگا۔ وہ جب بحث میں غلطی کرے گا۔ اس کی مہارت کی کمزوری ثابت ہوگی، وہ جب فیصلہ غلط کرے گا اس کی قانون دانی محل

بحث قرار پائے گی۔ وہ جب محاورہ کی غلطی کرے گا اس کی زبان دانی کا تصور ہوگا۔

اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اس سے زیادہ ذہین طالب علم ہو۔ جو اس سے زیادہ عاقل طبیب ہو۔ جو اس سے زیادہ ماہر وکیل ہو۔ جو اس سے زیادہ قانون دان جج ہو۔ جو اس سے زیادہ محاورہ وال اہل زبان ہو اس سے یہ غلطی غیر ممکن ہے۔

”غیر ممکن ہے“ کیا معنی؟ یعنی اس ذہانت اس کی حذاقت اس کی مہارت اس کی قانون دانی اس کی زبان دانی غلطی سے مانع ہے اس لیے غیر ممکن۔

یوں ہی اگر کہاجائے کہ نبی و رسول سے گناہ ہونا غیر ممکن، غلطی ہونا غیر ممکن تو اس غیر ممکن کے بھی معنی کیوں نہ قرار دیے جائیں کہ اس کا کامل احکامس فرائض اس کی پوری معرفت و حقیقت شناسی اور اس کی کامل عقل و معاملہ فہمی گناہ اور غلطی سے مانع ہے۔ لطف یہ ہے کہ جناب مدبر نگار اس ”نہ کر سکنے“ پر ایک سبکدستی احتجاج کرتے کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ ”ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ تہوٹ بول سکتا ہو، لیکن نہ بولے وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو، اس کے بعد پھر خود ہی حضرت رسولؐ کی عصمت پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ تحریر فرما گئے ہیں کہ:-

”میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے۔ ایک رسولؐ کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپؐ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی۔ اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا۔“

اب فرمائیے کہ اس ”مرتکب نہیں ہو سکتا“ اور ”امکان نہیں ہے“ کے کیا معنی

ہیں؟

لفظی تعبیر کے اسی الجھاؤ میں پھنس کر فرقہ شیعہ کے اس عقیدہ پر کہ خدا کے لیے ظلم محال ہے فعل قبیح محال ہے، کذب محال ہے، وعدہ خلافی محال ہے جس کے دوسرے الفاظ یہی ہوئے کہ خدا ظلم نہیں کر سکتا، فعل قبیح نہیں کر سکتا، جھوٹ اور وعدہ خلافی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ جمہور اہل اسلام کی جانب سے بڑی بے دے ہوتی ہے کہ دیکھو یہ خدا کی قدرت کے منکر ہیں اور اس کو عدل پر مجبور قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے شیعہ عموم قدرت کے منکر نہیں ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی حکیمانہ شان اس کی قدرت کو ان امور کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہونے دے سکتی۔

بالکل اسی صورت سے عصمت کے مسئلہ میں گناہ نہ کر سکے، ”گناہ کے غیر ممکن ہونے“ کے یہ معنی قرار دینا کہ معصوم گناہ پر قادر ہی نہیں ہے بالکل غلط ہے۔
 ”وہ گناہ نہیں کر سکتا“ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عفت نفس اور پارسائی قدس و نزاہت اور حکیمانہ رفعت ارادہ گناہ سے مانع ہے۔

وہ پہلے تو گناہ کر سکتا ہے مگر اپنے بلند آفاقی خصوصیات کی بنا پر وہ چاہے ہی گا نہیں۔

اس سے ہرگز قدرت سلب نہیں ہوتی اور نہ پیدائشی معصومیت سے نبی کا منتصف کرنا لازم آتا ہے، جو بے شبہ منصب نبوت کی توہین کر رہا ہے۔

دوسرا سوال

”انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا عقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟“

یہی پہلے سوال کے آخری جزو کا محصل ہے جس کے الفاظ یہ تھے کہ ”اگر لغزش و

نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لیے کافی ہے تو کیوں؟

جناب نیا زکاء فیصلہ اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ ان کی سابقہ عبارت سے ظاہر ہو چکا ہے۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ گناہ سے تو ایک نبی یا رسول کا معصوم ہونا ضروری ہے لیکن لغزش و نسیان اور اجتہادی خطا کا امکان ہے۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ رسول کسی معاملے میں ہورائے قائم کرے وہ درست نہ ہو اور اس میں غلطی ہوئی ہو۔ ان کی دلیل اس کے اذہم ہے کہ ”گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔“

میں سمجھتا ہوں کہ ایک نبی کے ساتھ امت کا تعلق اگر وہ ہوتا جو ایک سالک و متراض پیر و مرشد کے ساتھ اس کے پاک باطن مرید کا یعنی نبی صرف روحانی حیثیت سے بندگاںِ خدا کو خدا سے تقرب حاصل کرنے کا ایک باطنی ذریعہ ہوتا کہ اسکی روحانی تقدس و پاکیزگی سے فیض حاصل کر کے خلق خدا واصل الی اللہ ہو جائے۔ اور اپنے نفس کو پاکیزہ بنا کر خدا کی بارگاہ سے نزدیکی حاصل کرے تو بے شک اس کے لیے صرف رسول کا پاک باطن اور ضمیر کی خرابیوں سے علیحدہ ہونا ضروری تھا تاکہ اس کی باطنی صفائی اور نیت کی پاکیزگی سے متراض مرید کی روحانیت میں اضافہ ہو اور اس کے نفس میں صفائی پیدا ہو۔ اس کے لیے اس میں کسی قسم کی معاملہ فہمی اور اصابتِ رائے عقلی کمال کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آخرت کی نجات کا تعلق ضمیر و نیت ہی کے ساتھ ہے اور اس لیے صاف سادہ مسلمانوں کے لیے یہ روایت نوکر زبان ہے کہ ”اَللّٰہُ اَجْلَزُ بِلَمَ“

(یعنی بہشت کے لوگ سادہ لوح بھولے بھلے ہوتے ہیں) اور اسی لیے ایک بہت بڑے عالم اسلام کا مقولہ ہے:-

”رب رجل نزجو شفاعته ولا نقبل شهادته“

”(یعنی) بہت سے ایسے آدمی ہیں کہ ہم اپنے لیے ان کی شفاعت کے متوقع ہو سکتے ہیں (کیونکہ یہ آخرت کا معاملہ ہے) لیکن حکمہ قضائیں ان کی گواہی قبول نہ کریں گے (کیونکہ اس میں معاملہ فہمی اور عقل و تدبیر کی ضرورت ہے)“

مگر ایک نبی و رسول کی نسبت یہ خیال اگر کوئی ”ملائے مسجد“ یا صاف سادہ مقدس ”مولوی“ ظاہر کرتا تو پھر بھی قابلِ تعجب نہ تھا۔ لیکن جناب مدبر نگار ایسے روشن خیال و وسیع النظر، متفکر انسان کی جانب سے ہرگز اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔

پھر جبکہ رسول کی حیثیت صرف ایک واسطہ روحانی اور وسیلہ باطنی کی نہیں ہے بلکہ وہ امت کی عملی اصلاح کا ذمہ دار، ان کے انسانی خصوصیات کا مکمل اور اپنے قول و عمل سے ان کا حقیقی رہنما اور ان کے لیے اتباع و پیروی کے واسطے ایک نمونہ ہوتا ہے تو اب اس کے لیے صرف باطن کا صاف اور ضمیر کا پاک ہونا ہرگز کافی نہیں ہے۔ وہ اپنے باطن اور ضمیر کے لحاظ سے کتنا ہی مکمل ہو لیکن اگر وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا رہے، رائے قائم کرنے میں غلطیاں کرتا ہے۔ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط سمجھ لیتا ہے اور غلط طریقہ عمل کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ اور غلط راستہ پر چلتا اور دوسروں کو چلاتا ہے۔ تو ایسا شخص ہرگز اصلاح خلق اور رہنمائی امت کے قابل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور کسی طرح نبوت و رسالت کے عہدہ کا اہل نہیں ہے۔

دنیا کے ہر شعبہ میں اسی عصمت کی تلاش ہوتی ہے۔ مریض کو لاکھ لقیں دلائیے کہ فلاں حکیم تمہارے بارے میں ”بدنیت“ ہرگز نہیں ہے، یعنی وہ جان بوجھ کر تمہیں نہیں مار ڈالے گا، لیکن اس کی اس ”نیک نیتی“ سے کبھی اس کے مرض کا ”دماں“ نہیں ہو

سکتا جبکہ وہ نسخوں میں غلطی کر جائے یعنی زہر کو تریاق سمجھ کر دے دیتا ہو، وہ تلاش کرے گا "حاذق" کی، یعنی جس سے غلطی نہ ہوتی ہو۔

ایک موکل کو ہزار یقین دلائیے کہ فلاں وکیل تمہارا دشمن نہیں ہے اور سمجھو بوجھو کہ تمہارے مخالف پیروی نہیں کرے گا مگر کیا نتیجہ جبکہ اسے معلوم ہو کہ اس میں اصابت رائے میں یعنی وہ مضبوط آئنٹس کو مفید سمجھ کر عرضی دعوے میں تحریر کرتا اور بحث میں پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ ہار جاتا ہے۔ وہ تلاش کرے گا "ناہرین" وکیل کی یعنی جو دھوکا نہ کھاتا ہو۔

ایک طالب علم کو کتنا ہی مشورہ دیجیے کہ فلاں استاد سے تعلیم حاصل کرو، تمہیں غلط مطلب غلط سمجھتے ہوئے نہیں بتائیں گے، وہ کہے گا پھر میرا کیا فائدہ جبکہ وہ غلط مطلب صحیح سمجھ کر مجھے بتلائیں اور میری ذہنی گمراہی کا سبب قرار پائیں، وہ تلاش کرے گا ایسے معلم کی جو صحیح مطلب سمجھا ہو اور اسے صحیح طریقہ سے سمجھا بھی دے۔

یکالت، بیرسٹری، پروفیسری، ماسٹری، حقانہ داری، ججی، کلکٹری، ڈاکٹری، کلرکی غرض ہر عہدہ و منصب کو سائٹیفیکیٹوں اور ڈپلوماؤں کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے، اور یہ تمام اسناد امتحانوں کی کامیابی کے ساتھ وابستہ اور کامیابی کے بھی مراتب اور بوقت اختلاف ترجیح ہمیشہ محتانہ درجہ کے پاس ہونے والوں کو دی جاتی ہے، اور کامیابی و ناکامی نیز کامیابی کے درجوں کی تفریق امتحان کی کامیوں کی جانچ پر مبنی اور ممتحنین کی طرف سے کامیوں کی جانچ، نمبروں کا دنیا سب غلطیوں کی کمی اور زیادتی کے ساتھ متعلق جس نے غلطیاں زیادہ کیں اس کے نمبر سب کم جس نے غلطی سب سے کم کی یا بالکل نہیں کی اس کے نمبر سب سے زیادہ، وہ فیل یہ پاس، وہ سند سے محروم، یہ سند سے سرفراز و عہدہ و منصب سے مایوس، یہ عہدہ کا مستحق، اب جانیے ممتحنین کے پاس، قسمیں کھا کھا کر انھیں یقین دلائیے کہ غالب علموں کی نیت صاف ہوتی ہے اور ضمیر

میں خرابی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ جو غلطی کرتے ہیں غلطی سمجھ کر ہرگز نہیں کرتے۔ معصن بھی کہیں گے کہ ہم نیت سے نہیں بحث، غلط پرچہ لکھنے والا صحیح سمجھ کر اس غلطی کا مرتکب ہوتا ہے یہی تو اس کی غلطی ہے، اس لیے پاس ہونے کا مستحق نہیں ہے۔

یونیورسٹی کے ارکان اہل حل و عقد کے پاس جانیے کہ یہ طالب علم فیل ضرور ہوا ہے مگر جان بوجھ کر فیل نہیں ہوا، نیت اس کی پاک ہے لہذا سند سے محروم نہ کیا جائے وہ کہیں گے ہمیں نیت سے بحث نہیں، بہر حال پاس ہونے کا تامل نہ تھا، اس لیے سند پانے کا مستحق نہیں۔

خداوندانِ عہدہ و منصب کے پاس جانیے کہ اس کو منصفی، حجتی، پروفیسری وغیرہ کے عہدوں سے محروم نہ کیجئے، اس نے پرچے غلط لکھے، غلطیاں ضرور کیں مگر غلط سمجھ کر نہیں کیں، یہ پاس نہیں ہوا مگر جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، وہ کہیں گے ہمیں اس سے مطلب نہیں ہمارے یہاں تو اتنی قابلیت کی ضرورت ہے، اس سندی حاجت ہے۔ بہر حال جب غلطیاں کیں معلوم ہوا تو قابلیت ناقص ہے لہذا عہدہ و منصب کی اہلیت نہیں، غرض دنیا کے ہر شعبہ میں جس عصمت کی تلاش ہے اور جس پر دنیا کا نظام قائم ہے وہ یہی عصمت ہے، یعنی غلطیوں سے عصمت۔

اب چونکہ ہماری قدرت کوتاہ ہے اس لیے ہم ہر شعبہ میں اپنے مقصد پر بھرتلاش کرتے ہیں، ہم کو بالکل مکمل عصمت نہیں ملتی مگر اس کے زیادہ سے زیادہ کامل نمونہ کو ہم اختیار کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض انجام دے دیا۔ طبیب کی تلاش ہوئی تو ایسا طبیب ڈھونڈ لیا جو ہمارے حدود و سترس میں کم از کم غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ وکیل ڈھونڈا تو ایسا جو کم از کم غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

درحقیقت یہ کم از کم کی تجدید ہماری کوتاہ دستی کا نتیجہ ہے۔ ہماری پیاس بھی اس کم از کم پر بجھتی تھیں مگر عصمت بنی بنی بے چادری ہمارا امکان اس سے زیادہ

نہیں۔ اس لیے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔

لیکن اگر ان میں سے ہر شعبہ میں منتخب کرنے والی ایسی ہستی جو جس کی قدرت محدود نہیں ہے اور اطلاع کو تاہ نہیں ہے۔ اور جس سے خود بھی غلطی کا امکان نہیں ہے تو ہم کو سمجھنا لازمی ہے کہ اس نے بھی "عصمت" کے جوہر کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ اور چونکہ اس کے علم و قدرت میں کوتاہی نہیں اس لیے اس کو "کم از کم" والی مجبوری پیش نہ آئی ہوگی۔ اور اس نے کامل "غلطی سے مبرا" ہی کو مقرر کیا ہوگا۔ جس کا اصطلاحی لفظ ہے "معصوم"۔ میں طبیب ڈھونڈتا ہوں "معصوم" مگر مجھے ملتا نہیں اگر خدا میرے لیے کسی طبیب کو خود مقرر کر دے تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ وہ اس کے علم میں "معصوم طبیب" ہے اور اس کے علم میں خلل نہیں ہے۔

میں وکیل ڈھونڈتا ہوں "معصوم" مگر میرے امکانی ہاتھوں سے دستیاب نہیں ہوتا، اگر خدا میرے مقدمہ کی پیروی کے لیے کوئی وکیل مقرر کر دے تو میں یقینی طور پر سمجھوں گا کہ وہ "معصوم وکیل" ہے۔ ایسے ہی ہر شعبہ میں۔

نبی و رسول کا تقرر اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں بھی اپنے نزدیک نبوت و رسالت کے لیے "معصوم" ہی کو ڈھونڈتا۔ مگر جیسے طبیب مجھے بالکل معصوم

ملا، وکیل بالکل معصوم نہ ملا ویسے ہی نبی و رسول بھی بالکل معصوم میرے ہاتھوں سے دستیاب نہ ہوتا۔ مگر جو سب سے زیادہ مکمل درجہ میری تلاش میں ملتا،

اس کو اپنا مقصد قرار دے لیتا۔ میں بے شک ایسے کو نبی بنا لیتا اور رسول منتخب کر لیتا جو میرے حدود اطلاع میں غلطیوں سے زیادہ سے زیادہ محفوظ

ہو۔ یعنی کم سے کم غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہو لیکن نبوت کا عہدہ تو براہ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کی قرار داد پر مبنی ہے۔ اس نے اگر "معصوم" کو نہ

ڈھونڈا تو وہ اپنے "حکیمانہ انتخاب" میں مجھ سے بھی پست ہو گیا۔ اس لیے

مختب کرے گا تو وہ معصوم ہوگا اور چونکہ اس کا ڈھونڈ کر منتخب کرنے والا میں نہیں ہوں بلکہ خدا ہے اس لیے وہاں "کم از کم" والی حد بندی کے کوئی معنی نہیں۔ وہ مقرر کرے گا تو ایسے ہی کو جو بالکل غلطیوں سے مبرا معصوم عن الخطا ہو۔

اور یہی رمز ہے کہ شیعوں نے امامت میں بھی عصمت کی شق لگا دی ہے۔ چونکہ امامت و خلافت بھی ان کے نزدیک مثل نبوت کے خدا کی طرف کا مقرر کردہ منصب ہے۔ اس لیے "رمز عصمت" میں نبوت و امامت دونوں مشترک حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسی عصمت کی ضرورت "نبوت" میں دیسی ہی امامت میں تفرقہ کی کوئی گنجائش نہیں



بھلا بتائیے تو سہی کہ صرف نیک نیتی اور ضمیر کی پاکیزگی ایک نبی و رسول کے لیے کس مرض کی دوا ہوگی۔ اور مقصد نبوت و رسالت کو کس طرح پورا کرے گی۔ جبکہ ان کی غلطیوں کی بنا پر اس کے ہاتھوں خلیق خدا کے گمراہ ہونے کا اندیشہ موجود ہے۔ چلتی ہوا کے جھونکے کو جبریل کے پر کی ہوا سمجھنا اور نیک نیتی کے ساتھ حقیقتاً یقین کر لیتا ہے۔ دیوار کے چھچھے چھپے ہوئے انسان کی آواز کو صدائے غیبی جانتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے دل میں پیدا شدہ خیالات کو خواہ مخواہ خدا کی طرف سے نازل شدہ خیال کرنا اور واقعی اعتقاد کر لیتا ہو۔ غلط باتوں کو صحیح سمجھنا اور اپنے نزدیک لوگوں کو اسی صحیح راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو ضروری اور ناروا افعال کو لازم العمل سمجھ کر دنیا کو دعوت دیتا، سختی کے ساتھ ان پر خود کار بند ہونا اور دوسروں کو کار بند بنانا ہے یقیناً ایسے شخص کے دامن پر گناہ کا دعبہ شکل سے لگایا جاسکے گا۔ اس کے ضمیر پر حملہ ہرگز روا نہ ہوگا۔ منزلے انہوی کا ایسے شخص کو سختی ثابت کرنا بہت دشوار ہے لیکن کیا مقصد نبوت و رسالت ایسے شخص سے انجام پایا؟ ہدایتِ خلق کا مقصد حاصل ہوا اور دنیا حیات یافتہ ہوئی؟

میں سمجھتا ہوں کہ کسی چھوٹے موٹے گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا اور دنیا کو بتلادینا کہ یہ گناہ ہے
آنا خطرناک اور مقصد نبوت کے لیے مضرت رساں نہیں ہے۔ جتنا غلط فہمیوں میں
مبتلا ہونا، گناہ کو ثواب سمجھ کر کرنا اور غلط مسلک کی طرف صحیح سمجھ کر رہنمائی کرنا۔

مسائل الوہیت و نبوت کے بارے میں جہاں تک ارباب تحقیق کا خیال ہے
ان کا اصل تعلق عقلی احکام کے ساتھ ہے اور دلائل نقلیہ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے
کیونکہ نقل کے حدود عمل ہی ان دونوں مرحلوں کے بعد سے شروع ہوتے ہیں۔ نیز عقلی
احکام قطعی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن نقلی دلائل زیادہ تر مظنون الدلالة اس لیے
ظاہری الفاظ کسی مسلمہ عقلی کے خلاف بھی نظر آتے ہیں تو انھیں بہر حال ایسے معنی پر محمول
کیا جاتا ہے جو قطعی الثبوت نتائج کے خلاف نہ ہوں۔

اسی لیے ”الرحمن علی العرش استوی“ کے الفاظ سے خدا کے ممکن جسمانی
اور ”میداہ مبسوطتان“ سے خدا کے لائے لائے ہاتھوں کا عقیدہ در خود قبول
نہیں قرار دیا گیا اور اس کے معنی بہر حال ایسے قرار دیے گئے جو ذوق سلیم کے بالکل
خلاف بھی نہ ہوں اور ایک قطعی الثبوت حقیقت کے منافی بھی نہ قرار پائیں۔ یہی صورت
نبوت کے عقیدہ کی ہے، اسی بنا پر خود جناب نیاز کو بھی تاویل سے چارہ کار نظر نہیں
آیا کیونکہ گناہ سے انبیاء کی عصمت کا خود انھوں نے اقرار کیا ہے۔ مگر ان کے پیش
کردہ آیات میں گناہ ہی کے مراد لفظ کا تذکرہ ہے۔ استغفر لذنبک اور لیغفرلک
اللہ ما تقدم من ذنبک ان دونوں آیتوں میں صاف ”ذنب“ کا لفظ ہے جس کے
معنی ہیں گناہ اور مغفرت کے لفظ کا تعلق بھی یہی بتلاتا ہے اور ”عفا اللہ عنک“
کے الفاظ بھی اسی کی ترجمانی کرتے ہیں مگر چونکہ گناہ کی نسبت کو خود ان کی عقل نے بھی
قطعی طور پر منتفی قرار دیا ہے اس لیے انھوں نے ان تمام آیات کو خطائے اجتہاد پر
ڈھال دیا ہے حالانکہ اجتہادی غلطی ہرگز ”ذنب“ کا مصداق نہیں ہوتی۔

انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ رسول کسی "معصیت" یا گناہ میں مبتلا نہیں ہو سکتا، لیکن "نحیٰ آدم ربہ فغوی" قرآن مجید میں موجود ہے جس میں صاف لفظ معصیت کا استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ایسے آیات موجود ہیں جن سے رسالت مآبؐ کے غلطیوں سے بری ہونے کا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے اور جسے صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جبکہ شانِ نبوت و رسالت قطعی طور سے اس کی مقتضی بھی ہو جیسا کہ اس کے قبل توضیح کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

آیت "قل ان ضللت فالتما احلل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الی ہرقتی" میں بطور تعلیق مزدور لکھا گیا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو تو میں اس کا ذمہ دار ہوں گا۔ اور اگر سیدھی راہ اختیار کروں تو خدا کی ہدایت سے ہے۔

لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ جملہ شرطیہ کے دونوں طرف کے لیے وقوع ضروری نہیں ہے اس میں ثبوت اور نفی دونوں کی گنجائش ہے۔ مگر دوسری آیت میں صاف پہلے جملہ دالٰی شرط کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے یعنی ارشاد ہوا ہے۔ "ما ضل صاحبک وما غوی" اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بیشک امکانِ حیثیت کے حدود میں بحیثیت بشری رسول لغزش پر بھی قدرت رکھتا ہے لیکن اس لغزش کا وقوع نہیں ہے رہ گیا اس کا عدم وقوع وہ ان خصوصیات انسانی کے اعلیٰ معیار کی بنا پر ہے جو رسول کو حاصل وحی بنانے کا باعث ہیں جسے "فبما یوحی الی رقتی" کے لفظوں میں ذکر کیا گیا ہے اور انہیں دونوں پہلوؤں کو "قل انما انا بشر مثلكم یوحی الی" میں نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے جزو میں رسول اور دوسرے افراد کے درمیان جو نقطہ اشتراک ہے اس کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں مابہ الامتیاز کا ذکر ہے جو رسول کی ذات کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ کیونکہ خدا کی وحی بغیر استحقاق نہیں ہوا کرتی اور استحقاق خصوصیات ذاتی پر مبنی ہے۔

”مَا كَيْفَ يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ میں صاف ظاہر کیا گیا ہے کہ پیغمبر کا کوئی کلام مرضی الہی کے خلاف ہوتا ہی نہیں اور جو کچھ زبان سے کہیں وہ وہی ہے کہ اگر وحی بھی اترتی تو وہی کہتی جو انھوں نے اپنے ذاتی امان سے کہا ہے۔ آیات اتباع جیسے :-

”وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ ”اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ“ وغیرہ یہ بھی غیر مبہم طریقہ سے پیغمبر کے اتباع کو ضروری قرار دیتے ہیں ”اتباع“ اور ”اطاعت“ میں فرق ہے۔ کیونکہ اطاعت صرف احکام سے تعلق رکھتی ہے اور اتباع اور تاسی دونوں عمل سے متعلق ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کو نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے جس کے بعد غلطی کے امکان کے کوئی معنی نہیں۔

”اِنَّكَ لَعَلٰی خَلَقْتَ عَظِيْمًا“ میں بھی خدا کے عظیم کی جانب سے رسول کے افعال اعمال کو اعتدال عظیم پر ناکز قرار دے کر اس میں کسی طرح کے نقص و کمزوری کے شبہہ کا سد باب کر دیا ہے اور النبی اولیٰ بالمومنین من انفسهم کے الفاظ میں ان کو تمام مومنین کے متعلق خود ان مومنین کے ذاتی اختیارات سے بالاتر اختیارات تفویض کر کے اس کی ذمہ داری سونپی ہے کہ یہ جو کچھ مسلمانوں کے حق میں کہیں گے۔ وہ مسلمانوں کے لیے مفید ہی ہو گا جس کے بعد اس کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جو کچھ انھوں نے مسلمانوں کے لیے سوچا ہو اور طریق عمل اختیار کیا ہو اور انھیں ہدایت کی ہو وہ درحقیقت موزل نہ ہو اور خود مسلمان ان کے حکم کے خلاف اپنے لیے جو صورت تجویز کریں وہ نامناسب و اصلاح ہو۔

درحقیقت ایک نبی و رسول کے لیے غلطی کا امکان ہونے کی صورت میں

پھر قاس کے کسی قتل و فعل پر قطعی طور سے اعتماد ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ ٹھیک ہی ہے زیادہ سے زیادہ ظن حاصل ہو گا۔ لیکن اصول خفائے ظن کوئی چیز نہیں۔

”ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً“ اسی لیے بعض وہ علمائے اسلام جنہوں نے خطا و اجتہادی کو رسولؐ کے لیے جائز کہا ہے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ رسولؐ سے خطا و اجتہادی ممکن تو ہے مگر خدا اس خطا پر رسولؐ کو برقرار نہیں رہنے دیتا اس کی طرف سے اس خطا کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے نظائر میں بھی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ”عس وکون ان جاءک الا عمنی“ — اور ”عفا اللہ عنہ لم اذنت لهم“ — وغیرہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ جہاں پر خطا کی اصلاح نہ ہو اور کسی آیت کے ذریعہ سے اس خطا پر متنبہ نہ کیا گیا ہو وہ خطا نہ سمجھی جائے گی بلکہ رسولؐ کا قول عمل خداوند عالم کی جانب سے متنبہ نہ کیے جانے کے ضمیمہ کے ساتھ دلیل قطعی ہو گا اس طرز عمل اور ہدایت کی صحت کا۔

اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ خلافت جناب امیرؓ کے مسئلہ میں اگر رسولؐ سے خطا و اجتہادی ہوئی تو اس کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ اس وقت سے کہ جب نبوت کا ابتدائی دور تھا اور بیعت العشیرہ میں پیغمبرؐ نے لوگوں سے اپنی نصرت کا وعدہ لینا چاہا۔ اور کوئی تیار نہ ہوا اور صرف حضرت علیؓ تھے جنہوں نے بلیک کنی اور اس وقت رسولؐ نے ارشاد کیا کہ یہی میرا وزیر ہوگا، خلیفہ ہوگا اور جانشین ہوگا۔

اس وقت خطا و اجتہادی کی بنیاد پڑی اور پھر ہر موقع پر رسولؐ اپنی اس خطا و اجتہادی کا پروپیگنڈا کرتے رہے جس میں ماہ گزرے سال گزرے، رزم و بزم کے کتنے ہی موقع سامنے آ گئے اور ہر جگہ پیغمبرؐ نے اپنے اس پروپیگنڈے کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ سب سے آخر میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں حج آخر کے بعد بڑے شد و مد کے ساتھ رسولؐ نے تفریر کر کے مسلمانوں کے سامنے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا مصلحت خدا

کو عام دعوت دی اور علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا۔

اس کے بعد جب مدینہ واپس آئے تب بھی جب تک مرض الموت کی شدت انتہا تک نہیں پہنچی جب تک کہ بات کرنے اور تلقین کرنے کا دم رہا اپنی اس خطا اجتہادی کی تبلیغ کرتے رہے اور اس طول طویل مدت تمام زمانہ رسالت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خدا نے تنبیہ کی۔ اندھے کی بات نہ سنی اور اس کی طرف سے منہ پھیر دیا تنبیہ ہوئی۔ بعض لوگوں کو جنگ میں شمولیت کی اجازت دی تنبیہ ہوئی۔ بعض عورتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تنبیہ ہوئی۔ سورۃ برأت سنانے کی غیر مستحکم کو بھیج دیا تنبیہ ہوئی۔ لیکن اتنے مہتمم بالشان رسولؐ میں آخر تک خطا اجتہادی پر یقین رہے اس کی تبلیغ کرتے رہے اس کی جانب دعوت دیتے رہے مگر خدا نے آدھی بات بھی نہ کہی، ذرا کمزور سے کمزور اور چھوٹی سے چھوٹی تنبیہ بھی نہ ہوئی، یہاں تک کہ سورۃ مادہ کے نزول کے بعد جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہوا پھر قرآنی وحی کا سلسلہ بھی بعد ہو گیا، مگر رسولؐ اس کے بعد بھی اپنی خطا اجتہادی پر قائم رہے۔

بلکہ اس دوران میں خدا نے عوض اس کے کہ رسولؐ کو ان کی خطا اجتہادی پر تنبیہ کرتا اپنے رویہ سے ان کی خطا اجتہادی کو اور تقویت دی مثلاً:

علیؑ نے سائل کو حالت رکوع میں انگوٹھی دے دی وہاں سے آیت اُتری

”اَتَمَّادِلَيْكَرَ اللّٰهُ، وَرَسُولُهُ، وَالَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ لَيَقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُوْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ“

اہل سنت کی تفسیریں اٹھا کر دیکھو، سب نے یہ روایت لکھی ہے کہ مراد اس سے علیؑ ہیں۔ اب لاکھ اہل سنت شور مچائیں کہ ولیؑ کے معنی یہاں مددگار، ناصر دوست وغیرہ کے ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ولیؑ کے معنی مالک و متصرف کے بھی ہیں ضرور۔ اب فرض کرو کہ خدا کا مقصود اس لفظ سے وہی ناصر و مددگار

رہا بھی ہو لیکن کہا اس سے رسولؐ کی اس خطا و اجتہادی کوتاہی کو تقویت حاصل نہیں ہوئی؟
 رسولؐ نے کہا: ”انا مدینۃ العلم و علی بابہا فمن اراد العلم
 فلیات الباب“ میں شہ لیم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں تو جو شخص علم کا طالب
 ہو وہ دروازہ پر آئے۔
 خدا نے ارشاد کیا:۔

”لیس البران ثا قوت البیوت م ظہورہا ولكن البر من
 اتقى و اتى البیوت من ابوابہا“ یعنی برائیوں میں سے نہیں ہے کہ تم گھروں
 میرا پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ گھروں میں جاؤ تو دروازوں کی طرف سے جاؤ۔
 اب سنی تمہیں اور ممکن ہے سچ بھی کہتے ہوں کہ یہ عام بات ہے۔ اس کا علیؑ سے
 کوئی تعلق نہیں مگر رسولؐ کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے رسولؐ کے
 پروپیگنڈے کو کیا قوت نہیں پہنچائی؟

رسولؐ سورہ برأت لے جانے پر حضرت ابوبکرؓ کو مامور کرتے ہیں۔ خدا واپس
 منگواتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ تمہاری نمائندگی صرف علیؑ ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے مقصود
 خلافت کی قرارداد نہ ہو لیکن کیا رسولؐ کی خطا و اجتہادی کوتاہی جو حضرت علیؑ کے بارے
 میں تھی اس سے قوت نہیں حاصل ہوئی؟

رسولؐ غدیر خم میں تقریر کرتے ہیں اور اپنی خطائے اجتہادی کے وسیع پروپیگنڈے
 کی سب سے آخری اور پُر زور کارروائی عمل میں لا کر علیؑ کی خلافت کا اعلان کرتے
 ہیں اور خدا کی طرف سے آیت اترتی ہے۔

”الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت
 لکم الاسلام دینا“ (یعنی) آج میں نے تمہارا دین مکمل کیا آج اپنی
 نعمت پوری کی اور آج تمہارے لیے دین اسلام کو پسندیدہ کیا۔

اس سے حقیقت میں مقصود جو کچھ بھی رہا ہو لیکن کیا اس سے رسولؐ کی خطا اجتہادی پر مہر تصدیق ثابت نہیں ہوتی؟

میں سچ کہتا ہوں اور خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر شیعہ واقعاً گمراہی میں مبتلا ہیں اور ردِ قیامت سوال ہوا تو شیعہ صاف کہہ دیں گے کہ ہماری گمراہی کی ذمہ وار تیرے حبیب کی خطا اجتہادی ہے اور ان کی خطا اجتہادی کو تقویت پہنچانے کی ذمہ داری تیرے لوتیہ اور جانبداری و حمایت پر ہے جس کے بعد اگر ہم گمراہ ہوئے تو تیرے ماعتول اور تیرے حبیب کے ماعتول، ہم بالکل بے قصور ہیں اور بالکل بے گناہ اور پھر جب تیرا حبیب خطا اجتہادی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور عمر بھر مبتلا رہ سکتا ہے تو ہم تو گنہگار انسان ہیں۔ ہم اگر خطا اجتہادی میں مبتلا ہوئے اور عمر بھر مبتلا رہے تو ہمیں سزا دیئے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس کا کوئی جواب ہرگز نہ ہوگا اور یقیناً اگر خدا ظالم نہیں ہے تو کبھی وہ ہم کو اس کے بعد آتش جہنم میں نہیں بھیج سکتا۔ ہم نجات کے حق دار ہیں اور کوئی طاقت ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔

تیسرا سوال

”وصایت جناب امیرِ ثقات کرنے کے لیے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعہ پیش کرتے ہیں؟“

اس بحث کے بہت سے اجزاء ناقص اور غیر مکمل صورت میں ”ہر نام“ صاحب کے مضمون میں آچکے ہیں۔ اس لیے کہ ایک غیر متعلق ہندو دوسرے مذہب کے متعلق کتنی ہی وسعتِ نظر حاصل کرے، لیکن اسی باب کے ایک واقف کار انسان کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور ان اجزاء کے ثبوت و صحت کے اوپر جناب نیاز کی

مہر تصدیق بھی ثابت ہو چکی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہم ان کو اس جگہ مکمل اور حقیقی صورت کے ساتھ پیش کریں جس کی بنا پر ان کو شیعہ بطور نصوص قطعہ سمجھتے اور پیش کرتے ہیں۔

(۱)

واقعہ بیعتِ عشرہ جس میں حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ:-

”هَذَا اخي وصيوتي وخليفتي فيكم“ اس ارشاد کے لب و لہجہ اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں کہ یہ رسولؐ نے بطور مشورہ ارشاد کیا تھا اور مطلب یہ تھا کہ اگر خلیفہ کا انتخاب کیا جائے تو میرا وٹ بنی علیؑ سمجھنا۔

بلکہ الفاظ اور عنوان واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک قرارداد اور اعلان ہے جو رسولؐ کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔

رسولؐ کا سب سے پہلے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنا کہ کون شخص تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے تاکہ وہی میرا خلیفہ و وزیر ہو اور پھر جب سب نے سکوت کیا اور علیؑ نے اقرار نصرت کیا تو رسولؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ ”دیکھو یہ ہے میرا وصی و خلیفہ و وزیر“ غیر مبہم طریقہ سے بتلاتا ہے کہ (الف) رسولؐ خلافت کی قرارداد کا اختیار اپنے لیے سمجھتے تھے ورنہ آپ کو اس معاہدہ کا کوئی حق ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جو شخص میری نصرت کا اقرار کرے گا وہی میرا خلیفہ و وزیر قرار پائے گا۔

(ب) یہ کہ جب علیؑ نے وعدہ نصرت کر لیا تو اسی وقت معاہدہ کی تکمیل اور واعدہ جانشینی کا اعلان کر دیا گیا اب جس وقت تک کہ یہ حکم منسوخ نہ ہو اس وقت تک اس سے مخالفت کی کوئی گنجائش نہیں اور اسی بنا پر بعض روایات میں موجود ہے کہ جب اس کے بعد مجمع متفرق ہوا تو قریش جناب ابوطالب (حضرت علیؑ کے والد) سے بطور

متحرک رہے تھے کہ یسعی اب تو اپنے بیٹے کی اطاعت کیجیے۔ ان کو آپ پر حاکم مقرر کر دیا گیا۔

پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پوری کاروائی رسول کی جانب سے بناہ بروہی عمل میں آئی تھی جس کے متعلق قرآن مجید میں آیت موجود ہے:-

”اذر عشیرتک الاقربین واخفص جناحک لمن اتبعک من المؤمنین“ (یعنی) ”اپنے قریب کے عزیزوں کو متنبہ رو اور اپنے بانٹوں کو جھکا دؤ اس شخص کے لیے جو مومنین میں سے تمہارا اتباع کرے“

اس میں صاف دو حکم نظر آ رہے ہیں۔ ایک (عشیرتک الاقربین) کا انداز دوسرے اس شخص کے لیے جو اتباع کی حامی بھرے اور نصرت کا اقرار کرے ایک خاص قسم کا امتیاز جسے ”واخفص جناحک“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے یہ ظاہر ہے کہ تمام مذہبی شعوبوں میں ”وحی متلو“ یعنی قرآن کی ہدایتیں محل حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل رسول کے عمل سے ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے ”اقیموا الصلوٰۃ“ رسولؐ نے نماز پڑھ کے دکھلائی کہ نمازیوں پڑھی جاتی ہے۔ ”کتب علیکم الصیام“ رسولؐ نے روزہ رکھ کر دکھلایا کہ اس طرح۔ ”لله علی الناس حج البیت“ رسولؐ نے مناسب حج ادا کر کے ان کی تشریح کی۔ بہر حال جہاں تک دیکھا جائے مذہب کے ہر شعبہ میں قرآنی مندرجات ایک اجمال کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تشریح ہمیشہ افعال پیغمبر سے ہوتی ہے۔

”واخفص جناحک لمن اتبعک“ کا جزو ”اذر عشیرتک الاقربین“ کے ساتھ لگا ہوا ہے اور جس سے باجماع مفسرین بیعتِ عشیرہ کا واقعہ مراد ہے صاف بتا رہا ہے کہ یہ ”واخفص جناحک“ کا حکم کوئی عام بات نہیں ہے جو اس موقع سے کوئی خصوصی تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا تعلق اس موقع کے ساتھ ضرور ہے

”واخفض جناحك“ کے معنی حسن اخلاق سے پیش آنے کے لینا رسول کے وسعت اخلاق کی توہین کرنا ہے کیونکہ وہ رسول تو ایسا تھا کہ جو کفار و مشرکین تک سے حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔

یقیناً یہ ”واخفض جناحك“ جو ”من اتبعك من المؤمنین“ کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے کسی طرح کے امتیازِ خصوصی کا پتہ دیتا ہے جو اس موقع پر اتباع کا اقرار کرنے والے کی ذات سے متعلق ہے۔ رسول کے عمل سے ظاہر ہے کہ انہوں نے دونوں جزوں کا امتثال کیا اور اسی امتثال سے حقیقت ان کے معانی کی تشریح ہوئی۔ انھوں نے اپنے اعزاء و اقارب کو جمع کر کے تبلیغ و دعوت کے ساتھ ”انذارِ عثیرتک الاقربین“ کی ہدایت کو انجام دیا اور ”من اتبعك من المؤمنین“ کے لیے خصوصی حیثیت سے ”واخفض جناحك“ کے اتباع میں انہوں نے اتباع و نصرت کا اقرار کرنے والی ذات کے لیے ایک امتیازِ خصوصی عطا کیا۔

معلوم ہوتا ہے رسول ”خفض جناح“ (یعنی بازو جھکا دینے) کا مطلب مجھے ایک طرح کے معاہدہ و اقرار کا بار اپنے کاندھوں پر لے لینا۔

مکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ پیغمبر نے خدا کے الفاظ سمجھنے میں غلطی کی خفض جناح کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے مگر اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول نے جو کچھ کیا وہ ”نیک نیتی“ کے ساتھ اپنے خیال میں ”بر بنائے وحی“ اب اگر اُن سے الفاظِ وحی کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی تو خدا کا فرض تھا کہ وہ اُن کو اس غلطی پر متنبہ کرے اور اس کی اصلاح کر دے اور پھر وحی کے مفاد اور تبلیغ احکامِ خداوندی میں غلطی تو ایسی چیز ہے جسے غالباً جناب نیاز صاحب بھی رسول کی ذات کے لیے غیر ممکن قرار دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی کی چاشینی کا یہ اعلان بر بنائے وحی تھا اور حکمِ خداوندی کی بنا پر تھا۔ جو وحی متلو یعنی قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔

۲۶۴

(۲)

آیت ولایت۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

”الْمَا وَلِيَكُمْ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ سَرَّاحُونَ“

اس کے لیے ملاحظہ ہوں ذیل کے روایات :

الخطیب فی المتفق عن ابن عباس، عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابوالشیخ
ابن مردویہ، عن ابن عباس، طبرانی فی الاوسط، ابن مردویہ عن عمار بن یاسر، ابوالشیخ
ابن مردویہ عن علی بن ابی طالب، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن عساکر عن سلم بن کیس، ابن جریر
عن مجاہد، ابن جریر عن السدی و عقبہ بن حکیم، طبرانی و ابن مردویہ ابو نعیم عن ابی رافع ابن
مردویہ عن ابن عباس۔

(در منشور للمحافظ السیوطی جلد ۲ صفحہ ۲۹۳، ۲۹۴)

ان روایات میں متفقہ طور پر یہ مذکور ہے کہ یہ آیت اس موقع پر اُتری ہے کہ
جب حضرت علیؑ نے ایک سائل کو نماز میں انگشت شہادت کے اشارہ سے انگوٹھی دی تھی
فسار کے سیاسی تقاضا کی بنا پر علیؑ کی کوئی فضیلت بلا معارض تو رہ ہی نہیں سکتی
تھی اس لیے اس آیت کی نسبت بھی بعض روایات دوسرے موجود ہیں مگر مذکورہ بالا
محدثین کی شہادتیں جو بہر حال علیؑ کے ساتھ کوئی جانبداری نہ رکھتے تھے اور نہ مذہبی حیثیت
سے ان کو اس روایت کے گھڑنے کی ضرورت تھی ان دوسرے معارض روایات کو جو بجائے
خود بھی متعارض ہیں، بالکل مشکوک بنادیتی ہیں۔ اور اسی لیے تمام مفسرین اہل سنت اس
روایت کے بالکل انکار کی گنجائش ہرگز نہیں پاتے۔ مگر دہکتے ہیں کہ ”ولی“ کے معنی ناصر و
مددگار کے ہیں۔ حاکم و متصرف کے معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟

بے شک کیا ضرورت ہے اگر قرآن کی بنا پر ان ہی معنی کا تعین نہ ہوتا ہو کیونکہ لفظ

مشترک کا کسی ایک ہی کے ساتھ تعلق ہمیشہ قرآن ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔
یہاں مددگار و ناصر مراد لینے سے ایک تو خاص کوئی محصل اس آیت کا ہوتا ہی نہیں
اس لیے کہ مددگار و ناصر تو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:-
”وَالْمُؤْمِنُونَ لِبَعْضِهِمْ ادِیَاءُ لِبَعْضٍ“ (یعنی مومنین آپس میں ایک دوسرے کے
مددگار ہیں) پھر اس میں تخصیص کے کیا معنی؟ اور پھر رسولؐ اپنے قول و عمل سے اسی لفظ کی حاکم و
متصرف کے معنی میں تکرار کر کر کے برابر تفسیر کرتے رہے جیسے بریدہ کی روایت جس میں آپ
نے فرمایا: ”وَهُوَ وَلِیُّکُمْ بَعْدِی“

ان الفاظ کا تذکرہ کثیر التعداد روایات میں موجود ہے جن میں سے بعض ”ہر نام“ صاحب
کے مضمون میں آچکی ہیں۔ پھر جبکہ رسولؐ کے ان ارشادات میں واضح طور پر یہ معین ہے
کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں اور اسی بنا پر جناب مدینہ نگار بھی تحریر فرماتے ہیں
”اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب
امیر خلیفہ قرار دیے جائیں جیسا کہ آپؐ نے بار بار اشارۃً و کنایۃً کیا بلکہ ایک
حدیثک ملاحظہ فرمائیے اس کو ظاہر بھی کیا۔“

اد جب کہ یہی ”ولی“ کا لفظ قرآن مجید میں بھی موجود ہے اور جبکہ بروایت مفسرین
وہاں بھی ولایت کی صفت علیؑ کے لیے قرار دی گئی ہے تو پھر آخر رسوا کیے ان ارشادات
کے مبرہنائے وحی ماننے میں کیوں توقف کیا جاسے؟ آنا تو کم از کم ضرور ہی ثابت ہو چکا ہے
کہ رسولؐ نے اس ”ولی“ کے لفظ کے معنی جو قرآن میں ہے ”حاکم و متصرف“ ہی کے سمجھے اور
اس سے مراد علیؑ ہی کی ولایت قرار دی اور اس لیے وہاں چونکہ خدا و رسولؐ کے بعد
ولایت میں علیؑ کا درجہ رکھا تھا لہذا آپؐ نے بھی ارشاد کیا ”وَهُوَ وَلِیُّکُمْ بَعْدِی“
اب اگر ”ولی“ سے الفاظ کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو خدا کا فرض تھا کہ متنبہ کر دیتا
اور اس غلطی پر رسولؐ کو برقرار نہ رہنے دیتا اور پھر الفاظ وحی کے غلط معنی سمجھنے کے

امکان کا رسول کی نسبت غالباً کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

(۳)

آیت تبلیغ جس کے الفاظ یہ ہیں :-

”یا ایہا الرسول بلغ ما أنزل الیک من ربک وان لم تفعل فمأ
بلغت رسالتک واللہ یعصمک من الناس“

”(یعنی) اے پیغمبر پہنچا دو اس شے کو جو نازل کی گئی ہے تمہاری طرف تمہارے
رب کی جانب سے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کی رسالت کو کچھ پہنچایا ہی نہیں
اور خدا لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔“

یہی وہ پُر زور حکم ہے جس سے حضرت علیؑ کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا
ثابت ہوتا ہے اور اسی کو غالباً ”ہر نام“ صاحب نے لکھا ہے کہ ”شیعہ علیؑ کی امامت
کے متعلق قرآنی ہدایت کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔“

حسب ذیل روایات اہل سنت اس باب میں متفق ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں
ولایت علیؑ کی تبلیغ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

ابن ابی حاتم وابن مردویہ وابن عساکر عن ابن سعید الخدری، ابن مردویہ عن ابن
مسعود ابن ابی حاتم عن عنترہ عن علیؑ ابو بکر الشیرازی نیما نزل من القرآن فی علیؑ عن ابن
عباس، ابواسحق احمد بن محمد الثعلبی عن البراء بن عازب، محمد بن طلحہ القرظی فی مطالب
السؤل باسناد انوار احدی عبد الرزاق الرصعی عن ابن عباس، نظام الدین النیشاپوری
فی غرائب القرآن عن ابی سعید الخدری وابن عباس والبراء بن عازب ومحمد بن علی السید
علی الهمدانی فی مودة القرنی عن ابن عباس، نور الدین ابن الصبیح المالکی فی الفصول
المہتمہ با، ناد الواسعی۔ بدلا الدین العینی فی عمدة القاری جمال الدین المحدث الشیرازی
فی کتاب الاربعین شہاب الدین امدنی توضیح الدلائل۔ محمد بن مستمدرخان البخشی فی

مفتاح النجا — وغیرہ۔

جو اشخاص اس بارے میں شک و شبہ کرتے ہیں وہ کسی خاص ایسے حکم کا پتہ نہیں دیتے جس کی تبلیغ کا اس زور و شور کے ساتھ تاکید کی حکم مہم ہو۔ ان میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ”ما انزل الیہ“ سے قرآن و شریعت مراد ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتداءً زمانہ بعثت سے رسول کی عمر گزری تبلیغ قرآن و شریعت کرتے کرتے توحید و رسالت اور معاد ایسے اصول دین سے لے کر نماز و روزہ حج و زکوٰۃ اور احکام معاملات و قصاص و دیات تک آپ نے سب کی تبلیغ کی اور کبھی نہ چھپکچھپائے، نہ پس و پیش کیا نہ کسی خوف و اندیشہ کے احساس سے متاثر ہوئے۔ پھر آخر اب ساری رسالت کی عمر ختم ہونے کے بعد یہ کہنے کے کیا معنی کہ اے رسول تبلیغ کرو دین و شریعت کی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کچھ رسالت پہنچائی ہی نہیں؟

کیا رسول اب تک تبلیغ دین و شریعت نہ کر چکے تھے؟ کیا آپ نے خداوندی پیغام دنیا کو نہ پہنچائے تھے؟ کیا آپ نے احکام الہی سے لوگوں کو خبردار نہ کیا تھا؟ پھر آخر اب اس حکم کا حاصل؟

اور پھر تبلیغ رسالت کے معنی ہی تبلیغ دین و شریعت کے ہیں۔ اس کے بعد ”ما انزل الیہ“ کو بھی دین و شریعت کے معنی میں لے لینا قرآن پاک کی آیت کو جسے مسلمان فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ کہتے ہیں معنی و مفہوم کے جوہر سے بے نیاز سمجھنا ہے۔

مفہوم آیت کا اس وقت یہ ہوگا کہ ”اے رسول دین و شریعت کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی تو تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی۔“

کیا یہ ”دندانِ توجہ در دہاں اندر چشمانِ تو ز برابر دانند“ کا سا صحیح نمونہ یا اس سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہے۔

الفاظ کی یہ ترکیب صاف بتلاتی ہے کہ ”ما انزل الیہ“ سے کوئی خاص اہم حکم مراد ہے اور اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ یہ حکم ایسا اہم حکم ہے کہ اس کی اگر تم نے تبلیغ نہیں کی تو گویا تمام دین و شریعت کی تبلیغ نہیں ہوئی۔

اس کی مثالیں روزمرہ کی زبان میں براہ راست رہتی ہیں۔ محل تاکید میں برابر کہتے ہیں کہ ”تم نے اگر یہ کام نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں؟ اب وہ خاص حکم کیا ہے؟

آیت سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حکم ایسا ہے جس میں خطرات پائے جاتے ہیں اور ان ہی خطرات کا اندیشہ رسول کو اب تک اس حکم کی تبلیغ سے مانع رہا ہے اور درحقیقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا پر اس کے منتظر تھے کہ اس طرح کا تاکید ہی حکم خدا کی جانب سے آجائے تو آپ اس اہم اعلان کی طرف اقدام فرمائیں۔ پھر وہ خطرات کیا ہیں؟

یہ بھی آیت سے ظاہر ہے کہ خطروہ کسی آفت ارضی و سماوی کسی بلائے ناگہانی، کسی آندھی پانی کا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے خطروہ ہے، لوگوں کی مخالفت سے صرف نہیں، بلکہ ضرر رسانی اور آفات جانی سے اور اگر ایسا نہ ہو تو ”واللہ ليعصمکم عن الناس“ کے ٹکڑے کا کوئی محل نہیں ہے۔

آیت سورہ مائدہ کی ہے جو حجۃ الوداع میں اترتا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام قبائل عرب اسلام لے چکے تھے اور حضرت مسرورہ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطیع ہو چکے تھے۔ یہود کی شورشیں ختم ہو گئیں عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ میں صلح ہو چکی۔ مشرکین قریش کی جنگجو باہر روح خندق کے بعد ختم ہو گئی اور ان کی عداوت و عناد نے صلح حدیبیہ میں آخری سانسیں لیں جس کے بعد فتح مکہ میں اس کی حس و حرکت بالکل باقی نہ رہی۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کا آخری سال اور آخری حج، مترنار مسلمان مکہ معظمہ میں اگر رسول کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے میں مصروف۔ اس صورت میں بیخود و دہشت، یہ خطروہ

کا احساس یہود سے ہو نہیں سکتا۔ نصاریٰ سے ہو نہیں سکتا۔ مشرکین سے ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ آیت سورہ مائدہ کی ہے جو کسی قول کسی روایت کسی معمولی سے معمولی اسناد پر بھی ابتداءً اسلام کا نازل شدہ نہیں ہے بلکہ اسی موقع کا ہے جب اسلام کو انتہائی قوت حاصل ہو گئی تھی اور غیر مسلمین سے پیغمبر کو کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

پھر ”واللہ یعصمکم من الناس“ کے الفاظ کیا یہی نہیں بتاتے ہیں کہ حکم کوئی ایسا تھا جس میں خود مسلمانوں کی جماعت سے خطرہ تھا اور ان ہی کے متعلق رسولؐ سے برگشتگی اور نقصان رسائی کا اندیشہ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اقلیت کی مخالفت اور اکثریت کی موافقت کے ساتھ ”الناس“ کی تعظیم درست نہیں ہو سکتی اور نہ خطرہ کا کوئی محل ہے۔ بلکہ ”واللہ یعصمکم من الناس“ کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ معاملہ ایسا تھا کہ جس میں جمہور رسولؐ کی رائے کے خلاف تھے اور آپ کو اس میں عام مخالفت کا خیال تھا۔

یقیناً مفسرین اس نقطہ سے ہٹ کر جو اکثر ارباب تفسیر میں متفقہ حیثیت رکھتا ہے آیت کے ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی خاص تاویل و تفسیر کر ہی نہیں سکتے۔ آیت اپنے تمام خصوصیات کی بنا پر صرف خلافت حضرت علیؑ کے بارے میں منطبق ہوتی ہے۔ رسولؐ کو اس معاملہ میں یقیناً عام مخالفت کا اندیشہ تھا۔ اور خود مسلمانوں کے بارے میں آپ کو احساس تھا کہ وہ اس سے ہرگز متفق نہیں ہوں گے جیسا کہ مدیر نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

”آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیر کا خلیفہ بن جانا آسان نہیں ہے اور ان کے اتنے مخالفت موجود ہیں کہ اس پر اصرار کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوگا۔ آگے چل کر آپ نے تحریر کیا ہے:-

”یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جب ایک محبوب کے متعدد چاہنے والے ہوتے

میں تو ان میں سے ہر ایک اپنا ہی درخور حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے تو دوسروں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسالت مآبؐ جس خصوصیت کا اظہار جناب امیرؓ سے کیا کرتے تھے اُسے نظرًا تمام صحابہ کے لیے باعثِ رشک ہونا چاہیے تھا اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جناب امیرؓ کی رسول اللہؐ کے دل میں تھی بالکل وہی دوسروں کی نگاہ میں تھی۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی طرف سے ایک عام جذبہٴ ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپؐ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاید ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ جو کچھ ہوا سب اسلامی نقطہٴ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اہل عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کاٹنا ان کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا۔“

پھر تمام صاحب نے بھی اپنے ابتدائی مضمون میں کافی شواہد اس امر کے لکھے ہیں۔ کہ کس کس طرح صحابہ حضرت علیؓ کے معاملہ میں رسولؐ کے رویہ پر اعتراض و مخالفت کرتے تھے۔ نیز یہ کہ خود رسولؐ کو صحابہ کی نسبت اس معاملہ میں کتنی بے اطمینانی تھی اور آپؐ اپنی فراست کی بنا پر گویا دیکھ رہے تھے کہ کس طرح صحابہ آپؐ کے بعد علیؓ سے لڑکدانی کریں گے اور ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔

اس صورتِ حال کی بنا پر بے شک اصولی درایت کے لحاظ سے بالکل قرین قیاس ہے یہی امر کہ حضرت رسولؐ کو اشارۃً و صراحتہً خاص خاص موقوف پر علیؓ کی خلافت کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن آپؐ کو اس کے عمومی اعلان و اظہار میں خطرہ کا اندیشہ ہو اور آپؐ منتظر ہوں کہ خدا کی طرف سے پُر زور تائیدی حکم

اُٹے جس کے بعد میرے لیے کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تب میں اس کا سر انجام کروں۔
خدا نے بھی اس آیت میں اطمینان دہی کے طور پر یہ وعدہ نہیں کیا ہے اور نہ خبر دی ہے کہ تم جو کچھ تبلیغ کرو گے اُسے سب تسلیم کر لیں گے اور اختلاف نہ کریں گے، بلکہ صرف یہ وعدہ کیا ہے کہ تمہاری جان کو ان کے ہاتھ سے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکم کے خلاف مخالفانہ شورش برپا ہوگی اور اس کے مخالفت بھی ہوں گے، مگر رسولؐ کی جان کو صدمہ نہیں پہنچے گا۔

مکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر آیت کا مقصود یہی تھا تو اس میں صاف صاف علی کے نصب و خلافت کا ذکر کیوں نہ کر دیا گیا اور نام لے کر تصریح کیوں نہ کر دی گئی۔
مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت یہ منظم قرآنی کی ایک حکیمانہ روش تھی اگر قرآن میں کہیں اس طرح کے مضامین کو صاف صاف نام کی تصریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہوتا تو اس وقت مسلمانوں کے قرآن بھی دو ہوتے۔ ایک قرآن میں وہ آیتیں درج ہوتیں اور ایک میں سرے سے وہ آیتیں درج ہی نہ ہوتیں۔ اس صورت میں جو کچھ حقیقت کا اظہار قرآنی آیات سے اس وقت ہو رہا ہے۔ اتنا بھی نہ ہوتا اس لیے یہ قرآن کا ایک خاص حکیمانہ انداز تھا کہ اس نے اپنے مقاصد کو ایک طرح ابہام کے پردہ میں رکھا ہے لیکن قرآن ایسے قائم کیے ہیں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔
ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ قرآن میں خاص خاص آیتیں منافقین کے تذکرہ پر مشتمل ہیں اور ان کا کوئی نہ کوئی مصلدق ضرور ہے مگر نام نہیں لیا گیا۔ سورۃ طلاق و تحریم میں رسول اللہؐ کے بعض ازدواج کی نسبت خاص خاص واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ان کا بھی مصلدق کوئی ہے مگر نام نہیں لیا۔

اسی طرح سیکڑوں آیات متعدد مواقع پر کثیر التعداد صحابیوں کی تنبیہ، تعریف یا مذمت میں اتاری گئیں اور کہیں کسی ایک کا بھی نام نہیں لیا۔ تمام صحابہ کرام میں صرف

زید بن حارثہؓ کا نام قرآن میں لایا گیا۔ فلما قضی زید منها دطرانہ وجناکھا۔ لیکن زید کی ہستی کسی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان محل اختلاف مسمیٰ ہی نہیں کیونکہ زید کی شہادت حیات رسول اللہؐ ہی میں ہو گئی اور اس مسئلہ کو ابھی مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلافی درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کسی ایک جگہ بھی کسی کا نام موجود نہیں ہے۔

اس کی وجہ سے یہ تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ یہ تمام آیات فرضی و تمثیلی افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مصداق کوئی اس زمانہ میں تھا ہی نہیں بلکہ حقیقتاً مصداق ہر ایک کا معین تھا مگر قرآن کی ”وحی متلو“ میں اس کا نام نہیں ہے۔

اس کے لیے بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ نام تھے اور وہ حذف کر دیے گئے مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں، میں اس کو جیسا کہ میں نے کہا قرآن کی ایک حکیمانہ کاروائی سمجھتا ہوں، جس میں مفاد اسلامی کا پہلو مضمر تھا۔ بعض روایات میں بعض صحابہ کے قرآن میں جو کہیں کہیں بعض اہول کا بہ تصریح اضافہ ہونا مذکور ہے۔ اسے ”تفسیری نوٹ“ کی حیثیت سے قرار دیتا ہوں۔ جس سے تعین مراد میں مدد ضرور مل سکتی ہے چنانچہ زیر بحث آیت کے متعلق بھی یہ روایت موجود ہے کہ ابن مسعود اس آیت کو بایں الفاظ پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت رسولؐ کے زمانہ میں وہ یوں ہی پڑھی جاتی تھی کہ:-

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (ان علیا
مولیٰ المؤمنین) وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ

(در منثور جلد ۲ صفحہ ۲۱۸)

اس سب کے بعد جہاں تک روایت و درایت کا تعلق ہے میں تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں پاتا کہ یہ آیت حضرت علیؓ کی خلافت ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے بعد خدا کی ہدایت اس باب میں صراحت ظاہر ہے۔



جس کے متعلق جناب نیا ز صاحب نے بھی تحریر فرمایا
حدیث غدیر ہے کہ ”یہ شیعوں کے پاس ولایت جناب امیرؓ کی

سب سے بڑی شہادت ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل ”ہزنام“ صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ نیز جناب
 مدیر نگار نے بھی اپنے محاکمہ میں اس کی تکرار کی ہے یہ حضرت رسولؐ کا وہ صاف کھلا
 ہوا تاریخی اعلان ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اور اس میں آپؐ نے
 یہ ارشاد کیا ہے کہ:۔

”خدا میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں، اور اس کے بعد جس کا

میں مولا ہوں علیؓ بھی اس کا مولا ہے۔“

خود الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس اعلان میں مذہبی شان پائی جاتی ہے یہ کوئی
 سیاسی مشورہ نہیں ہے نہ ذاتی اظہار خیال ہے بلکہ بحیثیت رسولؐ بحیثیت پیغمبرؐ آپؐ
 اپنے بعد کے لیے اعلان کر رہے ہیں۔

بعض لوگ حدیث کے معنی میں کلام کرتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں کہ ”نص“

نہیں ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ”نص“ ہوتا تو اس کے اور کیا الفاظ ہو سکتے تھے؟

اس کے پہلے ”وزیر“ کہہ چکے ”وصی“ کہہ چکے ”خلیفہ“ کہہ چکے ”ولی“ کہہ چکے

اب کہتے ہیں کہ ”خدا میرا مولا ہے اور میں تمہارا مولا ہوں“ اب جس کا میں مولا ہوں اس

کے علیؓ بھی مولا ہیں؟

اس سے کیا پتہ نہیں چلتا کہ علیؓ کا مولا ہونا اسی طرح حاکم و مقصرت ہونے کی

شان سے ہے جس طرح خدا کا اور رسولؐ کا؛ مگر تاویل کی دنیا تنگ نہیں ہے طے

ہے کہ ہر معاملہ میں رسولؐ روزِ مژدہ کی زبان میں بات چیت کرتے ہیں اور وہی معنی سمجھ لیے جاتے ہیں جو عام محاورہ کے مطابق اس لفظ کے ہیں۔ مگر اس معاملہٴ خاص میں دوبارہ علی بن ابی طالبؑ جو کچھ رسولؐ کی زبان سے نکلے اس کو دوسرے معنی پہنا لیے جائیں۔ "غلبہ" کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اہل و متعلقین میں وہ ان کی جگہ پر ہیں اور "وفا" کہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی بھر وہ آپ کی فکر کو مضبوط رکھنے والے اور "وصی" کہا تو صرف آپ کے قرضوں کے ادا کرنے کے لیے اور "ولی" کہا تو بمعنی دوست اور "مولیٰ" کہا تو وہ ناصر کے معنی ہیں۔

اس طرح نتیجتاً ایک منظم لنگ ہو جائے گا۔ الفاظ کا دفتر ختم ہو جائے گا اور اس کے مافی الضمیر یعنی کسی کے ذہن نشین نہ ہوں گے۔ آج کل دنیا "درايت درایت" پکارتی ہے اور یہاں پر عقل سے کام نہیں لیتی کہ حضرت رسولؐ اپنا مفروضہ قطع کرتے ہیں ہزاروں آدمیوں کو چیل بیا بان میں، خاص تہذیب و آداب کے وقت مجتمع کرتے ہیں منبر پر جاتے ہیں پر زور الفاظ میں تہید قائم کرتے ہیں، اپنی دفات کی خبر دیتے ہیں۔ لوگوں سے اپنی ہر طرح کی سرداری، حکومت، لوگوں کے نفس پر کامل سلطنت کا اقرار لیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے کیا ہیں! یہ کہ جس کا میں دوست ہوں اس کے علی بھی "دوست" ہیں یا جس کا میں "مددگار" ہوں اس کے علی بھی "مددگار" ہیں۔

آخر یہ کون سی ایسی بات تھی جو لوگوں کی طبیعتوں پر بار ہو جس کے لیے اپنے اختیارات، جملانے کی ضرورت ہو اور اپنی حکومت کے اقرار لینے کی حاجت! اس تمام کارِ رانی کا حاصل کیا ہوا اور یہ کون سی ایسی بات تھی جس کا اس شہود کے ساتھ اعلان ہو؟ پھر یہ کون سا ایسا امر تھا جس پر حضرت عمرؓ برہیں اور جناب امیرؓ و مبارکبادیں کہ "هنيئاً للهِ اصبحت مولیٰ کل مومن ومومنة" یعنی "مبارک ہو آپ کو کہ ہر مومن و مومنہ کے مولا قرار پا گئے" یہ مبارک باد کا ہے کی ہے؟

اس کی ہے کہ آپ آج ہر مومن و مومنہ کے مددگار بن گئے؟

کہا جاتا ہے کہ نولا کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں ہی نہیں۔ مگر نہیں ہیں وہیں تک کہ جہاں تک غدیر خم کے واقعہ کا تعلق ہے لیکن اور دوسرے موقعہ دل سے اُترا کسی دوسری جگہ مولیٰ کا لفظ آیا، پھر اس کے معنی مالک، متصرف، حاکم وغیرہ کے اقرار پا جائیں گے۔ ملاحظہ ہو تفسیر سراج منیر خطیب شریانی (مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۸) (سورۃ النعام)۔

”ثم رددوا الى الخلق الى الله، اي الى حكمه وجزائمه مولا هم اي سيدهم ومدبر امورهم كلها الحق اي ثابت الولاية وكل ولاية غيرة تعالى عدم“

یعنی قرآن مجید کی اس آیت میں کہ ”ثم رددوا الى الله، مولا هم الحق“ مولا کے معنی ہیں سید و آقا اور امور کا منظم حق کے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت حکومت اسی کی برقرار ہے اور اس کے سوا ہر ایک کی حکومت کا عدم ہے۔

سورۃ یونس کی آیت :- ”ورددوا الى الله، مولا هم الحق“ میں بھی لکھا ہے۔

”مولا هم اي ربهم ومتولي امورهم على الحقيقة“ یعنی مولا کے معنی ہیں مالک اور ان کے امور کا حقیقی منتظم“ (سراج منیر جلد صفحہ ۱۶) تفسیر بیضاوی میں بھی سورۃ یونس اور النعام دونوں جگہ اس کی تصریح ہے۔

تاج العروس شرح قاموس مصنفہ سید مرتضیٰ زیدری (مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۹۹) میں ہے :-

”المولى ايضا الوتى الذى يولى عليه، ملك وها بمعنى واحد ومنه الحديث ايما امرأة نكحت بغيا ذن مولاها ودواها بعضهم بغير اذن وليها وروى ابن سلام عن يونس المولى فى الدين

هو الولی و ذالک قوله تعالى ذالک بان الله مولی الذین امنوا و ان
الکافرین لا مولی لهم ای لا ولی لهم و منہ الحدیث من کنت مولاہ
فعلی مولاہ ای من کنت ولیہ

اس عبارت میں صاف تصریح موجود ہے کہ مولیٰ کے معنی صاحب اختیار اور
حاکم کے ہیں اور یہ کہ مولا اور ولی دونوں مترادف حیثیت رکھتے ہیں۔
اگر واقعات کا مطالعہ کرنے والا بے لوث نگاہ رکھتا ہو تو وہ صاف سمجھے گا کہ
رسولؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت، حکومت و جانشینی کا اعلان کیا اور لوگوں نے بھی
اس وقت یہی سمجھا اور اسی لیے حضرت علیؑ کو مبارکبادیں دیں۔



ان کے علاوہ بھی متعدد احادیث کو شیعوں نے اپنے مدعا کے اثبات میں پیش
کرتے ہیں اور پیش کرنا درست بھی ہے۔ جیسے حدیث منزلت جس میں حضرت رسولؐ نے
جناب امیرؑ کو مخاطب کر کے اشارہ کیا ہے۔

”کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے دہی نعت رکھو جو ہار دان کو موسیٰؑ سے
حاصل تھی۔ سو اے اس کے میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے۔“

یہ حدیث آپؐ نے اس وقت ارشاد فرمائی ہے جب غزوہ تبوک میں رسول اللہؐ
نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علیؑ کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ
ہی میں قیام کریں۔

اگر آخر کا فقرہ ”الا انتہ لا نبی بعدی“ نہ ہوتا تو شاید کہا جاسکتا تھا کہ منزلت
ہارونی کا تعلق صرف اتنے زمانہ سے تھا جب آنحضرتؐ تشریف لیے جا رہے تھے
مگر اس جملہ نے اگر اپنے قبل میں تعمیم کا نتیجہ دے دیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہارونی موسیٰؑ کے جانشین اور نائب اور شریک کار تھے بیشک

اگر نبوت کا سلسلہ رسولؐ کے بعد قطع نہ ہوتا تو نبوت بھی جناب امیرؓ کے لیے ثابت ہوتی۔ لیکن چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا اس لیے خلافت و جانشینی بہ شکل امامت آپؐ کے لیے ثابت رہے گی۔

حدیث ثقلین جس کو خصوصیت کے ساتھ آنحضرتؐ نے علی بن ابی طالب کے اعلان ولایت کے موقع پر بھی بیان فرمایا۔ اور اس کے بعد اپنے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ارشاد کیا۔ اس میں تمام امت کو بن میں اس وقت تو صحابہ کرام ہی تھے اور تمام اکابر داخل تھے اہل بیت کے ساتھ تنک کا حکم دیا۔ اور یہ کہ ان کا دامن چھوؤ گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

میری کچھ نہیں آتا کہ امت نے اس کے اوپر عمل کس طرح کیا اور اس پر عمل کی صورت کیا تھی؟ جبکہ مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کی پیشوائی نے غلط فہمی کے لیے حاصل تھی جس کے بعد اہل بیتؑ کی حیثیت ایک معمولی امتی سے زیادہ نہ رہی تھی اور کوئی امتیاز خصوصی ان کے لیے ہرگز حاصل نہ تھا۔

یہ احادیث بے شک ”وحی متلو“ کی حیثیت نہیں رکھتے یعنی حدیث اور قرآن میں امتیاز ضرور ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ قرآن کا تعلق قرآن خداوندی سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہؐ کی ذاتی رائے سے۔ احادیث رسولؐ بھی اکثر بربنائے وحی ہوتے تھے لیکن خود وحی میں یہ تفرقہ ہے کہ وہ کبھی ”وحی متلو“ کی حیثیت رکھتی تھی جس کو کہتے ہیں ”قرآن“ اور کبھی ”وحی غیر متلو“ جس کی مظہر ہے حدیث۔ اس لیے اکثر مسائل مذہبی یعنی روزہ اور نماز وغیرہ ایسے خالص عبادات کے احکام بھی احادیث سے ثابت ہوئے ہیں حالانکہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے خود ملائکہ و انجیل بھی قائل ہیں کہ رسولؐ کے احکام تمام بربنائے وحی ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ حدیث ثقلین کے بیان فرمانے میں غدیر خم والے خطبہ میں خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اس کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔
 ارشاد ہوتا ہے: ”قد نبأ فی اللطیف الخبیر انہما لن یفترقا
 حتی یرداعلیٰ الخوض“

(یعنی) ”مجھ کو خدا نے تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں (قرآن اور اہل بیتؑ) ہرگز جدا
 نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ میرے پاس خوض کوثر پر وارد ہوں؟“
 اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اعلان اہل بیتؑ کے بارے میں صرف اپنی ذاتی
 رائے سے نہ تھا، بلکہ وحی خداوندی کی بنا پر تھا جس کے بعد شک و شبہ کی گنجائش
 نہیں رہتی۔

چوتھا سوال

مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟
 میرے خیال میں دینی تعلق جو ایک اہم مذہبی حکم کو کسی مذہب کے ساتھ ہو سکتا ہے
 جناب مدیر نگار کی رائے ہے کہ:۔

”کہ اس کا مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ اصولاً ہونا چاہیے بلکہ اس کا تعلق
 صرف سیاسیات سے تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید اس
 مسئلہ میں ساکت ہے یعنی رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعہ سے کوئی ہدایت اس باب
 میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی
 کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا۔“

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب
 ابراہیم خلیفہ قرار دیے جائیں۔ لیکن — اس نامزدگی کی حیثیت صرف ایک

ذاتی رائے کی ہی غیبت۔ جس کو وحی سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بارہا رسول اللہ نے جناب امیر کو دلی، مولیٰ دہی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا۔ لیکن جب آپ کے دھال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی۔ اگر رسول اللہ کی یہ خواہش کسی وحی الہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلاشبہ پیش نہایت صاف الفاظ میں اس کا اظہار کر جاتے اور وہ الفاظ کلام مجید میں بھی ہوتے۔ اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باد کیا جائے تو ہم کو حسب ذیل باتیں معارض نظر آتی ہیں:-

۱۔ اگر خلافت جناب امیر کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے کلام مجید میں بونا چاہیے تھا، حالانکہ نہیں ہے۔

۲۔ اگر واقعی فرمانِ حسدِ اوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے کہ دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلام مجید میں ہوتا۔ رسول اللہ خود اپنے سامنے ہی حضرت علیؓ کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کر کے رخصت ہوتے، حالانکہ یہ بھی تاریخ ثابت نہیں۔

۳۔ اگر یہ کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ خود اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکام مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لیے وہ باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی کوشش ضرور کرتے۔ لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ خاموش ہو رہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ آپ نے خود حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کر لینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام شور و مل میں شریک ہوتے تھے اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔

اگر حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کو غاصب خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلافت فشاءِ خداوندی ہوتی تو کم از کم آپ یہ ضرور کرتے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور مراسمِ موالات ترک کر دیتے، اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا، اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دورِ خلافت کا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اس کا رسولؐ۔ لیکن حیرت ہے کہ جناب امیرؓ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر کر دیا۔ اور انھوں نے نہ کبھی صدائے احتجاجِ بلند کی اور نہ فشاءِ خدا اور رسولؐ کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت علیؓ کا خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں حد درجہ اس پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اس کے اور کسی سبب کی بنا پر نہیں ہو سکتا تھا کہ آپؐ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جان کر ذاتیات و مصالح کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لیے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔

مذکورہ بالا جماعت میں جس شد و مد کے ساتھ اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مسئلہ خلافت کوئی مذہبی مسئلہ نہ تھا وہ ناظرین کے پیش نظر ہے۔ اس کے سامنے ایک بکاتب کے قلم میں بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو واضح کر سکے۔

آفرین ہے جناب "ہر نام" صاحب کو کہ انھوں نے باوجود اجنبیت اور فطاریہ عجز و اعتراضِ قصور کے اپنے آخری مضمون میں اس بحث کے اکثر پہلوؤں کو اتنی خوبصورتی سے روشن کیا ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔

انھوں نے کہا ہے کہ خلافت کا تعلق مذہب سے اسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اسے صرف سیاسیات کے شعبہ سے متعلق رکھا جائے لیکن خلافت

کی حیثیت اس سے مختلف ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی جانب سے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ یہ کہ :-

”ہی نیابتہ عن النبی فی امور الدین والذنیاً“، تو اس کا تعلق مذہب سے ظاہر ہے۔

انھوں نے واقعات کی بنا پر یہ بھی دکھلایا ہے کہ پیغمبر نے اس کو بہ طور ایک سیاسی مسئلہ کے پیش نہیں کیا تھا۔ بلکہ معیارِ نجات بتایا تھا۔ اور اس پر آخرت کی بازپرس کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور خالص سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ جناب ”ہرنام“ کا مذکورہ بالا استدلال یقینی بہت مضبوط ہے۔ جس سے ان کی نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کہنا کہ کلامِ مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے، اسی وقت تک جتنی بجانب قرار پاسکتا ہے جب تک حقیقت پر اطلاع نہیں ہے۔ لیکن گذشتہ سوال کے جواب میں ہمارے بیانات نے یہ امر بالکل صاف کر دیا ہے کہ کلامِ مجید اس مسئلہ میں ساکت نہیں ہے اور یہ کہ رسول اللہ کی تبلیغ اس باب میں وحی الہی اور ہدایت خداوندی پر مبنی تھی۔

اگر رسول اللہ کی نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی حیثیت رکھتی تو آپ کو صاف صاف اس کا اظہار کرنا چاہیے تھا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کو یہ ہرگز روا نہیں تھا کہ بہ طور مذہبی حکم اس کا اعلان کریں اور اسے نجات اور فلاحِ اخروی کا معیار قرار دیں۔ کیونکہ ایک نبی سے اگر غلط رجحان پیدا ہو تو بھی یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک غیر مذہبی چیز کو مذہبی لباس میں پیش کرے کیونکہ یہ ایک بدترین فریب ہے اور تبلیغ ہے جس کا ایک دیانت دار آدمی کبھی مرتکب نہیں ہو سکتا۔

یہ کہنا کہ جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں

خاموشی اختیار کر لی۔ یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے جس کے متعلق ہر نام صاحب اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرقہ شیعہ کے قول کے لیے جو باتیں بطور معارض پیش کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے۔

خلافت جناب امیر کا اعلان بر بنائے وحی تھا اور وہ وحی قرآن میں بھی موجود ہے اور رسولؐ نے بھی اس کا اظہار کیا اور عام مجمع کے سامنے اعلان کیا۔ روایت میں موجود ہے کہ آپؐ نے سب سے اقرار لیا۔ کہ کیا میں تم سب کا مولا نہیں ہوں؟ جب سب نے اقرار کیا تب آپؐ نے یہ کہا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔

اس سے بڑھ کر اعلان کرنے اور اقرار لینے کی کیا صورت ہو سکتی تھی جبکہ قرآن نے رسولؐ کے فرائض کو بھی اس سے زیادہ نہیں بتلایا ہے۔ ارشاد کیا ہے:-
 ”وَمَا عَلَيْكَ اَلَا اَلْبَیْضُ“ نیز یہ بھی کہا ہے کہ رسولؐ کا کام جبر کرنا نہیں ہے۔
 ”وَمَا انتَ عَلَیْهِمْ بِمُصِیْطٍ“
 اور ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔ ”انتَ تَكْرَهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ“

اس اصول کے مطابق یہاں رسولؐ پر فرض یہی عائد کیا گیا تھا کہ وہ تبلیغ کریں۔ ”یا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اَنْزَلَ الْیَلٰیكَ مِنْ رَبِّكَ“۔ چنانچہ انھوں نے تبلیغ کر دی اور اتنے غیر معمولی اور اہم طریقہ سے کسی حکم کی اس سے پہلے تبلیغ نہیں کی تھی۔ پھر اب اس کے بعد رسولؐ کیا کرتے اور کس طرح لوگوں سے تسلیم کراتے۔



حضرت علیؑ ضرور واقف تھے کہ یہ مذہبی سلسلہ ہے لیکن ہر مذہبی حکم کے اہزار کے لیے ہر حال میں خونریزی اور مسلمانوں کا قتل عام تو روا نہیں ہے۔ آپؑ سے خوب واقف تھے آپؑ جانتے تھے کہ اس وقت ہوا کا رُخ کدھر ہے اور سیلاب کا بہاؤ کس طرف؟

آپؑ کو معلوم تھا کہ اس وقت اس حق کا حصول اور اس فرض مذہبی کا قیام بغیر عظیم کشت و خون کے نہیں ہو سکتا اور اس طرح کا ہنگامہ پیدا ہو جانا اس وقت اہل اسلام ہی کے لیے سببِ فتنہ۔

آپؑ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک مذہبی سلسلہ کے متعلق رہنمائی کا فرض کس طرح پورا ہوتا ہے؟ صرف تبلیغ و تلقین سے جس کی تمام منزلوں کو بغیر سیر خود طے کر چکے تھے جس سے اتمامِ حجت پورے طور پر ہو چکی تھی۔

آپؑ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کی جماعت میں خود حضرت رسولؐ کے زمانہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جن کے دلوں میں ردِوحِ اسلامی جاگزیں نہیں ہوئی تھی۔ جو ذرا ذرا سی بات پر پیچھے ہٹ جاتے پر تیار تھے جو رسولؐ پر احسان جھلکتے تھے کہ ہم آپؐ پر اسلام لائے۔ جن نگاہوں میں احکامِ مذہبی کی وقعت اتنی سبک تھی کہ رسولؐ کے پیچھے سے نمازیں توڑ کے باجا دیکھنے چلے جاتے تھے اور رسولؐ کو اکیلا چھوڑ دیتے تھے، جو کفار و مشرکین کو خبر رسائی کرتے تھے، جو سامنے آ کر کہتے تھے کہ ہم آپؐ پر ایمان لائے اور مجھے مذاق اڑاتے تھے اور تمہیں کرتے تھے، جو رسولؐ کی طرف گمراہی کی نسبت دیتے تھے، جو آپؐ کی باتوں پر اعتراض کرتے تھے اور نبوت میں شک کرتے تھے، لیکن آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو گریز کیا۔ ان لوگوں پر کبھی تشدد نہیں کیا۔ ان کو اپنی جماعت سے باہر نہیں نکالا، ان پر کبھی تلوار نہیں چلائی، بلکہ ان کے راز ہائے درد پر وہ کو نام لے کر اپنی جانب سے ظاہر بھی نہیں کیا صرف

اس لیے کہ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتے ہیں تو یہی سہی ظاہری اسلام کے نام لیا جائے۔
یہی سہی۔ تو بیعت اسلامی کی تشکیل ہوگی تو ان میں کھرے افراد پیدا ہو ہی جائیں گے۔
یقیناً اگر حضرت علیؑ اپنے پیش رو کے حقیقی جانشین تھے تو ان کو اسی تسلیم کو
پیش نظر رکھنا ضروری تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کی خلافت حقیقی کی
صحیح شان ہی باقی نہ رہتی۔

بے شک جس طرح رسولؐ کا فرض تھا کہ وہ غلطیوں پر ٹوکتے رہیں بغرض قبول پر متنبہ
کریں کج رویوں کا اظہار کرتے رہیں اور حقیقت کا انکشاف کرتے رہیں اور بس اسی طرح
حضرت علیؑ کا بھی فرض تھا کہ وہ امتیاز کردہ روئے سے اپنی ناراضگی نیز اس طرز عمل
کی غلطی کا اظہار کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا کیا۔

اگر شیعوں کی روایت کو نہ بھی مانا جائے کہ حضرت علیؑ نے بالکل حضرت ابو بکر
کی بیعت نہیں کی تب بھی اتنا تو بر بنائے روایت امام بخاری مسلم ہے کہ آپ نے
حضرت فاطمہؑ کی زندگی تک قطعی بیعت نہیں کی۔ اس لیے کہ اس وقت تک آپ
کی کچھ نہ کچھ وجاہت مسلمانوں میں سمجھی جاتی تھی لیکن جب حضرت فاطمہؑ کا انتقال ہو
گیا تو لوگ آپ سے بالکل روگرداں ہو گئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسولؐ کی اس بیعت نے جس کو حضرت "سیدتنا الزہراء"
فرما گئے تھے اور "بضعتہ منی" کے لفظ سے یاد کر گئے تھے اس نے مرتے مرتے تک
اس بیعت کو تسلیم نہیں کیا اور حضرت علیؑ نے بھی اپنی ناراضگی کا ثبوت پیش کیا۔
بقول بعض اہل تحقیق حقیقت یہیں سے منکشف ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ
مسلمانوں کی متفقہ حدیث ہے: "من مات ولم یعرف امام زمانہ
مات میتة جاهلیة"

(یعنی) جو شخص مر جائے اور اپنے امام زمانہ کے ساتھ معرفت و عقیدت نہ حاصل

کرے اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔ اب مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے، اپنے رسول کی مقدس بیٹی ”سیدۃ النساء العالمین“ کی موت کے بارے میں جو بغیر خلیفہ وقت کی اطاعت کے حاصل ہوئی۔

اگر سیدۃ عالم کی ذات کو اس حدیث کی زد سے الگ کرنا ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ خلافت مذہبی حیثیت سے درست نہ تھی۔ اسی طرح حضرت علیؑ کا صرف ایک دن کا توقف بھی قبولِ بیعت میں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اس کو صحیح خلافت نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ موت کے اندیشہ سے کوئی بشر کسی وقت غالی نہیں ہے اور ایک اہم جائزگی اطاعت سے انحراف کی صورت میں موت بہر حال موت جاہلیت ہوتی ہے وہ گیا حضرت علیؑ کا ان حضرات کے مشوروں میں شریک ہونا۔ ان کو صحیح رائے بتلانا اور ان کی موقع بہ موقع رہنمائی کرنا، یہی تو حقیقت دلیل ہے حضرت علیؑ کی اس طہارتِ ضمیر اور سہروردی اسلامی کی جو آپ کو حقیقی جانشین رسولؐ و محافظ اسلام کہتے پر مجبور کرتی ہے۔

جبکہ حالات کی بنا پر رسولؐ کے اس حکم سے انحراف ہو گیا جو آپ نے خلافتِ علیؑ کے اعلان کی صورت میں دیا تھا اور لوگوں نے اس فرض کی انجام دہی سے عدول کیا تو اب اگر کوئی خود غرض اپرت طبیعت اور چھوٹے نفس کا انسان ہوتا تو اس کے بعد بدل ہو کر اسلام اور مسلمین کی خدمت سے بالکل جدا اور بقول مدیر نگار کٹ کر ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو جاتا لیکن اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا کہ اس شخص کی قایم خدمات اور اسلام کے ساتھ سہروریاں صرف حصولِ خلافت کی امید میں تھیں۔

نیز اگر مسلمانوں نے کسی ایک حکم مذہبی کی مخالفت کی تو اس کا یہ اثر تو نہیں ہونا چاہیے کہ اب اسلام کے دوسرے احکام کو بھی بدل جانے دیا جائے یا خود مذہب اسلام کے صدات کو گوارا کر لیا جائے۔

حضرت علیؑ کے مشورے ہمیشہ ہی دو نوعیتیں رکھتے تھے۔ ایک جب کبھی کوئی مسئلہ شرعی پیش ہوا اور دربارِ خلافت سے حکم خداوندی کے خلاف فیصلہ ہونے لگا اس وقت موقع ملا تو علیؑ نے اصلاح کی اور دوسرے یہ کہ مفادِ اسلامی کو کسی جنگ یا دوسری طرح کی دشواری میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو آپؑ نے صحیح مشورہ دیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حفاظتِ اسلام اور رعایتِ مذہب کی ذمہ داریاں آپؑ کے ساتھ وابستہ تھیں جنہیں آپؑ کسی نہ کسی طرح انجام دیتے تھے اور یہی وہ حقیقی خلافت و امامت ہے جو ان کے لیے محفوظ تھی۔ اور جس کے فرائض وہ کسی نہ کسی پردہ میں ادا ضرور کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہری خلافت یعنی منہ حکومت پر دوسرے افراد نے قبضہ بھی کر لیا ہو۔

حضرت رسولؐ کا سلوک منافقین کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو ان کے آپؐ کی حکم عدولی کرتے رہتے تھے صاف اسی رویہ کا منظر ہے۔

آپؐ نے باوجود ان کے مخالفانہ حالات کے کبھی ان سے ترکِ موالات نہیں کیا۔ اور ہمیشہ اصلاح کی کوشش فرماتے رہے۔ اسی طرح جانشینِ رسولؐ حضرت علیؑ۔

اس میں کیا کوئی شبہ ہے کہ منافقین کی زندگی کا تمام دورِ معروض الہی ہے جس سے نہ خدا غمخوار ہو سکتا ہے نہ اس کا رسولؐ۔ پھر کیا ہجرت کا اظہار کیا جاسکتا ہے اس امر پر کہ حضرت رسولؐ نے اپنی عمر کا کثیر حصہ ان غیر اسلامی افراد کے ساتھ بسر کیا۔

یقیناً اگر رسولؐ کا منافقین کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور اسلامی سلوک کرنا ان کے نفاق کی تائید نہیں ہے جبکہ آیاتِ قرآنی ان کو ان کے نفاق پر تنبیہ کرتی رہتی تھیں۔ تو اسی طرح حضرت علیؑ کا تعلقاتِ معاشرت قائم رکھنا ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے مسئلہ خلافت میں رسولؐ کی مخالفت کی ان کے اس اقدام کی تائید نہیں قرار پاسکتی جبکہ آپؐ نے اس پر احتجاج کیا اور اظہارِ اختلاف کر دیا۔ اور جس طرح ان

کے ساتھ حُرَن سلوک اور نیک برتاؤ اُن کو آخرت میں رستگار و نیک کردار بنانے کا ضامن نہیں ہے اسی طرح اُن اشخاص کے ساتھ حضرت علیؑ کا یہ حُرَن سلوک ان کے نجات اُخروی اور دنیوی کو داری کا ہرگز ثبوت نہیں ہے۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس دور میں اصل خلافتِ اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکم خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدودِ علمی کے اندر بہت حد تک ظواہرِ اسلامی محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اور پابندیِ شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یعنی شریعتِ اسلام اور احکامِ خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا۔ محرمات و کبائر کی تنقین نہیں تھی۔ بلکہ ان کے اوپر حدود کا اجرا کیا جاتا تھا اور بغیر کسی تاویل و توجہیہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقتِ اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن بہر حال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی عمر ختم ہی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے علیؑ ایسے محافظِ اسلام نے تلوارِ پیام میں رکھی اور ۲۵ برس کی طویل مدت اپنے حقوق کی پامالی اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گزاری اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہیں کی۔ نفسیاتی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے یہ بات کہ ایک بہادر اور شیر دل انسان جس کی عمر بچپن سے لے کر جوانی اور بھرپور جوانی تک برابر میدانِ جنگ میں گزاری جس کی تلوار سے برابر خون میلتا رہا اور جس نے سینکڑوں آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اسی کے ساتھ جس نے کبھی شکست نہیں کھائی بلکہ ہمیشہ فتح پائی۔ وہ ایک مرتبہ بھی برس تک آنا خاموشی پسند ہو جاتا کہ کوئی ادنیٰ اسے ادنیٰ تحریک اس کی جانب سے عمل میں نہیں آتی اور کسی جنگجو یا نہ روئیہ کا اظہار اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ علیؑ ایک جذباتی انسان نہیں تھے، انہوں نے خون کے دریا بہا دیے۔ مگر بخشش غیظ و غضب کی بنا پر نہیں بلکہ فرض کا احساس کر کے اور

سکوت اختیار کیا تو کمزوری سے نہیں بلکہ مصلحت کا احساس کر کے۔
انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ ہی اسلام جس کی حفاظت اس وقت تلوار کھینچ کر کی جا رہی تھی اسی کی حفاظت اس وقت تلوار کو نیام میں رکھتے پر موقوف ہے اس لیے آپ نے اسلام کی موجودہ ظاہری صورت کی بقا کو غنیمت سمجھا اور فوج کشی و شمشیر زنی سے پرہیز کیا۔

بے شک جب یہ خلافت بنو امیہ تک پہنچی اب اسلام کے ظاہری شعار بھی ملتے جا رہے تھے۔ اب احکام مذہبی کے مقابلہ میں کھلم کھلا مخالفت ہو رہی تھی۔ اب شریعت کے مقابلہ میں صاف بغاوت کا اعلان تھا۔ اس لیے ان ہی علی کے فرزند حسینؑ نے کربلا کے معرکہ کو برپا کر کے دنیا کو دکھلادیا کہ اسی اسلام کی حفاظت کے لیے جس طرح ایک وقت میں فاطمہ شان سے جنگ کی جا سکتی ہے جس طرح ایک وقت میں مظلومانہ شان سے سکوت کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک وقت میں مقہورانہ اور بیکسانہ شان سے قتل بھی ہوتا جا سکتا ہے۔

البتہ حضرت علیؑ نے ابتدائی دور میں جنگ مناسب نہیں سمجھی لیکن آپ نے اپنے حق خلافت کے اظہار سے بھی کبھی حشیم پوشی نہیں کی نیز کسی دوسرے کے انعتاد خلافت کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی۔ یہاں تک کہ تیسرے دور میں جب مجلس شوریٰ کے اندر آپ کو بھی ایک رکن قرار دیا تو آپ نے خاموشی کے ساتھ ووٹ بحق حضرت عثمان نہیں دیا۔ بلکہ پورے شد و مد کے ساتھ اپنے حق خلافت کو مزید ثابت کیا۔ اور وہ تاریخی خطبہ پڑھا جو دنیا کے تاریخ میں یادگار رہے گا جس میں تمام احادیث فضاہل کو بھی ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اور غدیر نیز دوسرے موقعوں کے صریحی اعلانات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور جب جناب عبدالرحمن بن عوف نے یہ سیاسی چال چلی کہ جو شخص اپنے تئیں خلافت سے علیحدہ کر لے وہ حکم ہو جائے تو حضرت علیؑ

نے فیصلہ اپنے خلافت ہو جانا گوارا کیا۔ جو صورتِ حال کی بنا پر پہلے سے یقینی تھا لیکن خود اپنے تئیں خلافت سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کو جہاں تک کے پُر اس طریقہ سے ہو سکتا تھا برابر پورا کرتے رہے اور مسلمانوں کی گمراہی کے اسباب میں خود عملی طور پر شریک نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ خلفاء کے ساتھ حقیقتاً اتحاد رکھتے تھے اور آپ کو کوئی ناگواری اُن حضرات کی خلافت سے نہ تھی۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ بہادر جرنیل جو ابتدائے بعثت سے لے کر رسولؐ کے آخر عمر تک برابر ہر لڑائی میں علمدار یا سپہ سالار رہا ہو جس نے کبھی شکست کی صورت نہ دیکھی ہو جس کی شجاعت کا بہادرانِ عرب کے دل پر سکھ ہو، رسولؐ کے بعد اتنی لڑائیاں ہو جائیں روم و شام کے ممالک فتح ہوں، ایران و عراق پر اسلامی فوج کشی ہو اور قبائل سے اسلامی جہاد، مگر وہی بہادر ہاں وہی جرنیل اس پوری طویل مدت میں کسی ایک لڑائی میں بھی شرکت نہ کرے، بالکل علیحدہ رہے اور ایسا معلوم ہو کہ اس کے بازوؤں کی طاقت سلب ہو گئی، اس کے دل کی مہبت جاتی رہی اور اس کی تلوار کند ہو گئی۔

فوجوں کی سپہ سالاری سے نئے نئے جرنیلوں کے سپرد ہو۔ خالد بن الولیدؓ، سعید بن العاصؓ، قحطانیؓ، وایران مشہور ہوں مگر علیؓ کا کہیں نام نظر نہ آئے۔ بے شک کسی خاص موقع پر جب کوئی ایسی ہی ضرورت پیش آئے اور درباخلافت کی طرف سے مشورہ کے لیے بلائے جائیں تو چلے جائیں اور اس وقت صحیح مشورہ دیدیں یہ رزم کا تذکرہ تھا اور جہاد کا مرحلہ، اب علمی کارنامہ کا حال سنو کہ قرآن کے جمع و تالیف ایسی اہم خدمت جس پر مسلمانوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کا انحصار اور علیؓ کی ایسی ذات جس کے متعلق حضرت رسولؐ نے ارشاد کیا ہو: ”انما مدینۃ العلم وعلیؓ بابہا“

اور خاص طور سے علم القرآن کی یہ فرما کر گواہی دی ہو کہ :-

”علیٰ مع القرآن والقرآن مع علی“ اور ”لمن یفتقر احقی یردا علیٰ المحض“ کے الفاظ میں بھی قرآن اور اہل بیتؑ کی دائمی معیت کا ثبوت دیا ہو اور خود علیؑ کا یہ دعویٰ رہا ہو کہ :- سلونی عن کل ایۃ من کتاب اللہ عز و جل“ مجھ سے قرآن کی ہر آیت کے بارے میں سوال کر لو“ لیکن جب قرآن کی جمع و تالیف کا مرحلہ پیش آئے تو زید بن ثابت کے خدمات حاصل کیے جائیں مسجد کے دروازہ پر آدمی بٹھائے جائیں اور ایک ایک سے قرآن کی آیتوں کے متعلق سوال کیا جائے اور دو دو آدمیوں کی گواہی پر آیتیں درج کی جائیں اور بعض آیتیں بڑی جستجو کے بعد کسی ایک صحابی کے پاس دستیاب ہوں اور اسی کے اعتماد پر لکھی جائیں مگر علیؑ کو اس خدمت میں شریک نہ کیا جائے اور ان کا نام تک نظر نہ آئے کہ وہ بھی اس اہم کام میں کوئی دخل رکھتے تھے۔

کیا اس کے بعد یہ دعویٰ قرین قیاس ہے کہ علیؑ اور خلفاء میں اتحاد تھا اور کسی طرح کی کوئی رنجش درمیان میں نہ تھی؟ یا یہ کہنا درست ہے کہ اگر حضرت علیؑ اس خلافت کو جائز تصور نہ کرتے تھے تو آپؐ کٹ کر علیحدہ ہو جاتے؟

اس کے بعد اگر یہ نظر آئے کہ جب کبھی علیؑ کو مشورہ کے لیے بلایا گیا تو آپؐ نے مشورہ سے عذر نہیں کیا اور مشورہ وہی دیا جو حقیقتاً آپؐ کے نزدیک صحیح تھا تو اسے صرف علیؑ کی بلند نفسی اور عالیٰ طر فی سمجھنا چاہیے۔ امانت و دیانت سمجھنا چاہیے۔ بے لوثی اور اسلامی ہندردی سمجھنا چاہیے اور یہی وہ بلند اخلاقی معیار ہے جو رسولؐ کے بعد علیؑ کو بلند ترین سطح کا نشان ثابت کرتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ آپؐ نے مذہبی حیثیت سے خلفاء کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور آپؐ کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔

پانچواں سوال

اسلام نے ہئیتِ اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لیے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟
اس سوال کے متعلق جناب مدیر نگار کی رائے جس پر اس سوال کی بنیاد قائم ہے حسب ذیل ہے:-

”اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور سلسلہ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس لیے رسول اللہؐ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔“

یہ حقیقتاً وہ ایک ہمہ گیر خیال ہے جو اس وقت فی سدی ننانوے مسلمانوں کے دماغ میں مضمر ہے یہاں تک کہ بہت سے افراد شیعہ بھی دانستہ و نادانستہ اس کے ساتھ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ عراق و ایران کا فقہ ”مشرطہ دستبہ“ اسی ایک خیال میں کشمکش کا نتیجہ تھا۔

اور اس لیے مسلمانوں کی جماعت متعجب ہوگی اگر میں اس کے خلاف اظہارِ خیال کروں لیکن کیا کروں کہ کلامِ پاک اور نیز درایتِ اسلامی کی رز سے میری سمجھ میں اس کے خلاف ہی آتا ہے۔

جیسا کہ جناب نیانے متعدد بار تحریر فرمایا ہے اور حقیقت ثابتہ بھی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو حیثیتیں حاصل تھیں، ایک حیثیت معلمِ روحانی ہونے کی اور دوسری حیثیت حاکم و متصرف ہونے کی۔ نگار کے الفاظ میں پہلی حیثیت مذہبی ہے اور دوسری سیاسی۔

پہلی حیثیت کے متعلق خیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ براہ راست الہامی چیز ہے اس لیے اس کا تعلق خدا سے ہونا چاہیے لیکن دوسری حیثیت کے لحاظ سے تو پیغمبر اکینہ بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے جو سیاسی حیثیت سے نافذ الحکم ہو۔

اگر اسلام میں حکومت کی بنیاد بہر صورت جمہوریت ہی پر ہوتی تو آخر خود رسولؐ کا انتخاب بحیثیت حاکم و متصرف کے کس انتخاب عام اور افراد جامعہ کے عمومی اختیار و قرار داد سے ہونا تھا۔ اور جب رسولؐ کی خود مختارانہ بادشاہت میں افراد امت کا کوئی دسترس نہیں ہے تو رسولؐ اگر اپنے بعد کے لیے بحیثیت خلیفہ نبیائین کسی شخص کو حاکم و متصرف قرار دے جائیں تو اس میں جمہور کو مداخلت کا کیا حق ہوگا اور یہ کتنا کمال صحیح ہوگا کہ یہ اسلام کی روح جمہوریت کے خلاف ہے۔

میرے خیال میں ”روح جمہوریت“ جسے عام لوگ جمہوریت کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ تو اسی وقت رخصت ہو گئی جب پیغمبرؐ کا انتخاب خدا کی جانب سے ہوا اور عام افراد کو اس رائے دہندگی کا حق نہیں دیا گیا۔

احکام و تجویزات پیغمبرؐ کے مقابلہ میں عام افراد کا سلب حقوق اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ صاف صاف اعلان کر دیا: ”ماکان المؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امران یكون لہم الخیرۃ من امرہم“ (یعنی) ”ہرگز مسلمانوں میں کسی شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ جب خدا اور رسولؐ کوئی بات طے کر دیں تو انہیں کوئی اختیار باقی رہے اپنے امر میں“

بلکہ اسلام نے رسولؐ کے لیے اتنی بڑی مکمل ڈکٹیٹر شپ قرار دی ہے جس کی نظیر دنیا میں لانا مشکل ہے اس طرح کہ ”النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم“ (یعنی) ”نبیؐ کو تمام مؤمنین پر خود ان کے نفوس سے زائد اختیار ہے“ اور جب غدیر کے واقعہ پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ نے اپنی

۳۰۳

اس مستقل حاکمانہ حیثیت (مکمل ڈکٹیٹر شپ) کا حوالہ دیتے ہوئے اور سب سے
اس کا اقرار لیتے ہوئے خود اپنے اختیارات امتیازی سے بالکل اپنی ہی حیثیت اپنے
ہی اختیار و اقتدار کو اپنے بعد علی کو تفویض کیا۔ یہ کہہ کر کہ: ”من کنت مولاه
فہذا اعلیٰ مولاه“

اس کے بعد یہ کہنا کہاں صحیح ہے کہ اسلام روح جمہوریت کا حامی ہے اور اس
لیے کسی کو نامزد کرنا روح اسلامی کے خلاف ہے۔

”جمہوریت“ یقیناً خوش آئند مفہوم ہے لیکن اس کا اصلی مفاد یہ ہے کہ تمام افراد
جامعہ کے حقوق یکساں حیثیت سے محفوظ رہیں اس میں تغلب و تصرف کا اندیشہ
نہ ہو۔ یہ اس ”جمہوریت“ سے جس کی تشکیل دنیا میں ہوا کرتی ہے غیر ممکن ہے۔

جب تک اہل دنیا میں دو طبقے ہیں عوام و خواص اور عوام کی اکثریت ذاتی رائے
نہ رکھنے والی بلکہ ”بیٹریا دھسان“ صورت سے ہر پکارنے والے کی آواز پر نا کجھی
سے جلی جلنے والی اور خواص کی اکثریت بندہ ہوا دہوس ہونے کی جہت سے اغراض
شخصیہ کا پیلا اور ذاتی جاہ طلبی و اقتدار پسندی کا مجسمہ ہے۔ اس وقت تک صحیح
جمہوریت کا دنیا میں وجود ہو ہی نہیں سکتا اور جسے ”جمہوریت“ کہا جاتا ہے وہ ایک سخت
”زین“ ”مغویانہ“ ”استیادہ“ جسے ”جمہوریت“ کے نام سے مجبوری بھالی جمہور کے سر
خواہ خواہ منڈھا جاتا ہے اور اس دھوکے کی ٹیٹی میں اغراض نفسانیہ کا شکار کھیلنا
جاتا ہے۔

بے شک مفاد ”جمہوریت“ کے حاصل ہونے کے لیے ایک اطمینان بخش
صورت ہے یہ کہ نمائندہ خداوندی جس کے بارے میں یہ حقیقت مسلم ہو چکی ہے
کہ وہ بنیاداری و رعایت اور دوسرے لفظوں میں ضمیر کی خرابیوں سے پاک و منزوع یعنی
بالکل معصوم ہے خود اپنے صوابدید سے کسی شخص کو مصالح عامہ کا ذمہ دار بنایا جائے۔

اس طرح یقیناً تمام افراد کو سمجھ لینا پڑے گا کہ اب کسی کے ساتھ ظلم و تشدد، جبر و استبداد نہ ہوگا اور سب یکساں طور پر حریت کی ہوا میں سانس لیں گے اور مساوات کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

اس نکتہ کو کافی تفصیل کے ساتھ جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ ”وجودِ حجت“ میں اپنے خاص اندازِ تحریر میں لکھا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے:—

”امام اور بالفاظِ دیگر حافظِ شریعت کا تقرر اگر باہمی نجات اور انتقام، خود اختیاری و کثرتِ آراء کی بنا پر ہو تو اس حافظ و نگہبان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ خود شریعت کے بارے میں اکثریت جس طریقہ پر جائے گی وہی حق سمجھا جائے گا۔ اگرچہ وہ شریعت کی تبدیل و تحریف اور اس کی تراش و تراش ہی کیوں نہ ہو اور اگر نظامِ شریعت پر عمل درآمد کے بارے میں اکثریت سے غلطی کا احتمال ہے تو حافظِ شریعت کے انتخاب میں اس غلطی کا امکان زیادہ ہے۔ ملکی و ملی عملوں کے انتخابات اور ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور ہر شخص ان سے واقف ہے۔

بے جا رونا و غایت، بجا بنداری، بے انصافی، تعارضاتِ مردت اور آپس کے تعلقات، موجودہ منافع اور آئندہ کے توقعات، جھوٹے مواعید کا فریب اور بے حقیقت طفلِ تسلیاں، ذاتی نفوذ و اقتدار اور حکام کی بارگاہ میں بے حقیقت، اثر و رسوخ، ظاہری تزک و احتشام اور ملمع کار و جاہلت و اعزاز دہ چیزیں وہ ہیں جو اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دینے کے کامیاب ترین ذرائع ہیں اور اکثریتوں کی تشکیلات اکثر و بیشتر ان ہی بنیادوں پر ہوتی ہے۔

امامت کسی محدود جماعت یا مخصوص قریہ، شہر یا صوبہ کی حکومت و سلطنت نہیں ہے بلکہ وہ تمام امت کی صلحت و انتظام کی ذمہ دار ہے اور جہاں جہاں تک کسی شریعت کا دامن وسیع ہو امامت کو وسعت حاصل ہوگی۔ وہ ایسا منصب ہے جس کے سبب سے یتیم بچے، یموہ، کمزور اور مظلوم، غنی، فقیر، قوی، ضعیف، سب کو برابر فائدہ پہنچے اور عالم میں بشری نظامِ خدائی فشار کے مطابق پورے طور پر درست ہو، اگر امامت ایک ایسے شخص کے سپرد کر دی گئی ہو خود خواہشات نفس کا پابند ہے تو اس سے خود دوسروں پر ظلم و ستم کا اندیشہ ہے چہ جائیکہ اس کے ذریعہ ظالم مظلوم میں پورے طور سے انصاف کا فرض انجام پائے۔

بلکہ یہ عرض اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب اس کا تقوا اس علم الغیوب سستی کے سپرد کر دیا جائے جو مبنی نوع بشر کے باطنی رموز و نیات سے پورے طور پر واقف ہے اس سے بڑھ کر مصالح عامہ کا لحاظ کیونکر ہو سکتا ہے۔

درحقیقت یہ اصول کہ امامت کے انتخاب کو رسول کے واسطے سے حضرت باری تعالیٰ عزائمہ تک منتہی ہونا چاہیے۔ مکمل طور سے جمہوریت و مساوات پر مبنی ہے۔ درحقیقت حاضر و مستقبل میں بشری مصالح کی تجدداشت اور تمام طبقات بشر کے مساوی طور پر حقوق کی حفاظت جو الہی انصاف و عدل و حکمت کی روشنی میں انجام پائے۔ اور جس میں دھوکے، دھڑکی، مکر و فریب، تعصب و استبداد، حق تلفی و ناحق کوشی، اہل حق و عقد اور امت کے نمائندوں میں اہل تدلیس و نفاق کے مداخلہ اور آزادی رائے کے نام سے کمزور افراد کے اختیارات

سلب کرنے اور جبر و قسر سے ان کی زبان بند کرنے کا امکان نہ ہو، اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی۔“

یہ اس مسئلہ کا تصفیہ کن پہلو ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چھٹا سوال

ہردو فرقہ کے روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں؟ — اگر پڑا تو کیا؟
 اس سوال کے جواب میں اگر واقعات سے استناد کیا جائے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سیاسی ماحول کا جہاں تک اثر پڑا ہے وہ خلافت جناب امیرؒ کے روایات کے مضر پہلو سے تعلق رکھتا ہے یعنی اہل سنت کے وہ روایات جن سے دوسرے خلفاء کی افضلیت ظاہر ہوتی ہے یا جن سے خلافت جناب امیرؒ یا آپؐ کی افضلیت کے روایات کا معارضہ کیا جاتا ہے ان میں بہت زیادہ سیاسی اثرات کار فرما ہیں اور اسی لیے اس کی تائید فرقہ شیعہ کے روایات سے باطل نہیں ہوتی، لیکن فرقہ شیعہ کے روایات جن کی تائید خود اہل سنت کے روایات میں بھی موجود ہے ان میں کسی سیاسی ماحول کا اثر پڑنا حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔
 بلکہ سیاسی ماحول تو ان روایات کے بالکل مخفی اور نسیا نسیا ہو جانے کا متقاضی تھا جس کے بعد میں نو سن کی طاقت کا ایک حیرت انگیز معجزہ سمجھتا ہوں کہ یہ فضائل باقی رہے اور اتنے نمایاں طریقے سے کہ باوجود انتہائی کوششوں کے ان کے مقابل روایات فضیلت ان کے برابر کیا عشرہ عشر بھی نہیں ہیں۔

اس سوال کے جواب میں اس سے زیادہ لکھنے کا اب قلم کو حوصلہ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہی تو پھر دیکھا جائے گا۔

والسلام

۳۰۷

قیامِ امامت کی ضرورت
امامت کے بارہویں امام پر ختم ہو جانیکا سبب
اور
امام موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ

نشتہ

عالیجناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قیلہ مدظلہ

jabir.abbas@yahoo.com

قیامِ امامت کی ضرورتؑ

امامت کے بارہویں امام پر ختم ہو جانے کا سبب

اور

امام موعودؑ کے وجود و ظہور کی عقلی توجہ

رسالہ نگار میں جو ملک کے مشہور جدت پسند ادیب جناب نیاز فتحپوری کی ادارت میں شائع ہوتا ہے وہ برس سے مسئلہ خلافت و امامت پر ایک عجیب سلسلہ جاری ہے۔

جناب نیاز کے خیالات مذہبیات کے شعبہ میں ہمیشہ دلچسپی کا مرکز رہے ہیں اور ایک زمانہ ہوا جب ”معجزات حضرت عیسیٰ“ کے بارے میں مجھے بھی موصوف سے دو دو باتیں کرنا پڑی ہیں۔

حیرت ہے کہ جو شخص مذہب کی ضرورت ہی کا قائل نہ ہو اور ملائکہ و جنت و نار سب کا منکر ہو۔ وہ مسئلہ امامت کے ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کرے اور اپنے رسالہ کے صفحات کو اس سلسلہ کے بڑے بڑے بسیط معنایں کے لیے وقف کر دے۔ یہ راز بالکل سرسبہ ہے اور ہر حال ”امور مملکت خویش خسرواں دانند“ کے مطابق

سہ اسد قائم زیر ۱۳۵۵ھ

کسی شخص کو کس میں دخل در معقولات کی ضرورت بھی نہیں۔

ماسچ ۱۹۷۶ء کے پرچہ میں موصوت نے 'خلافت و امامت' سے متعلق گیارہ سوالات شائع کیے ہیں جن کے جواب کے لیے آپ نے ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دی ہے۔

جو لوگ ڈاکٹر امجد کا رکی مذہب اسلام کے ساتھ دلچسپی سے قریب خمدہ ہو کر ان کے سامنے تبلیغ و دعوت کے فرائض ادا کرنے اور اس سلسلہ میں اپنے وقت و سرمایہ کے صرف کرنے کو ضروری سمجھے ہوں، انھیں مدیر نگار کے اس اعلان پر بھی لبیک کہنا فرص ہے۔ چاہے نتیجہ میں جس طرح ڈاکٹر امجد کا رکی اعلان دعوت کی نوعیت ایک سیاسی شعبہ بازی سے بڑھ کر نہ نکلی اسی طرح مدیر نگار کی جانب سے بھی نتیجہ ملاوٹی ہی ہوا کوئی فائدہ نہ نکلے۔

بہر حال نگار میں یہ سلسلہ جاری ہے اور نگار کی شطرنجی بساط بحث کے مہرے جن میں اکثر اب تک نقاب پوش ہیں وہ اس کے صفحات پر اپنی ہاں دکھائیں ہی گئے۔ جس سے مجھے کوئی بحث نہیں ہے۔ لیکن نگار کے شائع کردہ سوالات میں سے چند سوالات کا تعلق چونکہ حضرت امام ثانی عسکری علیہ السلام کے ساتھ ہے لہذا اس کے کالموں میں چاہتا ہوں ان سوالات کو حل کر دوں جس سے مجھے مدیر نگار کو کوئی اطمینان دلانا نہیں ہے بلکہ نفس حقیقت کا انکشاف منظور ہے۔

قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت

میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے

یہ سوال ہے جس کے پہلے جنو کے متعلق میں اپنے رسالہ "وجود و حجت" میں کافی

تذکرہ کر چکا ہوں، میں نے لکھا ہے کہ "افراد نوح" کی تلوّق مزاجی اور خواہش پرستی اس امر کی ذمہ دار نہیں ہے کہ ایک مرتبہ صحیح تعلیمات حاصل کرنے کے بعد وہ پورے ثبات استقامت کے ساتھ ان کو باقی رکھیں، ورنہ کسی ایک نبی کے مبعوث ہونے کے بعد پھر دنیا کو کسی نبی کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس صورت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مبعوث ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

قانون قدرت بدل نہیں سکتا۔ نظام طبیعت پلٹنے کا نہیں، اہم سابقہ کی تاریخ کا مطالعہ کرو، اقوام عالم کے طبائع و انقلاب پر نظر ڈالو۔ صاحب شریعت رسولوں کے علاوہ ایک ہی شریعت کی تجدید کے لیے متواتر انبیاء کی بعثت کے فلسفہ میں تعمق کرو۔ کس طرح ایک نبی کی ہدایت کا نقش تازہ رکھنے کے لیے برابر اس شریعت کی تعلیم کے لیے انبیاء کی بعثت ہوتی تھی اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا تھا جب تک کہ مصالح نوعی میں تغیر نہ ہو اور نظام ارتقا و تجدّد کی بنا پر ایک دوسرا رسول نئی شریعت کے ساتھ مبعوث نہ کیا جائے۔ اسی طرح زمانہ کا کوئی دور کسی آدمی اور رہنمائے حقیقی اور معلم ربانی کے وجود سے خالی نہیں رہا ہے۔ "وان من امت الا خلا فیہا نذیر" وکل قوم ہادیہ "یونہی خدا کی حجت ہر زمانہ کے لوگوں پر تمام ہوتی تھی کہ جو ارسال رسل اور بعثت انبیاء کا اصل مقصد ہے۔"

لعلّا یکون للناس علی اللہ حجتہ بلعد الرّسل" اور یہی سنت اللہ سابق زمانہ کی امتوں پر برابر قائم تھی۔ "لئن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا"

یہ ان انبیاء کا تذکرہ ہے جن کی شریعتیں مقیدہ اور جن کی نبوت محدود زمانہ کے ساتھ محدود تھی۔ آسان تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ دوسرے نبی کا مبعوث ہو کر اسی کی شریعت کے نقش کو از سر نو تازہ کر دینا اور دوسری شریعت کے ذریعہ سے نوح

بشر کی ہدایت کا اچلے ثانیہ ہونا، لیکن ان شریعتوں میں بھی ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کے آنے تک اس پہلی شریعت کی حفاظت و صیانت اور تعلیم و تلقین کے لیے رہنمایانِ خصوصی خدا کی جانب سے موجود رہتے تھے۔ پھر وہ نبوت جو صحیفۂ انبیاء کے لیے ہر اختتام ہوا اور جس کی خاتمیت کا اعلان ”ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین“ اور ”لانی بعدی“ کے صاف و تصریح الفاظ میں ہو چکا ہو جس کی انتہا انتہا۔ دورِ فلک کی ہم عنال اور جس کا امتداد، امتدادِ عمر دنیا کا ہم نفس ہو۔ یعنی اس نبی کی نبوت جس کے بعد کوئی نبی اور جس رسول کے بعد کوئی رسول آنے والا نہ ہو، اس نبی و رسول کے انتقال پر اس کی شریعت کے لیے کیا حفاظت کی ضرورت نہیں ہے جو اس شریعت کی نگہداری کرے اور افراتِ خلق کو اس کے احکام کی جانب صحیح رہنمائی کر سکے اسی کا نام امام ہے اور وہی جانشین رسول اور خلیفہ النبی کے جاننے کا مستحق ہے۔

کیا ایسے امام کو ہر زمانہ میں موجود رہنا چاہیے؟ بے شک موجود رہنا چاہیے اس لیے کہ ضرورت اس کی ہر زمانہ میں موجود ہے۔ شریعت اسلام اگر کسی خاص جزو زمانہ سے محدود ہوتی تو حفاظتِ شریعت کا وجود بھی اس خاص جزو کے ساتھ مخصوص ہوتا، لیکن جبکہ شریعت کا دائرہ وسیع اور آخری حدودِ دنیا تک پہنچا ہوا ہے تو اس کی حفاظت کا سامان بھی آخر تک ہونا ضروری ہے۔

بے شک حفاظتِ ملت و رہنمائی امت کا فرض ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہری طور سے جس کی نشت پر حکومت کا اقتدار اور سلطنت کا جہاد و جلال موجود ہو، اور دوسرے مخفی صورت پر جس میں کارِ ہدایت پردہ کے اندر انجام دیا جائے۔

پہلی صورت یقیناً مقصد کے حصول میں پورے طور پر کامیابی کا واحد ذریعہ ہے

لیکن جب عام افراد کا جذبہ اقتدار پسندی اس غرض کے حصول میں سدراہ ہو جائے، تو قدرتاً امام کا فرض دوسرے جزو کی طرف منتقل اور فرضیہ ہدایت کا پردہ کے اندر ادا ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔

اب رہا دوسرا جزو کہ صرف اہل بیت میں اس کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟ نہیں، بالکل ضروری نہیں ہے، یعنی امامت کے شرائط عقلیہ میں ہرگز نہیں ہے کہ وہ اہل بیت ہی میں ہو، اس کے شرائط جو ہیں وہ افضلیت، عصمت اور مخصوص من اللہ ہونا ہے۔ یہ خصوصیات اگر اہل بیت کے علاوہ کسی فرد میں پائے جائیں تو یقیناً وہ امامت کا مستحق ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خصوصیات صرف اہل بیت کے ان مخصوص افراد میں پائے جاتے ہیں جس کی امامت کا شیعہ اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ ان کا موجود ہونا کیسا دنیا میں اس کا کوئی مدعی بھی نہیں ہے۔

یہی ہستیاں وہ ہیں جن کے بارے میں حضرت رسولؐ نے نام بنام اپنی جانشینی و خلافت کے متعلق نص فرمائی اور ان کو امامت کے لیے نامزد فرمایا اور یہیں سے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ:-

کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات باخبر تھے؟ اگر تھے تو کیوں؟

کیونکہ مدیر نگہار نے اپنے محاکمہ میں جو نتائج نکالے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:-
’چونکہ رسول اللہؐ عالم الغیب نہیں تھے اور مستقبل کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا اس لیے آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیت میں کون کس اہلیت کا پیدا ہوگا اور وہ مستحق امامت و خلافت ہوگا یا نہیں؟
اور اگر یہ کہا جائے کہ آل رسولؐ کا صلح و مکمل انسان ہونا حقائق ثابت

میں سے ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت بھی تمام سادات کو انہیں صفات سے متصف ہونا چاہیئے حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ موصوف نے اپنے محاکمہ میں مرتبہ نبوت کی توضیح کرتے ہوئے بھی یہ بحث کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام غیب نہیں رکھتے تھے اور اس کے ثبوت میں وہ آیتیں پیش کی ہیں جن میں رسول نے ذاتی طور پر اپنے نفس سے علم غیب کی نفی کی ہے۔ حالانکہ اسی قرآن میں یہ ہو چکا ”الا من ارتضى من رسول“ یعنی خدا اپنے رسولوں میں سے جس کو پسند کرتا ہے غیب کی باتوں کا علم عطا بھی فرماتا ہے اور یہ امر مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور حقیقت ثابتہ بھی ہے کہ تمام پیغمبروں میں ہمارے رسول اکرم کا مرتبہ سب سے بلند تھا اس لیے اگر کوئی اور نہ بھی ہو ”من ارتضى من رسول“ کا مصداق تو ہمارے پیغمبر ضرور تھے اس لیے نفی اگر ہوئی ہے تو بذات خود کلیتاً تمام غیب کی باتیں جاننے کی۔ لیکن خصوصی حیثیت سے جن امور کا علم خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو جائے ان کی اطلاع حاصل نہ رسول اللہ کے لیے بلاشبہ ثابت ہے۔

اگر تھے تو کیوں؟ اس لیے کہ ان کے معلومات ظاہری ذرائع تک محدود نہ تھے بلکہ ان کے علم کا بڑا ذریعہ تعلیم والقاے الہی تھا اور خود حضرت حق سبحانہ کے علم غیب ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ لہذا جس کو وہ علم عطا فرمائے اس کے عالم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ اب یہ کہنا کہ آپ کو کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ اہل بیت میں کون کس اہلیت کا پیدا ہو گا اور وہ مستحق امامت و خلافت ہو گا یا نہیں؟ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب خدا کو بھی نہ معلوم ہو سکے اور اگر خدا کو یہ معلوم ہو سکتا ہے تو بتعلیم الہی رسول کو بھی معلوم ہو سکے گا اور جب آپ نام بنام بتائیں گے کہ میرے بعد یہ اشخاص خلیفہ و امام ہوں گے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ خداوند عالم نے ان اشخاص کو نامزد کیا ہے اور اس نے رسول کی زبان سے اس کی تبلیغ کرائی ہے جس کے بعد ان کے منصوص من اللہ ہونے میں

کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے گا۔

امامت کے بارہویں امام پر ختم ہونے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

یہی کہ عظیم الہی میں صفاتِ امامت کا حامل ان چھٹیوں کے سوا کوئی اھذہ تھا، اور حضرت رسولؐ نے اپنی جانشینی کے لیے صرف بارہ ہی اشخاص کو نامزد کیا جن کے متعلق فرما بھی دیا کہ وہ قیامت تک باقی رہیں گے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے احادیث :-

۱۔ عبد اللہ بن مسعود کی روایت :- نیا بیع المودۃ مطبوعہ استامبول ص ۲۴۵

”عہد الینا نبینا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان یدیکون

بعده اثنا عشر خلیفۃ بعدد نقباء بنی اسرائیل“

ہمارے رسولؐ نے ہم سے یہ عہد و پیمان قرار دیا ہے کہ آپ کے بعد نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے موافق ۱۲ خلیفہ ہوں گے۔

۲۔ صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :-

”لا یزال الدین قائماً حتی تقوم الساعة ویکون علیہم اثنا عشر

خلیفۃ کلہم من قریش“ ہمیشہ دین قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آئے

اور تمام لوگوں کے خلیفہ بارہ ہونگے جو سب قریش کے ہونگے ”بنی“ کے قیامت تک قائم رہنے کی تمہید

سابقہ افرویش میں بارہ خلفاء ہونے کی خبر دینا صراط سے ہٹا ہے کہ وفات رسولؐ سے روز قیامت تک

کی مجموعی مقدار کہ جس میں دین کا قیام و بقا ہے پورے بارہ خلفاء پر منقسم ہے۔

سنن البدوۃ کی روایت :-

”لا یزال ہذا الدین عن یرا الی اثنی عشر خلیفۃ کلہم من

قریش“

لوگوں کا دین اس وقت تک جاری و نافذ رہے گا کہ جب تک بارہ خلفاء ان کے والی ہیں کہ جو سب قریش سے ہوں۔

”ان هذا الامر لا ينقضى حتى يمضى فيهم اثنا عشر خليفة
كلهم من قریش“

یہ امر دین منقضی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بارہ خلفاء نہ گزر جائیں جو سب کے سب قریش ہوں گے۔

ان احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ دین کا قیام و بقا ان خلفاء کے دم تک ہے اور حدیث میں تصریح ہے کہ دین کا قیام و بقا روز قیامت تک ہے اس سے صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ ان بارہ خلفاء کو وفات رسولؐ سے لے کر قیامت تک کی مدت میں موجود رہنا چاہیئے اگر ان احادیث کے مفاد پر غور کیا جائے تو یہ احادیث ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی خلافت کے سوا کسی اور پر منطبق ہی نہیں ہو سکتے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان ہی کے وجود تک شیرازہ عالم قائم ہے اور ان کے بعد قیامت آنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امام مستور یا مہدی موعود و ظہور کی عقلی توجہ

یہی اس کے لیے کافی ہے کہ ایک صادق و مصدق پیغمبر نے اس کی خبر دی اور عقلی حیثیت سے اس میں کوئی استحالة و اقعناع نہیں جو شخص اسے عقلی حیثیت سے غیر ممکن کہنا چاہتا ہو اسے دلیل پیش کرنا چاہیئے۔

یہ کہ ایک موجود ہستی آنکھوں سے ادھل کس طرح ہو سکتی ہے؟ بالکل قابل قبول نہیں جب کہ مذہب کی بنیاد ہی غیب کے اعتقاد پر ہے۔ یعنی جو کسی غائب چیز پر ایمان کو اپنے ذوق مشاہدہ کے لیے ننگ بھتا ہو اسے آخری نقطہ سے لے کر اقل تک تمام

حقائق مذہب کا انکار ضروری ہے۔ لہذا کم از کم ایک صاحبِ مذہب کو تو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ کسی حقیقت کا اس بنا پر انکار کرے کہ وہ آنکھوں سے غائب ہے۔

جبکہ وہ کارسازِ عالم کے وجود کا اقرار کرچکا اور وہ غائب ہے انبیاء کی صداقت کو تسلیم کرچکا اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں، روزِ محشر اور اس کے خصوصیات نیز جنت و دوزخ کا اقرار کرچکا حالانکہ وہ سب غائب ہیں، ملائک پر ایمان لاچکا اور وہ اس کی آنکھوں سے غائب ہیں۔ غرض قرآن مجید اور تعلیماتِ رسول کریمؐ کے تحت نہ معلوم کتنی باتوں پر اسے ایمان لانا پڑا جو اس کے مشاہدہ سے بلند ہیں۔ اتنی غیبی باتوں پر ایمان لانے کے بعد بھی کیا اس کا مونہہ ہے کہ وہ کسی عقیدہ سے اس لیے روگردانی کرے کہ وہ مشاہدہ سے خارج اور غیب پر مبنی ہے۔



مضمون سابق پر مدیر محترم نگار کا

ادارتی نوٹ

جنوری ۱۹۳۷ء

(نگار) مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق یہ بالکل پہلا مقالہ ہے جس میں "نقل" سے بہت کڑ "عقل" سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور جو عقائد اہل تشیع کی "روایتی سطح" پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے میں نے جو چند سوالات قائم کیے تھے ان سے مدعا یہی تھا کہ اس بحث کا علمی پہلو سامنے آجائے اور اسی لیے میں نے سب سے پہلے شیعہ علماء کو متوجہ کیا تھا کہ جب تک ان کی "درایت" کا صحیح علم نہ ہو جائے بحث و گفتگو کے مدد متعین نہیں ہو سکتے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ مقالہ شیعہ نقطہ نظر کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ اور اس سے زیادہ اگر کچھ لکھا جاسکتا ہے تو وہ اس کی "شرح و بسط" ہوگی۔ الغرض شیعہ جماعت کی طرف سے یہ چیز قطعی و آخری حجت کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔ اور اس کے "رد و قبول" پر فیصلہ کا انحصار ہے۔

میرا ارادہ ہوا تھا کہ اپنی رائے بھی ساتھ ہی ساتھ شائع کر دوں، لیکن چونکہ بدقسمتی سے میرا شمار ان لوگوں میں ہے جنہیں نہ تشیع سے کوئی واسطہ ہے نہ تسنن سے (اور اگر ہے تو دونوں سے یکساں) اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اہل تسنن کی رائے معلوم کیے بغیر (جو واقعی فریق ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں) اس مسئلہ پر کچھ لکھوں۔

بہر حال یہ مقالہ تمام علماء اہل سنت کے سامنے ہے اور نگار کے صفحات ان کے خیالات گرامی کے اظہار کے لیے کھلے ہوئے ہیں اگر انہوں نے توجہ کی تو یہ نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام اہل علم کے لیے باعث مسرت ہوگا، ورنہ بدرجہ مجبوری مجھ ہی کو وہ کچھ کہنا پڑیگا جس کا دوسرا نام دنیا نے "ناگفتہ بہ" رکھ چھوڑا ہے۔



تکرار طلب یا تقاضا

جنوری ۱۹۳۷ء
نگارِ فروری

سُنی علمائے کرام سے

جنوری ۱۹۳۷ء کے نگار میں جو مقالہ سلسلہ خلافت و امامت پر شائع ہوا ہے وہ شیعہ نقطہ نظر سے ایسا صاف دروِشن مقالہ ہے کہ اگر اس کو سامنے رکھ کر جواب دینے کی کوشش کی جائے تو بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس بحث کو میں نے جس پہلو سے اٹھایا ہے اور جس مخصوص انداز کے دلائل پیش کرنے کی پابندی میں نے عائد کی ہے اس نے گفتگو کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔

اب نتیجہ تک پہنچنے کے لیے صرف ایک منزل درمیان کی اور باقی رہ گئی ہے۔ یعنی یہ کہ سُنی علمائے کرام جنوری کے مضمون کو سامنے رکھ کر اپنی تحقیقات پیش کریں۔ میں خود اس وقت تک کچھ نہیں لکھنا چاہتا جب تک کہ فریقِ ثانی کو اظہارِ خیال کا موقع نہ دیا جائے۔ امید ہے کہ جن حضرات کو اس مقالہ کی موافقت یا مخالفت کرنا ہے وہ جلد تو جہر فرمائیں تاکہ جولائی تک مجھے بھی اظہارِ خیال کا موقع مل سکے۔



۳۲۱

مسئلہ خلافت و امامت

انسانیت اور اسلام کے نقطہ نظر سے

jabir.abbas@yahoo.com

نوشتہء عالیجناب

ابوسعید صاحب برمی

ایم۔ اے

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

الاساتیت اور اسلام کے نقطہ نظر سے



مذہب کے کسی اختلافی موضوع پر قلم اٹھانا بالعموم مفید ذقیعہ خیز نہیں ہوتا کیونکہ اس قسم کے مباحث پر نہ تو ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتا ہے اور نہ انھیں اس کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں مذہب انسانی معاشرت میں اس طرح دخل ہے کہ ایک انسان کو تبدیلی مذہب کے تصور سے بھی لرزہ آنے لگتا ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں مذہب کسی شخص کے انفرادی ایمان و ضمیر سے تعلق رکھتے والی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق مال، باپ، بیوی بچے، اعزہ و احباب نیز اس معاشرتی دائرہ سے ہے جس میں ایک آدمی زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر مذہب کا دائرہ اتنا تنگ اور محدود ہے کہ ایک دہائی اپنے عقائد و خیالات کو ایک جداگانہ اور مستقل مذہب کی نوعیت دیتا ہے (گو وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرے) اور اپنے مذہبی اقتیاز کو زیادہ سے زیادہ اُجھا کر کرنے کے لیے بہت سی جزوی اور فردی باتوں پر غلو برتنے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ نمازیں چلا کر آئین کئے کو فرض کا مرتبہ قرار دیتا ہے اور اپنے مخالفت عقائد رکھنے والوں کی ضد میں عام اخلاق انسانی کی اُن حدود کو بھی بچا دیتے ہیں کی کوشش کرتا ہے جن کو کسی حیثیت سے بھی معقول قرار نہیں دیا جاسکتا مثلاً عام انسانی اخلاق کب اس کا مقتضی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شخص کو گالی دیں، جڑا بھلا کہیں اس پر نہیں، اس کا مضحکہ اڑائیں، محض اس لیے کہ ہمارے اور اس کے مابین بعض باتوں میں رائے اور ضمیر کا ایسا اندازانہ اختلاف ہے لیکن ایک دہائی یا غیر متقلد اس کی

پردہ نہیں کرتا اور وہ آزادی کے ساتھ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی جیسے ائمہ کبار کو علانیہ موردِ طعن و تشنیع بنانے میں لطف و راحت محسوس کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان کا جہل و تعصب اس باب میں اور بھی بڑھا ہوا ہے، یہاں ہم ابھی اپنے مخصوص پیرو مرشد اور اپنے مخصوص مسجد و ملا کے جھگیلوں ہی سے آزاد نہیں رہے ہیں یہ جاسوسیہ مذہب کے اہم اختلافات پر عقل و دیانت کے ساتھ سکونِ قلب سے غور کر سکیں۔ پھر یہ چیز کچھ جہل ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دیوبند اور ندوہ کے فارغ التحصیل حضرات سے لے کر انگریزی یونیورسٹیوں کے سلی سڈیانتہ فضلا تک سب اسی جہل میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست جو ایم۔ اے کے آخری سال میں میرے شریکِ درس تھے صرف اتنی سی بات پر حد سے زیادہ برہم ہو گئے کہ میں نے اس بات کے ماننے میں تامل کیا تھا کہ کعبہ کی چھت کے اوپر سے کوئی پرندہ اڑ کر نہیں جاسکتا۔ گو وہ نہایت سنجیدہ فوجوان تھے۔ کلاس میں ان کا شمار ذہین طلباء میں ہوتا تھا۔ عام مطالعہ بھی ان کا اچھا تھا لیکن مذہبی دوا داری اور وسیع النظری کی وادی میں وہ اسی طرح کے کٹھن ملا تھے جس کے ایک ہاتھ میں مسجد کا بدھنا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں استنجے کا ڈھیلا۔

پھر میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی وسیع القلب اور وسیع الخيال انسان بستا ہی نہیں بلکہ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ ان کی تعداد آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ افسوس کیلئے صرف اس قسم کے مٹھی بھر افراد کے سامنے ”حقائق و معارف“ کے دفتر کھولنا عمومی نقطہ نظر سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ”امامت و خلافت“ پر میرا جو مضمون نگار جو لائی میں شائع ہوا تھا اس پر میرے ایک نہایت ہی مخلص شیعہ دوست نے جو ایم۔ اے میں میرے شریکِ درس بھی رہ چکے ہیں اپنی انتہائی وسیع النظری، وسیع القلبی اور تشنائی و دوا داری

کے باوجود مجھے خط میں لکھا تھا۔ ”ابہ فریبی کے اعتبار سے آپ کا مضمون بہت کامیاب ہے“ اور اس لیے میں اس مقالہ میں کتنی ہی دیانت و ایمان داری کے ساتھ بحث کر دل اور کتنے ہی اطمینان بخش انداز سے اپنے مقصد کو پیش نظر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں اس کی لکھنؤ میں ”مدح صحابہ“ کا قضیہ پھر بھی بدستور ہے گا اور ایک مجتہد سے لے کر مرثک پر چلنے والے راہگیر تک کے خیالات میں رتی برابر کوئی فرق نہ آئے گا۔

یہی وجہ تھی کہ اگرچہ ”امامت و خلافت“ کا مسئلہ تقریباً دو سال سے ناسور کی طرح نگار کے صفحات پر ریس رہا ہے اور اس دوران میں کئی مرتبہ خود میرا دل بھی چاہا کہ اس پر اپنے افکار و خیالات کو اہل علم کے سامنے پیش کر دوں، میرے بعض بے ریا دوستوں نے مجھ سے اس موضوع پر ظلم اٹھانے کے لیے اصرار بھی کیا۔ ”نگار“ کے مدیر محترم نے بھی اس ذمہ داری سے عہدہ براہ ہونے کو میرے لیے ناگزیر قرار دیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میری ہمت نہ پڑی کہ اس پر کچھ لکھوں، اس لیے کہ نکلی کر اور دنیا میں ڈال ”کا نظریہ ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں ”نگار“ میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان سے جو اثر مترتب ہوا ہے وہ صریح یہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں حضرات کو جدید تادیلات پر غور کرنے اور اپنے مقصود کو واضح سے واضح تر کرنے کے لیے استدلال تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑ رہی ہے۔ خیر ان لوگوں کو تھوڑی دیکھی جو ہر ایسے موقع پر اپنی زبان کی رگوں، منہ کے جھاگ، آنکھوں کی سرخی اور چہرہ کی تماشٹ کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے لیکن وہ لوگ بھی جو آزاد خیالی اور وسیع المشرب کی دوز میں اپنے کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ تک سمجھنے میں پس پیش نہیں کرتے جب شیعہ سنی کے اختلافی مسائل پر آتے ہیں تو قوم کی عزت کی خاطر وہی سب کچھ کرتے اور کہتے نظر آتے ہیں جو نہ کرنا اور نہ کہنا چاہیے۔

تاہم میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں کوئی صلحہ ایسا ہے جو مذہبی امور پر نسبتاً زیادہ منجیدگی اور سکون قلب کے ساتھ بحث کر سکتا ہے تو وہ شاید

صرف "نکار" کے خرمیلوں ہی کا حلقہ ہوگا۔ ورنہ یوں تو وہ سب کچھ الحاد و زندہ ہے جس کی تائید ندوہ تھا نہ عبون، بریلی یا دیوبند جیسی "خافا ہوں" سے نہ ہوتی ہو۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود جس چیز نے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے میں میری بہت افزائی کی ہے وہ شاعر دل کا نقطہ نگاہ ہے جس کے ماتحت وہ کسی کو سننے کے لیے نہیں بلکہ خود سننے کے لیے شعر گوئی کیا کرتے ہیں اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر واقعی میں غلطی پر ہوں تو ممکن ہے اس گفتگو کے سلسلہ میں میری اصلاح ہو جائے۔

اس مسئلہ کے متعلق نیاز صاحب نے اپنے محاکمہ (نکار ۱۹۳۶ء) میں یہ فیصلہ کیا ہے :-

"اس میں شک نہیں کہ رسول اللہؐ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد پیغمبر امیر خلیفہ قرار دیے جائیں جیسا کہ آپؐ نے بار بار اشارہ و کنایہ بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا۔"

لیکن اس فیصلہ کے باوجود آپ کا خیال ہے کہ رسول کریمؐ کی یہ خواہش صحیح اور جائز قرار نہیں پاسکتی اور اس لیے اسے ان کی اجتہادی غلطی سمجھا جائے لیکن چونکہ اس واسطے سے انبیاءؑ کی عصمت پر حرج آتا تھا اس لیے انھیں بہت بڑا گھیرا ل کر یہ ثابت کرنا پڑا ہے کہ "خطا" اور "غلطی" میں فرق ہے اور اس لیے اس اجتہادی غلطی کے باوجود رسولؐ کی عصمت عن الخطا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ممکن ہے یہ دلیل صحیح ہو لیکن اسے موجودہ مبحث سے متعلق کرنا میرے نزدیک صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انبیاءؑ نے بھول چوک ہو سکتی ہے تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ کسی ایسے اہم مسئلہ میں بھی انبیاءؑ سے غلطی ممکن ہے جس کا تعلق مذہب کی اساس سے ہو اور جس غلطی کی وجہ سے قت کا شیرازہ ہو جائے۔

تو ایں نیام سے کھینچ جائیں اور ابد الابد تک کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا افتراق و انتشار کھڑا ہو جائے۔ پس میرا محاکمہ یہ ہے کہ :-

۱۔ رسول اکرمؐ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں اور پھر یہ سلسلہ شاہان خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسل قائم رہے۔

۲۔ حضرت علیؑ کی الوہی امامت کے سلسلہ میں حقیقی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع اجمعی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم حقیقتہً وہ نہیں ہے جو "الوہی امامت" کی تائید کرتا ہو اور جس کے ماتحت خلافت کے حقدار صرف علیؑ اور آل علیؑ قرار پائیں۔

میں اپنے اس محاکمہ کی تائید میں دلائل پیش کرنے سے قبل مندرجہ ذیل تنقیحات قائم کرتا ہوں :-

۱۔ کیا عام مذاہبِ عالم کا بالعموم اور اسلام کا بالخصوص دعویٰ ہے کہ وہ روئے زمین پر بسنے والے ہر انسان کی دنیوی اور اخروی صلاح و فلاح کا پیغام لے کر آیا ہے بالفاظِ دیگر کیا ہر مذہب بالعموم اور اسلام بالخصوص اس کا مدعی ہے کہ وہ انسان کی معاشرتی، سیاسی، ذہنی اور اخلاقی تعلیمی کامیابی پر دو گرام رکھتا ہے اور یہ کہ دنیا کا کوئی اور مذہب اس سے زیادہ عمدہ، زیادہ قابل قبول اور عام انسانوں کے لیے زیادہ مفید پر دو گرام پیش نہیں کر سکتا؟

۲۔ کیا کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی و معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرنا ہو؟

۳۔ کیا کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے جو معمورۂ ارضی پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید اور قابل عمل نہ ہو اور جس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور بجا مطالبہ اور خواہش پر ضرب لگتی ہو؟

۴۔ کیا کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے جس کا کوئی اہم ترین اور بنیادی فیصلہ دنیا کی عقل عمومی کے خلاف ہو اور دنیا کے بنے والوں کو اُن کے کسی جائز حق سے محروم کرنا چاہتا ہو؟

اب مناسب ہوگا کہ ان چار دل تنقیحات میں سے ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کی جائے۔

پہلی تنقیح

یہ تنقیح اس قدر واضح و روشن ہے کہ اسے کسی تفصیلی بحث و نظر کا محتاج قرار نہیں دیا جاسکتا جس شخص میں معمولی سی عقل و بصیرت بھی ہوگی وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کو زیادہ منور و تابناک بنانے میں مدد و معاون ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دسٹے زمین کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو دنیا کی تمام بھلائیوں اور خوبیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کا مدعی نہ ہو۔ چنانچہ آج جب اچھوت قوم نے ان معاشرتی اور مجلسی مطالبہ کے خلاف احتجاج کیا جو برہمنوں اور پنڈتوں کی جانب سے صدیوں سے اُن پر توڑے جا رہے ہیں تو ہندوستان کے ہر گوشے سے ہندو مت کے خیر خواہ یہ کہتے ہوئے سنائی دینے لگے کہ۔

”اصل ہندو دھرم اس الزام سے بری ہے اور یہ ظلم و زیادتی بعد کے خود غرض اور جاہ پرست برہمنوں کی ذاتی اختراع و ایجاد ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب کے پاس انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو استوار و بہتر بنانے کا کوئی مکملائحہ عمل نہیں ہے وہ رفتہ رفتہ یا تو فنا ہو رہے ہیں یا اپنی قدیم شکل کو دانستہ یا نادانستہ طور پر بدل رہے ہیں۔ ورنہ جانیے خود آپ کے ہندوستان میں ہندو مذہب میں جو تغیرات نمودار ہو رہے ہیں وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے کی بات ہے

کل تک نہ تو کوئی غیر ہندو ہندو بنایا جاسکتا تھا اور نہ کوئی ہندو کسی غیر مذہب کو قبول کر لینے کے بعد ہندو مذہب میں دوبارہ داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن آج مکمل گھٹا اس عقیدہ کے خلاف بغاوت کی جا رہی ہے۔ اور سوامی دیانند جی کے پیرو علانیہ اس کا پرچار کر رہے ہیں کہ نہ صرف "مرتد ہندو" دوبارہ ہندو بنایا جاسکتا ہے بلکہ مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی غرض کہ ہر مذہب و ملت کے فرد کو ہندومت کے آغوش میں پناہ دی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہندو مذہب میں بت پرستی، توہم پرستی، بطل پرستی اور اسی قسم کے سیکڑوں ایسے نقائص ہیں جن کے خلاف آج علانیہ طور پر پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اصل ہندو دھرم ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ چنانچہ بنگال میں برہمہ سماج اور پنجاب میں آریہ سماج انھیں مساعی کا نتیجہ ہیں۔

اس چیز کو دلائل و براہین سے واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام کا دعویٰ بھی ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ دنیا میں ہر انسان کی صلاح و فلاح کے لیے خدا کی "آخری آواز" ہے اور ایک ایسا پروگرام خدا کی طرف سے لیکر آیا ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیوی و اخروی ہر اعتبار سے نشو و ارتقاء کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔

دوسری تنقید

اس تنقید پر بھی مجھے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ کہ ڈاکٹر امجد کا ر کے تبدیل مذہب کے اعلان کے بعد سے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اس موضوع پر اتنی بحث و تحمیس ہوئی ہے کہ اب سلسلہ میں غالباً کسی مزید تحقیق و گفتیش کی گنجائش باقی نہیں رہی جتنی کہ پنڈت مالوی جیسا متعصب اخیال و قدامت پرست ہندو جو آج بھی کسی "تنج ذات" کے ہندو کو اپنے خاندان میں قرابت و عزیز داری کا شرف دینے کے لیے تیار نہیں، یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ آج کل "اچھوت" کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے

- ۲۲۰ -

اسے اصلی ہندو دھرم سے کوئی واسطہ نہیں — گویا انھیں اس حقیقت کے آگے مجبوراً سپر ڈالنا ہی پڑی کہ کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرے؟ اور اس لیے ہندو دھرم کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے لازم ہوا کہ اُسے اُن تمام اُمور سے پاک سمات ظاہر کیا جائے جن کی بنا پر اس کو ارض پر بسنے والی چھ کروڑ مخلوق کے عام انسانی حقوق پر دن کی روشنی میں ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔

آج دنیا میں روس کی اشتراکیت عوام کے لیے اتنی جاذبِ نظر کیوں بنی ہوئی ہے؟ اور وہ کون سی وجہ ہے جس کی بنا پر شہنشاہیت پرست ممالک کے اتنے شدید بندھنوں کے باوجود یہ خیالات روئے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں؟ اور وہ کون سے محرکات و دواعی ہیں جن کی وجہ سے علامہ الان اس اپنی آبائی روایات، اپنے مسلک مذہب اور اپنے معتقدات کو اشتراکیت کی پیروی میں قابلِ ترمیم قرار دے رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مذہب نے سرمایہ پرستوں کے بقا و تحفظ کے لیے جو تدابیر اختیار کر رکھی ہیں وہ قطعاً ناجائز اور ظالمانہ ہیں اور اس لیے کوئی ایسا مذہب حقانیت و صداقت کا صحیح و بخوبی قرار نہیں دیا جاسکتا جو موجودہ سرمایہ پرستی کا حامی و ناصر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ میں عیسائیت کا صرف نام رہ گیا ہے ورنہ کسی شخص کے دل کے اندر اس کی عظمت و بزرگی باقی نہیں رہی جو مذہب ہونے کی حیثیت سے اسے حاصل ہونا چاہیئے۔

الفرض یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا کوئی حق خصب نہ ہوتا ہو۔

تیسری تنقیح

مذکورہ بالا دوسری تنقیح کے واضح ہو جانے کے بعد یہ تنقیح کسی بحث و تشریح کی محتاج نہیں رہتی۔ اس لیے کہ کسی مذہب میں انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی نگہداشت نہ کرنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ الٰہی اور الہامی نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے کوئی ایسی چیز اپنے بندوں کے سر نہیں مل سکتی جو ان کے کسی ایک جائز حق کو بھی سلب کرتی ہو۔ عقل سلیم اس بات کو کسی صورت سے نہیں مان سکتی کہ انسان پر ظلم و بے انصافی کے پہاڑ ٹوڑنے کے لیے خدا کی جانب سے کوئی مذہب بھیجا جائے اور اس لیے اگر کسی مذہب کے اصول و نظریات تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید و قابل عمل نہ ہوں۔ یا ان سے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب لگتی ہو تو بلا پس و پیش یہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب سرے سے الہامی نہیں ہے، یا کم از کم اس کا وہ حکم غیر الہامی ہے جو عام انسانوں کے لیے کسی جائز و معقول شکایت کا باعث ہو۔

چوتھی تنقیح

دوسری اور تیسری تنقیح کے بعد اس تنقیح کے قائم کرنے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا ہر پہلو نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی میں آجائے اس لیے میں نے اس تنقیح کو قائم کرنا ضروری سمجھا، لیکن اس پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ بالکل روشن حقیقت ہے کہ اگر کسی مذہب کا کوئی بنیادی اور اساسی عقیدہ ایسا ہو کہ اسے عقل عمومی جائز قرار نہ دیتی ہو تو ہم یا تو اس عقیدہ کو مذہب کا بنیادی و اساسی عقیدہ مانتے سے انکار کر دیں گے اور یا سرے

سے اس مذہب کے الہامی ہونے سے منکر ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگر کوئی مذہب انسان کو خیر و نیکی کے اتباع سے باز رکھتا ہے تو اس کے دائرہ سے علیحدگی ختم یا کر لینا انسانیت کا سب سے پہلا فرض ہے۔

لیکن یہاں میں جس چیز پر خصوصیت کے ساتھ زور دینا چاہتا ہوں وہ ”عقل عمومی“ کا لفظ ہے۔ ”عقل عمومی“ سے میری مراد وہ معمولی فہم و فراست ہے جس سے روزمرہ کے کاروبار میں ہم کام لیتے ہیں اور جس کے ذریعہ ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاداً نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی مثلاً ”سچ بولنا اچھا ہے“ یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اسی طرح ”انسان کا قتل کرنا دشنام قتل ہے۔“ یا ”جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔“ اس نوع کے تمام اصول و کلیات ایسے ہیں کہ جنہیں ہماری عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے۔

یہ میں نے اس لیے عرض کر دیا کہ کہیں اس موقع پر ”عقل و نقل“ کے اُن مباحث کی طرف ذہن منتقل نہ ہو جائے جن سے معتزلہ وغیرہ کی تصانیف بھری پڑی ہیں اس لیے کہ ان مباحث میں ”عقل“ کے لفظ سے بالعموم جس مفہوم کو مراد لیا گیا ہے وہ استدلال و قیاس آرائی کی وہ شکل ہے جس کے بعد مذہب سائنس و فلسفہ کی موت گائیوں میں پھنس کر صرف گہرے فلسفیوں کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہتا اور عوام کی نظروں میں اس کا ہر سہلہ ایک عقدہ لایخیل بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن میری مراد یہاں اس قسم کے ”استدلال و قیاس آرائی“ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس میرے پیش نظر استدلال و استنتاج کی وہ سادہ و سلیس صلاحیت ہے جس سے ہم عملی زندگی کے روزانہ کاروبار میں مدد لیتے ہیں اور اس لیے گو مذہب کو عقل سے علیحدہ رکھنے کی کتنی ہی کوشش کی گئی ہو لیکن یہ کسی کا عقیدہ نہیں ہے کہ مذہب کے اصول و

ضوابط کو عقل عمومی سے کوئی علاقہ دسرکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر مذہب کے دوسرے معنی ”جنوں اور کھنڈ“ کے سوا اور کچھ نہ ہو سکیں گے۔

ان چاروں تنقیحات کو بخوبی ذہن نشین کر سہ کے بعد اب آپ حضرت علیؑ کی ”الوہی خلافت“ کے سبب پر غور کیجئے۔ دیکھیے ”الوہی خلافت“ کا مطلب یہ ہے کہ:-
 ”خداوند کریمؐ نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریمؐ کے بعد اُن کے ناماد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں، اور علیؑ کے بعد اُن کی اولاد میں سے کسی کو یہ منصب طویل تفویض کیا جائے اور اسی طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے“
 اب اگر آپ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط کر سکتے ہیں:-

- ۱۔ خلافت و امامت حضرت علیؑ کی نسل کے لیے مخصوص ہے۔
- ۲۔ خلیفہ (یا امام) کی وفات پر اس کی جانشینی کے لیے پیش رو کا بیٹھایا بیٹے کی عدم موجودگی میں پیش رو کا کوئی اور قریب ترین عزیز ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہان خود مختار کے یہاں ولیعهدی کے لیے۔
- ۳۔ اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی مندرجہ ذیل شرائط کو تسلیم نہیں پاسکتا۔
- ۴۔ دنیا کے تمام مسلمان حضرت علیؑ کی نسل کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔

۵۔ چونکہ رسولؐ کے بعد علیؑ اور ان کی اولاد ہی خلافت و امامت کی حقدار ہے اور وہی اولوالامر آقا اور مولا ہیں اس لیے روئے زمین پر بننے والے ہر مسلمان کے لیے یہ فرض ہے کہ وہ ابدالآباد تک ”آل علیؑ“ کے ہر اشارہ پر بلا چون و چرا

تیسرے بیٹے کا نام کرتا رہے۔

۶۔ اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باخدا، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جائیداد کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا، بلکہ علیؑ کی اولاد میں سے ولید بعدی کے مروجہ اصول کے بموجب کسی "حقدار" کو مسند خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائے گا۔

اب ان عقائد کو بغور دیکھئے اور معلوم کیجئے کہ آیا یہ عقائد آپؐ کی "عقل عمومی" کے بنیادی اور اصولی سمات کے مخالف تو نہیں؛ یعنی آیا ان عقائد کو مان لینے کے بعد انسان کے انفرادی، معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت ممکن ہو سکے گی؟ آیا اس قسم کا عقیدہ محمودۃ ارضی پر بننے والے تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید اور قابل عمل ہو سکے گا؟ آیا اس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب نہ پہنچے گی؛ اور آیا یہ عقیدہ دنیا کے بننے والوں کو ان کے کسی جائز حق سے محروم کرنے کا موجب تو نہ ہوگا؟

دیکھیے ان عقائد کا فتنہ یہ ہے کہ بانی اسلامؐ کی خواہش یہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد مسلمانانِ عالم پر ان کی نسل تا قیام قیامت سلطانِ مطلق کی حیثیت سے حکمرانی کرے، اور ان کی نسل کے افراد کے ہوتے ہوئے روئے زمین کا کوئی مسلمان مستبد خلافت کا امیڈار نہ ہو سکے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ اجتماعی اور عمرانی نقطہ نظر سے نبی کریمؐ نے دنیا کے سامنے دو چیزیں پیش کیں:-

- ۱۔ غیر مسئول مطلق العنان حکومت جو خلیفہ کی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی ہے۔
- ۲۔ "نسلی امتیاز" جس کے ماتحت اولادِ رسولؐ دنیا کے تمام انسانوں پر ابداً لا بازننگ حکمران ہونے کی حقدار ہے اور آلِ علیؑ کا ہر بچہ مال کے پیٹ سے یہ استحقاق لے کر پیدا ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی گردنیں اس کے سامنے عقیدت و احترام

کے ساتھ خم ہو جائیں۔ محض اس لیے کہ وہ ”یکے از کُل علی“ ہے (نہ کہ اس لیے کہ اس نے اپنی ذاتی صلاحیت و استعداد اور خدمت و ایثار کے ماتحت علم ہر ذلغریٰ حاصل کی ہو)

اب پوری سنجیدگی اور انصاف پسندی کے ساتھ غور کیجیے کہ اگر کوئی مذہب دنیا پر اس قسم کے مطلق العنان نسلی امتیاز کو مسلط کرنا چاہے تو کیا وہ مذہب انسانی حقوق کے احترام و تحفظ کے تمام مذکورہ بالا دعادی نیز عقل عمومی کے اعتبار سے دنیا کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے؟ اور کیا اسلام کے اُن کھلے ہوئے اور واضح احکام کی موجودگی میں جن میں انسانی مساوات، حریت، شخصیت، آزادی، فکر و رائے اور نسل و نسب کے امتیازات کے انقضاء پر بار بار زور دیا گیا ہے، اس عقیدہ کو تسلیم کرنا اسلام کے اصولی عقائد میں قابل فہم تضاد و تباہی کو داخل کرنا نہیں ہے؟

پھر ممکن ہے کہ آج سے پانچ سو برس یا پانچ ہزار برس پہلے اس مسئلہ میں اختلاف آراء ہو سکتا لیکن ۱۷۸۹ء کے بعد سے فرانس کے ہمہ گیر انقلاب نے دنیا کے بچہ بچہ کو ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی کی اس بنیادی اور ابتدائی صداقت سے روشناس کر دیا ہے اور آج مشرق سے لے کر مغرب تک کوئی دماغ ایسا نہ ملے گا جو اس بات کا خواہاں ہو کہ دنیا کو ۱۷۸۹ء سے پہلے کے زمانہ کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ آج دنیا میں چار ڈکٹیر فرما روانی کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی ایک اس بات کا خواہشمند نہیں ہے کہ قرون وسطیٰ کی سی خود مختاری اور مطلق العنانی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ گذشتہ جنوری میں مسولینی نے روس کے ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں نہ تو اشتراکیت کے سماجی نظام کا قائل ہوں اور نہ موجودہ جمہوریت کا مفہوم میرے دل کے لیے باعث کشش ہے لیکن اس کا میرا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں دنیا کو ایک مرتبہ پھر اس غیر مسئول و مختار مطلق عہد کی طرف لوٹا لے جانا چاہتا ہوں۔ جو انقلاب فرانس

سے پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔

آج کل ڈکٹیٹروں کے موجودہ غلبہ و تسلط کو دیکھتے ہوئے کسی قدر غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس لیے اس بات کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ڈکٹیٹر اور آؤ کریٹ (رولر اسلٹک العنان فرمانروا) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ڈکٹیٹر قوم کی خواہشات و جذبات کی زندہ تصویر ہوتا ہے اور وہ قوم کے عمومی مطالبہ سے ایک انج متبادر نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی جو میں گھنٹے ایک ان ٹھک عملی انسان کی طرح بسر ہوتی ہے جو محض اپنی سابقہ قربانیوں اور حد سے بڑھے ہوئے حب وطن اور حب قوم کی وجہ سے اپنے اہل ملک کی آنکھ کا تار بانا ہوتا ہے۔ وہ قوم کی صلاح و فلاح کے لیے تمام امکانات کی تدبیر عمل میں لاتا ہے اور اس کا دماغ و جسم ایک لمحہ کے لیے بھی اس عیش و تنعم سے دوچار نہیں ہوتا جو شاہان ماضی کے حرم سراؤں کی خصوصیت خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر اپنے ذاتی رجحانات اور ذاتی خبط ————— کے بموجب کام نہیں کرتا۔ بلکہ قوم کی عمومی خواہشوں کا ایک مکمل نقشہ ہر وقت اس کے دماغ میں موجود رہتا ہے۔ الغرض ایک ڈکٹیٹر اور ایک آؤ کریٹ رولر میں بعد المشتیقین ہے۔ اور اس لیے ان دونوں کو باہم مخلوط کر کے بحث کو الجھانا نہ چاہیئے۔

علاوہ ازیں مسلمینی اور مٹل کی آمریت کے اصول کو دنیا قابل قبول بھی نہیں سمجھی۔ خود ان کی اپنی قومیں بھی پوری طرح ان کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کی زندگی ہر لمحہ خطرہ میں ہے اور گومر دست ان کا تارۃ اقبال عروج پر ہے لیکن بین الاقوامی سیاست سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی شہرت و عزت کی بنیادیں بہت ہی کمزور اور پتلی زمین پر رکھی گئی ہیں اور وہ وقت جلد آنے والا ہے جب خود انھیں کی قوم ان کے خلاف عظم بغاوت بلند کرے گی۔

پس اگر آؤ کریٹ "خلافت" کے مذکورۃ بالا استحقاق کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا

صاف مطلب یہ ہوگا کہ اسلام دنیا میں غیر مسئول، مطلق العنانی اور ناجائز نسلی امت کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کو یوں سمجھیے کہ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے آج ہر مشرک یہ طے کر دے کہ — ”مجھے خدا کی طرف سے پیغام ملا ہے کہ میں اور میرے بعد میری اولاد نسلاً بعد نسل ابد الابد تک جرمن قوم پر فرمانروائی کرے۔“

فرمائیے اگر آج مشرک مسولینی مصطفیٰ کمال یا اسرائیل کی طرف سے اس قسم کا دعوئے آپ کے گوش گزار کیا جائے تو آپ اس کا خیر مقدم کس طرح کریں گے؟ اور آپ اس قسم کے اعلان کو دنیا کے لیے برکت سمجھیں گے یا لعنت؟ — خیر آپ تو برکت و لعنت کا سوال طے کرنے میں سلف کے اقوال ہی کو لوٹ پلٹ کرتے رہیں گے لیکن یورپ کے باشندے جو اجتماعی اور شخصی حریت کے مفہوم سے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں۔ بہت جلد اصل حقیقت کو اپنے اس ڈکٹیٹر کے نکلے انار دیں گے اور انہی نگار کا دوسرا پرچہ شائع بھی ہونے پانچ لاکھ کہ اخبارات میں آپ موٹے موٹے حروف سے لکھی ہوئی یہ سرخی پڑھ لیں گے۔

”یورپ کے ایک محفوظ انجاس ڈکٹیٹر کی لاش دریائے رائن کے سپرد کر دی گئی۔“

میں اس وقت آیات و احادیث سے اس حقیقت کو ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ اسلام جمہوریت کا داعی ہے یا نسبی مطلق العنانی کا۔ میں تو آپ کی عقل عمومی سے یہ سہا سہا سوال کرتا ہوں کہ اگر آپ اسلام کو سچا اور الہامی مذہب قرار دیتے ہیں تو کیا آپ کے نزدیک اس کا ایک بنیادی اور اساسی عقیدہ اس نوع کا ہو سکتا ہے؟ کیا اسلام دنیا کے رہنے والوں پر اس طرح ایک نسل کو قیامت تک کے لیے فرمانروائی کرنے کا ٹھیکہ دے سکتا ہے؟ اور اگر اسلام ایسا حکم دے تو کیا آپ اسے الہامی اور الہوی مذہب قرار دیں گے؟

دیکھیے اگر آج ”الوہی خیانت“ کا مسکہ طے شدہ ہوتا اور اسلام میں ”اسل علی“ کو پھانسی

چرا استحقاق کے بعد دیگرے خلیفہ تسلیم کر لیا جابا کرتا تو ہر سید کے دماغ آسمان پر مچتے وہ اپنے کو حکمران خاندان کا فرد سمجھتا اور شاید آج راقم الحروف بھی اس سادی سطح پر ناظرین "نگار" سے مخاطب ہونے کی "ذلت" گوارا نہ کرتا۔ اس لیے کہ بہر حال سید ہونے کی تھوڑی سی بہت قیمت تو اس خاکسار کو ملتی ہی۔

پھر یہ چیز کوئی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق صرف میری ذاتی پیشینگوئی یا قیاس آرائی سے ہو۔ جی نہیں دور نہ جائیے۔ اپنے ہندوستان ہی میں ان فرقوں کو دیکھیے جن کے میاں اس قسم کا "ابوی استحقاق" تسلیم شدہ ہے اور پھر اندازہ کیجیے کہ اگر یہی چیز سادے اسلامیان عالم پر مسلط کر دی جاتی تو ہم مسلمانوں کی کیا دُرگت ہوتی

آپ ہزاریں سہ ہزار آغاخان سے ناواقف نہ ہوں گے۔ یہ اہل تشیع کے اس مخصوص فرقہ کے "امام" ہیں جو توحید فرقہ کہلاتا ہے۔ آپ براہ راست حضرت علیؑ سے نسلی تعلق رکھتے ہیں۔ توحید فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ آغاخان خدا کی طرف سے مذہبی اور دنیوی دونوں اعتبار سے کل مسلمانان عالم کے سردار و اقا ہیں اور ان کے بعد ان کے صاحبزادہ پرنس علی خاں اس سرداری و خواجگی کے مستحق ہیں۔ بعینہ وہی عقیدہ جو اس وقت زیر بحث ہے اس کا نتیجہ کیا ہے؟

آغاخان اور ان کے صاحبزادے پرنس علی خاں کی زندگیوں سے کون ناواقف ہے؟ یورپ کی سُن بادر جس پاش زنگینوں میں وہ رہتے ہیں۔ ان کی جویاں بے پردہ ہیں۔ یس (گھوڑ دوڑ) میں وہ کروڑوں روپیہ ہر سال لٹا دیتے ہیں۔ ایک ایک لاکھ روپے کا ایک ایک گھوڑا خریدا جاتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کا وہ کون، اعیش ہے جو اُمّتیں حاصل نہیں؟ لیکن اس کے باوجود توحید فرقہ ذہنی اعتبار سے ان کا قلام ہے، ان کے غسل کا پانی حیات سے جمع کیا جاتا ہے اور بیماروں کو شفا کی خاطر پلایا جاتا ہے اور کیوں نہ پلایا جائے؟ جبکہ "نور محمدی" سلسلہ بہ سلسلہ ان میں منتقل ہوتا ہے۔ ان کے پاؤں دھو کر

پچے جلتے ہیں، ان کے قدروں کے نیچے کی خاک کو خاک شفا قرار دیا جاتا ہے۔ انھیں وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جسے سنکر آپ کو یقین بھی بمشکل آئے گا۔

آغا خاں کو چھوڑیے، اگر کبھی مبینی جلنے کا اتفاق ہو تو سیدنا "پیر سیف الدین طاہر" کی بارگاہِ جلال میں قدم رکھیے۔ آپ بھی آلِ رسولؐ ہیں۔ براہِ راست حضرت علیؑ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور "ابوہی امامت" کی وجہ سے ساری دنیا کے بومرہ فرقہ کے روحانی اور دنیوی پیشوا ہیں۔ ہر بومرہ پر فرض ہے کہ ہر سال آپ کی "بارگاہ" کو ایک مخصوص "ٹیکس" (جس کا کوئی خاص مذہبی نام ہے) ادا کرے۔ پھر حقیقتہً اختصاراً نکاح اور موت کے مواقع پر بھی مختلف قسم کے ٹیکس مقرر ہیں جو اس "بارگاہ" کو دیے جلتے ہیں جس کی وجہ سے اس وقت کمی کر ڈر روپیہ کی رقم کے "واحد مالک" "حضور سیدنا" ہیں۔ آپ ایک نہایت پر تکلف عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کمی کمی موٹرل ہر وقت آپ کی سروس میں رہتی ہیں۔ دسترخوان پر ہارون و مامون کے اوان نظر آتے ہیں۔ فرسٹ کلاس یا غالباً اسپیشل سیلون میں آپ سفر کرتے ہیں جہاں جلتے ہیں لوگ سچ مچ آپ کے قدم لیتے ہیں اور ماتہ رالہ خرچ محمدی کے بموجب آپ کی چار بیویاں بھی ہیں۔ مکن ہے کچھ لونڈیاں بھی ہوں۔

کیا ان مناظر کو دیکھنے کے بعد آپ یہ نتیجہ آسانی نہیں نکال سکتے کہ اگر "ابوہی خلافت" کے مذکورہ بالا مسئلہ پر عامۃً المسلمین کا ایمان ہوتا تو پھر اسی قسم کا ایک خلیفہ یا امام ہم سب "ایمان والوں" کا بھی ہوتا اور ہم سب "چالیس کروڑ فرزندِ ان توحید" ایک ایسے "آغا خاں" کے مطیع و متقاد ہوتے جو پیرس و نیپلز میں گھورے دوڑا کرتا اور ہماری جیبوں سے ہر سال کروڑوں بلکہ اربوں "چہرہ شاہی کلدار" وصول کرتا رہتا۔

پھر یہ طریق عمل کچھ میرے ہی نزدیک قابلِ اعتراض نہیں بلکہ خود بوزل اور غبیل کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسے دماغ پیدا ہو چکے ہیں جو علانیہ اس جیتے سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں۔ بوہرول میں تو ایک جماعت ہی ایسی تشکیل پا گئی ہے جس نے

”سیدنا“ کی اس امتیازی شان کبریائی کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند کر دیلے، اور جس پر حضور ”سیدنا“ اپنی قزو جلال کی تموار کا آخری دار بھی صرف فرما چکے ہیں یعنی اس قسم کے تمام گستاخ و بے ادب افراد کو ذات سے باہر کر دیا گیا ہے۔ اور اب وہ ”سیدنا“ کے مخلصین کے یہاں نہ تو شادی کر سکتے ہیں، نہ ان کی کسی تقریب میں بلائے جاسکتے ہیں اور نہ کوئی اور صحیح عقیدہ۔ لوہوہ ان کی کسی تقریب میں شریک ہو سکتا ہے۔

الغرض یہ ہے وہ عالم جو الوہی خلافت کے عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر یہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام میں اسی کا حکم ہے تو پھر اس کا لافنی نتیجہ یہ ہے کہ یا تو ہر معقول و سنجیدہ انسان اس فیصلہ کی صداقت و حقانیت سے انکار کر دے اور یا پھر اسلام کو غیر الہامی یا کم از کم ناقابل عمل مذاہب کی صف میں رکھ کر ہمیشہ کے لیے اسے الوداع کہہ دے۔



میں یہاں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس بحث میں میں نے اپنا سارا زور استدلال عقل عمومی کے فیصلہ پر موقوف کیا ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے یقین ہے کہ اس ضمن میں میں نے جن بدیہی اور روشن حقیقتوں کو پیش کیا ہے ان میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یعنی کوئی معقول اور سنجیدہ انسان عقل عمومی کے اعتبار سے اس امر میں مجھ سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ اہل تشیع الوہی امامت کے عقیدہ کو جس نوع سے مانتے ہیں۔ وہ نہ تو صرف انسانیت کے عام نقطہ نظر سے ناقابل قبول ہے بلکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو انسان کے قوائے فکر و عمل کی صحیح نشو و نما ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کردار و گفتار کی آزادی ابد الابد تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ انسانوں کے مابین امتیاز و تفریق کی ابدی خلیجیں حائل ہو جائیں، ذہنی استعداد اور معاشرتی تفوق و برتری کی وہ کردہ فضا پیدا ہو جائے جو انسانیت کو رفتہ رفتہ ہندوؤں جیسی ذات

پات کے تصور سے قریب نہ کر دے، انسانی عقل و فکر پر پہرے بیٹھ جائیں اور دنیا کے بیٹے والے خدائے واحد کے علاوہ بہت سے ایسے بتوں کی پرستش کرنے لگیں جن کو پاش پاش کرنے کی کوشش آج دنیا کے ہر گوشہ میں کی جا رہی ہے۔ جو انسانیت کے نشوونما کے راستہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہیں اور جن پر محمد عربیؐ نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ٹوٹا اور تباہ کن ضرب لگائی تھی۔

ممکن ہے میری اس گزارش کو مذہبی تعصب و جانبداری پر مبنی قرار دیا جائے لیکن میں ایمان و ضمیر کی پوری صداقت و پاکبازی کے ساتھ رب جلیل کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ان نتائج تک پہنچنے میں فرقہ وارانہ عنصیت متنگ نظری سے کنارہ کش ہو کر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش کے نتیجہ کے طور پر میں نے جس چیز کو صحیح سمجھا ہے اسی کو ادھر کی سطور میں عرض کیا گیا ہے حتیٰ کہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی شیعہ گھرانے میں پیدا ہوتا ہوتا تب بھی غور کرنے کے بعد یہ عقیدہ یہی ہوتا جو پیش کیا گیا۔ لیکن چونکہ اتفاق سے میں اہل تشیع کے خاندان میں پیدا ہو گیا ہوں اس لیے یقیناً شیعہ حضرات مجھ پر فرقہ وارانہ حنبلیہ داری اور مذہبی عنصیت کا الزام عائد کرنے سے دریغ نہ کریں گے اور اس لیے میں ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس امر کے فیصلہ کے لیے دنیا کی کسی غیر جانبدار شخصیت کو بطور حکم مقرر کر لیں۔ حتیٰ کہ مجھے اس میں بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر وہ سولینی اور ہٹلر کو — جن کے آمرانہ اصول کو وہ اپنے دعوے کے آیات میں اکثر پیش کیا کرتے ہیں — اس فیصلہ کے لیے ثالث بنالیں۔ پس اگر وہ یہ فیصلہ کریں کہ اہل تشیع کا ”عقیدہ امامت“ انسان کی عقل عمومی کے منافی نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس کو ماننے کے بعد انسانی معاشرت اور انسانی ذہن و فکر کی طاقتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا یقینی نہیں ہے — تو سب سے پہلا شخص جو علانیہ شیعیت کو قبول کر کے آلِ رسولؐ کی شہادت پر سینہ کو بلی کرنا ہوا ”ابوہی خلافت و امامت“

کے عقیدہ کا جھٹکا ہاتھ میں لے کر میدان میں نکلے گا، وہ یہ خاک رہوگا۔

خلافت کا مسئلہ آیات و احادیث کی روشنی میں

عقلی نقطہ نظر سے اس مختصر سی گزارش کے بعد اب میں ان آیات و احادیث پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو ”الوہی خلافت“ کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ بحث کا کوئی شعبہ تشویش نہ رہے اور اس کا ہر پہلو پوری پوری طرح روشنی میں آجائے۔

اس حقیقت سے شیعہ حضرات کو بھی اتفاق ہے کہ قرآن نے حضرت علیؑ کی جانشینی کا کہیں صراحتاً تذکرہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۷ء کے نگار میں کسی فاضل اہل قلم نے شیعہ حضرات کی نمائندگی کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن نے ”اپنے مقاصد کو ایک طرح کے ابہام کے پردہ میں رکھا ہے۔ لیکن قرآن ایسے قائم کیے میں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر اسی ضمن میں یہی حضرت ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ:-

”بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ (قرآن میں بالتصریح) نام تھے اور وہ حذف کر دیے گئے ہیں مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں“

گویا اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ ”الوہی خلافت“ کے مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے:-

۱۔ ان قرآن سے نتائج اخذ کرنا چاہئیں جو قرآنی آیات سے مستنبط ہوتے ہیں۔

۲۔ احادیث نبویؐ کو دیکھنا چاہیے۔

۳۔ صحابہ اور تابعین کی ان تصریحات کو دیکھنا چاہیے جو آیات و احادیث کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً انھوں نے بیان کیں۔

آیات

وہ قرآنی آیات جن کی بار بار حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علیؑ کی الوہی صفات پر مضبوط فرائض قائم ہوتے ہیں یہ ہیں:-

۱۔ لیس البریان تأتوا البیوت من ظہورہا ولكن البیوت من التلی
وأتوا البیوت من ابوابہا (سورۃ بقرہ رکوع ۲۴)

”نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو۔“

۲۔ ”الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً“ (سورۃ مائدہ رکوع ۱)

”آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کر دیا اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین اسلام ہو۔“

۳۔ ”انذر عشیرتک الا قربین و اخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنین“ (سورہ شعراء رکوع ۱۱)

”اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متغیہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں ان کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ د یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ“

۴۔ ”اما دینکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوة ویؤتون الزکوٰۃ و هم راکعون۔“ (سورۃ مائدہ رکوع ۸)

”تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور غزوہ انکاری سے زندگی گزارتے ہیں“

۵۔ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما

بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ (سورہ مائدہ رکوع ۱۰)

”اے رسول! وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تیرے رب کی جانب سے

تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا، اس کا پیغام اور

اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔“

ان آیات کو دیکھنے سے آپ کو پتہ چلا ہوگا کہ بظاہر ان سے کسی طرح بھی نہ تشریح

نہیں ہوتا کہ ان کی غایت نزول حضرت علیؑ کی الوہی خلافت کو ثابت کرنا تھا۔ اہل

کے برعکس ان میں جسند ایسے عمومی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو بجائے خود مکمل ہیں

اور جن کی توضیح و تشریح کے لیے کسی مقدمہ یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان آیات

سے حضرت علیؑ کی امامت کا حکم مستنبط کرنے کے لیے شیعوں کی جانب سے

چند احادیث نبویؐ کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی خاطر میں ہر ایک آیت

کے شیعہ استدلال کو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

رسول کریمؐ نے فرمایا ہے:۔ انا مدینۃ العلم وعلی

کیت اول {بابھا فمن اراد العلم فلیأت الباب (یعنی میں علم

کا شہر ہوں اور علیؑ اس شہر کا دروازہ ہے، پس جو شخص علم حاصل کرنا چاہے اس

کے لیے ضروری ہے کہ اس دروازہ سے داخل ہو)۔

شیعہ حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا آیت کو رسولؐ کے

اس قول کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس کا صراحتاً یہ منشا ہوگا کہ قرآن اس

بات کا مؤید ہے کہ رسولؐ کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے، تو وہ صرف

علیؑ ہیں۔

لیکن اس استدلال پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نکتہ پنچ نظر اس بات کو معلوم کر سکتی ہیں کہ یہ تاویل کس حد تک قرین عقل ہے۔ جبکہ خود شیعہ مفسرین بھی اس کے مدعی نہیں ہیں کہ آیت زیر بحث کے نازل ہونے کے فوراً بعد حضور اکرمؐ نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہو۔ اور اس لیے اب استدلال کی منطق صرت یہ رہ جاتی ہے کہ رسولؐ کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے کیا رسولؐ کے پردیگنڈے کو قوت نہیں پہنچائی؟

اگر اس وقت اس بات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ اس طرح غیر واضح انداز سے اپنے مقصد کا اشارہ پردیگنڈہ کرنے سے رسول کریمؐ کی ذات پر موجودہ زمانہ کی دُلوپوسی اور شاطرانہ چال کا الزام عائد ہونا ہے تب بھی اس سے اصل مقصد ثابت نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اگر سعی و کوشش کے بعد اپنے شیعہ دوست کی خاطر سے کچھ دوا دارانہ انداز بھی اختیار کیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہ ظن قائم کیا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے اس آیت سے قرآن کریمؐ نے حضرت علیؑ کی برتری مراد لی ہو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ”إِنَّ الظَّنَّ لَا يَغْنَىٰ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا“ یہ آیت بھی امامت و خلافت سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔

آیت دوم لیکن اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ بینہ نبی کریمؐ کی اس تقریر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جو آپؐ نے ”غدير خم“ میں کی تھی اور جس میں حضرت علیؑ کو ”مولى المؤمنين“ کہا تھا اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

”خدا میرا مولیٰ ہے اور میں تمام مومنین کا مولیٰ ہوں اور اس کے بعد جس کا

میں مولیٰ ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔“

جس کے متعلق جناب نیاز نے اپنے محاکمہ میں یہ لکھا ہے کہ:-

”شیعوں کے پاس جناب امیرؑ کی ولایت کی یہ سب سے بڑی شہادت ہے۔“

لیکن مذکورہ بالا فقرہ قرآنی میں نہ تو مولیٰ کا لفظ مذکور ہے اور نہ خلافت و امامت

کے متعلق کوئی بعید ترین اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور اس لیے دلیل کی ساری بنیاد اصل آیت

کے بجائے صرت مذکورہ بالا حدیث قرار پاتی ہے۔ مگر قرآن کی زیر بحث آیت کے مفہوم میں کوئی ایسا خلا یا نقص نہیں ہے جس کے پیش نظر اسے کسی دوسری بات سے متعلق کرنا یا کسی حدیث کے ساتھ اسے ضم کرنا قرین عقل قرار دیا جائے۔ اس کے برعکس آیت کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ ایک سیدھی سادھی صداقت کو سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے شدید سستی کے اختلاط سے ہٹ کر غور کیجیے کہ رسول کریمؐ اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرماتے ہیں کہ ”آج تم پر خدا نے اپنی تمام نعمتیں مکمل کر دیں۔“ اور اس طرح قرآن کے احکام و ہدایات کو ابد الابد تک کے لیے اہل عالم کے واسطے شمع راہ بنانے کی اپیل کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کون سا ایسا خلا یا نقص ہے جس کو پورا کرنے کے لیے ”غدير غم“ کی حدیث کے ساتھ اس کا دامن باندھنا ضروری ہو۔

مجھے شیعہ حضرات کی اس سبکی پر رحم آتا ہے جس کے ماتحت وہ ڈوبتے آدمی کی طرح ہر ننگے کا سہارا ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ میں نے پورے سکون قلب کے ساتھ قطعاً غیر جذباتی انداز سے کئی گھنٹے مسلسل اس امر پر غور کیا کہ آیا واقعہؑ میں آیت کو خلافت علیؑ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے کوئی تاویل ایسی نہ مل سکی جسے بہر نوع اطمینان بخش کہا جاسکے۔

شیعہ حضرات اس آیت کو بمعیتِ عشیرہ کے واقعہ سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے کہ اگر اس آیت کو بمعیتِ مذکورہ سے علیحدہ کر لیا جائے تو اس سے اُن کے مقصود پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ مگر اس کے لیے وہ یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ تمام مذہبی شعوبوں میں ”وحی متلو“ یعنی قرآن کی ہدایتیں محلِ حیثیت رکھتی ہیں جن کی تفصیل رسولؐ کے عمل سے ہوئی ہے۔“

اگرچہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دینے میں استاد ملنے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقہ نے کھولا ہے

مگر پھر بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تخیل کی کون سی پرواز سے اس آیت کو ”محمل“ کی صفت میں رکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ یہ بذاتِ خود بالکل مکمل اور اپنے مفہوم ومعنی کے اعتبار سے بہرِ نفع غیر ناقص و کامل ہے۔ پھر اس کا فیصلہ مجھ سے نہیں۔ روئے زمین کے کسی صاحبِ الرائے (مگر غیر شیعہ) انسان سے حاصل کر لیجئے۔ یورپ و امریکہ کے مستشرقین سے پوچھیے۔ چین و جاپان کے کسی بالکل غیر متعلق آدمی سے دریافت کیجئے۔ فلپائن اور آسٹریلیا کے کسی نادائق حالاتِ انسان سے معلوم کیجئے اور اگر کسی ایک جگہ سے بھی یہ آواز اُٹھے کہ یہ آیت کسی نوح سے بھی کسی واقعہ خاص سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور بجائے خود کسی مضبوط و مکمل صداقت کی حامل نہیں ہے تو میں سپردِ لے کے لیے تیار ہوں۔

بہر حال یہ قرآنی آیت ہماری بحث سے خارج ہو جاتی ہے۔ وہ گئی بیعتِ عثیرہ دالی حارثہ۔ سو اس پر میں ”اسابیت“ کے ذیل میں اپنی رائے عرض کر دوں گا۔

آیت چہام اس آیت میں بھی کوئی ایسا ابہام و خلا نہیں ہے جس سے حضرت علیؑ کی خلافت پر استدلال قائم کیا جائے اور تصورِ تخیل کی کسی بعید ترین پرواز سے بھی اسے خلافت و امامت کے مسئلہ کے ساتھ متعلق کیا جائے۔ لیکن شیعہ حضرات حسبِ عادت اس آیت کے ”فوائے منصوص“ سے نہیں بلکہ اس کے ”شانِ نزول“ سے استدلال کرتے ہیں اور اس لیے قرآن کے بجائے شانِ نزول دالی حدیثِ معرضِ بحث میں آجاتی ہے۔ پس اگر شانِ نزول کی بے شمار روایات کے باہمی تضاد و مخالفت کو نظرِ انداز کر دیا جائے تب بھی اس استدلال کا تعلق قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے رہ جاتا ہے۔

آیت نجم اس آیت کے متعلق شیعہ حضرات کے فاضل ناسخ کا بیان ہے کہ :-

”یہی پُر زور حکمِ محکم ہے جس سے حضرت علیؑ کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا

ثابت ہوتا ہے۔“

لیکن یہاں بھی استدلال کا سارا زور اصل آیت کے بجائے صرف شان نزول سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اہل سنت کی تصانیف سے بہت سی روایات کو نقل کر کے یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب اس باب میں متفق ہیں کہ یہ آیت حجتہ الوداع میں ولایت علیؑ کی تبلیغ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔“

لیکن اس آیت کے الفاظ سے جو مفہوم اخذ ہوتا ہے وہ اپنی جگہ اتنا مکمل ہے کہ اس کی توضیح و تفصیل کے لیے شان نزول کی کسی حدیث کو مدینے رکھنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ تنہا اس آیت سے حضرت علیؑ کی الوہی خلافت کا حکم ہرگز مستفاد نہیں ہوتا ہاں اگر شان نزول کو صحیح مان لیا جائے تب البتہ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے اور اس لیے یہاں بھی قرآن پر بحث کرنے کے بجائے صرف حدیث معروض گفتگو میں آجاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں اشارۃً یا صراحتہً کسی طرح حضرت علیؑ کی امامت کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے مختلف احادیث و واقعات کو کھینچ تان کر قرآنی آیات سے متعلق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس قسم کی تمام کوششیں اتنی سفسطہ آمیز اور غیر تسلی بخش ہیں کہ عام انسانی دماغ ان کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور گو تعصبات تنگ نظری کے ماحول میں ذاتی انراض و منہاد کے دائرہ میں وہ کتنی ہی دل خوش کن نظر آئیں لیکن علم و تحقیق کی روشنی میں وہ بے حقیقت ہی ہو جاتی ہیں۔ اور اس اہم اور بنیادی مسئلہ میں قرآن کی خاموشی شیعہ حضرات کے مشن کے لیے شدید طور پر نقصان رسال ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ اسی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے شیعہوں کے متعدد مجتہدین یہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ قرآن سے وہ آیات و احادیث حذف کر دی گئی ہیں جن میں حضرت علیؑ کی امامت کے مسئلہ کو ناقابل انکار طور پر بیان کیا گیا ہے۔ غالباً اہل تشیع عام طور پر تحریف قرآن

کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کے قابل احترام مجتہدین کی وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں قرآن کی بہت سی آیات کو زعم خود صحیح کر کے نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ سیات القلوب وغیرہ کے مصنفات اس امر کی کھلی ہوئی شہادت کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ جمہور شیعہ درحقیقت تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں لیکن جب ان کو اپنے مخصوص عقائد کی تائید میں ایک آیت بھی ابن الدنثین "دستیاب نہیں ہوتی تو انھیں قدرتا اپنے عقائد پر شک و شبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اسی شک کے شبہ کو دور کرنے کے لیے بعض شیعہ مجتہدین نے قرآن کی تحریف کا دعویٰ کیا ہے۔ اور اپنے شلک مریدوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ "سنیوں نے قرآن سے وہ آیات حذف کر دی ہیں جن میں آل بیت کی امامت کے متعلق بالنصریح احکام مذکور تھے۔

چنانچہ میں نے اپنے ایک مخلص شیعہ دوست کے سامنے جب شیعہ حضرات کے "عقبہ تحریف قرآن" کا تذکرہ کیا تو انھیں یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور گودہ نہایت فاضل نوجوان تھے لیکن پھر بھی میرا یہ قول ان کے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کے ماننے سے اس وقت تک انکار کرتے رہے جب تک کہ میں خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کے تحریف شدہ قلمی نسخہ اور حیات القلوب وغیرہ کا مطالعہ ان کو نہ کرادیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے فرمایا۔ "یہ کتابیں ہمارے یہاں معتبر نہیں ہیں۔ اور — کم از کم میں — کسی ایسے قرآن پر ایمان رکھنا کمتر سمجھتا ہوں جو قرآن کے موجودہ "بین الدنثین" نسخہ سے ایک حرفت اور ایک کاجھی اختلاف رکھتا ہو۔



احادیث

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عقل سلیم اور قرآن دونوں اعتبار سے شہادت و امامت کا مسئلہ شیعہ حضرات کے حق میں فیصل نہیں ہوتا۔ عقل سلیم کا فیصلہ تو کھلے طور پر شیعہ حضرات کے مخالف ہے۔ جیسا کہ اس مقالہ کے ابتدائی صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں اس مسئلہ کا کہیں تذکرہ نہیں جتنی کہ بعید ترین تاویلات کے بعد بھی شیعہ حضرات اپنے مفید مطلب قرآن سے کوئی حکم مستنبط کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ البتہ احادیث کے مہدان میں جنگ اور ہمارے طلبی کی کافی گنجائش ہے۔ بلکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے اس قضیہ کو قضیہ بنا دیا ہے۔ ورنہ عمر بن عبد العزیز یا زیادہ سے زیادہ بنی امیہ کی خلافت کے سقوط کے بعد سے یہ اختلاف ہمیشہ کے لیے دماغوں سے محو ہو چکا ہوتا۔

لیکن میں اس وقت احادیث کی صحت و عدم صحت پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ اس بحث میں پڑنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کون کون سی احادیث صحیح ہیں یا صحیح ہو سکتی ہیں اور کون کون سی غلط۔ اس لیے کہ اس طرح یہ بحث اتنی طویل ہو جائے گی کہ اس کا مطالعہ ہر شخص پر بار ہو جائے گا۔ اور دوسرے نتیجہ کے اعتبار سے بھی بالکل غیر مفید رہے گی اس لیے کہ احادیث میں استثنائے اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود بھی کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو قریب قریب نامکن ضرور ہے اور اس لیے میں کسی حدیث کی صحت و عدم صحت کے متعلق کوئی رائے دے کر کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ لیکن اس سلسلہ میں کم از کم اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ چونکہ احادیث کے اعتبار سے دونوں فریقوں کے پاس برابر کا بوجھ ہے۔ اس لیے اس استدلال کو بحث سے خارج کر دینے

کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہت سی باہم تضاد و مخالفت احادیث کے هجوم میں ایک غیر جانبدار جج کا فیصلہ ہی ہو سکتا ہے کہ صرف ان احادیث کو قابل غور سمجھا جائے جو عقل سلیم پر پوری اتریں یا جنہیں مسلمانانِ عالم کی اکثریت صحیح تسلیم کرتی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہمسردو اعتبارات سے شیعہ حضرات کے ساتھ بے انصافی نہ کر دیں گے۔ اگر اس میدان میں انھیں دعوتِ مقابلہ نہ دیں۔

لیکن ڈر ہے کہ کہیں شیعہ حضرات میرے اس طریقِ عمل کو قابلِ اعتراض قرار دیں اور جس طرح دُوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو فقہیت سمجھتا ہے اسی طرح وہ بھی اسی ایک نقطہ پر میری کل عرضداشت کو ناقابلِ قبول قرار نہ دے دیں۔ اس لیے میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کرنا نہیں چاہتا، البتہ ان تمام احادیث پر جو اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں یا پیش کی جا سکتی ہیں فرداً فرداً بحث کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اگر شیعہ حضرات کی مستند احادیث کی مدد سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باہن الوجوہ عمدہ برآ ہو جاؤں گا۔ اور اس لیے میں بالکل غیر منظرانہ طور پر یہاں ان احادیث کو نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو شیعہ حضرات کے لیے ہر حیثیت سے قابلِ قبول ہیں اور جن کے اعتبار سے خلافتِ امامت کے مسئلہ میں میرے نقطہ نظر کی کامل تائید ہوتی ہے:-

خلفائے راشدین

یکھل ہوئی حقیقت ہے کہ حضرت علیؑ نے خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو کبھی بھی اسلام کے منافی قرار نہیں دیا۔ یہی نہیں کہ ان حضرات کو ہمیشہ نہایت مقدس و قابلِ احترام سمجھا اور ہمیشہ ان کے ساتھ تعاون و اشتراکِ عمل کرتے رہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر خلفائے ثلاثہ کا زمانہ واقعی خاصانہ دورِ خلافت ہوتا تو حضرت علیؑ جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس

غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں ہرگز سہم نہ کرتا۔ اور پوری طاقت کے ساتھ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے خدا و رسول کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ جس کے بعد یہ اتودہ اعلان کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر سندِ خلافت پر متمکن ہو جاتے اور جہیل کی طرح میدانِ کارزار میں خاک و خون میں ٹپتے نظر کرتے۔ ہمارے شیعی نمائندوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ :-

(خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے) دور میں اصل خلافتِ اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکمِ خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدودِ علمی کے اندر (۹) بہت حد تک ظواہرِ اسلامی محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اور بابتِ شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یعنی شریعتِ اسلام اُدھار کا حکمِ خداوندی کے ساتھ کھلم کھلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا۔ محرمات و کبائر کی تلقین نہیں تھی۔ بلکہ ان کے اوپر حدود کا اجراء کیا جاتا تھا۔ اور بغیر کسی تاویل و توجہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقتِ اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن بہر حال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی۔ اور چونکہ اس وقت تلوار اٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی عمر ختم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے علمی ایسے محاذِ اسلام نے تلوارِ نیام میں رکھی اور پچیس برس کی طویل مدت تک اپنے حقوق کی پامالی (۱) اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گزار دی۔ اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہ کی۔“ (نکارِ جنوری، ص ۳۷ صفحہ ۸۹)

اس کے جواب میں میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ صرف ذیل میں ان کتابوں سے جن کو اہل تشیع قابلِ استناد و لائقِ استشہاد مانتے ہیں چند ایسی روایات نقل کیے دیتا ہوں جن سے ظاہر ہو گا کہ حضرت علیؑ کی رائے میں ابوبکرؓ و عمرؓ کی ذاتِ نیران کے

عہدِ خلافت کی کیا وقعت تھی؟ پھر اگر یہ روایتیں بخاری سے نقل کی جاتیں تو بلاشبہ ہمارے شیعہ بمعانی ان پر ہنسی اڑا سکتے تھے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں خود انہیں کی قابلِ اعتناء کتابوں سے یہ حوالے پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

۱۔ جس زمانہ میں حضرت علیؑ اور امیر معاویہؓ کے مابین خلافت کا قضیہ چل رہا تھا اس وقت جناب علیؑ نے امیر معاویہؓ کو ایک طویل خط بھیجا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔
 ”اے معاویہ! پچھ زشتہ بودی کہ فاضل تر اصحاب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر صدیق و بعد ازاں عمر فاروق بودند بجان و سر تن کہ نصیب ایشان بزرگی بوده است“

آگے چل کر اسی خط میں آپ لکھتے ہیں کہ:۔

اُن دونوں کی وفات نے مجھ کو اور تمام مسلمانوں کو عظیم صدمہ پہنچایا ہے خداوند تعالیٰ ان پر رحمت کرے۔ انھوں نے دین کے استحکام کے لیے بہت سی نیک باتیں کیں اور اسلام کو بہت سی بدعتوں سے پاک کر دیا۔ خدا انھیں جزاٰ خیر دے۔ لیکن اے معاویہ! تجھ کو ان بزرگوں سے کیا نسبت؟ وہ ہمارے صدیق تھا اور ہم ہی سے تعلق رکھتا تھا، تجھے اس سے کیا سروکار؟ اسی طرح عمر فاروق ہمارا فاروق تھا جو سچے کو باطل سے جدا کرتا تھا، وہ ہمارے دوستوں کا دوست اور ہمارے دشمنوں کا دشمن تھا۔“

۲۔ سوید بن غنفہ ایک صحابی تھے، آپ نے ایک روز حضرت علیؑ سے کہا کہ ”اے علیؑ آج میں نے ایک ایسا مجمع دیکھا جو ابوبکر و عمر کی حقارت کرتے تھے، اور عبداللہ بن سبا ان کا سر غنہ تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر ان کو بدکلامی سے روکا۔ لیکن انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم حضرت علیؑ کی مرضی سے ایسا کرتے ہیں۔“

۱۰ کتاب الفتوح ابن عامر کوفی شیعہ صفحہ ۵۷۔ شرح منہج البلاغہ مطبوعہ ایران

۳۵۳

صحابی مذکور فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت علیؑ بہت غضبناک ہوئے اور اسی روز آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں رسولؐ کو یہ فرمایا کہ:-

”میں اس قوم کو عذاب کروں گا آخر وہ ہیں کون؟ نیز اہل ہوں میں اس قوم سے جو رسولؐ کے دو بھائیوں رسولؐ کے دو وزیر ہیں اور مسلمانوں کے دو باپوں کی ہیں تو میں کہتے ہیں، حالانکہ ان کا دوست اونچے پایہ کا مومن اور ان کا دشمن فاسق و بے دین ہے۔“

۳۔ قمی شیعہ نے اپنی تفسیر قرآن میں سورہ توبہ کی مشہور آیت ”ثانی اثین اذہانی الغار“ کے ذیل میں اپنے باپ کی سند سے بحوالہ امام جعفر صادقؑ یہ روایت نقل کی ہے ”قال لسا کان رسول اللہ فی الغار قال لابی بلرکالی النظر الی السفینۃ جعفر واصحابہ نعتم فی البحر والنظر الی الانصار فقال ابو بکر وزناہم یا رسول اللہ انت الصدیق“

”مردی ہے کہ جب نبی کریمؐ غار میں تھے تو آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا کہ مجھے ایسا نظر آتا ہے گویا کہ میں جعفر اور اس کے رفقاء کی کشتی کو سمندر میں کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں اور انصار کو بھی دیکھ رہا ہوں۔“ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے دریافت کیا کہ ”اے رسول خداؐ کیا آپؐ سچ جج اخیس دیکھ رہے ہیں؟“ آپؐ نے جواب دیا ”ہاں“۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ ”تو مجھے بھی دکھا دیجئے۔“ یہ سن کر آپؐ نے ان کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور ان کو بھی دکھلادیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے کہا آپ صدیق (سچے) ہیں۔“

۴۔ سورہ نور کی ایک آیت ہے۔ ”ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (یعنی خدا اس زمین کا وارث اپنے نیک بندوں کو بتاتا ہے) اس کی تفسیر میں خلاصۃ المصحح کے

۱۲ اہ اواق المحابیت از یحییٰ ابن حمزہ شیعہ زیدی

شیعہ مجتہد صاحب فرماتے ہیں:-

”در اندک زمانہ حق تعالیٰ وعدہ مومنان را وفا نموده جزیرہ عرب و دیار کسریٰ

و بلاد روم بدیشال ارزانی نموده“

اس توضیح کی ضرورت نہیں کہ جزیرہ عرب و دیار کسریٰ اور بلاد روم خلفائے ثلاثہ ہی کے عہد میں مفتوح ہوئے ہیں۔

۵۔ شیعوں کی کتاب کشف الغمہ میں یہ روایت مذکور ہے کہ ”جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے۔“

۶۔ جس وقت حضرت صدیق اکبر نے وفات پائی۔ تو حضرت علیؑ زار و قطار روئے ہوئے خلیفہ اول کے جنازہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ آج کے دن نبوت کی خلافت منقطع ہو گئی اور فرمایا احسن الخلفاء حین ارتداد الناس۔
فصول امامیہ میں ہے:-

عن ابی جعفر محمد بن علی الباقر علیہ السلام انه قال لجماعة خاضوا فی ابی بکر وعمر وعثمان اما تخبرونی انهم من المهاجرین الذین اخرجوا من ديارهم واموالهم یبتغون فضلا من الله ورضوانا ویتصرون الله ورسوله؟ قالوا لا فانهم من الذین یتبوعون والدار والایمان قبلهم یحبون من هاجر الیهم؟ قالوا لا وقال ”اما تدبریم ان تكونوا احدا هذین الفریقین واما اشهد انکم لستم من قال الله تعالیٰ فیهم والذین جاؤا من بعدهم یتقربون ربنا اغفر لنا ولا اخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا قلا للذین امنوا ربنا انک رحیم“

”ابو جعفر محمد بن علی باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے

ابوبکر عمراد عثمان کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ لوگ (یعنی ابوبکر و عمراد عثمان) ان مہاجرین میں سے تھے جن کے متعلق خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ "الذین اخرجوا من ديارهم الخ (یعنی وہ لوگ جو بعض اس لیے بے خانہ مال کیے گئے کہ وہ خدا کی خوشنودی کے طلبگار تھے اور اللہ اس کے رسول کی مدد کرتے تھے) اس کے جواب میں ان لوگوں نے کہا "نہیں" پھر آپ نے دریافت کیا کہ "تو کیا پھر یہ لوگ (ابوبکر و عمراد عثمان) ان لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ "من الذين يتوء الى الايمان ... الخ۔ (یعنی وہ جنہوں نے اپنا سب کچھ مہاجرین کے لیے وقف کر دیا) اس کا جواب بھی ان لوگوں نے نفی میں دیا۔ یہ سن کر آپ نے کہا "بیشک تم خود بھی مذکورہ بالا دونوں درجوں (یعنی مہاجرین و انصار) میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہو۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہو جو مہاجرین و انصار کے بعد آئیں گے۔ اور جو اپنے لیے اور اپنے ان بھائیوں کے لیے جو ان سے پہلے گزر چکے دعائے مغفرت کریں گے، اور یہ کہیں گے کہ "اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے بغض و عناد پیدا نہ کر۔ اے اللہ تو مہربان رحمت والا ہے۔"

۸۔ منج البلاغت میں حضرت علیؑ کا ایک خطبہ درج ہے۔ یہ خطبہ اس وقت دیا گیا ہے جبکہ حضرت عمرؓ و دردم پر جہالت کا قصد فرما رہے تھے۔ اس خطبہ میں جناب امیرؓ نے حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کا ملجا و ماواظا ہر فرمایا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ تم بذاتِ نفس جہاد پر نہ جاؤ۔ تم عرب کی جان ہو۔ اس لیے تمہاری جان کو نقصان پہنچنا کل اہل عرب کو نقصان پہنچنے کے مترادف ہے۔

یہ خطبہ بہت طویل ہے اور منج البلاغہ میں تمام و کمال درج ہے۔

۹۔ جلاء العیون کے باب دمایا میں حضرت علیؑ کی یہ وصیت درج ہے :-

”اصحابِ رسولؐ کی رعایت کرو“ انصوں نے خدا کے دین میں کوئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے کی راہ دی۔^۱
یہ امر محتاج بیان نہیں کہ خلفائے ثلاثہ کو کسی نے صحابہؓ کی صفت خارج نہیں کیا ہے۔

الوہی خلافت

صفحاتِ ماقبل میں یہ امر بخوبی واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق قرآن مجید بالکل ساکت ہے اور اس میں کوئی نص قطعی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس خلافت پر استدلال کیا جاسکے۔ شیعہ حضرات کے منہ اندہ نے اس سلسلہ میں جتنی آیات کو کھینچ تان کر اس واقعہ سے متعلق کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان سب پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ لیکن اس پر ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر قرآن مجید میں جناب امیرؓ کی خلافت کے بارے میں نصوص قطعیہ موجود ہوتیں تو بعض شیعہ اہل علم کو قرآن میں تخریف کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے شیعہ مجتہدین کی جانب سے قرآن میں تخریف کی گئی ہے اور تخریف شدہ عبارتوں میں صرف جناب امیرؓ کی خلافت و وصایت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس لیے ظاہر ہے کہ اگر قرآن اس بارے میں ساکت نہ ہوتا تو یہ غریب اتنے بڑے اقدام کی زحمت کیوں گوارا کرتے۔

چنانچہ علامہ باقر مجلسیؒ نے اپنی کتاب حیات القلوب کی جلد سوم میں خوب جی بھر کر قرآنی آیات میں مکمل اضافہ کیا ہے۔ ولایت علیؓ کے ثبوت کے لیے حسبِ درخواست مناسب الفاظ بڑھادیے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ ”وحدیث وارد شدہ کہ ثلث قرآن و انضال اہل بیت و ثلثہ در مشالبت دشمنان ایشان است“^۲

۱۔ جلاء العیون جلد اول صفحہ ۲۰۸ ۲۔ حیات القلوب حصہ سوم صفحہ ۴۱

اسی طرح اس مصنف نے اپنی ایک دوسری کتاب ”تذکرۃ الائمہ“ میں بھی آیات کو تحریف کیا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس شیعوں کی کتاب ”حدیث کلینی“ میں قرآن کی ستر ہزار آیات بیان کی گئی ہیں حالانکہ موجودہ قرآن میں صرف چھ ہزار آیات ہیں۔

پتہ کی خدا بخش لائبریری میں بھی ایک تحریف شدہ قرآن مجید موجود ہے جس میں چند آیات کے اضافہ کے علاوہ ولایت و وصایت پر مستقل دو سو تین بڑھائی گئی ہیں۔

یہاں میں اس بات کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے غالباً جمہور شیعہ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں اور اس لیے میرا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں عام شیعہ حضرات کو تحریف قرآن کا قائل ثابت کر دوں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن میں خلافت علیؑ کے متعلق نصوص قطعیہ موجود نہیں ہیں اور اسی بنا پر بعض شیعہ مجتہدین کو اپنے اس عقیدہ کے ثبوت کے لیے قرآن مجید میں تحریف کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آیا۔

حضرت علیؑ کی الوہی خلافت کے ثبوت میں بہت سی احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں غدیر خم کی حدیث کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن میں ان احادیث پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے برخلاف میں تو شیعہ حضرات کی مستند کتابوں سے صرف یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ الوہی خلافت کا اعتقاد غلط ہے۔ یعنی خدا یا رسول خدا کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ رسول کریمؐ کے بعد حضرت علیؑ ہی خلیفہ بنائے جاتے۔

اہل تشیع کے مشہور مجتہد بحرانی نے شرح نہج البلاغہ (مطبوعہ طران) میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:-

”ایک رات رسول کریمؐ اپنی زوجہ حضرت حفصہ کے حجرہ میں تشریف رکھتے تھے مگر اتفاق سے حضرت حفصہ اس وقت موجود نہ تھیں اور اس لیے آپؐ نے یہ رات اپنی دوسری زوجہ ماریہ قبطیہ کے حجرہ میں بسر فرمائی۔ صبح حضرت حفصہ کو اپنی حق تلفی کی شکایت ہوئی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا، کہ ”اے حفصہ تم ناخوش نہ ہو“ ہم تم کو دو خوشخبریاں سناتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماریہ قبطیہ کو ہم نے اپنے اوپر حرام کیا، دوسرے یہ کہ ہمارے بعد ہمارا خلیفہ ابوبکر ہوگا اور اس کے بعد تمہارا باپ عمر۔ لیکن دیکھو یہ راز ہے۔ اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ خدا تعالیٰ ہم پر ناراض ہوگا۔ اس پر حفصہ نے دریافت کیا کہ آپؐ کو یہ خبر کس نے دی، حضورؐ نے فرمایا ”کہ علیم و خبیر نے“ مگر حضرت حفصہ نے مارے خوشی کے یہ خبر عائشہ صدیقہ کو کر دی۔ اور تمام مدینہ میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس پر فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔

”اے رسولؐ جو چیز ہم نے تجھ پر حلال کر دی ہے تجھ کو اس کے حرام کرنے کا کیا اختیار حاصل ہے اور اے نبیؐ کی بی بیو اپنے نبیؐ کا راز کسی پر ظاہر نہ کیا کرو۔“ (سورہ تحریم)

اس روایت سے اس بات کا با وضاحت پتہ چلتا ہے کہ خدائے کریم کو یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ رسول کریمؐ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں بلکہ اس کے برعکس ابوبکر و عمر کی خلافت ایک طے شدہ مسئلہ تھا جو خود رسولؐ کے علم سے بھی باہر نہ تھا۔

۲۔ جلال العیون میں لکھا ہے کہ جب رسول کریمؐ پر مرض الموت کا غلبہ شدید ہوا تو آپؐ نے چاہا کہ اپنی میراث و جائزینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد فرمادیں مگر حضرت عباس نے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا، میرے بھائے حضرت علیؓ کے سپرد کر دیجئے۔

۳۔ جلال العیون مطبوعہ مطبعہ جعفری لکھنؤ ص ۶۔

اس روایت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ رسول کریمؐ اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علیؑ ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے۔

۳۔ ملا باقر محمد نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ”ایک بار نبی کریمؐ نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالیٰ نے سب رد کر دیں۔ آخر شب میں حضرت علیؑ بھی مسجد میں تشریف لائے رسول خداؐ نے فرمایا۔ ”اے علیؑ تمہاری ولایت اور خلافت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی۔“

غالباً میں اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لیے اس سے زیادہ روشن دلیل اور کوئی پیش نہیں کر سکتا حتیٰ کہ اگر میں حدیث گھڑنے پر آمادہ بھی اس سے زیادہ واضح اور غیر مبہم حدیث گھڑنے میں شاید مشکل کا بیاب ہو سکتا۔

۴۔ ”عیون الاخبار“ شیعوں کی معتبر کتاب ہے۔ اس میں حضرت علیؑ سے حسب ذیل روایت منقول ہے۔

فَبَيَّنَّا اَنَا نُمَثِّي مَعَ النَّبِيِّ فِي بَعْضِ طَرَقِ الْمَدِينَةِ اِذْ نَقِينَا مَشِيْمَ طَوِيلٍ — فَسَلَّمَ عَلَيَّ النَّبِيُّ وَارْحَبَ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلَيَّ فَقَالَ سَلَامٌ عَلَيَّكَ يَا رَايِعَ الْخُلَفَاءِ رَحِمَهُ اللهُ وَبَرَكَاتُهُ اَلَيْسَ ذَلِكَ هُوَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ بَلَىٰ — ثُمَّ مَضَىٰ۔

”ایک مرتبہ ہم رسول کریمؐ کے ساتھ مدینہ کی کسی سڑک پر چل رہے تھے۔ کہ دفعہ ہم سے ایک طویل قد انسان سے ملاقات ہوئی۔ اس شخص نے رسول کریمؐ کو سلام کیا اور مرجا کہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔ سلام علیک اے جو حق خلیفہ آپ پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو“ اس کے بعد اس نے

رسول کریمؐ کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا، کیا یہ چوتھے خلیفہ نہیں ہیں؟ اے رسول
خدا! آپؐ نے فرمایا 'ہاں' اس کے بعد وہ چلا گیا۔

ان روایات کو نقل کر دینے کے بعد غدیر خم کے قسم کی تمام احادیث اگر قابل اعتبار
نہیں تو کم از کم مشکوک و مشتبہ ضرور قرار پا جاتی ہیں۔ جس کے بعد ان کو صحیح ثابت کرنے کے
دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یعنی اہل روایت یا (۲) جمہور مسلمین کا عقیدہ۔ جسے فقہاء کی اصطلاح
میں اجماع کہا جاتا ہے۔

روایت کے نقطہ نظر سے الہی خلافت کا عقیدہ جس قدر ناقابل قبول ہے اس پر تفصیلی
بحث ہو چکی ہے۔ یہ کیا جمہور مسلمین کا مسئلہ، سو اس میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں کر دے
زمین پر جو مسلمان بستے ہیں ان میں سے دس بارہ فیصدی سے زیادہ خلیفہ عقیدہ کے قائل نہیں
ہیں۔ لیکن ہے میری اس دوسری شے یعنی جمہور مسلمین کے عقیدہ کو صحیح ماننے سے شیعہ حضرات
کو کچھ اختلاف ہو۔ اس لیے میں اس سلسلہ میں عقلی دلیل پیش کرنے کے بجائے حضرت علیؑ
کا وہ قول نقل کر لینا کافی سمجھتا ہوں جو شیعوں کی معتبر کتاب منہج البلاغہ میں درج ہے یعنی
ان امیر المومنین قال الناس جماعة بين الله عليهم وغضب الله
على من خالف ان الله اهل السنة والجماعة۔

”امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ (یعنی کرم) ہوتا ہے
اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے خدا اُس پر غضبناک ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خدا کی قسم میں اہل
سنت والجماعت ہوں“ (یعنی سنت رسولؐ کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد
ہوں)

ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے کسی مزید توضیح و تشریح کی حاجت
باقی نہیں رہتی۔



اے ملے شیعہ اس باب میں متفق ہیں کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

سیاسی اختلاف

اہل تشیع اپنے اختلافات کو مذہبی عقیدہ اور مذہبی مسلک کا اختلاف قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ حضرت علیؑ کی خلافت کے وقت تک الٰہی امامت کی قسم کا کوئی عقیدہ یا شیعیت کے موجودہ اختلافی عقائد میں سے کوئی عقیدہ موجود نہ تھا۔ حضرت علیؑ کا خلیفہ ہونا یا نہ ہونا محض ایک سیاسی اختلاف تھا، بلکہ میں تو اسے سیاسی بھی نہیں صرف رائے کا ایماندارانہ اختلاف کہتا ہوں۔ یعنی بعض اصحاب کی رائے میں وہ موزوں تھے اور بعض کی رائے میں ناموزوں۔ اس امر کو مذہب کی بنیاد و اساس سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا۔ لیکن بدقسمتی سے حضرت علیؑ کے زمانہ میں ایک نو مسلم یہودی عبداللہ بن سبا نے الٰہی امامت کے عقیدہ کو سب سے پہلے اہل اسلام کے کان میں پھونکنا شروع کیا۔ یہ عقیدہ یہودی مذہب میں پایا جاتا ہے اور اس لیے اس نے کچھ تو اپنے سابق مذہب کے اثرات کے ماتحت اور کچھ دیگر سیاسی اغراض کے پیش نظر اس عقیدہ کی تبلیغ شروع کر دی اور حضرت علیؑ کی ذات کے ساتھ وہ صفات منسوب کی جاتی ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے مشہور مجتہد فاضل امیر آبادی فرماتے ہیں:-

وكان (عبدالله بن سبا) اول من شمرع بالقول بخبر ضيعة امامته علي.

”عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علیؑ کی امامت بنی زعفریہ“ اس کے علاوہ منہج المقال، مجمع البحرین، تہذیب طبری، اجداد الیعون وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

عبداللہ بن سبا نے ائمہ کے ساتھ بالکل الٰہی صفات منسوب کر کے انہیں انسان سے خدا بنا دیا۔ چنانچہ شیعوں کے مشہور جامع احادیث ”کلینی“ نے عمار جہنی سے ایک روایت

نقل کی ہے جس میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:-

انا عین اللہ انا بید اللہ انا جنب اللہ انا باب اللہ

”ہم اللہ کی آنکھ میں، ہم اللہ کے بائیں ہاتھ میں، ہم اللہ کا پہلو میں، ہم اللہ کا دروازہ ہیں“
بحار الانوار جلد دوم صفحہ ۱۱۱ میں حضرت امام حسینؑ کی زبان سے یہ جملہ منقول ہے:-

”ہم اللہ کی اولاد ہیں“

اسی کتاب کے صفحہ ۸ پر ہے کہ امام حسینؑ شہید نہیں ہوئے بلکہ عیسے ابن مریمؑ کی طرح زندہ آسمان پر اٹھالیے گئے۔

تفسیر ہندی میں شیخ ابو جعفر طوسی شیعہ داؤد بن کثیر سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابو عبد اللہ علیہ السلام یعنی امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ کیا نماز، زکوٰۃ اور حج سے آپ ہی کی ذات مبارک مراد ہے؟ اس پر مستفسر کو جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ نہ صرف نماز، زکوٰۃ اور حج ہی سے ہماری ذات مراد ہے، بلکہ بیت الاحرام، بلد الحرام، کعبۃ اللہ اور قعبۃ اللہ سے بھی ہم ہی مراد ہیں۔

شیعوں کے مشہور مستند مجتہد احمدیث ”اصول کافی“ میں لکھا ہے کہ قرآن میں جس جگہ ”رب یا ربک“ کا لفظ آیا ہے اس سے حضرت علیؑ مراد ہیں۔

الغرض اس قسم کے عقائد کو اس زمانہ میں بڑی شدت کے ساتھ پھیلا یا گیا لیکن حضرت علیؑ نے ہمیشہ ان کے خلاف اپنی نفرت و بغیراری کا اعلان کیا۔ مگر چونکہ مجھے استناد میں صرف اہل تشیع کی کتابوں کے حوالے پیش کرنا ہیں اس لیے ”کلبینی“ کی مندرجہ ذیل روایت پر اکتفا کرتا ہوں جو سدی سے مروی ہے۔

”فرمایا حضرت علیؑ نے، اے اللہ لعنت کر ہمارے دشمن پر اور لعنت کر ہمارے اس دوست پر جو حد سے بڑھ جائے، یعنی مجھ کو یہ رتبہ سے بڑھا دے“
اسلام نے توحید پر جتنا زور دیا ہے اور جس بیباکی و درندہ آہنی کے ساتھ خود من

کو ایک معمولی انسان ظاہر کیا ہے اس کے پیش نظر مذکورہ بالا اعتقاد کا غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہونا کسی طرح بھی محل نظر قرار نہیں پاسکتا۔ اور غالباً اگر سیاسی رائے کا اختلاف اور قبیلوں کی باہمی عنصیت کی بنا پر حضرت علیؑ اور آپ کے فرزندوں کی مخالفت کا مسئلہ یوں سمجھ نہ جاتا تو اس قسم کے عقائد رکھنے والا کوئی ایک فرد بھی اسلام میں نہ پایا جاتا۔ لیکن حضرت علیؑ اور معاویہ کی جنگ جمل میں شہادت اور بنو امیہ کی سخت گیر پالیسی کی بنا پر یہ عقائد خفیہ خفیہ متلیٰ کے حامیوں میں پھیلنے شروع ہو گئے جنہوں نے رفتہ رفتہ ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کی۔ اور یہی وہ جند عقائد ہیں جن کو آج شیعیت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ عقائد غیر منظم طور پر ہر شخص کے اپنے ذاتی جذبات و احساسات اور ذاتی عنصیت و اضافی حالات کے بموجب شائع ہوئے اس لیے شیعوں میں بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے جیسا کہ ”کلینی“ وغیرہ کتب شیعہ سے پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ کسی صاحب نے تو بدرالدجی ”نام ایک رسالہ میں مذہب ہے کہ شیعوں میں ستر سے زیادہ فرقے ہیں۔ اور ان کے نام اعتقاد تفسیل سے گنائے گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اول اول تو حضرت علیؑ کی خلافت کا قضیہ محض ایک سیاسی قضیہ تھا اور اصلی مذہب کے بنیادی اور اساسی اعتقادات سے اسے کوئی دور کا علاقہ بھی نہ تھا لیکن بعد میں تاوانفت غیر غلط اور خود غرض افراد نے اپنے مقلدوں کے دائرہ کو وسیع کرنے اور ان کو شدت کے ساتھ اس مسلک پر عمل پیرا بنانے کے لیے خواہ مخواہ اسے مذہبی رنگ دینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سیدھا سادا سیاسی مسئلہ رفتہ رفتہ ایک مذہبی عقیدہ میں تبدیل ہو گیا۔ اور عالم اسلام میں دو مختلف کمپ بن گئے۔

لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے شیعہ حضرات یہاں کی دیگر اقوام کی طرح ابھی تک بدستور جہل و تعصب کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں لیکن بلاواسطہ کے شیعہ حضرات کی نظروں کے سامنے رفتہ رفتہ یہ حقیقت بنے نقاب ہو رہی ہے۔ چنانچہ

شہد شیعہ فاضل مرزا عبدالکریم دہخانی نے شیعہ سنی کے قضیہ پر ایک مبسوط و مفصل مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں کہ:-

”اگر ہم شیعہ سنی دونوں کے خیالات، کے فردی اور بنیادی اصولوں کو علمی طور پر اور خلوص دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ صرف ایک اہم سیاسی اختلاف رائے ہے دونوں گروہوں میں پایا جاتا ہے اور وہ امامت یا خلافت کے نظریہ سے متعلق رکھتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی اختلاف ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں سنی ایک سیاسی نظریہ کو مانتے ہیں اور شیعہ دوسرے نظریہ پر ایمان لاتے ہیں۔“

لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ مسرت وہ الفاظ ہیں جو شیعہ ایران عراق کے مفسر ہی پیشوا شیخ دہخانی نے دسمبر ۱۹۳۱ء میں کامل دمدارانہ حیثیت سے جامعہ اذہر مصر میں ایک تاریخی تقریر کرتے ہوئے بیان فرمائے ہیں۔ آپ نے فرمایا:-

”شیعہ سنی کا اختلاف فی الحقیقت ایک فرعی اختلاف ہے جس طرح کہ سنیوں میں حنفی اور شافعی کا اختلاف ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ اختلاف شیعہ سنیوں کے درمیان حدِ فاصل بن گیا ہے“

سہزاد شیعہ مذہب کے بارے میں ایک بات اور پیش کر کے اس بحث کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

محبت دہردی ہر اصلاحی ادارہ کا بنیادی اصول ہے اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہر اصلاحی ادارہ کی بنیاد اخوت عامہ محبت دہردی کی مضبوط و مستحکم چٹان پر نصب کی جاتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی تحریک عام اس سے کہ اسے الماحی مذہب کے نام سے تعبیر کیا جائے یا اصلاحی ادارہ کے نام سے اس وقت تک خالص الوہی یا

اصلاحی قرار نہیں دی جاسکتی جب تک کہ اس کی بنیادیں نفرت و عناد کے بجائے فحشاء و فجور پر استوار نہ کی گئی ہوں۔ یعنی کوئی سچا اور الٰہی مذہب اس لیے نہیں آیا کہ انسانوں کے کسی خاص طبقہ کے خلاف نفرت و حقارت کی اسپرٹ پھیلائے بہرحینہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر اصلاحی ادارہ نفرت کی اسپرٹ سے بالکل نا آشنا ہوتا ہے کیونکہ بہرحال وہ اپنے مخالفوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن اس کی یہ ناپسندیدگی اصل مذہب کی بنیاد نہیں ہوتی۔ یعنی کسی مذہب کا بنیادی عقیدہ یہ نہیں ہوتا کہ آفت کو ذیل سمجھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ تب اچھا ہے اب اس سلسلہ میں ضمناً آفت بُرا ہو جاتا ہے تو ہو جائے اور اس لیے دنیا کے ہر اصلاحی ادارہ میں نفرت و عناد کی اسپرٹ منفیانہ یا سلبی طور پر پائی جاتی ہے نہ کہ اثباتی اور دہجونی طور پر۔

لیکن دنیا میں یہ امتیاز صرف شیعہ مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کی بنیاد محبت و اخوت کے بجائے نفرت و عناد کے جذبات پر قائم کی گئی ہے یعنی جہاں شیعوں کے بنیادی عقائد میں حضرت علیؑ کو امام و وصی ماننا داخل ہے، وہاں خلفائے ثلاثہ پر تبرّا کرنا اور ان کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنا بھی مذہب کا جزو قرار دیا گیا ہے۔

نفرت و عناد کے اس عقیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل تشیع کے عقائد کی بنیاد و حقیقت محبت و اصلاح پر نہیں ہے بلکہ نفرت و انتقام پر ہے، کیونکہ اگر یہ مانہ ہوتا تو اس میں کسی کو بُرا بھلا کہتا ہرگز فرض نہ قرار دیا جاتا۔ حالانکہ خلفائے ثلاثہ کے خلاف داؤد و عن دینا ہی و حقیقت اصل شیعیت سمجھا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی احتیاج کی طرح تک سنے کو تیار نہیں۔

شیعہ حضرات کے یہاں خلفائے ثلاثہ کے برحق ماننے والوں کو کوسنا پیٹنا

فرض بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ شیعہوں کے مجموعہ احادیث ”جامعہ عباسی“ میں لکھا ہے کہ اگر کبھی کسی شیعہ کو اتفاقاً کسی غیر شیعہ کے جنازہ کی نماز پڑھنا پڑ جائے تو اس کے لیے یہ دعا مانگے :-

”اے اللہ اس کی قبر میں سانپ اور بچھو متعین کر دے اس کے پیٹ میں آگ بھردے، اس کو دوزخ میں ڈال دے“
پس جب تک اہل تشیع میں تیرے کو اثباتی اور وجہی حیثیت حاصل ہے اس وقت تک اس فرقہ کے عقائد کو اصلاحی یا الہامی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ اسے انتقام و نفرت کے اس جذبہ سے منسوب کیا جائے گا۔ جو عام اخلاق و شائستگی کے بھی سرسرمنا فی ہے۔ چرچا ہے کہ اعلیٰ اخلاق و روحانیت سے۔

ابوسعید برزنجی ایم اے

رسالہ نگار ثابت جولائی ۱۹۳۷ء



jabir.abbas@yahoo.com

۳۶۹

مسئلہ خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

”م، ح“ کے قلم سے

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

یادش بخیر! میرے محترم نیاز تقویٰ صاحب عجیب دلچسپ انسان واقع ہوئے ہیں۔ مجھے آپ کا وہ زمانہ یاد ہے جب آپ عالمِ بالاتر لیتے گئے تھے اور جنتِ دوزخ کی سیر میں مصروف تھے۔ لیکن نتیجہ ہی "مہبوط" ہوا۔ پھر اسی روز گاہِ زہد و معصیت کی طرف لوٹے، پھر وہی لیل و نہار دہی کار و بازو وہی نقش و نگار! نہ جانے کیوں انھیں لاندہب کہا جاتا ہے۔ لاندہبیت ہی میری دانست میں کوئی مفہوم حقیقی نہیں رکھتی۔ مذہب کی وسیع گہرائیوں سے کوئی انسان باہر نہیں جاسکتا۔ لاندہبیت بھی ایک مذہب ہے جسے دہریت یا ہجرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر نیاز کو لاندہب کہنا کیونکر دیا ہو سکتا ہے؟

میں نقش و نگار کا پرستار نہیں لیکن پھر بھی مجھے جس قدر لطفِ نگارگی حاصل ہو سکا میں سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب کو مذہب اور بالخصوص مذہبِ اسلام سے بہت کافی شغف ہے۔ ہمیشہ نگار کے صفحات پر مذہبیات کی ایک عجیب و غریب دنیا آباد رہتی ہے۔ یہ ادبات ہے کہ اس میں کوتاہ نظروں کے لیے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ امامت و خلافت کا مسئلہ زہد و تقویٰ کی طرح کس قدر خشک واقع ہوا ہے لیکن آج وہی مسئلہ نیاز کے لیے موضوعِ بحث ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلی بار اس مشہور مختلف فیہ مسئلہ میں "سنجیدگی" کے ساتھ نگار ہی کے صفحات پر بحث جاری ہوئی ہے کہ جس نے بھی اس میں حصہ لیا متانت نگار سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے کسی (حقیقی یا فرضی) ہزنام صاحب جس میں ہزنام کی گنجائش (ہے) کے نام سے اس بحث کا آغاز ہوا، مجھے خبر نہیں کہ انھوں نے کیا لکھا اور کیونکر اس سلسلہ میں شیعہ نقطہ نظر کی تائید فرمائی تھی۔ لیکن محمد نازوق صاحب کا نزدیک مفہوم ”فاران مجنور“ میں میری نظر سے گزرا تھا، مگر قسمتی سے وہ بھی اس دقت ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔ پھر خود جناب نیاز صاحب کا لکھا کہ شائع ہوا۔ اور اس پر ”آزاد خیال شیعہ کے قلم سے“ تبصرہ شائع ہوا۔ یہ دونوں مضامین اس دقت میرے پیش نظر ہیں۔

مجھے علم نہیں کہ علماء اہلسنت کی جانب سے نیاز صاحب کی دعوت جواب تائید و ستیجاب ہوئی یا نہیں میں اپنے ذاتی خیالات کے پیش کرنے میں سبقت کر رہا ہوں ممکن ہے میری تحریر آزاد خیالی و تنگ خیالی کے اصلی خط وصال کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ تیرہ سو برس کا زمانہ دراز گزر چکا لیکن آج تک گرفتارانِ بوبکر و علیؑ کے درمیان یہ امر حقیق ہی نہ ہو سکا کہ مستحقِ خلافت بلا فصل حضرت ابو بکرؓ تھے یا حضرت علیؓ۔ یقین کیجیے ایسے تفرقہ انگیز مباحث پر قلم اٹھانا سخت گرانمایا خاطر ہوتا ہے لیکن ضرورتیں مجبور کردیتی ہیں کہ ایسے فیصلہ طلب مواقع پر اپنے بے لاگ خیالات کا نہایت صفائی کے ساتھ اظہار کر دیا جائے۔

ایجاز و اختصار بیان کے لحاظ سے میں نیاز صاحب کے محاکمہ کی بابت براہِ راست کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ جو کچھ ان کے ارشادات ہیں وہ ان کے ذاتی خیالات یا بلفظ دیگر ”ناگفتہ معقولات“ ہیں۔ فریقین میں سے ان کی بات کا کوئی پابند نہیں۔ نہ وہ بقول خود کسی کے ترجمان میں۔ میرا مقصد صرف آزاد خیال شیعہ صاحب کے تبصرہ پر تبصرہ کرنا ہے اس سلسلہ میں اگر نیاز صاحب کے فرمودات بھی معروضِ بحث میں آجائیں گے تو انکی تصحیح بھی میرے لیے ناگزیر ہوگی۔

تبصرہ میں چند امور پر خصوصیت کے ساتھ زور قلم صرف کیا گیا ہے اور فی الحقیقت وہ مباحث ایسے ہی ہیں کہ اگر ان کے تمام پہلو روشنی میں آجائیں تو کم از کم فہم و بصیرت رکھنے والوں کے لیے صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ ان مباحث ضروریہ کو حسب درجہ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

- ۱۔ عصمتِ انبیاء و ائمہ۔
- ۲۔ وصایت جناب امیر کے اثبات کے لیے نصوص قطعیہ۔
- ۳۔ نفی مسئلہ خلافت۔
- ۴۔ اسلام کے نزدیک بہت اجتماعیہ کا مفہوم و اصول۔
- ۵۔ ہر دو فرق کے روایات پر سیاسی ماحول کا اثر



یہ ترتیب سوال صاحب تبصرہ کی ہے۔ اس میں چند سوالات غیر ضروری بھی ہیں جیسا کہ میرے آئندہ بیان سے ظاہر ہوگا اور ترتیب بھی میرے نزدیک کچھ زیادہ مناسب نہیں یوں رکھئے:-

- ۱۔ عصمتِ انبیاء و ائمہ
 - ۲۔ مسئلہ امامت
 - ۳۔ مفہوم خلافت
 - ۴۔ امور استحقاق خلافت
 - ۵۔ نصوص قطعیہ در باب خلافت۔
- پس انہیں امور پر اگر میر حاصل بحث ہو جائے تو مسئلہ خلافت کے تمام گوشے روشنی میں آجائیں۔
- میں اسی ترتیب کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

عصمتِ انبیاء و ائمہ

فریقین کے درمیان عصمتِ انبیاء کا مسئلہ میرے خیال میں مختلف فیہ نہیں ہے۔ معروض بحث میں صرف ائمہ کی عصمت آتی ہے لیکن چونکہ نیاز صاحب نے عصمتِ انبیاء کی بحث چھیڑ دی جس کی وجہ سے صاحب تبصرہ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ عصمتِ انبیاء کو بھی بکمال و تمام منفع کر دیں۔ اس لیے انہما حقیقت ہو گا اگر میں اس کا اعتراف نہ کر دوں کہ اس مسئلہ پر صاحب تبصرہ نے معقولیت کے ساتھ بحث کرنے میں بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ ذاتی طور سے مجھے ان کے خیالات سے چنداں اتفاق نہیں ہے۔ اور میں اس مسئلہ میں ایک حد تک نیاز صاحب کے نظریہ کی تائید کر دوں گا۔

حقیقت اس مسئلہ میں الفاظ کی نزاکت کے باعث التباس پیدا ہو گیا ہے، صرف دو چیزیں میں گناہ اور خطار اجتہادی، مجہول چوک کو بھی اس خطا میں داخل سمجھا گیا ہے حالانکہ یہ ایک علیحدہ امر ہے۔

گناہ کی بابت محاکمہ اور تبصرہ دونوں میں بالاتفاق یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یہ درست ہے۔

خطار اجتہادی اور مجہول چوک میں اختلاف ہے۔

نیاز صاحب کے نزدیک انبیاء سے خطار اجتہادی کا وقوع و صدور ممکن ہے اور مجہول چوک ہو جائی مگر منافی عصمت نہیں، صاحب تبصرہ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ خطار اجتہادی کو بھی نامکن الوقوع سمجھتے ہیں۔ (میں نامکن کا لفظ اسی معنی میں استعمال کر رہا ہوں جو صاحب تبصرہ نے بیان کیے ہیں) ان کے پاس اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر نبی سے امکان خطا و سیانہ اور اس کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ شریعت سے اطمینان و اعتبار ساقط ہو جاتا ہے اور پھر یہ سامان بنانا یا مکر و نڈہ دم کی دم میں ڈھیر نظر آنے کا

حالانکہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

رسول کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو خالق سے وابستگی کی صورت میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو بحیثیت اس کے بندہ ہونے کے بندوں کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے خالق سے اس کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الہیہ کو صحیح طریقہ سے حاصل کر کے باطن و جودہ اس کو بندوں تک پہنچا دے۔ اسی حیثیت کا اصطلاحی نام رسالت ہے۔ لیکن اس رسالت کے مسئلہ میں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ رسول کے لیے دو امر ضروری ہیں، اول اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح۔ یعنی احکام الہیہ کو اچھی طرح سمجھ لینا اور پھر اس کی صحیح طریقہ پر نشر و اشاعت کرنا۔

دوسری حیثیت نبی کی وہ ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان اور جملہ لوازمات انسانیت کے ساتھ متصف ہوتا ہے اسی حیثیت کو بشریت کہتے ہیں۔ اس امر کے واضح ہونے کے بعد یہ امر مغرور طلب ہے کہ نبی کی عصمت کس حیثیت کے لیے ضروری ہے، آیا رسالت اور بشریت دونوں کے لیے یا صرف رسالت کے لیے؟

میرے خیال میں رسالت کے لیے عصمت ضروری ہے اور اس کا اعتراف سب کو ہے، وہ گناہ نہیں کر سکتا، وہ خدا سے غلط احکام نہیں حاصل کر سکتا، اور نہ اس کو غلط طریقہ سے وہ دوسروں تک پہنچانے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

البتہ بشریت کے لیے میرے نزدیک عصمت ضروری نہیں ہے یعنی نبی کے وہ ذاتی امور کہ جو اسی حیات دنیویہ یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اگر کبھی لغزش ہو جائے تو اس کا کوئی منفی اثر عصمت رسالت پر نہیں مرتب ہو گا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ صاحب تبصرے قابل وکیل ادعای طیب کی مثال پیش کی ہے۔ بیشک ماہر قانون دان وہی سمجھا جائے گا۔ جو بیرونی مقدمات کے بارے میں غلطی کرتا ہی نہ ہو یا غلطی ہو جاتی ہو لیکن کم از کم طیب حاذق کے لیے ضروری ہے کہ وہ تشخیص امراض و تجویز علاج میں خطا نہ کرتا ہو یا بہت کم

کرتا ہو، بعینہً کم کی قید ہم اپنی انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں، لگہ خدا کسی طبیب حاذق کو متعین کرے تو یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ ایسا طبیب ”کم سے کم“ بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ نہ کٹھنیں امراض میں نہ تجویز علاج میں، لیکن ایسے طبیب کے لیے یہ تو مزوری نہیں قرار دیا جائیگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں غلط روی سے معصوم ہو۔ جہاں تک اس کی حذاقت طبابت کا تعلق ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی قدم جاوہ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ باوجود اس کے وہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں اگر کوئی لغزش کر جائے تو اس سے اس کی حذاقت طبابت پر کوئی حرج نہیں ہو سکتا۔ اس تقریر سے میرا صرف یہ مقصد ہے کہ انسان کے لیے کسی امر واحد میں کمال اس کو مستند نہیں کہ وہ جملہ کمالات کا حامل ہو۔ ٹھیک اسی طرح رسالت کا مسئلہ ہے رسول خدا سے احکام حاصل کرتا ہے اور بندوں تک اسے پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے عصمت لازم مستم ہے اور اس عصمت پر کوئی دھبہ نہ آئے گا، اگر وہ اپنے دنیاوی امور بشریت میں کوئی لغزش کر جائے۔ بشریت کی بار بار قید کا اضافہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ کہیں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ نبی اخلاقی غلطی مثلاً کذب و سرقر وغیرہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے، اخلاقی غلطی تو انہ کے محدودیں داخل ہے اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ امر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نبی معصوم رہتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل منقضی ہے جس کو میں اوپر پیش کر چکا۔

تعب ہے کہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے اپنے مذہب سے اغماض کرتے ہوئے عصمت انبیاء کے مسئلہ میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے، حالانکہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں عرض کر دوں کہ مذہب شیعہ میں تو عصمت نہ الوہیت کے لیے ضروری ہے نہ رسالت کے لیے لازم، نہ امامت کے لیے واجب، وہ خدا سے مزین غلطی کے وقوع کا اعتراف کرتے ہیں چہ جائیکہ رسالت۔ ملاحظہ ہو بحار الانوار میں روایت ہے جسے علامہ طوسی نے بھی

نقد الحاصل میں نقل کیا ہے :-

عن جعفر الصادق ع جعل اسمعيل القائم مقامه بعد نظهر من اسمعيل ما لم يرتضه فجعل القائم مقامه موسى فسئل عن ذلك فقال
بد الله في اسمعيل -

”جعفر صادق ع سے روایت ہے کہ انھوں نے اسمعیل کو اپنا قائم مقام اپنے بعد کے لیے قرار دیا مگر اسمعیل سے وہ بات ظاہر ہوئی جس کو انھوں نے پسند نہیں کیا، لہذا انھوں نے موسیٰ کاظم کو اپنا قائم مقام بنایا، اس کے متعلق اُن سے پوچھا گیا تو کہا، اللہ کو اسمعیل کی بابت
یاد ہو گیا۔“

ساتھ ہی ساتھ آپ لغت کے ذریعہ سے لفظ بڑا کو بھی سمجھ لیں۔

بد الله ای ظہر لہ ما لم یظہر -

”یعنی جو بات معلوم نہ تھی اس کے معلوم ہو جانے کو بڑا کہتے ہیں۔“

اب روایت کا مفہوم واضح ہو گیا کہ اللہ نے پہلے تو اسمعیل کی امامت کا حکم دیا، پھر اللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور موسیٰ کی امامت کا حکم دیا۔
شیخ صدوق رسالہ اعتقادیر میں لکھتے ہیں :-

ما بعد الله بنی شیئی کما بعد الله فی اسمعيل -

”اللہ کو کبھی ایسا بڑا نہیں ہوا جیسا کہ اسمعیل کے بارے میں ہوا۔“

نعوذ باللہ من ذلک، خدا سے جل کے باعث غلطی ہوئی اور ایسی شدید کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس روایت سے عصمت الوہبیت باطل ہوئی اور ضمتا عصمت امامت بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ حالانکہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے امامت کے منصب کو بھی منجانب اللہ دونا تسلیم کیا ہے اور اسی لیے عصمت لازم قرار دی ہے۔ حالانکہ یہ روایت دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ استبصار صفحہ ۲۱۷ :-

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال صلی علیہ السلام بالناس علی
غیر طہر و کانت الظہر فخرج منا دبیہ ان امیر المؤمنین صلی علی غیر
طہر فاعیدوا الخ۔

”جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز بغیر
طہارت پڑھی، پھر نمازی نے اعلان کیا کہ جناب ایٹرنے چونکہ بغیر طہارت (وہ) نماز پڑھی تھی
اس لیے اُس کا اعادہ کر لیا جائے۔“

بالقصد بغیر طہارت تو نماز کی ادائیگی تسلیم نہیں کی جاسکتی، لامحالہ مانا پڑیگا کہ غلطی ہو گئی
یا سو و نسیان (بھول چوک) کہہ لیجئے بہر کیف عصمت الوہیت و عصمت امامت کے ابطال
پر روشنی پڑتی ہے۔ عصمت نبوت سر دست مختلف ذیل ہے، چونکہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس لیے میں ان کی
کتابوں سے رسول کے سو و نسیان کی بابت کوئی ثبوت نہ پاسکا، ممکن ہے کہ ہو، البتہ
دیگر انبیاء کی بابت حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں اس قسم کی بہ کثرت تصریحات ملتی ہیں،
جس سے انبیاء کی غلطی و غلط فہمی اور لغزش و خطا و اجتہاد کی کابھوت ملتا ہے، مثلاً یہ
کہ حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس تشریف لائے تو بنی اسرائیل کو گور سالہ پرستی میں مبتلا دیکھ
کہ حضرت بارون پر خفا ہوئے حتیٰ کہ غضبناک ہو کر ان کی داڑھی کا پکڑ کر کھینچنے لگے، بعض اس
خیال کی بناء پر کہ انھوں نے میرے حکم کی اچھی طرح تعمیل نہ کی، حالانکہ وہ بالکل بے قصور
تھے حضرت موسیٰؑ کا یہ فعل غلطی پر مبنی ثابت ہوا یا مثلاً حضرت موسیٰؑ کو توریت کی تختیوں میں
بہت سے علوم دیکھ کر یہ خیال ہو گیا کہ میرے پاس تمام علوم جمع ہو گئے، حالانکہ حضرت خضرؑ
کے پاس بعض ایسے علوم تھے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس نہ تھے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کی غلط فہمی
تھی (تفسیر صافی مطبوعہ ایران) یا مثلاً حضرت موسیٰؑ علم سیکھنے کے لیے حضرت خضرؑ کے
ساتھ ہو لیے تھے، حضرت خضرؑ نے فرمایا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر کے ساتھ نہیں رہ سکتے

میرے کاموں پر تم اعتراض کر دیا کرو گے، حضرت موسیٰؑ نے عہد فرمایا تھا کہ میں صبر کے ساتھ رہوں گا، لیکن جب حضرت خضرؑ نے کشتی کے تختے توڑ ڈالے تو ان سے صبر نہ ہو سکا اور ٹوک دیا۔ کہ یہ تم بڑا کر رہے ہو، یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی بہ اندازِ مبلغ موجود ہے۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کی بے صبری اور عہد شکنی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز اس واقعہ خاص کی بابت قصور فہمی بھی ظاہر ہوتی ہے، یا مثلاً حضرت یوسفؑ جب اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے استقبال کے لیے آئے تو گھوڑے سے اتر کر پیادہ پا نہ ہوئے، اس خیال سے کہ میں شاہانہ شان و شوکت رکھنے کے باعث حضرت یعقوبؑ سے افضل ہوں۔ یہ لغزش حضرت یوسفؑ سے ایسی ہوئی کہ ان سے نورِ نبوت سلب کر لیا گیا اور کبھی ان کی اولاد میں پھر نبی نہیں پیدا ہوا۔ (حیات القلوب جلد اول) یہ تو دیگر انبیاء کے متعلق حضرات شیعہ کے مذہبی معتقدات میں ایک واقعہ ذاتِ خاص جناب رسول اللہؐ کا بھی سن لیجیے :-

تفسیر صافی مطبوعہ طہران بہ ذیل تفسیر سورہ نور تحت آیت انک امام باقر علیہ السلام نے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ :-

”مارِہ قطبیہ کے پاس جریج قطبی کی آمد و رفت پر بدگمانی ہوئی، تو رسولؐ نے علیؑ کو جریج کے قتل کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ جاکر جریج کو قتل کر ڈالو علیؑ تنوارے کر گئے۔ جریج بھلگے اور ایک درخت پر چڑھ کر نیچے گرے جس میں اُن کا ستر کھل گیا۔ اور یہ ظاہر ہو گیا کہ ان میں نہ علاماتِ مردی ہیں نہ علاماتِ نسائیت، تب علیؑ رسولؐ کے پاس آئے اور جریج کی حالت ظاہر کی۔ تو رسولؐ نے فرمایا کہ شکر ہے خدا کا جس نے ہمارے اہل بیت (یہ اہل بیت کا اطلاق حضرت امیہ قطبیہ پر ہو رہا ہے جو بجلے خود سمجھنے کی چیز ہے) سے برائی دور کر دی“

اس روایت سے چند امور مستفہم ہوتے ہیں :-

۱۔ یہ کہ جریح کی بابت رسول اللہ کو غلط فہمی ہوئی۔

۲۔ جناب امام کو بھی غلط فہمی ہوئی۔

۳۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر قتل جیسا خطرناک حکم صادر کر دیا گیا۔

۴۔ احکام غلطی کے بعد حکم واپس لے لیا گیا۔

۵۔ جناب امیر نے حکم رسول کو الیا واجب نہ سمجھا کہ بہر حال جریح کو قتل کر دیتے

نبی کی غلط فہمی کو محسوس کر کے ان کے حکم کی تعمیل سے باز رہے۔

یہ تو غلط فہمیاں تھیں صریح خطا و اجتہادی کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

”جنگ صفین میں جناب امیر اولائنالشی کے تسلیم کرنے سے منکر تھے اور

اپنی فوج میں اعلان کر دیا کہ ہرگز نالشی کو قبول نہ کیا جائے۔ پھر اس کے

بعد نالشی پر راضی ہو گئے جس کے باعث خود آپ کی فوج کے آدمی

خارجی ہو گئے اور جناب امیر کو برا بھلا کہنے لگے کہ تمہیں ایک رائے پر

قرار نہیں معلوم نہیں تمہاری پہلی رائے درست تھی یا یہ دوسری رائے

صائب ہے۔ بہر کیف تمہیں اپنی امامت پر خود شک ہے۔ یہ ناگوار

حالات جب پیش آئے تو جناب امیر کو سجدہ صدمہ ہوا اور کفر افسوس

ملنے ہوئے فرمایا کہ :-

هٰلَا اجزاء من تراث العقدة (منج البلاغہ)

یہی سنا ہے اس کی جو مستحکم رائے کو ترک کر دے۔“

کیا اس سے زیادہ صریح مثال خطائے اجتہادی کی اور دستیاب ہو سکتی ہے؟

مضمون کی طوالت کا خوف مانع ہو رہا ہے ورنہ ممکن تھا کہ میں ایسی اور بھی کثیر تعداد

میں نظائر و امثال پیش کرتا۔ بہر کیف جو کچھ پیش کر چکا اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ مذہب

شیعہ میں یہ عقیدہ تسلیم شدہ ہے کہ:-

خدا سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔

انبیاء سے بھی غلطی و غلط فہمی کا وقوع ہوتا ہے۔

ائمہ بھی غلطی، غلط فہمی، سہو و نسیان، مخطا و اجتہاد ہی سے مبتلا نہیں ہیں۔

معلوم نہیں کیونکر آزاد خیال شیعہ صاحب نے عصمتِ رسولؐ و ائمہ پر کس قدر زور قلم صرف فرمایا اور خود اپنے مذہبی سلمات و معتقدات کے خلاف جس کا انکو اعتراف کرنا پڑے گا۔

اس طویل بحث سے ہمارا دعویٰ بہت مدلل ہو گیا کہ رسولؐ کے لیے بشریت میں عصمت ضروری نہیں ہے جس کی تائید مذہبِ شیعہ سے بھی ہوتی ہے۔ البتہ اہلسنت کا یہ خیال ضرور ہے کہ انبیاء سے اس قسم کی لغزشیں بہت شاذ و نادر ہوتی ہیں، اور جب ہو جاتی ہیں تو ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ اللہ کسی صورت سے متنبہ کر دیتا ہے، اس خیال کے ثبوت میں آیاتِ عیسٰی و توراتی وغیرہ جو جنابِ نبیؐ نے نقل فرمائی ہیں وہی کافی ہیں۔ اس بحث کے بعد عصمتِ امامت کا مسئلہ خود بخود خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ درنحالیکہ ابطالِ عصمتِ ائمہ کے متعلق خود شیعہ لٹریچر میں ایک بہت بڑا انبار بھی موجود ہے۔

مسئلہ امامت

امام کے لغوی معنی پیشوا کے آتے ہیں، شرعی اصطلاح میں بھی یہ لفظ اپنے عموم معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کو بھی دینی پیشوا فرمایا گیا اتنی جاعلاج للناس اماماً (میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں) اور دوسری طرف مگر ابی کے پیشواؤں کے متعلق بھی امام ہی کا لفظ استعمال

کیا گیا ہے۔

”وجعلناہم ائمتہ یدعون الی النار“ وہ پیشوا ہیں کہ جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔

اہل سنت کے یہاں امامت کے لیے کوئی خصوصیت نہیں اور نہ مسئلہ امامت ضروریاتِ دین سے ہے۔ اس لیے کہ نہ قرآن امامت کے بارے میں کچھ کہتا ہے نہ احادیث و رسولؐ سے کوئی خاص بات مستنبط ہوتی ہے۔

معلوم نہیں حضراتِ شیعہ نے کہاں سے اس مسئلہ کو اخذ کیا ہے۔ اور اس شدت کے ساتھ کہ توحید و رسالت کے بعد اسے مدارِ ایمان قرار دیا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ حضراتِ شیعہ کے یہاں مسئلہ امامت کے سامنے نبوت بھی بیچ ہے۔ ایک معتبر شیعہ روایت کا حاصل ہے :-

”کہ حضرت آدم و حواؑ نے ائمتہ کی قدر و عظمت پر حسد کیا اور جسدِ علامات کفر سے ہے، لہذا وہ جنت سے نکالے گئے۔“

ائمتہ کے مقابلے میں ایک پیغمبر کی بابت یہ تجاللات ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک امامت کا درجہ نبوت سے کچھ بلند و بالا واقع ہوا ہے اور اسی لیے شاید اپنے کو امامیہ کہتے ہیں۔

امامت کا مسئلہ مذہبِ شیعہ میں ذیل کی خصوصیات رکھتا ہے :-

امامت ساری دنیا میں صرف قریش کے لیے مخصوص ہے۔

پھر قریش میں سے صرف بنی ہاشم کے لیے۔

بنی ہاشم میں سے صرف علیؑ اور اولادِ علیؑ کے لیے۔

اولادِ علیؑ میں سے صرف حسنؑ اور حسینؑ کے لیے۔

حسنؑ اور حسینؑ کی اولاد میں سے صرف حسینؑ کی اولاد کے لیے۔

اور ان میں سے بھی صرف اٹھ اماموں کے لیے مخصوص ہے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ قیود خانہ ساز ہیں یا نہیں سے مانوہ ہیں، اگر مانوہ ہیں تو کہاں سے؟ اس لیے کہ قرآن میں آیت کی بابت نہ اس قسم کی تصریحات ہیں نہ ایسی کوئی آیت جس سے یہ امور کسی طرح جمعی مستنبط ہو سکیں احادیث صحیحہ میں بھی ایسی تفصیلات موجود نہیں، دراصل ایک احادیث پر عقائد کی بنیاد بے معنی ہے ائمہ کی خصوصیات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور چونکہ نبی معصوم ہوتا ہے اس لیے لازم ہے کہ اس کا نائب بھی معصوم ہو کہ معصوم کا نائب غیر معصوم نہیں ہو سکتا۔

ائمہ کا انتخاب منجانب اللہ ہوتا ہے کیونکہ عصمت ایک باطنی شے ہے جس کی معرفت بجز خدا کے اور کسی کو نہیں ہو سکتی ہے۔ لہذا خدا ہی ائمہ کا انتخاب و تقریر کرتا ہے مگر بندے انتخاب کریں گے تو غیر معصوم منتخب ہو جائے گا۔ جس سے تمام امت کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ غیر معصوم سے خطا کا صدور ممکن ہے اور امام کی اطاعت ہر چیز میں ضروری ہے

یہ اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات اماموں پر چپیاں کی جاتی ہیں اور چونکہ بار ثبوت مدعی کے سر ہوتا ہے لہذا ائمہ کو ان امور کی تردید میں اضاعت وقت کی ضرورت نہیں ہے تاہم مجھے یہ کہنے میں کسی قسم کا باک نہیں محسوس ہوتا کہ امامت — نبوت کا ترکیبی بہ ترکیبی جواب ہے اللہ سئلہ امامت ختم نبوت کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے۔ ایک نبی مامور من اللہ ہوتا ہے معصوم ہوتا ہے مفروض الطاعہ ہوتا ہے۔ نبی کی یہ شان ہے کہ:-

مَا اتَاكَ الرَّسُولُ فَخُذْهُ وَمَا نَهَاكَ عَنْهُ فَانْتَهُوا
 ”جو کچھ تم کو رسول مکرم دے اسے اختیار کرو اور جس کام سے روک دے اسے چھوڑ دو“
 امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:-

مَلْجَأُ بِيْهِ عَلٰى فَاخْذُ بِهِ وَمَا نَهٰى عَنْهُ فَانْتَهُیْ (اصول کافی ص ۱۱)
 ”جو کچھ علیؑ (احکام) لائے میں ان پر عمل کرتا اور جس سے منع کر دیا اس سے باز رہتا ہوں“

۲۸۴

پھر نبی اور امام میں کیا فرق رہ گیا؟

و جری لہم مثل ما جری لمحمد علیہ السلام — ”اممہ کو بھی وہی باتیں حاصل ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھیں۔“

صاحب محمد حیدری نے اسی امر کو واضح کیا ہے :-

ہمہ صاحب حکم بر کائنات ہمہ چوں محمد منزہ صفات

ترازو کے ایک پلہ میں امامت ہے اور دوسرے میں نبوت، شیعہ مذہب تول رہا ہے اور دونوں پلے برابر ہوتے ہیں۔

و کذا لا یجری لائمتہ الہدی واحد بعد واحد (اصول کافی)

”اور یہی قانون اعتقاد تمام ائمہ (دوازده) کے لیے یکے بعد دیگرے نافذ ہے“

اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ امامت کا پلہ ٹھکنا جا رہا ہے، نبوت کا وزن گھٹنا جا رہا ہے نبی سے عتاب آمیز انداز میں باز پرس ہوتی ہے :-

یا ایہا التبی لم تحترم ما احل اللہ لك — ”اے نبی میں نے جو چیز تیرے لیے حلال کی تھی اسے تو نے کیوں حرام کر لی؟“

نبی اپنی ذات کے متعلق خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام کرنے کا مجاز نہیں۔ لیکن اماموں کا یہ رتبہ عالی قابل لحاظ ہے۔

فہم یحلتون ما یشاءون ویحرمون ما یشاءون (اصول کافی صفحہ ۲۷۸)

”امام باقر فرماتے ہیں کہ ائمہ کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جسے چاہیں حرام۔“ امامت نبوت سے بہت اوپر جا چکی، حتیٰ کہ اب اس کے جلوے حریر قدح میں نظر آتے ہیں۔

استقب علیہ فی شیئ من احکامہ کاملتہ عقب علی اللہ و رسولہ
والرأد علیہ فی صغیرۃ او کبیرۃ علی حد الشراک باللہ۔ (اصول کافی ص ۱۱)

”علیٰ پر اعتراض کرنے والا ان کے کسی حکم کی بابت شل اس کے ہے جو خدا اور رسول پر
اعتراض کرنے والا ہو، اور علیٰ کا رد کرنے والا چھوٹی بات، بڑی بات میں ایسا ہی ہے، جیسا
اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا۔“

اور اسی لیے شاید حضرت آدمؑ نے اللہ پر حسد کیا تھا، العظمت للہ۔ مسئلہ امامت سے
بہ محض یہ کہ ختم نبوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تابناکیوں کے آگے نبوت کا سراج منیر
بھی شمع سحری ہو کر رہ گیا ہے۔

آزاد خیال شیعہ صاحب کے نزدیک کیا یہ امور کسی طرح باور کیے جانے کے قابل
ہیں؟ چونکہ تبصرہ میں اس مسئلہ کو کسی مصلحت سے بالکل مبہم لکھا گیا ہے اس لیے ہم بھی
اس حال پر چھوڑنا مناسب سمجھتے ہیں۔

خلافت کا مفہوم

صاحب تبصرہ نے خلافت کی از روئے اصطلاح شرعی تعریف یوں بیان کی ہے کہ
”ہی النبی ابۃ فی الدین والدنیا“ خلیفہ امور دینی (مذہب) وغیرہ دینی (دنوی) میں نبی
کا نائب ہوتا ہے۔ یہ تعریف مبہم ہے اور کچھ غلط بھی ہے، مبہم تو یوں کہ خلیفہ امور دینی میں نبی کا
نائب تو ضرور ہوتا ہے مگر دین کے صرف ایک حصہ میں، جیسا کہ میں پہلے تشریح کر چکا ہوں کہ نبی
کے دینی کام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول اخذ احکام الہیہ اور دوسرے اس کا نشر و نفاذ خلیفہ
کو نبی کے پہلے کام سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ نبی کے بعد اخذ احکام کا کوئی سوال ہی
نہیں باقی رہتا لہذا خلیفہ کے لیے ہم عصمت نہیں لازم سمجھتے۔ دوسرا کام نشر و نفاذ
احکام الہیہ ہے، خلیفہ صرف اس امر میں نبی کا نائب و جانشین ہوتا ہے، خلافت کی مذکورہ بالا
تعریف اس لیے غلط ہے کہ خلیفہ نبی کا امور دینی یعنی وظائف بشریہ میں نائب نہیں ہوتا
ہے، اس لیے کہ ہر انسان کا ماحول اور گرد و پیش کے حالات جدا گانہ ہوتے ہیں، ایک

مسلمان کے لیے امرِ سعادت ہو گا کہ وہ مکہ یا مدینہ میں زندگی گزارے۔ لیکن شرعاً وہ اس پر مجبور نہیں اور نہ خلیفہ کے لیے ایسے امور ضروری قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اسلامی سلطنت کا قیام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں ہو چکا تھا، اور دارالسلطنت یا پائے تخت مدینہ منورہ تھا۔ خلفائے ثلاثہ کے عہد میں مدینہ ہی دارالسلطنت رہا، لیکن خلیفہ چہارم جناب علی مرتضیٰ کے عہدِ خلافت میں حالات کی نوعیت دگرگول ہو گئی اور ان کی مصالح نے مجبور کیا کہ وہ کوفہ کو اسلامی دارالسلطنت قرار دیں، چنانچہ انھوں نے ایسا کیا اور ہرگز ان کو یہ خیال مانع نہ ہوا کہ میں خلیفہ ہوں اور حیثیت جملہ امور میں نائب نبی ہونے کے میرا فرض ہے کہ مدینہ ہی کو پائے تخت باقی رکھوں خواہ وقت و فضا کا اقتضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کیا ان حالات کے پیش نظر کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کے لیے جملہ امور میں نیابت ضروری ہے؟ اصل صورت یہ ہے کہ خلافت و امامت بادشاہت کو کہتے ہیں، لیکن ایسی بادشاہت جو قیام و استحکام دین کے لیے بنیاد پر پیغمبر ہو، درنہ خلافت نہ ہوتی صرف ملکیت یا قیصریت ہوگی۔ اسلامی خلیفہ کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ قیام و بقا دین کے لیے فرائض جہاد کو انجام دے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ تحتِ اسلام کے لیے جو گوشیشیں ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے کی جاسکتی ہیں انھیں کا نام اسلام کے اندر اسلامی سیاست ہے خلیفہ اسی اسلامی سیاست کا نگران ہوتا ہے اور میں خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تعزیرات اسلامیہ کے اندر کسی دفعہ کا اضافہ کر سکے البتہ اس کا یہ فرض ہے کہ اگر کہیں شعائرِ اسلامیہ مزارِ محنت کی جاتی ہو تو اس کی مدافعت کرے۔ علمِ خلافت کی حیثیت بیک وقت پولیس اور فوج کی سی ہے کہ پولیس کا منصب صرف نفاذِ احکام ہے اور فوج کا نام ہے انھیں احکام و قوانین کی محافظ طاقت کا، لیکن پولیس اور فوج کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اسمبلی اور کونسل کے پاس شدہ قوانین میں دست اندازی کریں۔ علمِ خلافت کی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور

فوج میں صرف شاہی خاندان ہی کے افراد برسرِ کار ہوں کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اس شیعہ میں اپنی خدمات سے حکومت کو فائدہ پہنچا سکے۔ پھر حکومت الکیہ کے بارے میں کیوں ایسی عمل شرائط بیان کی جاتی ہیں کہ خلیفہ صرف امام ہی ہو سکتا ہے اور امام صرف خاندانِ نبوت کے افراد ہو سکتے ہیں اور ان افراد میں بھی صرف اولادِ فاطمہؑ اور ان میں صرف اولادِ حسینؑ اور ان میں بھی صرف ایک دینِ افراد اور پھر ان خود ساختہ قیود کو منجانب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے کوئی عقل والا انسان باور کر سکتا ہے۔

یہاں تو یہ استہمامِ نبوت کہ سارے عالم کے لیے عام کیا جا رہا ہے اور قرآن کو تائیمِ قیامت دے دے دی جا رہی ہے، اسلام کو دنیا کا آخری اور ابدی مذہب قرار دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی اسلام کے بقا و استحکام اور اس کے احکام کے نشر و نفاذ کے لیے خدا صرف بااِمانوں کو متعین کرتا ہے جن کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری میں ختم ہو جاتا ہے اور ایک امام صاحبِ کوفہ میں روپوش رہنے کا حکم دیا گیا جن کا وجود و عدم برابر ہے۔ پھر اسلام کو تیسرے ہجری کی طرح چھوڑ دیا گیا۔ بے بس و بیکس۔ نہ کوئی اس کا پرسانِ حل نہ عمِ خوار کیا اسی اسلام کو سارے جہان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا، میرا خیال ہے کہ اس قسم کے معتقدات اسلام کے ساتھ مذاق و استہزاء کے مترادف ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ خلافت و امامت تقاریرِ دین کے لیے ضروری ہے لیکن اسلام کے اندر ایک فروعی مسئلہ کی حیثیت اس کو حاصل ہے، اصولی مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر مدارِ ایمان و اسلام ہو جس کے انکار و ابا سے کفر لازم آئے۔ یہ تو وہ لوگ کہہ سکتے ہیں جن کے نزدیک امامت و خلافت نبوت کے ہم پلہ ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ توجید و رسالت کے ساتھ مسئلہ امامت کو بھی جزوِ ایمان نہیں بلکہ مدارِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک امامت و خلافت صرف دینی بادشاہت ہے اگرچہ خود خدا ہی نے کیوں نہ اس امام یا خلیفہ کا تقرر کیا ہو حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں یونہی تھے ان سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جہاد

کے لیے خدا کی طرف سے کسی بادشاہ کو مقرر کر دیا جیسے تاکہ ہم اس کی سنہائی میں جہاد کر سکیں، نبی کی درخواست پر خدا نے ایسے بادشاہ کا تقرر کر دیا۔

قال لهم نبیہم ان الله قد بعث لکم طالوت ملکاً۔ ان کے نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تم لوگوں کی بادشاہت کے لیے مبعوث کیا ہے؟

طالوت مبعوث من اللہ ہیں، فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لیے نبی کی موجودگی کی حالت میں تشریف لائے ہیں گویا کہ وہ سیاسی امور میں نبی کے خلیفہ ہیں لیکن پھر بھی خدا ان کو ملک کے افظ سے تعبیر کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا خلیفہ دینی بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے وہ نبی کی طرح مفروض الطاعت یا نبی کا جملہ امور میں نائب نہیں ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری اس مختصر سی بحث سے مفہوم خلافت کی تشریح اس قدر ہو چکی جو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن بعض عقلاً کسی اعتراض کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہ گئی۔

اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا باقی رہ گیا ہے کہ امور استحقاق خلافت کیا ہیں؟

امور استحقاق خلافت

جب یہ امر دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکا کہ خلافت دینی بادشاہ کا نام ہے (اور اسی لیے عام طور سے آج تک مسلمان بادشاہوں کو خلیفۃ المسلمین کہا جاتا ہے، پھر اس امر کے طے پا جانے میں کوئی دشواری ہی نہیں باقی رہتی کہ بادشاہت کا کون شخص مستحق ہو سکتا ہے یقیناً وہی امور جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں ان کی ایک شخص میں موجودگی اس کو مستحق خلافت قرار دے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں، اگر بغیر ان کے کوئی شخص بادشاہ نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ہم کو یہ نظر کرنی ہے، سلطنت و حکومت کے لیے

جابرانہ قوت اور قابرانہ طاقت کا ہونا ضروری ہے، جس میں قوت نہ ہو گی وہ کیا حکومت کر سکے گا۔ اس طاقت کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ وہ ذاتی طور سے جہانی قوت کا پی رکھتا ہو، فزون جنگ دہ گری میں اس کو مہارت تامل ہو۔ اور عزم و ارادہ کی بھی اس کے پاس غیر معمولی طاقت ہو اور طاقت کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکا انسان ہو۔ اور علم و تدبیر سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہو، تاکہ امور سیاست کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے اور ملکی نظم و نسق کو عمدہ اسلوب پر قائم کر سکے، اگر کسی میں یہ دو صفات موجود ہیں تو وہ بادشاہت کر سکتا ہے ورنہ ناممکن ہے۔ ملک طالوت کو جب اللہ نے مقرر فرمایا تو بنی اسرائیل کو اس کی بادشاہت پر اعتراض تھا، کہ طالوت کیونکر بادشاہ ہو سکتا ہے۔ خدا نے ان کے اعتراض کا یہی جواب دیا کہ طالوت میں بادشاہت کی استعداد صلاحیت موجود ہے۔

”لوگوں نے کہا طالوت کو ہم پر کیونکر بادشاہی حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ ہم اس کے مستحق ہیں کیونکہ طالوت کے پاس تو کوئی منہ زانہ (دولت) نہیں“

”نبی نے کہا اللہ نے طالوت کو تم پر بزرگی بخشی ہے اور ان کو علم (سیاست) و حجم (طاقت) میں کشادگی بخشی ہے، اللہ اپنا ملک جس کو چاہے دے“

(سورۃ بقرہ)

اس آیت سے مذکورہ بالا بیان کی اچھی طرح تائید ہوتی ہے، اور پہلے زمانہ کی بادشاہت کے لیے یہی دو شرطیں ضروری قرار دی جاسکتی ہیں۔

خلافت کا مستحق بھی وہی شخص ہو گا جس میں مذکورہ بالا دو شرطیں موجود ہوں، کیونکہ اس کا شرف صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا نفاذ کرے حدود اللہ کو قائم کرے

سے چنانچہ خود جناب امیر المومنین کا مقولہ ہے جس میں امیر (خلیفہ) کے فرائض بیان کیے گئے ہیں:-

لا بد للناس من امیر یؤا فاجر یعمل فی امر القہ المومن (باقی اگلے صفحہ)

اور حفاظت بقا دین کیلئے اگر ضرورت پیش آجائے تو مردانہ و جانبگسے بھی درلغ نہ کرے، ان امور کی انجام دہی کیلئے ضرورت ہے کہ وہ پختہ کار انسان ہو اس کے عزائم میں اس قدر استقلال ہو کہ دوسری طاقتیں اسے تنزل نہ کر سکتی ہوں، پرخطر مواقع میں اسکے پاؤں نہ ڈگ سکتے ہوں وہ ایسی کمزور ذہنیت کا مالک نہ ہو کہ مخالفت آرا سے ہر موقع پر شکست دے سکیں بلکہ سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والا انسان ہو، فہم و تدبیر اور فراست و دانائی سے کافی حصہ پایا ہو۔ نڈر ہو، اور بیباک، پختہ خیال اور راسخ المعزم، مشکلات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو، لوگوں پر ان کی غیر معمولی طاقت کا اثر قائم ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے احکام و مقررل سے منوا سکتا ہو۔ ایسا شخص خلیفہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خلافت کا مستحق ہے، ان شرائط کو دیکھتے ہوئے باخود تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ اوصاف و خصائل کسی خاندان یا کسی قبیلہ یا جماعت کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ جس میں بھی یہ خدا داد صلاحیت ہوگی ان اوصاف و کمالات کا وہ حامل ہوگا۔ اس کو حق حاصل ہوگا کہ وہ خلافت کر سکے۔ یہی اہل سنت کا مسلک ہے کہ وہ خلافت کو کسی گروہ میں محدود نہیں رکھتے۔۔۔ جن لوگوں نے اہل سنت کے نظریہ کو محدود سمجھا غلط سمجھا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸) دی جمع بلہ العقیق و یقاتل بلہ العدو۔ (منہج البانہ مصری ص ۱)

"لوگوں کے لیے امیر کا ہونا ضروری ہے خواہ وہ نیک ہو یا بدکار تاکہ اس کے عہد حکومت میں مسلمان اپنے فرائض ادا کر سکیں، مال غنیمت جمع کیا جاسکے اور دشمنوں سے مقابلہ کیا جاسکے۔"

۱۔ بعض حضرات کو یہ مغلطہ ہوا ہے کہ وہ اہل سنت کے نزدیک خلافت کو صرف قریش کے لیے مختص سمجھتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ ائمہ من القریش ضرور دار ہوا ہے لیکن یہ فرمان رسول اوقت کے حالات اور ماحول کے لحاظ سے تھا، اگر اس وقت طاقت و قوت کے اعتبار سے قریش ہی ایک ایسا قبیلہ تھا جو در قبائل سے غیر معمولی امتیاز رکھتا تھا اسی لیے امامت و خلافت کا اس کو مستحق قرار دیا ورنہ اسکے یہ مرکز نہیں کہ قریش میں امامت و خلافت منحصر ہو۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ابن مائہ ٹھیک کی بے پناہ عسکری طاقت کو دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ خلافت کا مستحق ٹھیک ہے اسکے یہ معنی نہ ہو گئے کہ ٹھیک ابدال آباد کے لیے خلافت کا مستحق ہو گیا۔ ۱۲

کیا جناب امیر مستحق خلافت تھے؟

یہ ایک ضمنی سوال قائم کیا گیا ہے جو بحث سابقہ کا تتمہ ہے اور جسے پوری بحث کا خلاصہ کہنا چاہیے۔ نصوص قطعیہ دربارہ خلافت علیؑ آخری سوال ہے جس پر میں آئندہ بحث کروں گا۔ اس سے پہلے فہم و درایت کی روشنی میں بھی دیکھنا ہے کہ حضرت علیؑ میں کہاں تک خلافت کی استعداد و صلاحیت موجود تھی، کہ یہی اصل بحث ہے لیکن یہ بھی کہوں گا کہ اس بحث میں چونکہ ذات گرامی جناب امیر المومنینؑ سے بحث ہوگی اور ان کے خصائص و کمالات پر اصول کے ماتحت تنقید و تبصرہ ہوگا کسی کو ناگوار نہ ہونا چاہیئے۔ میں بجانِ دُول ان کا احترام کرتا ہوں۔ میرے عقیدت و نیاز کی ایک دنیا ان کے کمالات معنوی و روحانی کے اعتراف کے لیے وقف ہے۔ میں مذہبی تعصب کی دیوانگی میں اس بلند مرتبت بہت ہی پرچم نہیں کر سکتا جس کا مقدس خون خود میری رگے پے میں دوڑ رہا ہے لیکن یہ حق ہے حنفی و حق بیانی کا کہ حقیقت کے چہرہ سے بلا تکلف نقاب اُلٹ دی جائے۔ میں اس وقت شیعہ نقطہ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں حضرت علیؑ کم الدجہ کی جہانی طاقت کا اعتراف ایک دنیا کو ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ سلطنت کے لیے جس سختی کی غزم جس ظلم و ثبات اور جس قوت فکر و مستقل مزاجی کا تذکرہ میں نے بھی بطور بشر اُٹھایا ہے ان کا حضرت علیؑ میں اگر فقدان نہ تھا تو کم از کم نمایاں طور سے نقصان ضرور موجود تھا۔ ان کو دوسروں سے اختلاف رائے کی ہمت کم ہوتی تھی۔ وہ اپنے عزائم میں غیر معمولی طریقہ سے ثبات و استقلال نہیں رکھتے تھے، ان کو خود اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ نہ ہوتا، وہ مخالف طاقتوں سے مرعوب ہو جاتے، ان میں وہ قابض مملکت اور آمرانہ دبدبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتیں مان لیتے یا ان کے احکام پر عمل پیرا ہوتے، یہ وہ حقائق ہیں جو ان کی سوانح حیات میں روشن حیثیت رکھتے ہیں۔

اُن امور کا اعتراف مجھ کو ہی نہیں بلکہ شیعہ دنیا کو بھی ہے۔ اور شیعہ مورخین اس سے انکار نہیں کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ خود حضرت علیؑ کو بھی ان امور کا اعتراف تھا۔

یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت سے ان کو انکارِ اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کے اظہار کی ان کو کبھی جرأت ہوئی؟ میں کہوں گا کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ خلافتِ صدیقہ کا ظاہری طور سے اعتراف ہی کرتے رہے، اگر کبھی کہیں سے یہ آواز بلند ہوتی کہ حضرت علیؑ کو خلافت ملنی چاہیے تھی تو فوراً حضرت علیؑ انکار کر بیٹھتے اور اپنے لیے مطالبہِ خلافت کی زور شور سے تردید فرماتے۔ حتیٰ کہ خلفائے ثلاثہ کا عہد گزر جانے کے بعد بھی جب ان سے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ منصبِ خلافت قبول فرمائیں تو ان کا یہی فرماتے رہے۔

”دعویٰ والتمسوا خیری“ (مجھ کو معاف کر دو، کسی اور سے کہو)

آپ نے یہ بھی فرمایا، کہ:

”ان تتركتمونی کا نا کا حد کم“ (اگر تم مجھ کو قبولِ خلافت سے علیحدہ رہنے دو تو میں تمہارے ہی جیسا ایک فرد ہوں گا۔

کس قدر وضاحت کے ساتھ بتایا جا رہا ہے کہ میں حتیٰ خلافت نہیں ہوں، اگر میں خلیفہ نہ ہوا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے حق سے محروم رہا، بلکہ جیسے تم لوگ ہو ویسے ہی مجھے سمجھو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:-

وعلیٰ اسمعکم واطو عکم لمن ولیتموه امرکم۔

”اور شاید کہ تم لوگوں کی نسبت اس کی بات زیادہ مانول گا اور زیادہ اس کا فرمانبردار رہوں گا جس کو تم خلیفہ بنا لو گے۔“

بہر حال جناب امیر المومنینؑ اپنے کو حتیٰ خلافت نہیں قرار دیتے، اور اس جملہ سے تو یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انتخابِ خلیفہ کا حق بالک کو حاصل ہے نہ کہ خدا کے فضل سے ہے۔

”لَمَنْ وَلَّيْتُمُوهُ“ پر غور کرو۔

پھر جناب امیر کا یہ ارشاد بھی قابلِ لحاظ ہے۔

انا لکم دزیراً خبیروکم منی امیراً (نہج البلاغہ)

”میں تم لوگوں کے لیے امیر (خلیفہ) ہونے کی نسبت بھینٹ دزیر ہونے کے زیادہ مفید ثابت ہوں گا۔“

جناب امیر علم و معرفت میں بڑا درجہ رکھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ میں سختِ خلافت نہیں ہوں۔ ان کو غالباً یہ بھی علم تھا کہ ابوبکر خلیفہ ہیں، پھر عمر ہوں گے، پھر عثمان، ان کے بعد کہیں شاید یہ درجہ مجھ کو ملے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ابوبکر کی خلافت پر کیوں خاموش ہیں۔ کیا آپ کو اختلاف کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے؟ تو آپ فرماتے، کہ نہیں میں موت سے ڈرنا چہ معنی، میں موت سے اس قدر مانوس ہوں جس طرح شیر خوار بچہ اپنی ماں کے پستانوں سے مانوس ہوتا ہے۔ مگر میں اپنے مخصوص علم کی بنا پر خاموش ہوں۔ اگر اسے ظاہر کر دوں تو تم میں اضطراب پیدا ہو جائے گا۔ یہ علم مخصوص کیا تھا؟ یہی کہ میں امیر تین آدمیوں کے بعد ہے اور اگر یہ مراد نہ ہو تو بھی یہ کہنا پڑے گا کہ وہ خلافتِ صدیقیہ کی بابت خاموش ہی رہے اور اختلاف نہ کر سکے۔

حضرت علیؓ میں خود اعتمادی کی اسپرٹ کم تھی۔ اپنی رائے پر قائم نہ رہتے۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے جنگِ صفین کا حوالہ پیش کیا تھا۔ کہ اس میں وہ اپنی سابق رائے سے منحرف ہو گئے جس کا نتیجہ انھیں کسے حق میں خراب نکلا اور خود ان کو تاسف بھی ہوا کہ استقامت رلنے کے ترک کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک جگہ آپ برہمہ خلافت فرماتے ہیں :-

”میں نے تم کو اس حکومت سے منع کیا تھا۔ مگر تم نے انکار کر دیا، اس طرح جیسے کٹر دشمن انکار کر دے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔“

۳۹۴

اور دو کرنا پڑا جو تھا رمی خواہش تھی اور تم لوگ بہت ہلکی کھوپڑی کے انسان
واقع ہوئے ہو۔“

اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ اپنی رائے پر قائم نہ رہے، اپنی بات منوانہ سکے، اور
بیوقوفوں کی بات مان لی۔

حضرت علیؑ کے رعب و دبیر میں اس قدر کمی تھی کہ ان کی رعایا ان کا کوئی کہنا ہی
نہ مانتی تھی، گھبرا کر فرماتے:۔

منبت بمن لا یطیع اذا امرت ولا یجیب اذا دعوت (منہج البلاغہ)
”میں ایسے لوگوں کی خلافت میں مبتلا کر دیا گیا ہوں جو نہ کہنا مانتے ہیں نہ پکار کا
جواب دیتے ہیں۔“

اور یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ ان کی باتوں کو لوگ ذرہ برابر وقعت نہ دیتے
اطاعت، فرمانبرداری تو بعد کی چیز ہے، حتیٰ کہ حضرت علیؑ شکوہ کرتے ہیں اور بد دعا
فرماتے ہیں کہ:۔

قاتلکم اللہ لقد ملأتم قلوبی فیہا دشمنیتہم صدری غیظاً (منہج البلاغہ)
”اللہ تم لوگوں کو ہلاک کر دے، تم نے میرے دل کو (غم کی) پیپ سے بھر دیا اور
میرے سینہ کو غصہ سے۔“

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:۔

”تم لوگوں نے مجھے اپنی رائے پر مستقیم نہیں رہنے دیا۔ اس قدر نافرمانی کی۔
یہاں تک کہ اہل قریش کہنے لگے کہ علیؑ بہادر تو ضرور ہیں لیکن علم حرب
نہیں رکھتے۔“ (منہج البلاغہ)

اور کچھ یہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر و عمرؓ نے لوگوں کو سکھلا پڑھا دیا ہو۔
کہ علیؑ کی مخالفت کیا کرو۔ یا حضرت عثمانؓ اپنے بعد کے لوگوں کو اس قسم کی کوئی وصیت

کر گئے ہوں بلکہ خود زمانہ نبوت میں بھی یہی حال تھا۔ یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے مگر لوگ ان کا کہنا نہ مانتے۔ حتیٰ کہ حضورؐ سے آکر اس کی شکایت کی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اپنے اندر کوئی خاص قابہ نہ جلال نہیں رکھتے تھے جس کی بنا پر حکومت کر سکیں مگر لوگ سمجھتے تھے کہ اگر کہنا نہ یائیں گے تو یہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتے۔ ابو بکرؓ کے عہد میں یہ برأت کسی بڑے سے بڑے انسان کو بھی نہ ہوسکی۔

میں نے شیعہ لٹریچر سے نبوت مہم پہنچایا ہے جس سے یہ امر روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گیا کہ حکومت کے لیے جس عظمت و جلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ حضرت علیؓ میں موجود نہ تھی۔ بقول شیعہ حضرات، آپؐ میں اس تذکرہ زوری تھی کہ حضرت عمرؓ نے گھر کو آگ لگا دی حضرت فاطمہؓ کو گھسیٹا، اسقاطِ حمل ہو گیا، حضرت فاطمہؓ نے بڑی سخت باتیں کہہ ڈالیں کہ تم کیسے مرد ہو، گھر میں بیٹھے رہتے ہو جیسے مال کے رحم میں جنین، اور ہم پر یہ ستم مچائے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ (نعم و نالہ) ہوا اور شیرِ خدا کی رگِ حمیت میں جنبش نہ ہوئی۔ اور اس پر یہ دعویٰ کہ انھیں کو خلافت ملنی چاہیے تھی۔ تذکرہ بالا حالات میں کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر وہ خلیفہ بنا دیے جاتے تو اسلام کو اسی طرح چار چاند لگ جاتے جیسا کہ ابو بکرؓ کے زمانہ خلافت میں لگے؟ میں کہتا ہوں کہ شیعہ تاریخ نے جس نوعیت سے ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس واقعہ ارتداد پر نظر ڈالو جبکہ رسولؐ کے بعد ارتداد کی وبا پھیل گئی حضرت ابو بکرؓ نے فوج کشی کرنی چاہی، تمام صحابہ بالا اتفاق حضرت ابو بکرؓ کی رائے کے مخالف تھے اگر حضرت ابو بکرؓ کی جگہ حضرت علیؓ ہوتے تو یقیناً مخالف آرا کی اس مہلت کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے سے بھر جاتے۔ مگر وہ ابو بکرؓ تھے، ایک کوہِ عزم و ثبات، ایک آسمانِ عظمت و جلال، انھیں اپنی اصابتِ رائے پر کامل اعتماد و یقین تھا حضرت عمرؓ جیسا دبنگ انسان ان کو اپنی رائے سے باز رکھنے گیا، لیکن ایسی ڈانٹے پلائی کہ انکو خاموش

ہی ہونا پڑا۔ ”عمر اتم جاہلیت میں کس قدر جبار تھے، اور اب اسلام میں اگر زُردل ہو گئے“ یہ الفاظ تھے جن سے مخاطب کیا تھا۔ خود اعتمادی کا یہ عالم کہ فرماتے، میری زندگی میں اور دین کم ہو جائے، یعنی میں اس دین کا وارث ہوں، وقت کا حاکم ہوں، زمانہ کا بادشاہ ہوں، میں فضا کی ناسازگاری کو اپنی طاقت سے ہموار کر سکتا ہوں، یہ شانِ خلافت مہدی — میں شیعی دنیا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا حضرت علیؑ سے بھی اس بلند حوصلگی کی توقع ہوئی تھی؟ یہ وہ امور میں جس کی وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ اولین خلافت کا استحقاق کسی طرح بھی حضرت علیؑ کو حاصل نہ تھا، یہ اور بات ہے کہ حضرت علیؑ سے فلوئی عقیدت یا شیخین سے گہری عداوت کے باعث حضرت علیؑ ہی کو مستحقِ خلافت ٹھہرایا جائے۔

”وَلَكِنِّي أَقُولُ مَا لَكُمْ لَا تَفْقَهُونَ حَدِيثًا“

نصوص قطعیہ رباہِ خلافت علیؑ

عقل و درایت کا فیصلہ ہو چکا، اب آؤ یہ عبرتناک منظر بھی دیکھو کہ ایک غلط دعویٰ کے لیے قرآن سے استدلال کیا جاتا ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ دعویٰ اپنی کوشش کے اندر کامیاب ہے یا بالکل ناکام؟

صاحب تبصرہ تھے بڑے زور و شور سے دعویٰ کیا ہے کہ خلافت جناب امیرؑ کے لیے نصوص قطعیہ ایک دو نہیں بہت سی موجود ہیں، اگرچہ وہ تین کے علاوہ اور نہ پیش کر سکے نصوص قطعیہ کے پیش کرنے میں صاحب تبصرہ نے ایک گہری مناظرانہ چال چلی ہے وہ یہ کہ ایک آیت بیان کی، اس میں حدیث کا پیوند لگایا اور نتیجہ حسبِ دعوٰی برآمد کر لیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک آزاد خیال انسان کے لیے علمی فریب کاری کہاں تک روا قرار دی جاسکتی ہے۔ میں ان نصوص قطعیہ پر بحث کرنے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک احادیث کا کیمرہ تبہ ہے تاکہ آئندہ فہم مقصود میں دشواری نہ لاحق ہو۔

قرآن عزیز میں متعدد مقامات پر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ رسولؐ غیر متواتر احادیث کا درجہ کے اقوال پر عمل کرو میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے گوشِ خویش رسولؐ کی زبان مبارک سے احکام سنے ان کو لازم تھا کہ وہ اس پر عمل کرتے رسولؐ کا قول ان کے لیے قرآن کے احکامات سے کم وزنی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

لیکن اگر آج کے تیرہ سو برس کا زمانہ گزر چکا مجھ سے کہا جائے کہ یہ زمان رسولؐ ہے اس کی تعمیل تم پر واجب ہے تو میرے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں اقوال رسولؐ کو واجب العمل نہیں سمجھتا، بلکہ اس لیے کہ جو احادیث کا ذخیرہ میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ میرے لیے کسی طرح قابل اعتماد نہیں اور میرے اعتقاد یقین کے لیے کوئی قطعی دلیل ایسی نہیں کہ میں اس کو قول رسولؐ ماننے پر مجبور کیا جاسکوں۔ یہ درست ہے کہ فن حدیث کے جمع و نشر میں بڑی کوشش و کاوش اور بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ فن اسما الرجال مسلمانوں کے پاس ایک قابل قدر و لائقِ فخر شے ہے مگر مجھے کس طرح تم مجبور کر سکتے ہو کہ میں اس کی صحت کا قرآن کی طرح یقین کر لوں۔

اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ یہ حدیث ایسی ہے جس کا سلسلہ سند رسولؐ تک پہنچنا ہے، راوی سارے سچے ہوں قابل اعتماد ہوں، متقی اور ثقہ ہوں، ان تمام باتوں کے اذعان کے باوجود میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ممکن ہے کہ رسولؐ نے ایسا فرمایا ہو اور بس اس سے زیادہ اعتراف کی توقع از روئے عقل فضول ہے غیر متواتر احادیث ظنی ہوتی ہیں ان سے اثبات عقائد ان پر مدارِ ایمان، اُن سے استخراجِ اصول اس قابل نہیں، کہ تسلیم کیا جاسکے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اہل سنت کا اس بارے میں صحیح عقیدہ کیا ہے؟ اگر بھی ہے تو عقل کے حینِ مطابق، اور اگر اس کے خلاف ہے تو ایسا عقیدہ مستحق ہے اس امر کا کہ اس کو بالکل رد کر دیا جائے۔ میں اپنے فیعی اجماع فی ہی اصول پر گھٹکھو کر نا چاہتا ہوں سب وہ نصوص قطعیه ملاحظہ ہوں جنہیں صاحب تبصر نے پیش فرمایا ہے۔

واقعة بیعتِ عثیرہ، فرمانِ رسول: ”هَذَا اخي ووصيتي وخليفتي فيكم“
 ”علی میرے بھائی، میرے وصی اور تم لوگوں کے خلیفہ ہیں“ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا
 پڑتا ہے کہ صاحبِ تبصرہ نے یا تو یہ سمجھا ہی نہیں کہ نص قطعی ”کسے کہتے ہیں یا دیدالنت
 جمل دینے کی کوشش کی ہے، کیا یہی فرمانِ رسول نص قطعی ہے؟ اگر انھیں نصوصات
 قطعیہ پر مدار اثباتِ خلافتِ علیؑ ہے تو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جنھیں حضرت علیؑ سے
 عقیدت ہوگی وہ بغیر ان نصوص کے بھی ان کو مستحقِ خلافت سمجھ لیں گے.... لیکن اگر
 نص قطعی کے معنی یہ ہیں کہ آیت :-

”انذر عشیرتک الا قربین واخفص جناحک من اتبعک من المؤمنین“

”اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے میرے ساتھ
 ہیں ان سے فرد تنی کے ساتھ پیش آ۔“

کی تفسیرِ بیعتِ عثیرہ کو قرار دیا گیا ہے تو دنیا کے استدلال کا خدا حافظ ہے، دعویٰ
 تو اتنا زبردست کر دیا گیا کہ اس آیت سے ”باجماع مفسرین“ واقعہ بیعتِ عثیرہ مراد ہے
 لیکن اس کے ثبوت میں ایک مفسر کا بھی الناسیدھا قول دستیاب نہ ہو سکا۔ انسان کیوں
 ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس کا ثبوت نہ لاسکے۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ اس پر شیعہ مفسرین کا اجماع
 ہے یا سنی مفسرین کا۔ پھر اس کے بعد واقعہ بیعتِ عثیرہ کا مرحلہ رہ جاتا ہے کہ اس کا
 تعلق روایات سے ہے جو کسی طرح قطعی باور نہیں کی جاسکتیں اور لطف یہ کہ اس
 روایت کی بدیہہ ظن محنت کا بھی تو کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ پھر کس قدر صریح ظلم
 ہے کہ ایک مجمل آیت کو لے کر ایک غیر معتبر حدیث کا پونداس میں لگا کر خلافتِ علیؑ کا
 جامہ تیار کیا جاتا ہے اور دعویٰ یہ کہ خلافتِ علیؑ پر یہ نص قطعی ہے۔

۳۹۹

میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں ایک اخلاقی درس دیا گیا ہے کہ اے نبی! مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ "خفص جناح" عربی کا محاورہ ہے جس کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ "فروتی" کسر نفی یا خاکساری کے ساتھ پیش آنے کے ہیں۔ اس قسم کی نرمی و فروتنی اختیار کرنے کی بعض دیگر مقامات پر بھی قرآن میں تعلیم دی گئی اور نبی کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔
 وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضَّ وَاسْنُ حَوْلَكَ۔

"اگر آپ تند مزاج و سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے" کاش ہمارے آزاد خیال شیعہ مضمون نگار کی نظر خفص جناح کے محاورہ پر پڑتی، تو یہ غلط فہمی نہ پیش آتی۔ کہ خفص جناح کے معنی "خلیفہ سازی" قرار دیے جائیں۔ میں ان کو دعوتِ دول کا کہ وہ ذرا وسعتِ نظر سے کام لیں، قرآن عزیز میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری، ان کے سامنے تسلیم و التقیاد ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ "واخفص لهما جناح الذل" (یعنی والدین کے لیے ذلت کے بازوؤں کو جھکا دو) پھر کیا اس کا یہ مفہوم قرار دیا جائیگا کہ ماں باپ کو اپنا خلیفہ بنا دو؟ قرآن فہمی کا یہ کچھ اچھا ثبوت نہیں۔

(۲)

"انما وليكم الله ورسوله والذين امنوا الذين يقيمون الصلوة ويؤتوا الزكاة وهم راكعون"

اس کے لیے ملاحظہ ہوں ذیل کی روایات:-

الخطيب في المتفق عن ابن عباس عبد الرزاق، عبد بن حميد بن جرير، البوشايخ، ابن مردويه عن ابن عباس طبراني في الاوسط، ابن مردويه عن ابى طالب ابن ابى حاتم، البوشايخ ابن عساكر عن سلمة بن كهيل، ابن جرير عن مجاهد، ابن جرير عن السدي عتبة

بن حکیم، الطبرانی وابن مردودہ، ابو نعیم عن ابی رافع ابن مردودہ عن ابن عباس (درمنثور السیوطی)

ان روایات میں یہ مذکور ہے کہ مندرجہ بالا آیت اس وقت انزی جبکہ حضرت علیؑ نے ایک سائل کو بحالت نماز انگشت شہادت سے اتار کر اٹکھٹھی دے دی تھی۔ صاحب تبصرہ نے یہ دوسری نص قطعی پیش فرمائی ہے اور میں جانتا ہوں کہ حضرات شیعہ کی سب سے بڑی مایہ ناز دلیل یہی ہے، شیخ حلی نے الفین میں اس بات کا التزام کیا تھا کہ وہ خلافت علیؑ پر دو ہزار دلیلیں قائم کریں گے۔ شیخ حلی نے بھی اپنی سب سے پہلی دلیل اسی آیت کو قرار دیا ہے۔

لیکن جب اس دلیل کو تحلیل کر دیجئے تو بالکل لاشعے نظر آتی ہے۔ میں بتاؤں گا کہ اس آیت سے استدلال میں کس قدر فریب سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس آیت میں بھی روایت کا پیوند جوڑا گیا، دلیل کی قطعیت تو اسی حرکت ناشائستہ کے باعث سوخت ہو گئی کہ روایت قطعی نہیں ظنی ہوتی ہے۔ دوسری شے یہ ہے کہ روایت کی نقل میں — تہذیب مانع ہوتی ہے ورنہ میں کہتا کہ بڑی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا گیا ہے۔ درمنثور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ درمنثور وہ کتاب ہے جس میں مصنف نے بغیر التزام صحت دنیا بھر کی صحیح و غلط، رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں۔ کہ جس کا بیشتر حصہ صرف "خرافات" ہے۔ اس کتاب سے آپ نے چند مصنفین کے حوالے پیش کر دیے کہ ان ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں نے اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے۔ یا نقل کر کے رد کر دیا ہے۔ یہ بھی نہیں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس روایت کی سند کیا ہے؟ رواۃ کیسے ہیں؟ ان چیزوں سے آنکھ بند کر کے محض فریب دینے اور نادانقت کو گمراہ کرنے کے لیے دو درجن کتابوں کے نام نقل کر دیے کہ ان ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے

چاہے وہ روایت جعلی ہی کیوں نہ ہو، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ روایت قطعی جھوٹی اور جعلی ہے۔ اس کی صحت کا ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جاسکتا۔

اس کی صحت کا اثبات ایسا ہی ناممکن ہے جیسے شب و تاریک کو روز روشن ثابت کرنا۔ بخلاف اس کے دوسری روایات اس کے متضاد واقع ہوئی ہیں جس کا اعتراف خود صاحب تبصرہ کو بھی ہے۔ پھر وہ کیوں قابل قبول نہیں ہیں؟ اس کا جواب کچھ نہیں ہے۔ پھر کیا انھیں جھوٹی حدیثوں سے اثبات خلافت علی ممکن ہے؟

حدیث کی توحید حقیقت نمی، آیت کی نوعیت ملاحظہ ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس سے مراد حضرت علیؑ ہی کی ذات ہے تو بیش از بیش ان کا ولی ہونا قرآن سے ثابت ہوا۔ لیکن دلی سے خلیفہ ہونا مراد لینا کیز کرد درست ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ولی بمعنی حاکم اور خلیفہ ہوتا ہے لیکن یہ کس نیت و انداز پر ہے کہ ایک لفظ کے ایسے معنی مراد لیے جائیں جو حقیقتاً اس کے نہ ہوں۔ لغت عرب میں کہیں ولی کے معنی حاکم کے نہیں آتے البتہ دالی کے معنی حاکم کے آتے ہیں، رضا شاہ کو دالی ایران تو کہا جاسکتا ہے اور کہا جاتا ہے لیکن دالی ایران نہیں کہا جاسکتا ہے اور نہ کہا جاتا ہے۔ دالی شام، دالی عراق وغیرہ مستعمل ہے، دالی شام کہنا لغت میں ایک جدید اضافہ ہوگا شیعہ مسجدوں سے اشہد انما علیا ولی اللہ کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں، کیا حضرات شیعہ کے نزدیک اس دلی اللہ کے معنی دالی اللہ کے ہیں؟ کیا حضرت علیؑ کو اللہ کا حاکم دالی قرار دیا جاسکتا ہے؟ پھر اسی آیت میں دلی کے معنی حاکم کے ہو جیائیں گے؟ میرے دوستو انصاف، ظلم نہ کرو، لغت اٹھا کر دیکھو ولایت کا لفظ دو طرح سے مستعمل ہے۔ داؤ پر فتح (زبر) ولایت اور داؤ پر کسر (زیر) ولایت پہلے کے معنی حکومت کے ہیں جس سے دالی بن رہا ہے اور دوسرے کے معنی محبت کے ہیں جس سے دلی مشتق ہے۔ اور اس کی جمع اولیا کہتی ہے۔ دالی کے معنی حاکم کے ہیں، دلی کے معنی دوست کے ہیں۔ قرآن میں بکثرت دلی، اولیاء کے الفاظ وارد ہوئے ہیں

اور ہر جگہ دوست ہی کے معنی ہیں۔ ”المؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض“
”مسلمان مرد و عورتیں بعض بعض کے دوست ہیں۔“

دلی اور محاورات میں بھی دوست ہی کے معنی میں مستعمل ہے، ولی اللہ ولی کامل وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ پھر بھی یہ بخود تو کروا آیت میں الذین آمنوا، یقیمون، مراکعون وغیرہ الفاظ جمع کے وارد ہوئے ہیں انہما حضرت علیؑ کو کیونکر مراد لیا جاسکتا ہے۔ یا اگر ایسا کیا جائے تو مجاز ہوگا اور مجاز کے لیے ضرورت اور قرینہ صارفہ کا ہونا اپنے فن کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ یہاں نہ کوئی ضرورت ہے، نہ قرینہ صارفہ۔

پھر کسی شدید غلطی کا ارتکاب کیا گیا کہ دھم مراکعون کو جو ترکیب کے اعتبار سے حال واقع ہو رہا ہے اس کو صرف یثوتون الزکوٰۃ کی ضمیر سے حال بنایا گیا ہے۔ یعنی جو زکوٰۃ دیتے ہیں بحالت رکوع، حالانکہ زکوٰۃ دینے کے ذکر سے پہلے یقیمون الصلوٰۃ کا جملہ بھی موجود ہے اور بخوبی قاعدہ کے اعتبار سے مراکعون کو اس جملہ سے بھی حال بنانا پڑے گا۔ اب معنی یہ ہو جائیں گے کہ جو نماز پڑھتے ہیں بحالت رکوع، زکوٰۃ دیتے ہیں بحالت رکوع — کس قدر محل حملہ ہو گیا، نماز بحالت رکوع کے کوئی معنی نہیں ہیں جب یہ غلط ہے تو زکوٰۃ بحالت رکوع بھی غلط، قصہ ختم ہوا۔ پھر ایک غلطی یہ بھی کی گئی ہے یا صاحب تبصرہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ انھوں نے رکوع سے مراد نماز والے رکوع کو لیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ رکوع کے معنی لغوی جھکنا یعنی عاجزی کرنا مراد ہے۔

پھر یہ بھی دیکھو اصطلاح شرعی میں زکوٰۃ ایک مخصوص صدقہ مفروضہ کو کہتے ہیں جو صاحب نصاب پر سال تمام ہونے کے بعد عائد ہوتا ہے حضرت علیؑ صاحب نصاب نہ تھے۔ انھوں نے زکوٰۃ کیونکر دی، زکوٰۃ سے صدقہ غیر مفروضہ مراد لینا بغیر قرینہ جابر نہیں پھر یہ دیکھو کہ حضرت علیؑ نے نمازیں صدقہ دیا، قرآن میں اسکی تعریف وارد ہوئی۔ اور

فقیہین میں سے کوئی اس کا بھی قائل نہیں کہ آج نمازیں صدفہ مستحب ہے، سنت و واجب کا ذکر رہنے دو، اگر ایسا کیا جائے تو بوجہ فعل کثیر ہونے کے فساد نماز کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی غور کرو کہ حضرت علیؑ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ جنگ اُرد میں آپ نماز پڑھ رہے تھے، پاؤں میں آکر تیر لگا، انھوں نے فوراً سے جاری ہو گئے مگر آپ کو خبر نہ ہوئی، بعد نماز لوگوں نے بتایا تو خبر ہوئی، اس قدر غرق فی الصلوٰۃ ہو جاتے تھے، یہاں سائل کی ان کو خبر کیونکر ہو گئی اور کس طرح انکو محیٰ اُتار کر دے دی، پھر ان چیزوں سے قطع نظر کہ لو آیت کے سیاق و سباق کو دیکھو، پہلے سے تذکرہ جلا آ رہا ہے کہ سیدہ نصاریٰ سے محبت نہ کرنا ترک محبت کا طریقہ بتایا گیا ہے، اسی ضمن میں فتہ ارتداد اور اس کا علاج بیان کیا گیا ہے، بعد میں بھی یہی سنوں ہے۔ اب تمہیں سوچو کہ درمیان میں حضرت علیؑ کی خلافت کے تذکرہ کا کون سا موقع و محل تھا، کیا قرآن میں یہ لغویت ہو سکتی ہے؟

پھر یہ دیکھو کہ اس آیت سے استدلال کے وقت انجام سے کیونکر آنکھیں بند کر لی گئی ہوں، مان لو کہ اس سے حضرت علیؑ کی خلافت کا ثبوت ملتا ہے لیکن حرج یہ تو سوچو کہ فلک ٹوٹ پڑیگا کس پر

دیگر ائمہ کی امامت نسبت و نابود ہوئی جاتی ہے۔ آیت کا پہلا لفظ اتم ہے جو پھر کے لیے آتم ہے، پھر یوں ترجمہ ہو گا کہ مومنین کی ولایت و خلافت صرف اسی کے لیے ہے جس نے نمازیں انکو محیٰ دی، حضرت علیؑ تو خلیفہ بن گئے لیکن اور اماموں کی امامت و خلافت کا اب کیا بندوبست ہو گا؟ —

میں تفصیل و اطنا ب سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں اس استدلال کے جملہ نقائص سامنے لاتا لیکن خوف مزید تطویل مانع ہو رہا ہے، اسی پر اکتفا کر کے کہتا ہوں جس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ اس نص قطعی سے کسی طرح بھی حضرت علیؑ کی خلافت پر استدلال جائز نہیں اور اس نص قطعی میں جو ضمیر شامل کیا گیا تھا اسکی صحت کا ثبوت ندارد اور طرفہ ستم یہ کہ اس روایت کو

مفسرین اہل سنت کے سر منڈھا گیا ہے حالانکہ میاں جو عالم ہے اس کا بھی مختصر نمونہ دیکھتے چلو۔

تفسیر جلالین للسیوطی میں اسی آیت کے تحت میں بیان کرتے ہیں کہ:-

”نزلت فی عبد اللہ بن سلام“ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں اس روایت پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

قد وضع بعض الذئابین حدیثاً مفتری ان هذه الآية نزلت فی علی

لما تصدق بخاتمہ فی الصلوة وهذا کذب باجماع اهل العلم والنقل۔

”بعض جھوٹوں نے یہ روایت گھڑ لی ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ

نمازیں انہوں نے انگوٹھی صدقہ کی حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔“

علامہ ابن حجر عسقلانی الکات الشاف کے اندر لکھتے ہیں:-

”کہ یہ انگشتی والی روایت ثعلبی نے بیان کی ہے لیکن اس کی سند ساقط ہے“

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں انہیں روایتوں کے متعلق لکھتے ہیں:-

لیس یصح شیئ منها لضعف اسانیدھا وجمالۃ رجالھا۔

”اس میں سے کوئی بھی صحیح نہیں اسناد ضعیف رجال مجہول ہیں۔“

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:-

وقصہ موضوعہ اعطائے انگشتی روایت کنند ”شیعہ ایک گستاخ تھا قصہ انگوٹھی کا بیان کرتے ہیں“

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں شیعوں کے استدلال کی بابت لکھتے ہیں:-

ولما استدلالہم بان هذه الآية نزلت فی حق علی فهو ممنوع۔

”شیعوں کا یہ استدلال کہ یہ آیت حق علی نازل ہوئی ہے بالکل لغو ہے“

ان تصریحات کو دیکھو ادھر یہ دیدہ دلیری دیکھو کہ مفسرین اہل سنت قصہ انگشتی

کے قائل ہیں، صاحب تفسیر کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ چند ہم مفہوم بظاہر کا ہونا اس کی صحت

ضامن نہیں، وہ اپنے یہاں کی اصول حدیث کی معتبر کتاب استنبصار ملاحظہ فرمائیں۔
 ”یا ایہا الرسول بلغ ما أنزل الیك من ربك وإن لم تفعل فما بلغت رسالتك
 والله یعصمک من الناس“

”اے رسول! ان باتوں کی تبلیغ کر دیجئے جو رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں اور اگر آپ
 نے ایسا نہ کیا تو میں پہنچائی آپ نے اسکی رسالت (پیغام) اللہ آپ کو لوگوں سے مومن رکھیکے۔“
 آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے قطعاً مکمل، واضح اور مستقل حکم کی حامل ہے، نہ کوئی
 خصلہ نہ ابہام نہ ایجاز نہ اہمال اور اس قسم کی متعدد آیات اور بھی قرآن میں موجود ہیں جس میں
 تبلیغ کی شدید تاکید کی گئی ہے لیکن یہ تمام طریقے تو دیکھئے کہ اس آیت کو خلافت علی پر نص قطعی
 قرار دیا جاتا ہے اور اس کو بڑی روشن دلیل کھد لیا گیا ہے، صاحب تبصرہ نے بھی بڑے زور و شور
 سے اسکو بیان کیا ہے اور اس سے پہلے شیخ حلی نے بھی ”منہاج الکرائم“ میں پرستش آیت
 کے بعد اسی کا ذکر کیا ہے۔

طرز استدلال یہ ہے کہ آیت میں جس چیز کی تبلیغ کا حکم ہے وہ حضرت علیؑ کی خلافت ہی
 کا حکم تھا، عام احکام شرعی کی تبلیغ کا حکم مراد نہیں ہے۔
 آیت کا شان نزول جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ بہت لچپ اور سنسنے کے قابل چیز ہے
 رسول اللہؐ اپنے آخری حج سے واپس ہو رہے تھے مقام غدیر خم پر پہنچے تو جبریلؑ
 تشریف لائے۔ اور انھوں نے کہا کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ آپ اس مجمع میں علیؑ کی خلافت کا
 اعلان کر دیجئے۔ رسولؐ نے خدا کیا کہ مجھے خوف ہے، اعلان خلافت علیؑ کے بعد لوگ
 آمادہ قتل و قتال نہ ہو جائیں جبریلؑ واپس گئے، خدا سے سب ماجرا بیان کیا تب یہ آیت
 اتری کہ اے نبی جو حکم نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر دیجئے، ورنہ آپؐ فراموش رسالت کے
 ادا کرنے والے قرار دے دیے جائیں گے، مگر پھر بھی رسولؐ کو تامل تھا۔ یہاں تک کہ خدا نے
 حفاظت کا وعدہ کیا تو آپؐ نے خلافت علیؑ کا اعلان کیا مگر اس مہم انداز میں کہ ”من کنت

مولاء فعلی مولاء " میں جس کا مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ "

یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کی تائید اس سے بہتر نہیں کی جاسکتی اور مجبوراً اپنے احباب کی ندرتِ فکر و پردازِ خیال کی داد دینی پڑتی ہے۔ استدلال اپنے جملہ زوایا کے ساتھ روشنی میں اچکا ہے اب دقت ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس کے ہر سرگوشہ اور ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے۔ اول تو مجھے پھر دی کتنا پڑتا ہے کہ اگر آیت کو روایت سے علیحدہ کر دیا جائے تو استدلال کا سارا بنا بنیا گھر وندہ خاک میں مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ آیت میں تو اشارۃً کتایتہ کسی طرح خلافت کی جو تک نہیں آتی ہے، چہ جائیکہ اس کو خلافتِ علیؑ پر نقصِ قطعی قرار دینا۔ کہ میرے نزدیک یہ ایک غیر منصفانہ زبردستی کے سوا کچھ نہیں ہے، بیباکی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اس حدیث کو اہل سنت کے یہاں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ حالانکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر بیباکی کے ساتھ ایسے غلط دعویٰ کیوں کیے جاتے ہیں اور کیوں دن کی روشنی میں اندھیر کیا جا رہا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نہاج السنۃ میں رقمطراز ہیں :-

اما قولہ من کنت مولاه فعلی مولاه فلہ فی الصحاح - ونقل عن البخاری وبراہیم المحرری وطائفۃ من اهل العلم بالحدیث انہم طعنوا فیہ وضعفوه وقال ابو محمد بن حزم لا یصح ہذا الحدیث من طریق التقات اصلا۔
" لیکن یہ قول من کنت مولاه الخ صحیح احادیث میں سے نہیں ہے اور امام بخاری وبراہیم و دیگر محدثین سے منقول ہے کہ ان حضرات نے اس روایت پر بڑی جرح کی ہے اور اس کو ضعیف بتلایا ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ حدیث بسند ثقافت کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر مکی صواعقِ محرقہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

" کہ اس حدیث پر جرح کرنے والی ایک جماعت ان محدثین کی ہے جن پر جرح و

تعدیل کا دار و مدار ہے جیسے ابوداؤد مجتہد تانی اور ابو حاتم رازی وغیرہ۔
 پھر کیا یہ دعویٰ شریفہ معنی ہو سکتا ہے کہ اہلسنت کے یہاں بھی اس حدیث
 کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور میں تو کہتا ہوں اہلسنت کا ذکر کیا خود بعض شیعی روایات کی بناء
 پر اس روایت کی صحت ظہور میں آجاتی ہے۔ اس لیے کہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت غدیر خم
 کے موقع پر نازل ہوئی اور اس کے بموجب خلافت علیؑ کا اعلان ہوا۔ بلکہ غدیر خم سے فوراً
 پیشتر عرفہ کے دن نازل ہوئی۔ ملاحظہ ہوا اصول کافی صفحہ ۱۷۸ مطبوعہ مکتبہ
 البوہاریہ دکن میں نے امام جعفر صادقؑ کو کہتے ہوئے سنا:-

ثم نزلت الولاية وانما اتاه ذلك في يوم الجمعة لعرفة انزل الله عز وجل
 اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي وکان کمال الدین بولاية علي
 بن ابی طالب۔

”پھر نازل ہوئی امامت علیؑ کی اور یہ حکم نبی کے پاس جمعہ کے دن عرفہ میں آیا، اللہ نے
 فرمایا۔ اليوم اكملت لكم الدين واتممت عليكم نعمتي۔ الخ دین کا کمال علی بن ابی طالب کی امامت سے ہوا۔“
 کہیت کے شان نزول میں غدیر خم کی روایت انصراح کی گئی نتیجہ یہ رہا جو سامنے ہے
 اور اب میں مجز اس کے کیا کہوں۔

”در کفر سم ثابت نہ زنا را رسوا کن“

اور اگر تسکین خاطر کے لیے میں تسلیم کر لوں کہ جو کچھ کہا گیا وہ درست ہے پھر بھی یہ
 امر قابل غور ہے کہ رسولؐ نے کیا چیز کہی؟ میں جس کا مولیٰ ہوں علیؑ بھی اس کے مولیٰ ہیں بزرگ
 شیعہ میں جس کا والی یا حاکم یا خلیفہ ہوں اس کے علیؑ بھی والی یا خلیفہ ہیں۔ اس سے زیادہ
 تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب سنو۔

خدا نے رسولؐ کی بابت فرمایا ہے:-

وان الله هو مولاه وجابريل وصالح المومنين۔

شیعی نقطہ نظر سے اس کا یہ ترجمہ ہوا کہ رسول کا — خدا حاکم و دالٰی ہے اور جبریل اور مومنین صالحین، یعنی تمام مومنین صالحین اور جبریل سب کے سب نبی کے خلیفہ ٹھہرے۔ کیا قرآن کے ساتھ یہ مذاق نہیں ہے؟ اس کے علاوہ میں کہتا ہوں ان تمام چیزوں سے قطع نظر کہ لو استدلال کی ماہیت پر غور کرو جس میں خدا اور رسول کے ساتھ کس قدر گستاخیاں ہیں اور اسلام کے ساتھ کیا کھلا ہوا استغھر ہے۔

صورت حال تو یہ ہے کہ نبی نے ساری عمر تبلیغ کی مصیبتیں جھیلیں، تکالیف برداشت کیں، صعوبتیں اٹھائیں، مسلسل مساعی، ان تھک کوششیں، پیہم جہد جہد کی لیکن بجز چند نفوس کے..... جنہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے کوئی سچے طریقے سے مسلمان نہ ہوا۔ یوں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان صرف مسلمان ہی کہلانے کے لیے موجود تھے، اگر حقیقت سب منافق بے ایمان، خدا اور رسول کے دشمن اور خاندان رسالت کے خون کے پیاسے تھے۔ اگر ان کے مجمع میں خلافت علی کا اعلان کیا جاتا تو خون سے تلواریں شربور ہوجاتی اور زمین رنگین ہوجاتی مگر (خاکم بدین) خدا کی سمجھ میں یہ بات ہی نہ آئی کہ وہ ایسے وقت میں خلافت علی کا اعلان کر کے کیوں نبی اور علی کی جان کو مقت میں تلف کیے جانے کا سامان کر رہا ہے۔

یا اگر اس کو یہی منظر تھا کہ علی ہی خلیفہ ہوں تو کیوں نہ پہلے ہی سے ایک بڑی جماعت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جو اس اعلان کے سننے کے بعد اسکے تسلیم و اعتراف میں لیت و لعل کرتی۔ پھر (لعوذ باللہ) اللہ کے حکم سے نبی کی سترابی تو دیکھو کہ خدا کہہ رہا ہے، خلافت علی کا اعلان کرو مگر نبی انکار کر رہے ہیں، ان کو اپنی جان کا ڈنڈا ہوا ہے، پھر کئی طرح اعلان بھی کیا تو گول مول جملوں میں جسے کوئی سمجھ ہی نہ پائے کہ۔

”مطلب سعدی چیت“

معاذ اللہ خدا کے یہ غیر نال اندیشانہ احکام نبی کے یہ بزدلانہ کیر کرطان کے مشن کی نامقبولیت، حمیدہ صحابہ کی منافقانہ پالیسی یہ سب کچھ تسلیم اور باور کر لیا جاتا ہے تاکہ کسی طرح ایک غیر متعلق آیت سے کھینچ کر خلافتِ علیؑ کا اثبات کیا جاسکے۔ العظمۃ اللہ۔ اور پھر خلافت و امامتِ بو ترابی کی یہ اہمیت کہ اگر اس کا اعلان نہ کیا گیا تو اس سے قبل کے بائیس سالہ کارنامے اسی طرح ملیا میٹ کر دیے جائیں جیسے نبیؐ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ گویا اسلام کا سارا مدار یا اسلام کا تمام ریزن خلافتِ علیؑ میں منحصر تھا اور اسلام کا اس کے سوا کچھ مقصد ہی نہ تھا۔ نبیؐ نے اپنے اصلاحی پروگرام یا اپنی مصلحتانہ سکیم سے اور پھر اپنی مسلسل مالی و نفسانی قربانیوں سے نہ محض یہ کہ عرب میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا بلکہ میں تو کتنا ہوں زمانہ کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ پھر بھی نبیؐ نے کچھ نہ کیا، اگر خلافتِ علیؑ کا اعلان نہ کیا۔ یہ حضرت علیؑ کی خلافت کا اثبات نہ تھا بلکہ اسلام و باقی اسلام کے ساتھ مذاق ہوا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب خلافت کا مسئلہ اس قدر اہم تھا تو خدا نے اس کی بابت صریح احکام کے نازل کرنے میں کیوں بخل سے کام لیا۔ اور کیوں ”مسئلہ خلافت“ کو مصنفِ نسوان کے بعض اذہان کے درون پردہ کی طرح مخفی رکھا گیا۔ حالانکہ رسولؐ کی یہ خواہش بھی تھی کہ خدا مسئلہ امامت کو کھلے لفظوں میں بیان کر دے۔

میل رسولؐ آں بود کہ تصریح و تفسیر ولایت در قرآن شورو آفتاب بر سنت نہ سود (صافی بشرح کافی مصنف علامہ خلیل تفسرونی)

”رسولؐ کی خواہش یہ تھی کہ امامت کی تشریح و تفسیر قرآن میں ہو جائے اور محض اہادیث پر اکتفا نہ ہو“ مگر باوجود اسکے خدا نے قرآن کے اندر کوئی تفسیری حکم اس کی بابت نہیں نازل کیا اور نہ اشارۃً و کنا فیہ یہی اس کا قرآن میں کہیں کوئی ذکر کیا بلکہ میں نے کہا کہ نہ جاملے کیوں ایسے متم بالشان مسئلہ کو جس پر مدارِ اسلام تھا خدا نے رائی نہ ہی بنائے رکھا۔

اصول کافی صفحہ ۸۷ میں امام رضاؑ سے روایت ہے :-

قال ابو جعفر عليه السلام دلایۃ اللہ اسرار الی جبرئیل واسرار جبرئیل الی محمد واسرار محمد الی علی واسرار علی الی من شاء وانتم تذلکون ذلک .

امام باقرؑ نے فرمایا کہ ولایت الہی یعنی مسئلہ امامت خدا نے بطور راز کے جبریل سے بیان کیا اور جبریلؑ نے رسولؐ سے بطور راز کے بیان کیا اور رسولؐ نے علیؑ سے بھی بطور راز کے بیان کیا اور علیؑ نے جس سے چاہا اس سے بطور راز کے بیان کیا۔ اس کے بعد امام باقرؑ نے فرمایا کہ اب تم لوگ (نالائق ہو جو) اسے شہود کیے دیتے ہو۔

اللہ اللہ جس مسئلہ کی یہ نوعیت تھی کہ وہ راز مرسلہ تھا اور سینہ بہ سینہ ائمہ معصومین تک پہنچا تھا اس کی تصریح قرآن میں تلاش کی جاتی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اور یہ تو دیکھو کہ جب یہ مسئلہ ایک راز تھا کہ خدا نے صرف جبریل سے اور جبریل نے فقط نبی سے اور نبی نے محض علیؑ سے بطور راز بیان کیا تو پھر اس غدیر خم کے افسانہ کا کیا حشر ہوگا جس میں ایک لاکھ انسانوں کے سمندر میں خلافت علیؑ کے اعلان کیے جانے کا تذکرہ ہے۔ کیا یہ جرأت کی جاسکتی ہے کہ اصول کافی کی روایت کو غلط قرار دیا جائے جسکی بابت ”امام غائب“ کا ارشاد ہے کہ ہذا اکابر لشیعتنا۔ ”یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے“ یا یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ امام باقرؑ کے قول کو غلط قرار دیدیا جائے درانحالیکہ وہ ”معصوم“ تھے پھر کس خراس روایت کا کیا جواب دیا جائے گا۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ ”ہمارا راز برابر پوشیدہ رہا، یہاں تک کہ ان مکار لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا اور انھوں نے اسکو گلیوں اور کوپوں میں پھر کر بیان کر دیا۔“ (اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ) یہی خلافت علیؑ پر نص قطعی تھی اور یہی وہ مایہ ناز دلیل تھی جس کے بیان کرنے میں صاحب تفسیر نے صفحہ کے صفحے سبھا کر ڈالے ہیں۔ آیت میں ایک غیر مصدقہ روایت کا پیوند لگایا مگر پیوند بھی ایسا کہ جس کے تار تار کبھرے ہوئے ہیں۔

(۴)

وَالْوَالِیُّونَ مِنْ ابْنِهَا — ”اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو“

یہ بھی خلافتِ علیؑ پر ایک نعرِ قطعی ہے اور وہ یوں کہ رسولؐ کا ارشاد ہے کہ ”انما مدینۃ العلمہ وعلیؑ بابُہا ومن اراد البیت فلیات الباب“ ”میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں جس کو گھر میں آنا ہو وہ دروازہ سے آئے۔“ بس خلافتِ علیؑ اس آیت سے ثابت ہو گئی، ٹھیک اسی طرح جیسے ایک ”ذکر“ نے قل ہوانذاحد“ سے شہادت کر لیا کا واقعہ یوں استنباط کیا تھا کہ وہ خدا ایک ہے جس نے عرب میں ایک نبی بھیجا تھا اور کس نبی کے ایک صاحبزادی تھیں فاطمہؑ، اور اُن کے دولہے تھے حسنؑ اور حسینؑ، یہی حسینؑ کو بلا میں شہید ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کے ساتھ کیوں مذاق کیا جاتا ہے، یعنی آیت کے ساتھ روایت کا دامن باندھنے پر بھی تو خلافتِ علیؑ کا اثبات نہیں ہوتا، چہ جائیکہ صرف آیت سے اثبات کیا جاسکے۔ اور پھر روایت کی روشنی میں روایت کو دیکھئے تو ناگفتنی کمزوریاں نظر آتی ہیں، ”اول تو سند کے اعتبار سے یہ روایت پایہ اعتبار تک نہیں پہنچتی، پھر یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ کسی شہر کا دروازہ صرف ایک نہیں ہوتا، بلکہ کئی ایک ہوتے ہیں اور عموماً چار دروازے ہوتے ہیں۔ تنہا علیؑ کو باب مدینۃ العلم کہنا غلط ہے۔ پھر یہ بھی طے شدہ امر نہیں کہ علیؑ کے لفظ سے ابن ابی طالبؑ مراد ہیں یا لغوی معنی ”بلند“ مراد ہیں یا لغوی معنی مراد لینے کے بعد روایت کا مفہوم یہ ہو گا کہ میں علم کا شہر ہوں اور بلند (علیؑ) ہے اس (شہر) کا دروازہ۔ دروازہ کی بلندی کے ذکر کرنے سے ”شہرِ علم“ کی اہمیت کا اظہار مقصود ہے۔ اوٹیں لکنا ہوں کہ ان امور سے قطع نظر بھی کرو، اگر صرف حضرت علیؑ کا مبلغِ علم ہی ان کی اولین خلافت کے لیے وجہ استحقاق ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت عثمانؓ اسی اولین خلافت کے مستحق نہ قرار دیے جائیں کیونکہ حضرت علیؑ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:—

انک لعلم ما لعلم (نہج البلاغہ)۔ بیشک وہ آپ سب کچھ جانتے ہیں جو میں

جاتا ہوں۔

پھر کیا یہ علم کی تسادی حضرت عثمان کو اولین خلافت کی مستحق نہیں قرار دے سکتی؟
حقیقت یہ ہے کہ ایسی روایات کی صحت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی ان اصحاب
کی صرف جزئی فضیلت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور بس ان روایات فضائل کو مسئلہ خلافت
امامت سے کیا تعلق؟ اگر صرف علم ہی دنیا میں وجہ حکومت و فرمانروائی ہو سکتا تو شاید آج
اورنگزیس حکومت پر ہٹکر دوسو لینی قابض نہ ہوتے، ازہم سلطنت اسٹالین اور مصطفیٰ کمال
کے ہاتھوں میں نہ ہوتی، ڈی وی اور جنرل فرانکو کی قیادت نہ تسلیم کی جاتی اور معاف کیا
جائے ایران کے تخت پر رضا شاہ پہلوی نہ ہوتے بلکہ کوئی "قبلہ سرکار شریعتدار" رونق افروز ہو
کر داد حکمرانی دیتے، مگر اس ناپاک مادی دنیا کا ازل سے کچھ عجیب و غریب رہا ہے کہ اس نے
صرف "زہد و اتقا" کو کبھی ہائیک حکومت نہیں سمجھا اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ ائمہ معصومین کو مخصوص
من اللہ تھے مگر دنیا کی مادی طاقتیں نہ جانے کیوں اس کے خلاف تھیں، نتیجہ یہ ہوتا کہ خدا نے
بھی خاموشی ہی اختیار کی۔ رسول نے بھی سکوت ہی میں مصلحت سمجھی، علیؑ شیر خدا کی آنکھوں کے
سامنے منافقوں نے تخت و تاج سنبھالا، خوب خوب داد جہان بینی و کشور کشائی دی، بزرگ شیر خدا
کا کچھ بس نہ چلا، وہی شیر خدا کہ جنہوں نے بڑے بڑے بہادران عرب کو خاک و خون میں ملا
دیا تھا اور بڑے بڑے یلان پیل تن کا ان کے نام سے نہرہ آب ہو جاتا تھا مگر وہ ابو بکر و عمر
کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے۔ اس لیے کہ آواز کا میاب نہ ہوتی۔ قوم ان کی قیادت پر کسی
طرح تیار نہ ہوتی کہ حضرت علیؑ سے بہتر مدبر و طاقتور دماغ حکمرانی میں مصروف تھے اور حکومت
کے لیے برا علم و تقویٰ و درکار نہیں۔

صاحب تبرہ نے جو نصوص قطعیہ پیش کی تھیں ان کی حقیقت اب کچھ اس طرح نمایاں ہو
گئی کہ منصف مزاجوں کو نصیحت کرنے میں آسانی ہو گی۔
جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے اکثر بہاے ساتھ کے بہار مر گئے

صاحب تیسروے میں عرض کر دل گاسہ
 بہ متارخ خود چہ نازی کہ بشہر دروستان
 دل غزنوی نیرزد بہ تبتے ایانے



دیکھنے والوں کو یہ نامعلوم ہوگا کہ قرآن میں صراحتہً تو درکنار اشارۃً بھی کہیں خلافت
 علیؑ کا کوئی پتہ نشان موجود نہیں اور قرآن سے ثبوت کیونکر مل سکے کہ یہ سب سے پہلے
 کی ذہنی خلاقیت کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ ہو جہاں کئی صفحہ ۱۷

”بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا پہلے یہودی تھا اور حضرت
 یوشع بن نون کے بارے میں غلو کیا کرتا تھا۔ پھر سلمان بنہما اور حضرت علیؑ سے
 محبت کرنے لگا، اور نبی علیہ السلام کے بعد حضرت علیؑ کے بارے میں بھی دیا
 ہی غلو کرنے لگا۔ یہ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے امامت علیؑ کے فرض
 ہونے کو شہرت دی۔ اور اُن کے دشمنوں پر تیرا کیا۔ اُن کے مخالفوں
 کی تکفیر کی، اسی لیے جو لوگ شیعوں کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ تشیع
 کی بنیاد یہودیت سے مانوڑ ہے۔“
 انفس!

نام نہرا بردن و دین یہودی داشتن

اسی لیے زمانہ سابق کے شیعہ علماء نے یہ راہ اختیار کی کہ قرآن کو محرف قرار دیا اور یہ عقیدہ
 قائم کر لیا کہ اس قرآن سے وہ تمام آیات حذف کر دی گئی ہیں جن میں خلافت و امامت کا
 تذکرہ تھا، یہ راہ آسان تھی، عموماً سب نے یہی راہ اختیار کی اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق
 ہے میں کامل و وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جمہور شیعہ تحریف قرآن کے قائل و معتقد ہیں۔ بہت
 ہی تتبع اور استقراء کے بعد صرف چار شخصوں کی بابت یہ معلوم ہو سکا کہ وہ تحریف قرآن

کے قائل نہیں، ورنہ ان کے علاوہ ”مہر خانہ آفتاب“ کا مصداق ہے۔

علامہ نوری طبرسی فصل الخطاب صفحہ ۳۲ میں لکھتے ہیں :-

الثانی عدم وقوع التغییر والنقصان فیہ و جمیع ما نزل علی رسول اللہ ہو
الموجود فی ایدی الناس فیما بین الدفتین والیہ ذهب الصدوق فی عتقائہ و
السید المرتضیٰ و شیخ الطائفة فی التبیان ولم یعرف من القدماء موافق لهم۔
”دوسرا قول قرآن کے اندر عدم تحریف کا ہے یعنی جو کچھ رسول پر نازل ہوا تھا وہ حروف
بحرف بین الدفتین موجود ہے۔ اس طرف شیخ صدوق، شیخ مرتضیٰ اور ابو جعفر طوسی شیخ الطائفة
لکے ہیں، مگر مقتدین میں ان برسہ حضرات کے موافق کوئی بھی نہیں۔“
پھر اسی کتاب کے صفحہ ۳۲ میں ہے :-

والی طبقة (ای المرتضیٰ) لم یعرف الخلفاء صریحاً الا من هذه المشائخ الالویة
یعنی شریف مرتضیٰ کے طبقہ تک تحریف قرآن کی صراحتہ مخالفت بجز ان چار بزرگوں
کے اور کوئی نہیں (چوتھے بزرگ ابو علی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان ہیں)

ظاہر ہے کہ پورے مذہب والوں میں سے صرف چار شخصوں کے انکار تحریف قرآن کو
کیا وقعت دی جاسکتی ہے جمہور شیعہ تو مانتے ہیں کہ قرآن میں قطع و برید کی گئی ہے اسی
وجہ سے جب تم شیعہ رسول کا مذہبی لٹریچر دیکھو گے تو تمہیں ایک روایت بھی ایسی نہ ملے گی
جس کا یہ مفہوم ہو کہ موجودہ قرآن وہی ہے جو حضور پر نازل ہوا تھا بخلاف اس کے تحریف
قرآن کی بابت روایتیں ڈھونڈو تو میں تم سے بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ ڈھائی ہزار روایتیں
میں گی جن میں اکثر و بیشتر ائمہ معصومین سے مروی و متعلق ہیں، یہ بحث بہت طویل ہے
ورنہ میں تفصیل کے ساتھ بتاتا کہ کیونکر شیعہ حضرات تحریف کے قائل ہیں اگر کسی کو اس کا
ثبوت حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ اصول کافی مصنف یعقوب کلینی تفسیر قمی مصنف علی بن
ابراہیم قمی، احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران، التفسیر صافی، تفسیر عیاشی، الفصل الخطاب مصنف علامہ نوری

’باری‘ استقصار الانحزام مصنفہ امام الشیعہ مولوی حامد حسینؒ کا مطالعہ کر کے جس میں روایات تحریف جبری پڑی ہیں۔

میر انخیال ہے کہ جمہور کا یہ عقیدہ ہی اس بات کے لیے سب سے بڑی دلیل ہے کہ موجودہ قرآن میں خلافت علیؑ کا وجود نہیں۔ ورنہ اعتقاد تحریف کی کوئی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔

ان تمام تراجمات کا حاصل صرف یہ ہے کہ یا تو مسئلہ خلافت و امامت علیؑ کو قرآن سے متعلق نہ سمجھا جائے یا پھر قرآن ہی کو قابل اعتبار نہ قرار دیا جائے۔ اس کے سوا کوئی تیسری صورت نہیں جس کو عقل و نقل کی تائید اور درایت و روایت کی حمایت حاصل ہو۔

اب میں اس بحث کو نہیں پر سر دست ختم کرتا ہوں کہ میری دانست میں فیعی دلائل و براہین اپنے جملہ حواشی و ردایا کے ساتھ روشنی میں آچکے، اور اس طرح ان کے حقائق روشن ہو چکے ہیں کہ کم از کم جو ہر لطیف سے بہرہ مند اشخاص ان کی استدلالی حیثیت کو ذہن برابر بھی وقعت نہیں دے سکتے، بہت دھرمی اور کج روی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں، اس کامعادلہ صرف خدا پر ہے۔

ہاں یہ ضرور عرض کر دوں گا کہ اب تک میری تمام تر گفتگو کا مدار سب سے پہلے تھا یعنی اعلیٰ خلافت علیؑ کے منصوص ہونے کا منکر تھا، لیکن اس کے بعد اگر ضرورت محسوس کی جائے۔ یعنی اہلسنت کے معتدل مسلک کو دیکھنے کی خواہش ہو کہ کس حد تک عقل و درایت کے ساتھ چپاں ہے تو میں اذعان و یقین کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے نہایت بلند آہنگی سے دعویٰ کرتا ہوں کہ غلط فہمی نہ بلکہ بالخصوص شیخین کی خلافت برحق تھی۔ وہ غاصب خلافت نہ تھے بلکہ مستحق خلافت تھے۔ میں اس مسئلہ کو درایت کے علاوہ قرآن کی تابناک روشنی میں پیش کر سکتا ہوں کہ جس سے انکار کی ہر مہم گنجائش ناممکن ہوگی۔ اور یہ وہ صورت نہ ہوگی کہ اعدائے باطل کے اثبات کے لیے جب دلائل و حجج کی دنیا میں قدم رکھا گیا تو ہر قدم پر یکسی نے، فریاد کی، اور ہر گام پر بے مانگی نے مرثیہ پڑھا۔ درایت نے دامن تمہا مارا اور عقل نے ہانڈ پکڑا۔ غرض

بیچارگی کی جس قدر بابولیاں ہوسکتی ہیں وہ خود خرمن دلائل کے حق میں بق و شتر ثابت ہوتیں۔

✽

آزاد خیال شیعہ صاحب کے مضمون کا یہ جواب لکھ رہا تھا اور اس کا بیشتر حصہ لکھ بھی چکا تھا، کہ ماہ جولائی کا نگار میری نظر سے گزرا جس میں میرے محترم ابو سعید برقی صاحب کا وہ مقالہ شائع ہوا ہے جو انھیں آزاد خیال شیعہ صاحب کے جواب میں ہے۔ ہر چند کہ برقی صاحب کا وہ مقالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے پھر بھی بحث کے چند گوشے ایسے لگے تھے جہاں سلسلہ میں بے نقاب ہونا نا ہی بہتر تھا، برقی صاحب کا مقالہ نظر سے گزر جانے کے بعد مجھے یہ آسانی ہوئی کہ بحث کے آخر میں جہاں کتب شیعہ سے احتجاج و استدلال کی ضرورت پیش آئی ہے میں نے ان تمام ردائیتوں کو ترک کر دیا ہے جو برقی صاحب اپنے بیان میں لانا چکے تھے کہ نکراوے بجز طوالت اور کچھ حاصل نہ تھا، مجموعی حیثیت سے ان جملہ مباحث کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ صاف نظر آتا ہے۔

کہ خلافتِ علیؑ کے لیے ایک بھی نص قطعی موجود نہیں، نہ رسولؐ کی یہ خواہش تھی بلکہ یہ بعض مفسدین کا اختراعی مسئلہ ہے اور اس قدر مہلک و خطرناک کہ اس کی بدولت فرقان کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

میں شیعہ علماء سے گزارش کر دل گا کہ وہ ان معروضات پر غیر جذباتی حیثیت سے غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں، بات آسان ہے، سمجھ میں آسکتی ہے بشرطیکہ تعصب اور تنگ نظری کی تاریک فضا سے علیحدہ ہو کر غور کیا جائے ورنہ ذاتی اغراض و مقاصد کا حجاب طبیعت کو اثر پذیر یوں سے مجبور رکھتا ہے اور انسان قبولِ صداقت کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہے و

م'ح

۴۱۷

مسئلہ خلافت و امامت

اسلام اور انسانیت کے نقطہ نظر سے

jabir.abbas@yahoo.com

ذکر حسینؑ

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

{ انسانیت اور اسلام کے نقطہ نظر سے }



جولائی ۱۳۳۷ء کے ہنگاموں میں بعنوان مندرجہ صدر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ گویا خلافت و امامت کے مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بحث کی دعوت عام ہے، اور تھکار کے اڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اصل موضوع پر دونوں فرقوں کی جانب سے ایسے دلائل پیش کیے جائیں کہ دنیا کسی حد تک اس قدیم اور دشوار تر گتھی کو سلجھانے کے قابل ہو سکے فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں پہلے انسانیت اور پھر اسلام کے نقطہ نظر سے گفتگو کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس لیے آئیے دیکھیں کہ انسانیت و اسلام کے جو اصول اعتقادی نے مقرر کیے ہیں وہ کس حد تک لائق تسلیم ہیں۔ اور انسانیت انہیں گوارا بھی کرتی ہے یا نہیں؟

وہ انسانیت کا مدار عقل عمومی پر رکھتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔
 عقل عمومی سے میری مراد وہ معمولی فہم و فراست ہے کہ جسے روزمرہ کے کاروبار میں ہم کام میں لاتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومی کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاد نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کو اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوتی، مثلاً سچ بولنا اچھا ہے یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اس طرح "انسان کا قتل کرنا" وحشیانہ فعل ہے یا "جھوٹ بولنا" بُری بات ہے۔ اس نوع کے تمام اصول و

کیا ت ایسے ہیں کہ جنہیں ہماری عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے۔
 انسو س ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی اس تشریح سے بھی ابہام رفع نہیں ہوتا، کیونکہ
 اس سلسلہ میں اس امر کی تشخیص کہ فلاں بات سچ ہے اور فلاں بات جھوٹ کس کے
 ذمہ قرار پائے گی، یہ ایک الجھن ہے۔

اب میں ایک اور نگاہ سے اس قول کو چا نچتا ہوں۔ اس بحث میں عقل عمومی کو
 حجت قرار دیا گیا ہے۔ یعنی عقل عمومی جس شے کا انکار کرے وہ رد کر دینے کے قابل
 ہے۔ اور جس شے کو قبول کرے وہ قابلِ اخذ ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مانا جائے اور عوام
 کا اقرار یا انکار حجت ہو جائے تو کوئی اصل اپنے مقام پر ثابت نہیں رہتی۔ یہی عقل عوام
 حقیقی جو ایک زمانہ میں شہنشاہیت مطلقہ کے سامنے جھکی ہوئی تھی اور اب یہی عقل عمومی
 ہے جس کے لیے بقول آل محترم اشتراکیت جاذبِ نظر بنی ہوئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ عوام ہر زمانہ میں کالافعام ہوا کرتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ عوام ہمیشہ
 ایک مخصوص جماعت کے ہاتھ میں ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے عوام کا رجحان کبھی ہند کے
 قابل نہیں ہو سکتا۔ اور صاحبِ نظر عوام کی قبولیت یا عدم قبولیت کو کبھی اہمیت نہیں
 دیتے بلکہ نفسِ ستم پر نظر رکھتے ہیں۔

میرے قول بالا کی دلیل خود اس مضمون میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کسی
 مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہیے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا حقِ غضب
 نہ ہوتا ہو۔ یہ جزوِ اقل ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ: "اویہی امامت سے
 انسانی جماعت کا حقِ غضب ہوتا ہے" یہ جزوِ ثانی ہے۔ ان دونوں کو ملانے سے
 جو نتیجہ نکلے گا وہ سلسلے ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ عقل عمومی ہمزبان ہو جائے، لیکن
 یہ ہمزبانی صاحبِ فکر کو مسحور کر سکے گی۔ وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس قضیہ کے اجراء جو
 قائم کیے گئے ہیں وہ کہاں تک صحت رکھتے ہیں، اب میں ان مطالب کی طرف

بڑھتا ہوں جو اس تحریر کی روح ہیں۔

۱۔ ”رسول اکرمؐ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں اور یہ سلسلہ شاہانِ خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسل قائم رہے۔“

۲۔ ”حضرت علیؑ کی ”الوہی امامت“ کے سلسلہ میں معتبی روایات، احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع، جعلی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم وہ نہیں ہے جو الوہی امامت کی تصدیق کرتا ہو۔“

یہ دعویٰ ہے اور اس دعویٰ کو نیا بننے کے لیے کچھ تنقیحات قائم کرتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ الوہی امامت یہ ہے کہ :-

”خداوند کریمؐ نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریمؐ کے بعد ان کے داماد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں اور ان کے بعد یہ منصب جلیل ان کی اولاد میں سے کسی کو عطا کر دیا جائے اور اس طرح یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے“ اس نتیجہ پر زور دیتے ہوئے کچھ اور بھی فرمایا گیا ہے جو قابل غور ہے، طوالت کے خیال سے اپنے ہی لفظوں میں ان کا خلاصہ درج کیے دیتا ہوں :-

- ۱۔ خلافت و امامت صرف علیؑ کی نسل کے لیے مخصوص ہے۔
- ۲۔ ہر خلیفہ کی جگہ اس کا بیٹا ہی سنبھالے گا، مثل شاہانِ خود مختار۔
- ۳۔ تمام دنیا کے مسلمان حضرت علیؑ کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں، وہی اولوالامر و آقا و مولا ہیں اور ہر مسلمان ان کے سامنے تسلیم و خضوع کرنے پر مجبور۔ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کتنے ہی تنقی و متوجع ہوں، اس سے محروم رہتے ہیں۔

۴۔ باقی اسلام کی گویا خواہش تھی کہ ان کی نسل تاقیامت مسلمانوں پر

حکومت کرے اور یہ حکومت مطلق العنان ہو۔ اس طرح خانوادہ علی کے لیے گویا نسلی امتیاز قائم ہو جاتا ہے اور آل علی کا ہر فرد گویا ماں کے پیٹ سے یہ حق لے کر پیدا ہوتا ہے کہ تمام ذیل کے مسلمان اس کے سامنے سرعقیدت جھکائیں۔“

اور یہ وہ باتیں ہیں جنہیں عقل عمومی قبول نہیں کرتی۔

قبل ازیں کہ دعویٰ اور استدلال پر توجہ کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انصاف پسند حضرات اس پر بھی غور فرمائیں کہ آج ہم جس نسلی امتیاز سے متنفر ہیں آج جو شہنشاہیت ہماری نظروں میں ٹھکنے لگی ہے کیا عقل عمومی اس سے اسی طرح متنفر و بیزار ہے اور کیا سقیفہ بنی ساعدہ میں مقابلہ انصار جو استدلال پیش کیا گیا تھا کہ ”الائمۃ من القریش“ کیا اس کے معنی اس کے سوا کچھ اور تھے؟ کیا اس استدلال سے نسلی امتیاز کی بونہیں لگتی؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسے عقل عمومی آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے پر کیوں مائل ہے؟ اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جو صورت اسلامی حکومت کی پائی گئی کیا وہ شہنشاہیت نہ تھی؟ اب رہا نسلی امتیاز۔ کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ مختلف اقوام میں اور مختلف نسلوں میں اس امتیاز کا احساس رہا ہے یا نہیں؟ اور آج بھی ہے یا نہیں؟ یہ عالمگیر احساس مجھے تو کبھی کم ہوتا نظر نہ آیا، بلکہ نبی نورع انسان کی ایک وسیع جماعت ہمشیرہ اس کی حمایت کرتی نظر آتی۔

یہ خیال کہ اسلام اس نسلی امتیاز کو مٹانے کے لیے آیا تھا کم از کم کلام مجید سے تو ثابت ہوتا نہیں بلکہ برخلاف اس کے اس امتیاز کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”ان الله اصطفى ادم و نوحا و آل ابراهيم و آل عمران علی العالمین“ کیا اس سے آل ابراہیم اور آل عمران کا نسلی امتیاز ثابت نہیں ہوتا؟ اس سے بھی تیز تر مٹنے:۔

”ام یحسدون الناس علی ما آتاهم اللہ من فضلہ فقد اتینا ال ابراہیم الکتاب والحکمتہ واتیناہم ملکا عظیما فمنہم من امن بہ ومنہم من صدّ عند کفی بجہنم سعیرا“

”کیا یہ لوگ ان لوگوں سے حسد رکھتے ہیں اس شے پر جو خدا نے اپنے فضل سے انہیں عطا کر دی ہے شک ہم نے آل ابراہیم کو کتاب بھی دے دی اور حکمت بھی اور انہیں ملک عظیم عطا کر دیا اب کوئی تو اس پر ایمان لاتا ہے اور کوئی رکتا ہے اور جہنم کے شعلے اس کے لیے بہت کافی ہیں۔“

آل ابراہیم پر بکثرت کی باتیں اور اس شد و مد سے کہ جو اس پر ایمان نہ لائے اُن کے لیے جہنم کے شعلے میں کس امر پر دال ہے؟ اور کیا یہ اس امر کا تین ثبوت نہیں ہے کہ خود مشیت الہی نوعی اور نسلی امتیاز کی حامی ہے۔

بلا شک و شبہ رسول اللہ کا مقصود جو اسلام لے کر دنیا کے سامنے آئے دنیا و عقبیٰ میں صرف سعادت بشری کا حصول تھا، اور چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے دنیا آخرت کا مقدمہ ہے اور دین وحی الہی ہے اس لیے اس میں کسی انسانی مصلحت اندیشی کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی تبلیغ میں ایک پیغمبر کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے لیے یا اپنی نسل کے لیے یا اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر جائے اگرچہ دنیا یہ شبہ کرتی ہے اور بعض تے حتماً و جزاً اس کا اعلان بھی کر دیا ہے چنانچہ زید کہتا ہے :-

لعبت ہاشم باملک ولا خبر جاء ولا وحی نزل
”ایک ہاشمی نے سلطنت کے لیے یہ کھیل کھیلا، حالانکہ نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی۔“

طبعی حلقوں میں جس سلطنت اور جس حکومت کو آل نبی کا حق سمجھا جاتا ہے

وہ دنیاوی حکومت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی سعادتِ کبریٰ ہے جس کا راز انحضرتؐ کے سینے میں رکھا گیا اور جس کو بروئے کار لانا بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا، مقصدِ الہی یہ تھا کہ اس قانون کے ماتحت حیاتِ انسانی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ سعادت کا کوئی انفرادی و اجتماعی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کوئی قانون زیرِ عمل نہیں آسکتا جب تک کہ حکومت کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو۔ چنانچہ حضرت پیغمبرؐ اپنے وقت میں خود حاکم تھے لیکن یہ حکومت نہ شہنشاہیت تھی نہ اسے ”ڈکٹیٹر شپ“ سے تعلق تھا اور نہ جمہوریت، کی منون احسان تھی بلکہ فی الحقیقت یہ حکومت نبوتِ الہیہ کی ایک شمع تھی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ نبوت کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ بازگاہِ الہی کے احکام اس کی مخلوق تک پہنچا دیں، اور دوسرا یہ کہ اس کے اجراء کا انتظام بھی فرمائیں اس اعتبار سے جس طرح نبوت من جانب اللہ ہے اسی طرح یہ حکومت بھی ہے اور رسول اللہ کے بعد لامحالہ ہم کو اس کے لیے محلِ قابل کی تلاش کرنی پڑے گی۔

یہاں علی و عمر کی بحث نہیں ہے۔ اگر علی محلِ قابل ہیں تو حشیم مارو شن اور اگر عمر اس کی قابلیت رکھتے ہیں تو دل ماشاؤ۔ مگر اس کا ذریعہ و شناخت بھی صرف زبانِ وحی ہونا چاہیے جو عقلِ عمومی سے بہت زیادہ بلند ہے۔

جائیکہ سلطانِ خمیرہ زرد غوغا نباشد عام را

ظاہر ہے کہ اس حکومت میں کتساب کو دخل نہیں تھا، بلکہ یہ عطیۃ الہی تھی اور یہ جہاں بھی قائم ہو اس کی شان برقرار رہنی چاہیے۔ جہاں پائی جائے من اللہ پائی جانی چاہیے اور ”من اللہیت“ کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف رسولؐ ہے۔ اب اسے حکومتِ الہیہ سمجھئے، خلافتِ الہیہ کیے، امامتِ الہیہ فرمائیے، جو کچھ چاہے کیے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس چیز کو رسولؐ بھی اپنے اختیار سے کسی کو عطا نہیں فرما سکتے تھے!

”ربانک یخلق ما یشاء ویختار ما کان لہم الخیرۃ“

یہ ہے وہ امامتِ الہیہ جو طبقہٴ شیعہ کا مطرحِ نظر ہے۔ اس امامت کے لیے یہ مرکزِ ضروری نہیں ہے کہ عوام بھی اس کے ساتھ رہیں اور اس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لیے پروپیگنڈا کرے۔ اس قدر بیان سے غالباً امامتِ الہیہ کے متعلق شیعہ نظریہ واضح ہو گیا ہوگا۔

حضراتِ اہل سنت جن کو خلفاء کہتے ہیں ہم بھی انھیں خلفاء کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے اتفاق سے وہ خلیفہ بنے، ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہی لپچہ لپچہ لیکن یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی حکومت حکومتِ الہیہ ہے کیونکہ اجماع و شوریٰ خود اس کے منافی ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ حضراتِ اہل سنت جس کو خود حاکم بنائیں اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اب اس کا ہر قول، ہر فعل، ہر حرکت حکمِ خدا ہے اور ہمیں سے سارا جھگڑا پیدا ہوتا ہے، شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، ہم اس کو ضرور حکمِ اسلامی سمجھیں گے، اس کی حکومت، حکومتِ اسلامی کہلائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے حکومتِ الہیہ بھی تسلیم کر لیا جائے۔

الغرض اشیعہ کے نزدیک خلفاء کی خلافت ایک دنیوی قسم کی حکومت تھی اور یہی سبب ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس خلافت کے لحاظ سے جو علی الظاہر انھیں اصول کے ماتحت انھیں ملی کوئی خاص فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اس خلافت کے باعث عالمِ شیعہ سے روشناس نہیں ہوئے۔ اگر یہ چند روزہ حکومت نہ ہوتی تو بھی علیؑ ہر حال علیؑ ہی رہتے۔ فاضل مضمون نگار نے جو تفصیلات قائم فرمائی ہیں اگرچہ وہ بہت کچھ بحثِ طلب بلکہ اصلاحِ طلب ہیں لیکن ان سے اور بعد کی تشریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک اولادِ علیؑ میں خلافت کا محصور ہونا دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہے لیکن حق تلفی کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دو برابر کے حقداروں میں سے کسی ایک کا حق غصب کیا جائے یا کسی زیادہ مستحق شخص کے مقابلہ میں کم استحقاق رکھنے والے کو ترجیح دی جائے

لیکن چونکہ امامتِ الہیہ کا تعلق کتابتِ نبوی سے نہیں ہے جن میں فرق و امتیاز کا پایا جانا ضروری ہے بلکہ محض منشاءِ خداوندی سے ہے اس لیے اگر اس کے صحیح مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ :-

”خداوندِ عالم طے کر چکا ہے کہ رسولِ کریمؐ کے بعد خلافتِ الہیہ علیٰ ہی کے لیے ہے اور علیؑ کے بعد اس کے گیارہ فرزندانوں کے لیے“

تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ ہاں یہ خیال دماغ سے نکل جانا چاہیے کہ یہ عطیہ ان لوگوں کے لیے اولادِ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ملا ہے یا رسولؐ یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مستطرب رہے۔ کیونکہ اگر اولادِ رسولؐ ہونے کی حیثیت محفوظ رہتی تو خود علیؑ کو بیٹے کیسے ملے؟ اور اگر اولادِ علیؑ کا محاذ کیا جائے تو علیؑ مرتضیٰ کی اولاد دوسری بیبیوں سے بھی ہے یہ منصب وہاں کیوں نہ پہنچا اور اگر بنو فاطمہ کا محاذ کیا جائے تو اولاد امام حسنؑ اس سے کیوں محروم رہی؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسبی امتیاز کا محاذ نہیں کیا گیا۔

فروع انسان میں آدم سے لے کر آج تک بے شمار انسان گذرے ہیں لیکن ان لا تعداد انسانوں میں سے صرف چند منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے اس کے کیا معنی؟ یہاں بھی یہی حق تلفی نظر آتی ہے۔ نقل کا جواب اس مقام پر یہ ہے کہ غضبِ حقوق کا اطلاق وہاں ہوا کہ تاہم جہاں کوئی حق بھی پایا جائے اور جب حق کا وجود ہی نہ ہو تو غضبِ حقوق یعنی جبر؟

میں اس تحریر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس منصبِ جلیل کو محقر کرنے کا اختیار خود رسولؐ کو بھی نہیں تھا۔ ہاں اعلان ان کے فرائضِ تبلیغ میں ضرورتاً وہی اعلان بطریقِ شیعہ بذریعہ اہل بیت علی التواتر ثابت ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے طعناً لکھا ہے کہ شیعہ تمام دنیا کی آبادی میں دس فیصدی بھی نہیں

ہیں۔ اگر یہ تحقیق صحیح مان لی جائے تو بھی دس فیصدی بہت ہیں کیونکہ جس فرقہ پر صدیوں تک تلوار چلی ہو اور چل رہی ہو اس کا صفحہ عالم پر باقی رہ جانا ہی حیرتناک امر ہے۔ بہر حال وہ جتنے بھی ہیں شرفاء ہیں۔ اس لیے کہ عوام الناس مصائب میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام دنیوی رحمتوں کو قبول کیوں کیا؟ کیا ان کے لیے حکومتوں میں منظم ہو جانا ممکن نہ تھا؟ یقیناً تھا، لیکن ان کی نظر مادی فوائد پر نہیں تھی۔ بلکہ وہ دین صحیح اور اسلام صحیح کے طلبگار تھے اور ان کے نزدیک اسلام صحیح کی حامل دوسری ہستیاں تھیں۔ لہذا انھوں نے حکام وقت کے مظالم سے مگر ان کا دامن نہ چھوڑا۔

خوجہ اور بولہ و جعفرات کے مرشدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام اولاد علی کو جو صاحبِ مضمون نے خلافتِ الہیہ کا مرکز بنایا ہے یہ محض ایجادِ بندہ ہے۔ اسی طرح آغا خاں اور ملاطاف حسین الدین کی تعلیم جو کچھ ہو عقیدہ خلافتِ الہیہ اس کا ذمہ دار نہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ انگلیشیہ کے ظہور کا سبب کیا ہے؟ ناظرین غور فرمائیں کہ روس میں بالشوزم کی بنیاد کیوں پڑی؟ ظاہر ہے کہ شاہانِ روس کے مظالم بالشوزم کے ظہور میں آنے کا سبب ہیں۔ اگر عوام امن و سکون کی زندگی بسر کریں مظلوم کو ظالم کی طرف سے کھٹکا نہ ہو، عدالت صحیحہ کا دور دورہ ہو تو بغاوت کے جراثیم پیدا ہی نہیں ہوتے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ابنِ آدم کا یہ فطری حق ہے کہ امن و آزادی کی تدبیریں سوچے۔ اب اس وقت کی اسلامی حکومتوں پر نظر کیجیے۔ ظاہر ہے کہ وہ منصوص من اللہ تو تھیں نہیں اور ظلم و استبداد دنیا میں پھیل رہا تھا اس لیے ایک جماعت نے ان سے گلو خلاصی کی کوشش کی۔

وہ ہستیاں جو منصوص من اللہ تھیں انھوں نے تو ہمیشہ صبر و سکوت کا حکم دیا، نہ خود ان امور میں حصہ لیا اور نہ کسی کو اجازت دی، لیکن یہ صبر و حلم ہر شخص کا حصہ نہیں تھا۔ جس کا پیادہ صبر لبریز ہوتا جاتا تھا وہ حکومت کے خلاف اٹھتا تھا اور اپنی جان دیتا تھا۔

علویین، سلاطین وقت کے خلاف لٹھے اس کا رازی ہی ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ قطعاً معذور تھے۔ چنانچہ زید بن علی اسی جذبہ کے ماتحت حکومت کے خلاف میدان میں آگئے اور حضرت ابوحنیفہ گویا ان کے خاص معاونین میں سے تھے (اگرچہ انھوں نے عین وقت پر عذر کر دیا) اللہ اہل بیتؑ جو ان حضرات کو روکتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ انہی حقیقت میں نگاہیں انجام کو جاتی تھیں۔

سب جانتے ہیں کہ جب دنیا سے حق و ناحق کا امتیاز اٹھ جاتا ہے تو ہر نوع کا انتشار و اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ان موقعوں پر بھی ہوتا۔ وہ لوگ جو ان سلطنتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کی نظر میں علویین اور فاطمیین کی ناکامیاں بھی تھیں، وہ ایک نئے اور کامیاب ذریعہ کی جستجو کر رہے تھے۔ پھر چونکہ ہر ناکامی انسان کے لیے سبق ہے کامیابی کا، لہذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بنو علی و بنو فاطمہ جو ناکام رہنے میں اس کا سبب یہ ہے کہ ان حضرات میں سب اوصاف سہی لیکن قیادت مذہبی نہیں حاصل نہیں اور جن بزرگواروں کو صحیح مذہبی عظمت حاصل ہے وہ اس میں شرکت نہیں کرتے اور اس کی عدم شرکت کے بارے میں سب آگاہ ہیں۔ اس لیے ملک کو کوئی دیکھی ان سے نہیں رہتی۔ اور حکومت باسانی مقابل آنے والوں کو زیر کر لیتی ہے۔

فکر کرنے والوں کے سامنے جب کوئی ایسا سبب آ جاتا ہے جو ان کے ارادوں میں حائل ہو تو وہ اس کے دور کرنے کی فکر کیا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عزم کر لیا گیا کہ ایک مذہبی مسند اگ قائم کی جائے تاکہ قائد کا دقار مذہبی حیثیت سے بھی مسلم ہو چنانچہ اسی خیال کے تحت اس تجویز کو عمل میں لایا گیا اور آخر ایسی کامیابی ہوئی کہ بڑی بڑی قیادتوں کے بنائے کچھ نہ بن سکی۔ فرقہ باطنیہ کی بنیاد قائم ہوئی جس کے ہاتھوں بڑے بڑے حکام قتل ہوئے۔ اب انھیں کو سا جاتا ہے۔ لیکن بالشوکیوں نے روس کے شاہی خاندان کا چُن چُن کے خاتمہ کیا تو اس پر کسی نے آہ بھی نہ کی بلکہ اکثر اہمیت کو سرا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ

جس روح کے تحت زارِ روس تباہ ہوا اسی کی بنا پر بڑے بڑے ملاقا قتل ہوئے جو فی الحقیقت عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے ظالمانہ حکومتوں کے ایجنٹ تھے۔
اہل نظر انصاف فرمائیں کہ ایسے فرقوں کی پیدائش کا سبب ظالمانہ حکومتیں ہیں یا عقیدۂ خلافتِ الملیہ۔

مزید توضیح ملاحظہ ہو۔ اہل سنت کے پاس انعقادِ خلافت کے چار طریقے ہیں۔
۱۔ اجماع۔ یعنی ایک ہم خیال گروہ کا مل جل کر کسی کو حاکم بنالینا۔ ہم خیال اس لیے کہتا ہوں کہ آزاد و واقعی اجماع محقق نہیں۔

۲۔ استخلاف۔ یعنی جلنے والا کسی کے لیے کہ جیسے کہ یہ میرا جانشین ہے۔

۳۔ شوریٰ۔ یعنی ایک محدود جماعت کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا۔

۴۔ قزو غلبہ۔ یعنی جس کے ہاتھ میں بھی تلوار آجائے اور سلطنت حاصل کر لے۔

واقعاً جامعیت اسی کا نام ہے یعنی جتنے طریقے بھی حکومت کے ہو سکتے ہیں وہ سب گھیر لیے گئے ہیں۔ کسی قسم کی بھی حکومت ہو وہ ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جن صورتوں سے حکومتوں کا ظہور ہوا ان سب کو حق بنانے کے لیے یہ اصول تصنیف کیے گئے ہیں۔ گویا حکومتیں کسی اصول کے تحت نہیں بلکہ اصول حکومت کے تحت ہیں۔

یہاں تک غنیمت ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور ان کی بیعت سے تقاعد کرنے والا مستوجبِ جہنم چنانچہ ایسے ہی متوہوں کے لیے یہ حدیث پیش کی گئی ہے:-

”من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتة جاهلیة“

صاحبانِ غور و فکر سے التماس ہے کہ طرق چہرگانہ ہو بیان کیے گئے وہ اصل میں تین ہی ہیں۔ اس لیے کہ اجماع و قومی و شوریٰ کی روح ایک ہی ہے۔ اور یہ تین ہی طریقے

بلاشبہ متضاد ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں اسلامی طریقہ کون سا ہے؟ اگر یہ سب کسی اسلامی حکم کے تحت ہیں تو معاف کیجیے ایک اہم اور اصولی مسئلہ میں ایسے متضاد احکام! عقلاً ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام کرنا چاہیئے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کے آخر میں اپنی تحریر کا خلاصہ درج کر دوں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ اسلام بلاشک و شبہ سعادت بشر کے لیے آیا ہے۔

۲۔ اسی سعادت کا ایک جزو خلافتِ الہیہ ہے۔

۳۔ خلافتِ الہیہ ایک موصفتِ الہیہ ہے۔ وہ کسی نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ جوہر ذاتی کی بنا پر ہے۔ کسی ایک نسل میں اس کا پایا جانا اس مفہوم کا حامل نہیں کہ نسلی امتیاز مد نظر رکھا گیا ہے۔

۴۔ خلافتِ الہیہ سے کسی فرد یا جماعت کی حق تلفی کا ذکر ایک دھوکا ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ ظالم شخص یا ظالم خاندان اس عطا کا مستحق تھا، بغیر اثبات حقوق کے غضبِ حقوق کہنا ایک بے معنی بات ہے۔

۵۔ اگر غیر مستحق مدعیانِ امامت پیدا ہوئے تو امامتِ الہیہ اس کی ذمہ دار نہیں۔

۶۔ عقلِ عمومی کی حجت کا دعویٰ غلط ہے۔



یہاں تک انسانیت مفروضہ کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب قرآنِ اہادیث کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

شیعہ اور سنیوں میں ایک اصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ شیعہ ہر مسئلہ کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے حضراتِ اہل سنت کا مسلک دوسرا ہے چنانچہ اسی تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محور کے نزدیک "انسانیت" اور شیعہ ہے اور "اسلام"۔

اور شے ۔

مسئلہ قرآن میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطالب صاف و صریح سمجھ میں بھی آ سکتے ہیں یا نہیں۔ ملاحظہ کیجیے یہ کتاب خود اپنے متعلق کیا کہتی ہے :-

”فیہ آیات محکمات من ام الكتاب اخبر متشابہات“

اس میں بعض آیات محکمات ہیں اور دوسری تشابہات ہیں اور خود قرآن یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت محکم ہے اور فلاں تشابہ ۔

اس کتاب میں اجمال بھی ہے مثلاً اَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ۔ لغت کے لحاظ سے دیکھو تو صلوٰۃ کے معنی دعا اور زکوٰۃ کے معنی نذر۔ قرآن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ صلوٰۃ سے مراد وہ عبادت ہے جس کے اجزاء تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشهد وغیرہ ہیں۔ یا زکوٰۃ سے مراد وہ خیرات ہے جو مذہبی فرض کے طور پر ادا کی جاتی ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

ان الله اصطفى ادم ونوحا وال ابراهيم (خود قرآن کچھ نہیں بتاتا کہ آل ابراہیم سے مراد کون ہیں یا بعض دوسری جگہ فرمایا :-

”يقول الذين كفروا لست مرسلنا قتل كفى بالله شهيدا بيني و بينكم ومن عنده علم الكتاب“

”کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے، کہہ دے میرے اور تمہارے درمیان شہادت دینے کے لیے خدا کا فی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے یہ صاحب علم الکتاب کون ہے؟ قرآن بظاہر خاموش ہے۔ ایک اور آیت ملاحظہ ہو :-

”اِنَّهُ نَقَرَاتِ كَرِيْمٍ فِي كِتَابِ مَكْنُونٍ لَا يَمْسُهُ اِلَّا الْمَطْمَهِرُونَ“

یہ قرآن کریم ہے جو کتاب مکنون میں ہے اسے مس نہیں کریں گے مگر مطہر، وہ کتاب مکنون کیا ہے جو ظرف قرآن ہے؟

یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ ایک ایک قدم پر بھی مشکل پیش آتی ہے یہ مشکلات تو تفسیر کی حد تک ہیں، اب رہی تاویل اور تو ایک دریائے ناپید اکتا رہے۔

آیات قرآنی کے سلسلہ میں اعتراضات تحریر فرمایا گیا ہے کہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دیے ہیں استاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے ہی فرقہ نے کھولا ہے اور حاشیہ پر پروفیسر مجلس کی کتاب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔

پہلے تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تاویل کے معنی ہیں کسی لفظ کو اس کی حقیقت اولیہ کی طرف پلٹنا یا چنانچہ بعض مقام پر یہی حقیقت اولیہ مراد لی جاتی ہے اور ظاہر لفظ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مقامات پر حقیقت اولیہ بھی مد نظر رکھی جاتی ہے اور ظاہر معنی بھی۔ مثلاً ”يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ كَمَا اٰمَنْتُمْ اَنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ“ کے ہاتھ پر ہے۔ معلوم ہے کہ ”یہ“ یا ”ہاتھ“ سے ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے، اس لیے یہاں ”قوت و قدرت و گرفت“ کے معنی مراد لیے جاتے۔ گئے اور ظاہر معنی کا قطعاً لحاظ نہ ہوگا۔

۲۔ ”اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ“۔ یہ کہ نماز کی حقیقت اولیہ رجوع الی اللہ ہے۔ اب یہ معنی بھی ملحوظ رہیں گے اور اس کے مفہوم ظاہری کا بھی لحاظ رکھا جائے گا جو شارح علیہ السلام نے متعین فرمایا ہے کیونکہ بعض ارباب کے خلاف کوئی دلیل عقلی یا نقلی موجود نہیں ہے۔ بلکہ علی التواتر یہی اصول عبارت تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ ہیں تاویل کے معنی جو عرض کیے گئے۔ اب اگر اس قسم کی تاویل کی دروازہ شیعوں نے کھولا ہے تو وہ اولوالالباب ہیں۔ صاحب فہم و فراست ہیں، لیکن اگر فاضل معتمد نگار اپنے خیال میں تاویل کے معنی یہ

سمجھ رہے ہیں کہ اصل مفہوم و منشا کو کھینچ تان کر کچھ سے کچھ بنا دینا تو اس کی تفصیل آئینہ اور اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مطالبِ قرآنی برعاری اور ہر نامحرم کی کچھ میں نہیں آسکتے۔ اسی لیے اس کے معتمدِ اول خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، مسلمان مجبور تھے، کہ وقتِ نزول آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب دریافت کریں۔ دریافت کرتے تھے اور جواب پاتے تھے۔ انھیں جوابات کو تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس تفسیر کو چھڑ کر قرآن کو کافی سمجھنا یا خود اس کے مفہوم منہیں کرنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ معلّیت سے انکار کرنا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے؟ آیا تفسیر سے باہر اٹھائیں یا اس پر عمل کریں؟ اور اگر عمل کریں تو کس کے توسط سے؟ شیعہ دوسری صورت کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور توسط کے حاملہ میں ان کی نگاہ اہل بیت پر جمی ہوئی ہے۔ مطالبِ قرآنی کے متعلق یہ ہے شیعہ نقطہ نگاہ۔ اب میں قایل کی قرآن فہمی پر نظر کروں گا۔ ابتدائے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں:-

”وہ قرآنی آیات جن کی بناء پر حضراتِ شیعہ کی جانب سے عمرہ یا یشیال کیا جاتا

ہے کہ ان سے حضرت علیؑ کی الوہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں۔“

اس تحریر سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف اتنی ہی آیتیں مدارِ مذہب شیعہ میں۔ خیر آئیے مطلب کی طرف۔

”لَیْسَ الْبَرِّیَّانَ تَأْوِیْلُ الْبَیْوَتِ مِنْ ظُہُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبَرِّیَّانَ اتَّقَىٰ وَالْوَا
الْبَیْوَتِ مِنْ اَبْوَابِهَا“

”نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھر دل میں دروازے سے داخل ہو۔“

تفسیر آیت یہ ہے کہ برائے جاہلیت عرب جب حالتِ احرام میں ہوتے تھے تو دروازوں سے گھر دل میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پشتِ خانہ میں کھڑکی سی بنا لیتے تھے۔ اسی میں سے آئے جاتے تھے اور اسے جزدین سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعہ اس

اس رسم پرستی کی ممانعت کر دی۔

یہ تو وہ حقیقی مفہوم ہوا جو الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جو اس آیت کی شانِ نزول پر مبنی ہے۔ لیکن ذرا نظر کو وسعت دیجئے۔ احکامِ قرآنی کسی خاص مسئلہ سے متعلق صادر تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں اس قسم کے سارے واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو قوانینِ اسلامی مختص المقامِ زمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس حکم میں سیدھا راستہ چلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کجروی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ آیت کی تاویل غلط ہے یا صحیح۔ تاویل یہ ہے کہ ہر فن میں ہر علم میں ہر مسئلہ میں اسی قاعدہ سے داخل ہونا چاہیے جو اس کے لیے معین و مقرر ہے۔ اگر عقب سے آؤ گے یعنی خلافِ قاعدہ داخل ہو گے تو کچھ استفادہ نہ کر سکو گے۔ یہ ایک سیدھا سادہ عقلی اصول ہے اور اسی آیت کے تحت میں آ رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر فن میں داخل ہونے کے لیے اس شخص کے پاس جانا چاہیے جو اس فن کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسی عقلی اصول کی بنا پر نوح کا دروازہ مخفی ہے اور راگ کا دروازہ گویا، نوح کیلئے کے لیے نوحی کے پاس جانیے اور راگ کیلئے کے لیے گویئے کے پاس۔ اسی طرح خدا شناسی کا ذوق ہے تو رسولؐ کے پاس جلیئے کیونکہ معرفتِ الہی کا دروازہ رسولؐ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ علمِ رسولؐ کا دروازہ کون ہے؟ یعنی علمِ رسولؐ کا باب تو ضرور ہونا چاہیئے۔ مگر وہ ایسا کون ہے جو ہر حیثیت سے واقفِ علمِ رسولؐ ہے۔ شیعہ یہاں تک تو صرف بحکمِ عقل آتا ہے اور حجبِ تلاش کا قدم بڑھتا ہے تو اس کی خوش قسمتی سے ارشادِ رسولؐ اس کے لیے شعلِ راہ بن جاتا ہے کہ ”انا مدینۃ العلم وعلیٰ بابہا“

اب اس شناخت کے بعد اس نظر اس ارشادِ الہی پر جاتی ہے:-

”هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر

اولوا الالباب“

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اس استدلال میں کیا خرابی ہے اور آپ ہی متعین کیجیے کہ آخر عالمِ علم رسولؐ کا حلقہ کون ہے ؟

۴۔ ”الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً۔“

ترجمہ آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کر دیا (نعمت کا ترجمہ احسان کیا خوب) اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین (اسلام ہو)

اس کے متعلق اوشاد ہوتا ہے کہ سمجھیں نہیں آتا کہ اس آیت میں کونسا خلا یا نقص ہے جو حدیثِ غدیر کے ختم کرنے کی ضرورت ہوئی ۔

بے شک ذرا دور کی بات ہے ۔ اس مقام پر پھر کسی قدر تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔

واضح ہو کہ ”الایوم“ میں ”الف“ ”لام“ ”یوم“ کافی نمایاں ہے ۔ یہ ”الف“ ”لام“ ”یوم“ کو جو نکرہ ہے معرّفہ بنا رہا ہے ۔ اسی لیے اس کا ترجمہ ”آج“ کیا گیا ۔ مگر میں ترجمہ کرتا ہوں ”آج کا دن“ کہ اصل لفظ کی قوت اسی میں باقی رہتی ہے ۔ الغرض الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن کوئی مخصوص دن ہے ۔ اب آپ فرمائیں کہ وہ روزِ مخصوص کون سا ہے ۔ عرض کیجیے ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے اور جب اس پروگرام کا جزو اخیر انجام پا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے دن ہم نے اس پروگرام سے فراغت پائی ۔ یا آج کے دن ہم نے اس کی تکمیل کرادی ۔ ہاں یہ واضح رہے کہ پروگرام کی تکمیل کے پانچ دس دن بعد بلکہ اس کے دوسرے ہی دن ”الایوم“ کہنا درست نہ ہوگا ۔ اسی طرح سے آئندہ مذکور میں نہ صرف یومِ مخصوص بلکہ نبوت کے پروگرام کے جزو اخیر کی شناخت بھی ضروری ہے ۔ اس کو خلا یا نقص نہیں کہتے بلکہ اسے ”دعوتِ فقہ“ کہتے ہیں ۔

یہ ارشاد کہ ”رسولِ کریمؐ نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرمایا“ کچھ مفید نہیں ہے

اسی کو تعریف المجہول بالمجہول کہتے ہیں۔

لفظ مولیٰ سے جو تعرض کیا گیا ہے میں اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب کچھ کہا جائے تو کس کے سامنے۔

۳۔ ”وانذار عشبہ وفاق الاقربین واخفص جناحہ۔“

(ترجمہ) اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں

ان کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

اب سوال یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل رسول اللہؐ نے کی یا نہیں؟ اگر نہ کی تو کیا کوئی عنوان جنس اختیار کیا یا دوسرے ہی عام طور پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ آخر تاریخی حیثیت واقفہ کی کیا ہے؟ فاضل مضمون نگار نے اس مقام پر وعدہ کیا تھا کہ بعیت عشبہ کے واقعہ پر بحث احادیث پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر تمام بحث احادیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ گویا پی گئے۔ اگر ڈپٹی منڈیر احمد مرحوم زندہ ہوتے تو اس موقع پر ضرور لکھ دیتے کہ ”معلوم ہوا پانی مریا ہے۔“

۴۔ ”اتلوا لیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوة ویؤتون الزکوۃ وہم مراکعون۔“

(ترجمہ) تمھارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور دو لوگ جو ایمان لے آئے ہیں نماز

پڑھتے ہیں اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں، ”ولی“ کا ترجمہ ”رفیق“ کیا کہنا۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی کے لیے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے اور اُسے کسی کی ولایت میں آنا پڑے تو وہاں ولی کے کیا معنی ہوں گے؟

اب دوسرے پہلو کو دیکھیے۔ ”وہم مراکعون“ کا ترجمہ فرمایا گیا ہے ”اور عجز و انکسار

سے زندگی گزارتے ہیں“ اب میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ ”واؤ“ کو ”عاطفہ“ نہیں ”حالیہ“ قرار

دیتا ہوں اور کہتا ہوں ”وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درانحالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں“ کون سا قانون

عربیت اس ترجمہ سے روک سکتا ہے۔ اس طرح اس آیت کے دو ترجمے ہو گئے۔ ایک وہ

جو صاحبِ مضمون نے کیل ہے، دوسرا یہ جو میرے قلم سے نکلا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ایک ایسا معیار ہو جس کی طرف دونوں رجوع کر کے فیصلہ کر سکیں۔ اگر کوئی معیار نہیں ہے تو پھر معاملہ یوں ہی مبہم کا مبہم رہے گا۔

اب میں اردو کے مفہوم اس آیت کو دیکھنا چاہتا ہوں مفہومِ اولین یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک گروہ تو اولیاء کا ہے جس کا سلسلہ خود ذاتِ باری ہے۔ دوسری وہ جماعت ہے جو ”کم“ کی مخاطب ہے جن سے کہا گیا ہے کہ اللہ رسول اور ان صفات والے لوگ تمہارے دلی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دو کون لوگ ہیں جن پر یہ حد مقرر ہوئی ہے، ان کا یقین کیے بغیر آیت تشبیہ مفہوم ہی رہے گی۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اولیاء کا طبقہ الگ ہے اور ”مواہد علیہم“ کا طبقہ الگ اور طبقہِ اہل میں لازماً کچھ ایسی صفات ہیں جو انہیں دوسرے طبقے سے ممتاز کر رہی ہیں۔ ورنہ ایک جماعت کو دلی قرار دینا اور دوسری کو ”مواہد علیہم“ ایک بے معنی بات ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ طبقہِ ثانی میں وہ صفات نہیں ہیں جن کا طبقہِ اولیٰ حامل ہے۔ اب حکیم سلیم واجب ہے کہ ”وجہ امتیاز“ کی تلاش کی جائے اور وہ ایسی شے ہو کہ دوسروں میں نہ پائی جاسکے۔ دیکھیے ”الذین اٰمنوا“ سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔ اس لیے کہ ایمان ایک شے مشترک ہے جو کم و بیش ہر مخاطب میں موجود ہے۔ اسی طرح ”یفیون الصلوٰۃ“ بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا، سب ہی نماز پڑھتے ہیں علیٰ ہذا ”یوتون الزکوٰۃ“ ادائے زکوٰۃ سے بھی کوئی خصوصیت خاصہ ظاہر نہیں ہوتی۔

اس لیے صاحبِ مضمون کے ترجمہ کی بنا پر اس آیت کا کوئی مفہوم صحیح پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی وجہ امتیاز معلوم ہوتی ہے۔

برسبیلِ تنزیل زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مفہوم پیدا کریں تو یہی ہوگا کہ جن کا ایمان اعلیٰ درجہ ہے جو انتہائی مضموع و خشوع سے ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں جو برابر زکوٰۃ دیتے ہیں۔

جو ہمیشہ خضوع و خشوع سے زندگی گزارتے ہیں یہ لوگ دلی ہیں، ان لوگوں کے جن کا ایمان ادنیٰ درجہ کا ہے یا صرف زبانی ہے۔ لیکن مفہوم پھر بھی مبہم کا مبہم رہ جاتا ہے۔ بتایا جائے وہ بڑے ایمان دار کون ہیں جو کمزور ایمان والوں کے رفیق ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ ایمان کی کمی دیشی ایک امر باطنی ہے۔ اسی طرح خضوع و خشوع فی الصلوٰۃ ان امور کا کون اندازہ لگائے؟ غرض اس مفہوم کی بنا پر بھی انسان کسی صحیح نقطہ تک نہیں پہنچ سکتا اور فاضل مضمون نگار نے جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی بنا پر آیت گو رکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہے۔

برخلاف انہیں دوسرا ترجمہ ”وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درمنا لیکر رکوع میں ہوتے ہیں“ ایک نہایت صاف و صریح ”وجہ امتیاز“ ہے اور یہ شان امتیازی جہاں پائی جا سکتی وہیں ولایت متحقق ہو جلتے گی۔ اس بات کی پرواہ نہیں کہ یہ ”امتیاز“ کہاں پایا جاتا ہے؟ ہمیں اصرار نہیں کہ علیٰ ہی اس کے حامل ہیں، نہیں، بلکہ میں ثابت ہو جائے تھا، عمر ثابِت کر دیجیے قبول۔ لیکن محض اس بنا پر کہ علیٰ میں یہ شان امتیاز ”پائی جاتی ہے“ مفہوم آیت کو بدلنے کی سعی کرنا دیانت کا کام نہیں ہے۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ ”ولی“ کا ترجمہ ”رفیق“ کس بنا پر فرمایا گیا ہے۔ آیا ”ولی“ اور ”رفیق“ مترادف الفاظ ہیں؟ یا فقط ولایت مشترک ہے۔ اگر مشترک ہے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً لفظ ”عین“ کہ سورج کے معنی بھی دیتا ہے اور چشمہ ”کو بھی عین“ کہتے ہیں۔ ”انکھ“ کے لیے بھی متصل ہے پس جب تک کوئی قرینہ نہ پایا جلتے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ اب بتایا جلتے کہ اس آیت میں کون سا قرینہ تھا جس کی بنا پر ”ولی“ کے معنی ”رفیق“ کر لیے گئے۔

۵۔ ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ“

(ترجمہ) اے رسول! وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام، اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

اس آیت کے متعلق خلاصہ ارشاد ہے کہ مفہوم آیت بجائے خود مکمل ہے شانِ نزول دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

آئیے اس کا امتحان کریں مفہوم اولین کے لحاظ سے آیت میں جو پہلو نکلتے ہیں، قابلِ لحاظ ہیں۔

۱۔ ”ما انزل الیٰک“ جو تیری طرف نازل کیا جا چکا، اس سے یہ مفہوم نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ نازل شدہ شے ایک ہے یا کئی ہیں۔ مثلاً زید عمرو سے کہتا ہے ”انعل ما قلت لک“ وہ کہہ کر تجھ سے کہہ چکا ہوں۔ ضروری ہے کہ متکلم اور مخاطب کے ذہن میں تو وہ مفہوم موجود ہو، لیکن سننے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ حتماً کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک مقام ہے یا کئی کام ہیں۔ پس ”ما“ کا ترجمہ جو ”وہ چیزیں“ کیا گیا کس دلیل سے؟ یہ ہے پہلے ہی قدم پر لغزش۔

۲۔ اس آیت میں ایک ایسی تاکیدِ شان ہے جو تہدید کی حد تک پہنچ رہی ہے۔

۳۔ وعدہ حفاظت بھی بتا رہا ہے کہ اس میں لوگوں کی طرف سے خوف بھی ہے۔

۴۔ ضروری بات ہے کہ وہ شے جس کی بابت اس خبر و مد سے حکم تبلیغ ملا ہے، وہ

پہلے نازل ہو چکی ہو اور رسول! اسے جانتا ہو، جیسا کہ مثال میں اشارہ کیا گیا۔

جب تک ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لایا جائے، کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ ہاں مکمل ہے مگر ان عقودوں کے کھل جانے کے بعد۔ بغیر ان پہلوؤں کو روشن کیے یہ کہتے ہوئے چل دینا کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے، بحث تو نہ ہوئی دامن چھڑانا ہوا۔

یہی مشکلات ہیں جو انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شانِ نزول کی طرف رجوع کرے اور شانِ نزول کو دیکھ کر جو مطالب پیدا ہوں انھیں پیش کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن سے استدلال نہ ہوگا بلکہ شانِ نزول یا حدیث سے استدلال رہ جائے گا۔ کیونکہ جس طرح صرف نحو معانی، بیان کی قرآن فہمی کے لیے ضرورت ہے، اسی طرح شانِ نزول تاریخِ حدیث کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سب قرآن فہمی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بہ لحاظِ علمِ معانی و بیان قرآن سے استدلال کرے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ شخص قرآن سے نہیں بلکہ معانی و بیان سے استدلال کر رہا ہے۔

بحث آیات ختم ہو رہی ہے اور اس ختم پر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس بحث میں قطعاً کامیابی حاصل نہیں کی۔ سطحی سطحی باتوں سے دل بہلانا چاہا ہے جن سے صاحبِ فکر و نظر کے سامنے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ آیات کی بحث ختم ہوگئی اور مجھے یقین ہے کہ تاریخینِ کرام کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاحبِ مضمون نے جس تفصیل آیات کو غیر واقعی تاویل سمجھا ہے وہ تاویل ہے یا حقیقت۔ اس بحث میں میری جانب سے صرف اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ جو مغالطہ ذہنی مضمون نگار کو ہوا ہے اور مغالطہ منطقی انھوں نے دینا چاہا ہے اس کی اصلاح ہو جائے۔ ورنہ ان آیات کے رموز و اسرار پر ابھی بحث و گفتگو کی بہت گنجائش ہے۔

فاضل مضمون نگار کے تنم سے تحریفِ قرآن کے متعلق شیعوں پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اب میں اس کی تحقیق پر توجہ کرتا ہوں۔

ان کا قیاس ہے کہ شیعہ حضرات جب قرآن سے عقیدہ خلافتِ آلِ بیتِ ثابت نہ کر سکے تو تحریفِ قرآن کی آڑ کھڑی۔ اور شیعہ مجتہدین نے اپنے شلگ مریدوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ مینوں نے وہ آیات حذف کر دیں جن میں بالتصریح امامت کے

متعلق احکام مذکور تھے۔

لیکن فاضل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ عام طور پر شیعہ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں (شکریہ) پھر جب شیعوں کی عمومی حالت معلوم ہو گئی تو تحریفِ قرآن کا ذکر نہ جانے کس قسم کی منطق ہے؟

طبعاً سوال ہوتا ہے کہ شیعوں میں تو روایاتِ تحریف کی بنا پر شلک مریدوں کا کتنی دی گئی لیکن کتبِ سنیہ میں جو ان کا طومار پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے؟ کبھی اس طرتِ توبہ فرمائی گئی ہے؟ ہاں میں عرض کرتا ہوں۔

یکملي ہونی بات ہے کہ جامعینِ قرآن نے اس ترتیب کو باقی نہیں رکھا جو چنی چاہیے تھی، پھر جن جن ترکیبوں سے قرآن جمع ہوا ہے وہ ترکیبیں بھی سامنے موجود ہیں عہدِ ثنائت میں جو قرآن جلائے گئے وہ تادمِ پنج کے ایک معمولی متعلم سے بھی مخفی نہیں ان کے جلائے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو پسند نہ کر سہ تھے اور موجودہ ترتیب کے حامی تھے، پھر میں اربابِ عقل سے پوچھتا ہوں کہ ایک آیت کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ دی جائے اور دوسری آیت اس کے مقام میں آجائے کیا اسے ”محرّفون الکلام عن مواضعہ“ ”وہ کلمات کو ان کے مقام سے تحریف کرتے ہیں“ نہیں کہہ سکتے؟

اب یہ اعتراض باقی ہے کہ عقیدہ خلافتِ الیہ قرآن میں بالتصریح مذکور نہیں ہے۔ نہیں سمجھ سکا کہ صراحت سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے یہ مراد ہے کہ علیؑ کا نام نہ لیا جائے۔ کے ساتھ مذکور نہیں ہوا، لیکن ادنیٰ غور سے یہ معنی حل ہو سکتا ہے کہ دعوتِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور صلابتِ فقر کے لیے ہے۔

یہ عزت کے ساتھ ہوتا تو اسی طرح ہو سکتا تھا کہ ”اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم“ میں ہے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت کہ لوگ اس قول پر سکوت کر لیتے۔ اس کے اسان امر

۴۴۲ -

تھا یہ کہنا کہ علیؑ نام نہیں ہے بلکہ خلیفہ کی صفت ہے یعنی اے رسولؐ تیرے بعد تیرا خلیفہ بلند مرتبہ واللہ ہے۔

تعجب نہ کیجیے، حدیث مدنیہ مشہور حدیث ہے۔ محدثین اہل سنت اس حدیث کو باب فضائل علوی میں نقل کرتے ہیں مگر آج اس کے معنی نکالے جلتے ہیں کہ میں شہر علم ہوں جس کا دروازہ بلند ہے۔

اگر اسمِ علیؑ اس حیثیت سے درجِ قرآن ہوتا یقیناً یہی حشر ہوتا، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام ائمہ کے نام مکمل کھلا درج کیے جاتے، مثلاً "ثم الحسن ثم الحسین" اہل بصیرت جانتے ہیں کہ میرے قرآن ہے جس کا نام حکماء کی اصطلاح میں عقل اجمالی ہے اور صاحبانِ عقل وہ ہیں جو اجمال میں تفصیل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

عام فہم اور سادہ زبان میں یوں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی بنیاد ایجاز و اختصار پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کا حسن ہے اگر اس طرح نام درج کیے جلتے تو اچھا خاصہ شجرہ بن جاتا۔ اس ایجاز کی مثالیں قرآن میں کافی موجود ہیں مثلاً خدا نے اصطفیٰ آلِ ابراہیم کا ذکر کیا ہے اس میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں:-

۱۔ تنها بنو اسحق مراد ہیں؛ اور پھر ان میں بھی کل یا بعض؛

۲۔ فقط بنو اسمعیل مراد ہیں؛ اور وہ بھی کلاً یا بعضاً؛

۳۔ دونوں مراد ہیں؛ اور پھر بحیثیت کل یا بحیثیت بعض۔

پس ان سوالات کا سمجھنا اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ اسی طرح قرآن نے بیان کر دیا، "اہل البیت" اب یہ معلوم کرنا ہمارا فریضہ ہے کہ اہل بیت مطہرین کون ہیں؟

الغرض تصریح و صراحت کے متعلق ہوش کوک مرش کیے جاتے ہیں وہ اہل عقل کے لیے قابلِ توجہ نہیں ہیں آخر میں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو

ختم کیا جاتا ہے یہ معلوم ہے کہ حضرات اہل سنت نہایت اطمینان سے فتویٰ دیتے ہیں کہ شیعوں کے پاس خلافتِ الہیہ کے لیے کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیعوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن ان حضرات نے کبھی خلافتِ اجماعی و شوریٰ پر بھی نظر ڈالی ہے کہ یہ طریقہ خلافتِ اصولِ قرآنی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اہل سنت کے پاس اس بارے میں ایک آیت ہے جس سے وہ تسک کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی :-

”واصرہم شوریٰ بینہم“

مشورہ کے بہتر ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسان کو مشورہ کی ضرورت پڑتی ہے علاوہ ازیں مشورہ سے باہمی ارتباط اور تعلقات بھی محکم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ :-

”فبأمر حجة من الله كنت لهم ولا كنت فظاً غليظاً القلب لا أنفوا من حوائج نافع عنهم واستغفر لهم وشارهم في الأمر فاذا عزمتم فتوكل على الله ان الله يحب المتوكلين“ (آل عمران)

(ترجمہ) اس حجت کے بعد جو تیرا حصہ ہے تو ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ اور اگر تو بخیر اور سنگدل ہو تا تو یہ تیرے پاس سے متفرق ہو جلتے۔ پس ان سے درگزر کر ان کے لیے استغفار کر اور ان سے مشورہ کر اور جب تو عزم کر چکا تو اللہ پر توکل کر۔ بالتحقیق کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ تالیفِ قلوب کے لیے دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا ان کے لیے استغفار کرنا اور ان سے مشورہ کرنا نہایت مفید چیزیں ہیں۔ علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے :- ”الاستشارة مبین الهدایة وقد خاطر من استبدأ بایة مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور اپنی رائے پر بھروسہ کرنے والا خطرہ میں ہے۔

ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم صرت اتنا ہے کہ جب کسی کو کوئی اہم کام پیش ہو تو وہ ضرور مشورہ کرے کہ عین فلاح ہی ہے۔ میں اس مقام پر صاحبانِ عقل سلیم سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت سے کیونکر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ چند انسان اغراضِ خاص کے ماتحت ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور باہر کر کہہ دیں کہ ہم نے فلاں شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا۔

اس مقام بحث کے علاوہ لفظ ”امرہم“ واقع ہوئے یعنی ”ان کا امر“ اور پہلی بحث تو یہی ہے کہ خلافتِ امیہ امر باللہ ہے یا امر الناس؟ اس بحث کو طے کرنے کے بعد اس مسئلہ کو آیت کے زیر سایہ لانے کی کوشش ہو سکتی ہے درنہ بیجا رہے۔

خیالات کی نیزگیاں ہر رنگ میں حیرت افزا ہیں۔ خلافتِ ثانیہ میں تو مشورہ کو دخل میں دیا گیا۔ صرت ہمارے والے کا حکم تھا۔ دوسرے لفظوں میں دلی عہدی۔ پھر یہاں کیا ہو گا۔ (الغرض آیت شوریٰ حضراتِ اہل سنت کے مان لیے ہوئے معنی کو محیط نہیں ہے اور نہ خلافت کی تنصیب کے لیے اسے استدلال پیش کیا جاسکتا ہے۔

خلفائے راشدین

یہ وہ بحث ہے جسے لکھ کر خیالِ خود دنیائے تشیع پر وہ بار رکھ دیا گیا ہے کہ گویا قیامت تک سبکدوشی نہیں ہو سکتی۔ مگر پہلا سوال اس مسئلہ میں یہ ہے کہ خلفاء کے ساتھ ”راشدین“ کی نسبت کہاں سے آئی؟ خدا سے؟ رسول سے؟ یا خود ساختہ؟

اس لفظ پر اصرار کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خلافت کے متعلق اسلام میں دو ہی نظریے پائے جاتے ہیں۔ یعنی را خلافت من اللہ اور (۲) خلافت من الناس۔ ان میں پہلا عقیدہ تو گویا ہے ہی نہیں۔ الاحوالہ دوسرا نظریہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ اب اگر کوئی شخص پہلے عقیدہ کو چھوڑ دے جو خیالِ حضراتِ مہوم ہے تو دوسرے مہوم میں تو مبتلا نہیں ہو گا۔ وہ سرچا دیکھے گا کہ جتنے سلاطین مع خلفاء اسلام میں گزرے ہیں۔ وہ

سب انہیں اصول کے تحت میں میں جو تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لہذا کسی کو خلیفہ کہنا اور کسی کو سلطان انتراق بے معنی ہے۔ بھڑکڑ یہ کہ کچھ لوگوں کو راشدین سے ملقب کرنا اور کچھ لوگوں کو غیر راشدین قرار دینا بالکل بے ربط ہے۔ اگر خلیفہ کہنے میں کوئی خاص بات ہے تو سب کو خلیفہ کہئے اور راشدین کہنے کو جی چاہتا ہے تو سب کو راشدین کہیے۔ ”ایک بام دودھوا“ ایک قسم کا منہ ہے۔

اب رہا یہ امر کہ کسی کی نیکیاں زیادہ میں کسی کی کم ہیں۔ ہوا کریں ہیں کیا؟ اپنی اپنی گور اور اپنا اپنا عمل۔

میں اس کی مزید توضیح کیے دیتا ہوں کہ عنوان کے تحت میں جن حضرات کی سیرت شکاری کی جاتی ہے نہ مطلب صرف یہی ہے نا، کہ اس محفل سے اعتقاد بانی کی آنکھیں میں چکا چوند پیدا کی جائے اسے آزادی خیال نہیں کہتے۔ استدلال کا ایک بھونکا اس سادی تعمیر کو جیج و بن سے الٹا کر پھینک سکتا ہے۔ ان حضرات کے محاسن لاکھ گنوائے جائیں بہر حال وہ منصوص من اللہ تو نہیں ہیں انسان ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ یہ لوگوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقام میں ایک شیعہ کے نزدیک علیؑ کی بھی کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لیے کہ شیعہ جو حضرت علیؑ کو مان رہے ہیں وہ صرف اس لیے کہ منصوص من اللہ ہیں اور جب یہ عقیدہ ہی اڑ گیا تو پھر علیؑ بھی کیے از دیگران ہیں۔ وہ کسی جماعت میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ان کا ایک ذاتی فعل ہوگا جو قطعاً کسی کے لیے حجت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ ”راشدین“ کا تسمیہ لفظ ”خلفاء“ کے ساتھ محض ایک خوش اعتقادی ہے۔

اب میں اس طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ حضرات خلفاء کے ساتھ علی رضی اللہ عنہ کا سلوک ایک شیعہ کی نگاہ میں کیا معنی رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ شیعہ خلافت اکبریہ کے جس عقیدہ کو دل میں جگہ دیے ہوئے ہیں۔ اس

عقیدہ کی رو سے صرف حضرت علیؑ ہی امام نہیں ہیں بلکہ دوسرے حضرات ائمہ بھی ہیں اور اس عقیدہ کی بنا پر ان میں اور حضرت علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک دوسرے کے قول و فعل کے شارح ہیں۔ ان دوسرے بزرگواروں نے اپنے زمانہ کی حکومتوں کے مقابل صلح و آشتی ہی کو اپنا طریقہ قرار دیا۔ لیکن ان بزرگواروں کے اس صلح و آشتی کو مد نظر رکھتے ہوئے ان حکومتوں کو شیعوں نے کبھی حکومت حقہ تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ خود ان بزرگواروں کا کوئی ایسا ارشاد یا ہدایت ہے بلکہ اس کے خلاف ان کے اقوال موجود ہیں۔ ائمہ اہل بیت کا یہ عمل ہمارے نزدیک علی مرتضیٰ کے فعل اور علی کا شارح ہے جس طرح قہنی مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ نے حکومت وقت کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ گزاری اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی پس جس طرح ائمہ کا یہ فعل حکومت وقت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے اسی طرح علی مرتضیٰ کی مصالحت سے عند الشیوعہ حقانیت حکومت وقت پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

شیعہ اگر خلافت ائمہ کے نظریہ کا حامی ہے تو اس کا یہی اصولی جواب ہے جو عرض کیا گیا۔ پھر کیا حق ہے دنیا کو کسی کے معتقدات کو نہ سمجھتے ہوئے اس پردہ بار رکھے جس کا وہ اصولاً منکر ہے اور اگر شیعہ اس عقیدہ سے دست بردار ہو کر اس دائرہ سے نکل رہا ہے تو پھر اس کی آزادی خیال کے سامنے امتیازات کی کوئی دیوار حائل نہ ہونی چاہیے کس کے راہدین اور کس کے غیر راہدین۔

خوش نباشد جامہ نیچے اطلس دنیے پلاس !

اس بحث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ”اگر میں شیعہ حضرات کی مستند احادیث سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجہ عہدہ برآ ہو جاؤں گا۔“

خواب نہایت اچھا ہے۔ تعبیر ناظرین کے سامنے آجئے گی۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ کسی سطحی مناظر کی تصنیف پر اعتماد کر کے حوالے اور عباتیں

لکھ دی گئی ہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ کتابوں کے نام تک صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے، شیعوں کی مشہور کتاب "حدیث کلینی" میں عرض کروں گا کہ شیعوں کے ہاں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ ایک کتاب حدیث "کافی" ہے۔ اس کے مصنف کا نام ہے محمد بن یعقوب کلینی (کلین کے رہنے والے) ایسی ڈسپیدیاں بہت ہیں، ناظرین عنقریب ملاحظہ کریں گے۔

ہاں اس عنوان "خلفائے راشدین کے متعلق میں" مجھ کو یاد آیا ہوں لیکن نا انصافی ہوگی اگر مندرجہ ذیل خیال کے متعلق معروضہ نہ کیا جائے۔

"اگر خلفائے ثلاثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت ہوتا تو حضرت علیؑ جیسا جلیل القدر سلطان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر کرتا، اور پوری طاقت کے ساتھ صلے احتجاج بلند کر کے خدا و رسول کے فساد کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلیٰ کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسند خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسینؑ کی طرح میدان کا زرار میں ترپتے نظر آتے۔"

صلح دہشتی کی پالیسی کے متعلق تو میں کہہ چکا ہوں اور اس کے متعلق شیعہ نمائندہ کا جواب جو درج کیا گیا ہے معقولیت پر مبنی ہے۔ ہاں یہ آخری سطور پر رائے زنی باقی ہے۔

نیضال جو آخر میں ظاہر کیا گیا ہے کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ بالفاظ مختلف اسے ہمیشہ دہرایا گیا ہے اور غالباً جب تک دنیا باقی ہے دہرایا ہی جائیگا۔

بہت خوب اعلیٰ قتل ہو جاتے، قتل ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مگر نتیجہ، شہادت حسینؑ سے جو نتیجہ مترتب ہوا وہ علیؑ کے قتل پر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا، ہر فعل کی تاثیر میں زمانہ کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ علاوہ انیل قتل علیؑ کے معنی یہ تھے کہ حسینؑ بھی قتل ہو جاتے بلکہ تمام حائد بنی ہاشم موت کے گھاٹ اترتے۔ نتیجہ کیا ہوتا؟ صاف ظاہر ہے

کہ حکومت بے کھٹکے اغیار کے ماتھوں میں کیسلیتی اور یہی خواہان حکومت کی طرف سے بیرونی دنیا کے لیے جو تاریخی مواد پیش کیا جاتا ظاہر ہے وہ کیسا ہوتا۔

”تاریخی واقعہ ہے کہ مالک بن نویرہ نے زکواۃ بھینچنے میں عذر کیا کہ رسول اللہؐ نے حکومتِ وقت کے لیے کوئی وصیت نہیں کر بلکہ نصیت کسی اور کے لیے ہے۔ فوراً فوج بھیج گئی۔ اس قبیلہ پر کامل بربریت کے ساتھ حملہ کیا گیا۔ بالآخر اس قبیلہ کا نام ”مرتدین“ کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ کیا قتل ہو جانے کے بعد علیؑ اور دیگر بنو ہاشم کا نام اس فہرست میں نہ آتا؟ اور کیوں نہ آتا؟ البتہ موقع علیؑ نے نہیں دیا۔

علاوہ ازیں علیؑ کے قتل ہو جانے پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنو تمیم اور بنو عدی اس حکومت پروردہ سکیں۔ بنو امیہ ہونع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے، ابوسفیان زندہ تھا۔ بنو ہاشم ہی تھے جن کو وہ اپنی لکڑی کا جھنڈا تھا۔ ان کے بعد میدانِ صاف تھا۔ باقی بنو تمیم اور بنو عدی اس کی ایک دھمکی سے خانہ نشین ہو جانے ابتداء سے ہی بنو امیہ

سرپرست پر آتے اور وہیں سے سے
و لعت ہاشم بالملک لا
خبر جاء ولا وحی نزل
کے ترانے بلب رہ جاتے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جس وقت حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان نے علیؑ سے آکر کہا کہ اٹھو۔ مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں گا۔ اگر علیؑ اس کے دم میں آ جاتے تو عین مسیدان کا رزار میں محاسنین سے مل کر بنو ہاشم کا خاتمہ کر دیتے اور ان کے بعد پھر دوسرے تھے ہی کیا۔ لیکن علیؑ اس راز سے واقف تھے، اس نے جو نقشہ ڈالا تھا اسے سمجھتے تھے۔ لہذا جبر ملک دیا اور صاف کہا کہ تو منافق ہے۔ یہی وہ اندرونی ریشہ دوانیاں جن پر نظر کرتے ہوئے اہل بصیرت نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اس وقت مدینہ میں جنگ داخلی کا واقع ہو جانا نفسِ اسلام کے

لیے مُضر تھا، اور ایسا مُضر کہ ابتدائے بعثت میں جو نتیجہ حضرت پیغمبرؐ کی شہادت سے نکلتا
وہی ابتدائے خلافت میں حضرت علیؑ کے قتل ہو جانے سے برا مہموتا۔

اب اس کے علاوہ فتیاب ہو کر تختِ سلطنت پر متمکن ہو جانے میں علیؑ کی حیثیت
بادی النظر میں اسی بادشاہ کی سی ہوتی جو اپنے مخالفین کو تہ تیغ کر کے سرِ سلطنت پر قدم
رکھا کرتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے ”فصبرت علیٰ اطوار المدة دشت المحنة“
اس طویل مدت اور سنج و الم کی شدت پر میں نے صبر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اغراض ذاتی کا قدم اگر درمیان میں ہوتا تو شاید علیؑ بھی یہی کر گزرتے
لیکن وہ اس سطح سے بلند ہیں۔

اب زمیں را آسمانے دیگر است

اب میں ان منقولات پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فاضل مضمون نگار کو خدا جانے
کتنی زحمت سے دستیاب ہوئے ہیں:-

۱۔ ایک خط کا مضمون رقم کیا گیا جو حضرت علیؑ نے حاکم شام کو جنگِ صفین
کے دوران میں لکھا ہے۔ اس میں حضراتِ شیعین کی تجبید کی گئی ہے۔

”کتاب الفتح“ ابنِ عاصم کو فی ”اور“ شرح نہج البلاغہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس
مقام پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ”ابنِ عاصم“ میرے خیال میں صحیح نہیں بلکہ صحیح
لفظ ”ابنِ اعثم“ ہے۔ لیکن وہ ”ابنِ عاصم“ ہو یا ”ابنِ اعثم“ اس کو شیعہ ظاہر کرنا ایک
دلچسپ تحقیق کی ابتدا کرنا ہے۔

شرح نہج البلاغہ کا حوالہ بھی شکوک ہے۔ نہج البلاغہ کی شرحیں کئی میں فارسی
بھی عربی بھی، علیٰ ہذا شارح شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ اگر بالفرض شیعہ کی شرح ہوتو
بھی اس پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔

حضرت امیر کا وہ خط جسے ”محاسن کتب“ سے تعبیر کرتے ہیں خود نہج البلاغہ میں

موجود ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کی تحریک کا کیا مضمون ہوگا۔ اس کے چند فقرات درج کر دیتا ہوں:-

”وزعمت ان افضل الناس فی الاسلام فلان وفلان امر ان تم
اعتزلت کلہ وان نقص لم یلحقا شلتہ“

ارباب نظر جانتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے دعوے کی بنیاد خون عثمان پر رکھی تھی اور بہال عرب اور خصوصاً شام میں اس دعویٰ کی حقانیت کے لیے کافی پروپیگنڈا کیا گیا تھا یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمان حضرات شیعین ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ علیؑ کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی ایسی تحریر مل جائے جسے مخالفت شیعین پر محمول کیا جاسکے اور دنیا کو بتایا جاسکے کہ علیؑ اس خلافت کے ابتداء ہی سے مخالفت میں اور وہ شیعین کو اپنے مکتوبات میں بڑا کہہ رہے ہیں ان کے وقت میں وہ کچھ نہ کر سکے لیکن عثمان کے وقت میں انھیں موقع مل گیا اور چونکہ عثمان شیعین کے قائم مقام تھے اور بہت شیعین پر عمل کرتا ان کا شعاع تھا لہذا انھیں قتل کیا اور وہ اس خون میں قطعاً شریک ہیں۔ مگر علیؑ کی طرف سے جو جواب ملتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا کہ سوائے مایوسی کچھ اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خط میں فرماتے ہیں:-

”وزعمت انی لکل الخلفاء حسد و علی کاتم یغیت ان لیکن ذلک
کذ فلیس الحنابیہ علیک فیکون العذر الیہ“

”تیرا یہ گمان ہے کہ میں نے تمام خلفاء سے حسد کیا اور سب پر بغاوت کی۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو تیری تو کوئی غلطی نہیں کی گئی کہ تیرے سامنے اس کا عذر کرنے کی ضرورت ہو۔ (تجھے کوئی حق مداخلت حاصل نہیں)“

اس کے بعد ایک طعن اور بھی تیز ہے اور اس کا جواب بھی مرقوم ہے۔ اسی سے علیؑ کی روحانی عظمت ان کے مخالفین کی ذہنی ہستی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”تو نے کہا ہے کہ میں بیعت کے لیے اس طرح لایا گیا جیسے اونٹ کو ٹھیل سے کھینچتے ہوئے لاتے ہیں یہاں تک کہ میں بیعت کروں، خدا کی قسم تو نے میری مذمت کا ارادہ کیا، مگر میری مدح کر گیا، تو نے مجھے نصیحت کرنا چاہا مگر خود رسوا ہو گیا، اس لیے کہ مظلوم ہونے میں مسلم کا کوئی نقصان نہیں جب تک وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلنے والا ہو۔“

اس خطبہ کے الفاظ سے حقیقت امر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علیؑ کی بیعت کس طرح حاصل کرنی کی کوشش کی گئی۔ معاویہؓ پر طعن کرتا ہے علیؑ اس واقعہ کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی وہ توجیہ کرتے ہیں جو علیؑ ہی سے مخصوص ہے۔ اب غیر جانبدارانہ تفصیل اہل انصاف کے ہاتھ ہے۔

۲۔ اتواق الحمایۃ: یحییٰ بن حمزہ ضیعہ زبیدی کی تصانیف سے بقائی لکھی ہے اور اس کی رطایت سے جس کے راوی سدید بن غفلہ میں اور جس سے شیخین کی کامل طرح ظاہر ہوتی ہے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ اتواق الحمایۃ مجھے محتاج اسالین کی بہن معلوم ہوتی ہے مگر بالفرض یہ کتاب وجود خارجی بھی رکھتی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تک صحیح عبارت نہ دیکھ لی جائے اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے خود زبیدی بن علیؑ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جب اموی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو عین کارزار میں ایک شخص نے سوال کیا کہ شیخین کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ظاہر ہے کہ اس موقع پر اس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ جناب زبیدی نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ اس کا جواب پھر دیا جائے گا۔ لڑائی شروع ہوئی عین جنگ میں ایک نیرتید کی پیشانی پر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ کچھ لوگ گرد جمع ہو گئے پوچھا وہ سائل کہاں ہے، وہ بھی آگیا۔ اس سے کہا کہ دیکھ انھیں کے سبب سے مجھے یہ حالت دیکھنی پڑی۔

غرض علیؑ یا بوعلیؑ ہے یہ توقع رکھنا کہ شیخین کی کوئی خاص عظمت ان کے دل میں ہو ایک غلط توقع ہے۔

۴۱۔ تفسیر قمی کے حوالہ سے سورہ توبہ کی آیت ”ثانی اثین“ کی تفسیر میں حضرت صادق سے ایک روایت نقل ہوئی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ روایت موجود ہے لیکن اس سے فائدہ کیا ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انھوں نے جعفر اور ان کے اصحاب کو سمندر میں دیکھ لیا اور عرض کی یا رسول اللہؐ آپ صدیق ہیں۔

اب کوئی بتائے کہ اس میں شیعوں کے خلافت کیا بات نکلی۔ یہ معجزہ اگر ہے تو رسول اللہؐ کا ہے شیعہ کب اس امر سے منکر ہیں کہ رسول اللہؐ کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ غار میں نہ تھے یقیناً تھے مگر محزون و ملول تھے لیکن ہے حضرت نے اس طرح ان کو سکون دینا چاہا ہو۔ دوسری روایت اسی واقعہ کے متعلق جو تفاسیر شیعہ میں مروی ہے میں اسے نقل نہیں کرتا اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس واقعہ سے کیا اثر لیا۔ اہل انصاف صرف اتنا دیکھ لیں کہ اگر ایسی ہی کوئی روایت علیؑ کا استحقاق جتنے کے لیے شیعوں کی طرف سے پیش ہوتی تو ان کو ”سفیہ“ بنانے کے لیے کوئی لغت باقی نہ رکھا جاتا۔

۴۲۔ سورہ نور کی آیت ”ان الارض یثخا عباد الصالحین“ کے متعلق ایک مضمون تفسیر خلاصۃ المنہج سے نقل ہوا ہے مقصد یہ ہے کہ یہ وعدہ خلق کے عہد میں پورا ہوا۔

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ آیت سورہ نور میں نہیں بلکہ سورہ انبیاء میں ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ ”صالحین“ نہیں ہے بلکہ ”صالحون“ ہے۔ یہ صفت ہے عباد کی اور عباد از روئے قانون عربیت مقام رفیع میں ہے۔

ان غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور بغیر اصل کتاب کی طرف رجوع کیے ہوئے غرض کرتا ہوں کہ تفسیر عامر میں یہ مضمون موجود ہے اور حسب عادت اہل علم مفسر نے اس قول کو بھی نقل کیا ہوگا۔ باقی تفسیر خاصہ میں اس آیت کے متعلق جو کچھ اللہ سے نقل ہوا ہے اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔

۵-۶۔ ان دونوں میں کشف الغمہ کے حوالہ سے دو عجیب و غریب روایتیں نقل ہوئی ہیں۔
۱۔ علی کا قول ہے کہ جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے۔

۲۔ حضرت ابوبکر کی وفات پر حضرت علیؓ بہت رنجے اور کہا "آج نبوت کی خلافت منقطع ہو گئی۔"

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب "کشف الغمہ" موجود ہے شیعہ عالم کی تالیف ہے کتاب کا پورا نام ہے "کشف الغمہ فی مناقب الائمہ" نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ موضوع کتاب کیا ہے؛ حضرت رسول اللہؐ سے لے کر امام دوازہم تک کے مناقب فضائل بیان ہوئے ہیں۔ التزام یہ کیا ہے کہ ہر دو فریق کی روایات پر بہ سلسلہ مناقب و فضائل درج کی جائیں۔

اہل عقل خود انصاف فرمائیں کہ مولف کتاب ہر دو روایات مندرجہ بالا کو درج کتاب کر کے اپنے موضوع کو کون سی قوت پہنچا سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے حالات حضرت امیرؓ خود سے پڑھے اور انہوں نے کہ مجھے ان دونوں روایاتوں کا کہیں اشارہ بھی نہ ملا۔ اس کے برعکس مولف کتاب کسی اور شے کو درج کر رہا ہے۔ جو قابل ملاحظہ ہے۔

"فی ذکر الصدیقین، من مناقب ابن المغازی عن ابن عباس"

اس روایت کا ماہر یہ ہے کہ تحت آیت "السا بقون السابقون" ابن عباس سے مروی ہے کہ یثرب بن نون نے موسیٰ کی طرف سبقت کی اور صاحب "آل بسین" نے عیسیٰ کی طرف اور علی بن ابی طالبؓ نے محمد بن عبد اللہ کی طرف اور وہ ان سے افضل ہے۔

دوسری روایت مسند امام احمد بن حنبل سے نقل کی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے خود علیؑ کی زبان سے سنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس کے رسولؐ کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں اور میرے سوا جو کوئی بھی اس کا قائل ہو وہ مفتری و کاذب ہے۔ میں نے تمام لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

یہی مضمون صدیقیت البوسی سے نقل ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب شیعہ بصائر الدجیات سے ایک حدیث اس بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مضمون دیگر کتب شیعہ میں کثرت پایا جاتا ہے۔ خود مولف کتاب نے بحث انقاب میں حضرت علیؑ کا لقب صدیق اکبر تحریر کیا ہے۔ اب بتایا جائے وہ حدیث کس گوشہ میں چھپی ہوئی ہے جس سے اس استدلال فرمایا گیا ہے اور یہ حدیث ختم خلافت نبوتؐ تو اد بھی مزید رہے۔ "فصول امامیہ" کے ایک حدیث حضرت باقرؑ سے درج کی گئی ہے۔ روایت کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا ہی جانتے۔

لیکن اس نام کی کوئی کتاب شیعہ تصنیفات میں نہیں ہے مجھے حیرت تھی کہ یہ فصول امامیہ کون سی کتاب ہے اور کس فن میں ہے۔ کم از کم میرے علم میں تو نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میرا محدود علم حجت نہیں ہے۔ لہذا ایک عراقی بزرگوار سے رجوع کی گئی جو ایک وسیع نظر کے مالک ہیں۔ انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ عجب نہیں "فصول المہمہ" مراد ہو جو آبن سبارغ المالکی کی تالیف ہے اور چونکہ یہ کتاب مناقب ائمہ اہل بیتؑ میں ہے، اس کے مؤلف کو شیعہ ظاہر کر دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ اسی شیعہ "فصول المہمہ فی معرفۃ الائمہ" کو دیکھا گیا حضرت باقرؑ کے حالات میں تلاش کی گئی کہ یہ حدیث یا روایت جو کچھ بھی ہے وہیں ملنی چاہیے، کئی گھنٹے خراب کیے اور نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس قسم کے غلط حوالوں کا مطلب کیا ہے؟ تحقیق حق یا مخاطب کو پریشان کرنا مذہب کی حمایت جب ایسے حیلہ حوالوں پر منحصر رہ جائے تو یہ وقت اس

مذہب کے لیے نہایت سبکی کا وقت ہوتا ہے۔

یہ تو حوالہ کی حالت ہے، اب یہی حدیث اس کے متعلق چند الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

فاضل مضمون نگار نے احادیث کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے:-

”احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے

کے باوجود کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔“

یہ گویا عند فرمایا گیا ہے اس امر کا کہ شیعہ متکلمین جو احادیث کتب اہل سنت سے

پیش کرتے ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہی حق شیعہوں کو بھی

حاصل ہے یا نہیں اور نہیں تو کیوں؟ اگر شیعہ استدلال کریں تو یہ مشہور کتاب ہر

معقول راوی ناقابل اعتبار اور اگر حضرات اہل سنت استدلال کریں تو شیعہوں

کا فرض ہے کہ مجہول روایت اور ہر نامعلوم کتاب کو مستند تسلیم کر لیں۔ ایں چہ بوالعجبی

است۔

اب میں دیکھتا ہوں نفس مضمون حدیث کو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے

بارے میں ان لوگوں کو غرض کرنے سے منع کیا گیا۔

معلوم ہے کہ حضرت باقرؑ کا زمانہ بنو امیہ کے شباب

کا زمانہ ہے۔ اور بنو امیہ کی نگاہیں اہل بیت کی طرف کیسی تھیں۔ اس کا جواب

تاریخ دے سکتی ہے اور آپ خود بھی واقف ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بنو امیہ کی خلافت

کی بنیادیں خلافت شیخین پر قائم ہوئی تھیں۔ اور حضرات ثلاثہ یا ان کی حکومتوں پر

تنقید کرنا، حکومت وقت کو برا کہنا تھا، ایسے وقت میں ان عوام کو جو گذرگاہ پر بیٹھ کر

تہذکرے کرتے تھے اگر حضرت نے سختی کے ساتھ رد کیا تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت باقر علیہ السلام کی محتاط زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جابر ابن

یزید کو ایک کتاب دی جاتی ہے کہ اسے حفظ کرو، لیکن جب تک بنو امیہ کی حکومت ہے اس کتاب کا ایک لفظ ظاہر نہ کر دو۔

اگر جناب باقرؑ کے ان اشاروں پر جو بہ نظر مصلحت تھے آپ استدلال کر رہے ہیں تو حضرت کے دوسرے ارشادات پر بھی آپ کو نظر فرمائی چاہیے۔

۸۔ ہاں نہج البلاغہ میں یہ خطبہ مذکور ہے حضرت امیرؑ نے جناب خلیفہؑ دومؑ کو میدان میں جانے سے روکا ہے۔ بہتر ہو کہ مناظرین اہل سنت، اس خطبہ کو درمیان میں لانے سے اجتناب فرمائیں کیونکہ اس صورت میں سب سے پہلے حضرت خلیفہؑ دومؑ کی مہارت جنگ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی یہاں صرف اس قدر وضاحت کافی ہے کہ علیؑ کے زمانہ میں حقیقی ڈائیاں ہوئیں علیؑ نفسِ نفیس ان میں شریک تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ غزوات میں خود رسول اللہؐ شریک ہوتے تھے۔ گویا غزوات میں خود شریک ہونا سنتِ میغیرہ ہے۔ پھر حضرت خلیفہؑ دومؑ کو اس سنتِ رسولؐ سے کیوں روکا گیا؟ بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کا یا علیؑ مرتضیٰ کا شکر کے ساتھ ہونا ہر جہت سے مفید تھا، اور حضرت ممدوح کی ہمراہی جنگی نقطہ نگاہ سے لشکر کے لیے مضر تھی اور علیؑ جانتے تھے کہ اس حضرت کا اثر اسلام کی عمومی حالت پر اچھا نہ پڑے گا۔ لہذا آیہ قلب کے ساتھ روک دیا۔

۹۔ حیدر العیون کے باب دسویا سے حضرت علیؑ کی وصیت نقل کی گئی ہے۔

۱۔ شیعہ مسئلہ تقیہ کو مانتے ہیں۔ فاعل مضمون نگار نے طنزاً حاشیہ پر اشارہ بھی کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ”دل میں بُت، زبان پر خدا“ اسے اتفاق کہتے ہیں، اور ”دل میں خدا، زبان پر بُت“ تقیہ ہے وہ بھی عند الضرورت۔ پڑھیے سورہ نحل کی یہ آیت من کفر بالله من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبه معطش بالایمان۔

”صحاب رسولؐ کی رعایت کر دو کہ انھوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے دیا۔“
یہ حوالہ صحیح ہے مگر بغیر کتاب دیکھے ہوئے نفل ہوتا ہے۔ میں عین عبارت نقل کرتا ہوں :-

”از خدا تیر سید در باب اصحاب پیغمبرؐ خود در رعایت نمایند آئندہ را کہ دین خدا بدعتی نہ کردہ اند و صاحب بدعتی را پناہ نہ دادہ اند بدستیکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصیت فرمودہ در حق اہل گروہ از صحابہ خود لعنت کرد بر کسے کہ بدعتی گند از صحابہ و غیر صحابہ کسے را کہ صاحب بدعتی را پناہ دہد و باری کہ شد۔“
ترجمہ :- ”اپنے پیغمبرؐ کے ان اصحاب کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ جنھوں نے دین خدا میں کوئی بدعت نہیں کی اور صاحب بدعت کو پناہ نہیں دی۔ بدستیکہ حضرت رسولؐ نے اپنے اصحاب کے اس گروہ کے بارے میں وصیت کی ہے اور لعنت کی ہے اس شخص پر جو بدعت کرے وہ صحابہ سے ہو یا غیر صحابہ سے اور اس پر جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اسکی مدد کرے۔“
شکوہ ہے کہ ابھی ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ دیکھیں کہ عبارت کتاب کیا کہتی ہے اور مفہوم کیا لیا گیا ہے۔ مجھے کتنا پڑتا ہے کہ تحریف معنوی کی اتنی دلچسپیاں وقت ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

رفایت کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے کہ وصیت ان اصحاب کے بارے میں کی گئی ہے کہ جو بدعتی نہ ہوں اور بدعتی کو پناہ دینے والے نہ ہوں اور جو بدعتی ہوں خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی ان پر لعنت کی گئی ہے۔ مترجم نے پہلی سطر کو دیکھ کر دھوکا کھایا ہے۔
”آئندہ“ کہ پہلے جملہ سے متعلق کر کے جملہ ختم کر دیا ہے اور اس طرح عبارت اپنے

آخر جزوے نامر لوط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو مفید سمجھا ہے اور اس پر اتفاق کی گئی ہے۔

الوہی خلافت

اب تک جس قدر توضیح کی گئی ہے اس کے لحاظ سے اہل نظر غالباً شیعہ عقیدہ خلافت کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتے اور سمجھتے ہیں اس کی صحیح ترجمانی نہیں کی جاتی۔

اب اس عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کے اعتراضوں کا جواب بھی پیش کیا جاتا ہے اگرچہ اس میں بیشتر دی امور میں جن کی تفصیل کی جا چکی ہے۔

تحریف قرآن کے متعلق حیات القلوب کی عبارت ثلث قرآن در فضائل اہلبیت و ثلثہ در مثالب دشمنان ایشان است کے سمجھنے میں اشتیاء ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی قرآن جو اس وقت موجود ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی مسلم الثبوت کتب ہے اس کا ثلث حصہ مناقب اہل بیت پر اور ثلث مثالب دشمنان اہل بیت پر مشتمل ہے اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں جسے فاضل مقالہ نگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح روایتیں جو کتب شیعہ سے پیش کی گئی ہیں اور جو عدم نص امامت علمی پر (نجیال مضمون نگار) دلالت کرتی ہیں۔ لائق غور ہیں۔

۱۔ اہل تشیع کے مشہور مجدد و تخریانی نے شرح نہج البلاغہ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ خلاصہ روایت یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ نے حضرت حفصہ کو خبر دی کہ میرے بعد ابو بکر خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیسرا باب حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ سے کہہ دیا۔

یہ مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے اور یہ چیزیں ہمیشہ سے شیعوں کے پیش نظر رہی ہیں شیعہ نظر یہ ان روایات کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر کوئی شیعیان

کسی واقعہ کی حقانیت یا عدم حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجیے آج یہودی فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر قابض ہیں اور اس کے متعلق کوئی پیشینگوئی کسی کتاب سادی میں پائی جائے تو کیا اس سے یہود کی حقانیت پر دلیل لائی جاسکتی ہے؟

حضرت رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو وصیتیں کرتے ہوئے بفری ہے کہ میرے بعد یہ امور ظہور میں آئیں گے جس پر علیؓ نے پوچھا کہ میرا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ فرمایا ”صبر“ یہی وہ راز باطنی ہے جس پر اہل دل حیرت کرتے ہیں اور اہل دنیا کوئی طعنہ اٹھا نہیں سکتے الغرض یہ پیشین گوئی حضرات خلفاء کی حقیقت کو ثابت نہیں کرتی۔

۲۔ ”جلال العیون میں لکھا ہے کہ حضرت رسول پر جب مرض کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جائیداد اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد کر دیں حضرت عباس نے کہا یہ کام مجھ سے نہ ہو گا البتہ میری بجائے حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا جائے۔“ نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ رسول کریمؐ اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علیؓ ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے۔

مناسب معلوم ہونا ہے کہ اصل عبارت نقل کر دوں تاکہ مبصر کو مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

”اے عم بنی تمیر قبول کن وصیت مرا و اہل من و در زمان من و بکیر میراث مرا و ادا کن دین مرا و وعدہ ہائے مرا بعمل بیا و در و ذمہ من بری بگردان عکس گفت یا رسول اللہ من مرد پیر عیال دارم و تو انا بر بہاری بخشنده تری و مال من و فائز من بعد ہائے تو بخشش ہائے تو این را از من بگذاں بسوئے کس نہ حالتش از من بیشتر باشد و حضرت صد مرتبہ این سخن را بار و اعادہ کرد و در ہر مرتبہ انجین جواب گفت پس حضرت فرمود کہ میراث خود را بکسے دہم کہ قبول کند اں را کہ حق قبول کردنی است و من را داکاں باشد و چنانچہ

تو لفظی جواب نہ گویا پس یا حضرت امیر المومنین خطاب کرد و فرمود یا علیؑ تو میری میراث مرا کہ مخصوص تست و کسے را با تو زائے نیست و قبول کن وصیت مرا و عمل بیا در وعدہ ہائے مرا و ادا کن قرضہائے مرا یا علیؑ مخلصی من باشی در اہل من و تبلیغ رسالت من بعد از من بجزوم کن۔“

ترجمہ۔ ”اے چچا میرے اہل کے بارے میں اور میری عورتوں کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو اور میری میراث لے لو۔ میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں کو عمل میں لاؤ۔ اور مجھے بری الذمہ کر دو۔ عباس نے کہا یا رسول اللہؐ میں بوڑھا آدمی ہوں عیالدار ہوں آپ ابوہریرہؓ سے بڑھ کر بخشش کرنے والے، میرا مال آپ کے وعدوں اور آپ کی بخششوں کے لیے وفا نہیں کر سکتا۔ اس وصیت و میراث کو اس کی طرف پلٹائیے جس کی طاقت مجھ سے بیشتر ہو۔ حضرت نے مبن مرتبہ اسی ارشاد کو دہرایا اور ہر مرتبہ عباس نے یہی جواب دیا پس حضرت نے فرمایا کہ اپنی میراث لیجیے کو دہل کا کہ جو اسے اسی طرح قبول کرے جو قبول کرنے کا حق ہو تمہارے اور وہ اس کے لیے سزاوار ہوا اور جس طرح تو نے کہا اس طرح جواب نہ دے۔ پس حضرت امیر المومنینؑ سے خطاب کیا، اور فرمایا یا علیؑ تو میری میراث لے کہ تجھ ہی کے مخصوص ہے اور کسی کو تجھ سے نزاع کا حق نہیں، میری وصیت قبول کر، میرے وعدوں کو عمل میں لا، میرے قرضوں کو ادا کر اور اے علیؑ میرے اہل میں میرا خلیفہ ہوا اور لوگوں پر میرے پیغاموں کی تبلیغ کر۔“

یہ ہے معین جہادت اور اس کا ترجمہ۔ میں اس روایت پر از روئے روایت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نفس مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس روایت میں میراث کا تذکرہ ہے۔ حضرت رسولؐ اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اگر

میری میراث یعنی چاہتے ہو تو ان شرائط کے تحت لے سکتے ہو۔ عباس اپنے انکسار کا عذر کرتے ہیں۔ تین مرتبہ یہی بات دہرائی جاتی ہے۔ تاکہ عکس کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور آخر یہ شے علی رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوتی ہے۔ نزاکت کلام یہ بھی ہے کہ عکس سے فرماتے ہیں "قبول کن وصیت من در اہل من و در زمان من" اور علیؑ سے فرماتے ہیں "علی خلیفہ من بکشی در اہل من و تبلیغ رسالت من بعد از من مبروم کن" رسول اللہ کے اس ارشاد و وصیت کا مطلب کیا تھا وہ اس جواب سے ظاہر ہے "یا رسول اللہ میں مرد پیر و عیال دارم" ظاہر ہے کہ کچھ خرچ کا معاملہ تھا اور اہل رسولؐ و زمان رسولؐ کی خبر گیری کا بار پڑتا تھا۔ اس لیے انکار کر دیا۔

میں نہ سمجھ سکا کہ خلافت و امامت سے اسے ربط کون سا ہے، واقعاً عباس کے خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی، جو معترض نے پیدا کی اور علیؑ کو بھی اس مقام میں خلافت دی گئی ہے وہ خلافت خاصہ ہے یعنی اہل رسولؐ و زمان رسولؐ کے مثل رسولؐ محافظ و نگران رہیں اور ان کا حکم مثل رسولؐ ان پر جاری ہو غرض معترض کے پیش کردہ نتیجہ سے اس روایت کو کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ ماباقر محمد نے حضرت امام حنفی صادق سے روایت کی ہے کہ ایک بار نبی کریمؐ نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالیٰ نے سب روا کر دیں۔ آخر شب میں حضرت علیؑ بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسول خداؐ نے فرمایا اے علیؑ تمہاری خلافت و امامت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی (حیات القلوب جلد ۳)

فصل مقالہ نگار نے اس مقام پر یہ فخریہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر میں حدیث گھڑنے پر آمادہ بھی اس سے زیادہ صاف واضح اور غیر مبہم حدیث گھڑنے میں شاید مشکل کامیاب ہو سکتا۔

اب خدا اصل عبارت ملاحظہ ہو :-

”حضرت رسولؐ شبے در مسجد ماند چوں نزدیک صبح شد حضرت امیر المؤمنین داخل مسجد شد پس حضرت رسولؐ اور اندا کر دکہ یا علیؑ گفت لبیک ، فرمود کہ یا بسوئے من چوں نزدیک شد حضرت فرمود تمام این شب را دیدی در اینجا پسر کردم و ہزار حاجت خود را از خدا سوال کردم و ہمہ را برآوردم مثل آنہا را نیز برائے تو سوال کردم و باز ہمہ عطا کرد و سوال کردم از برائے تو کہ ہدایت را بمعیت گردانند برائے تو کہ ہمہ اقرار کنند بغلافت تو قبول نہ کرد و این آیات را فرستاد اللہ احسب الناس ان میترکوا ان یقولوا امناً و ہم لا یفتنون و لقد خدا الذین من قبلہم فیلعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن انکا ذبین“

ترجمہ :- ایک شب رسولؐ نے مسجد میں قیام فرمایا جب صبح نزدیک ہوئی تو حضرت امیر المؤمنین داخل مسجد ہوئے پس حضرت رسولؐ نے آواز دی یا علیؑ اعرض کی لبیک فرمایا میرے پاس آؤ جب نزدیک آئے فرمایا تم نے دیکھا کہ یہ رات میں نے یہیں بسر کی ہے رات ہی ہزار حاجتیں خدا سے طلب کیں ۔ خدا نے انھیں پورا کیا اور انھیں کی مانند (ہزار حاجتیں) تیرے لیے بھی سوال کیا وہ تمام سوال بھی پورے کیے ۔ اور میں نے سوال کیا کہ امت کو تیرے واسطے جمع کر دے کہ سب تیری خلافت کا اقرار کریں ۔ اور سب تیرے تابع ہوں یہ سوال قبول نہ ہوا اور یہ آیات بھیجی گئیں ۔ اللہ ۔ کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے آئے چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی اور البتہ ہم نے ان کو بھی آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے اور البتہ خدا

جانتا ہے جو سچے ہیں اور البتہ خدا خوب جانتا ہے انھیں جو جھوٹے ہیں۔

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ منزلی وحی نے حقائق کو نہایت سادہ زبان میں بیان فرمایا ہے۔ علیٰ کو بتایا جا رہا ہے کہ مشیت الہی کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی لہذا ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگوں کو خداوند عالم مجبور کر کے تیری خلافت پر مجتمع کرے، اور جبرے کام لے کر انھیں نیز اتباع بنائے بلکہ ایک شانِ اختیاری کے ساتھ انھیں معرض امتحان میں رکھا گیا ہے اور تو ان کے لیے وجہ امتحان ہے اور یہ آیات سورہ عنکبوت اس سلسلہ پر روشنی ڈال رہی ہیں۔

یہ ہے وہ مطلب جو اہل عقل اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں۔ اب کیا اہل انصاف میری طرف سے دریافت کر سکتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ مفہوم کہاں سے پیدا کیا ہے۔ اور اسے علیؑ ہم نے تمھاری ولایت و خلافت کے واسطے دعانا لگی، وہ نامنتظر ہوئی۔ یہ کون سی عبارت کا ترجمہ ہے؟

۴۔ ایک روایت عیون الاخبار سے نقل فرمائی گئی ہے کہ حضرت خضرؑ نے علیؑ رضی اللہ عنہ کو رابع الخلفاء کہہ کر سلام کیا۔

فاضل مناظر نے عیون الاخبار کو نہیں دیکھی اس کا تو یقین ہے لیکن خیر اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ مضمون شیعوں میں مشہور ہے اور معمولی معمولی اہل سنیر بھی اسے بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی جملہ ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ خلفائے اربعہ شیعوں کے نزدیک حسب ذیل ہیں:-

۱۔ حضرت آدمؑ (۱) حضرت داؤدؑ (۲) حضرت ہارونؑ (۳) حضرت علیؑ کہ امام ہیں
کہ یہ تاویل ہے اور خدا جانے کیلئے، میں عرض کر دوں گا کہ جس قوم کی اصطلاح ہو رہی
اس کی تشریح کی حقدار ہوتی ہے، عقلاً کیسی اس پر ایراد نہیں کرتے، تمام علوم و
فنون اور ہر قسم قاعدہ و عمارت پر۔

۵۔ منہج البلاغہ کے حوالہ سے یہ عبارت نقل ہوئی ہے :-

”ان امیر المؤمنین قال الناس جماعة وید الله علیہم غضیب الله علی من خالف الجماعة انا والله اهل السنة والجماعة“

امیر المؤمنینؑ نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے، خدا اس پر غضبناک ہوتا ہے خدا کی قسم میں اہل سنت والجماعت ہوں۔ (یعنی سنت رسولؐ کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

اسو کلام میں افتخار ارشاد ہوا ہے کہ ”ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے کوئی توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“

اہل علم جانتے ہیں کہ عبارتوں سے جو مطالب وضع کیے جاتے ہیں ان کی حجت پر یقین کرنے کی ایک میزان ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مفہوم صحیح ہے یا غلط اسی معیار پر پیش کردہ عبارت کے مفہوم کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ ہو :-

۱۱۔ لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (نتیجہ) پس لوگوں پر اللہ کا ہاتھ (مفہوم اول)

(۲) لوگ جماعت میں (۲) اور جماعت کی شان یہ ہے کہ اس کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (نتیجہ) پس لوگوں کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (مفہوم ثانی) (ماشاء اللہ کی خوب عبارت اور کیا خوب مفہوم۔

”انا والله اهل السنة والجماعة“ یہ تو معلوم ہے کہ اصطلاحی معنوں میں تو یہ کلمہ ”اہل السنة والجماعة“ استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ اصطلاح مولد ہے اور بعد کو وضع کی گئی ہے۔ اسی لیے ترجمہ میں بھی اس کی توجیہ فرمائی گئی اب معلوم نہیں ہوتا کہ

اس جملہ سے کیا فائدہ اٹھانے کی توقع کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ منہج البلاغہ کے کس خطبہ میں یہ عبارت مرقوم ہے یا خطبات میں ہے؟ فرامین میں ہے۔ کلمات مختصرہ میں ہے؟ کہاں ہے؟ اربابِ علم ہرگز تعجب نہ فرمائیں۔ مذہبِ عمومی کی بنیاد انہیں دلچسپ صداقتوں پر اٹھائی جاتی ہے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے ہمیشہ سے یہی نسخہ استعمال ہوتا ہے۔

سیاسی اختلاف

اس عنوان کے ماتحت اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مذہبِ شیعہ کی ابتدا عبداللہ بن سبا ایک نو مسلم یہودی سے ہوئی۔

میں پہلے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کو طنزاً نو مسلم کہنا درست نہیں اس لیے کہ اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین قریش ہوں یا غیر قریش یہودی ہوں یا نصرانی۔ سب کے سب نو مسلم تھے۔ ہوائے ایک مخصوص خانوادہ کے مخصوص افراد کے ملتِ ابراہیمی جن کے سینوں میں بطور امانت چلی آ رہی تھی اس کے بعد فاضلِ استرآبادی کی تحریر سے استدلال کیا گیا ہے اور یہ تحریر مٹیش کی گئی ہے:-

وكان (عبد الله بن سبا)، اول من شيع القول بفرض امامته

علی۔

”عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علیؑ کی امامت مذہبی

فریضہ ہے“

اب اربابِ نظر انصاف کی آنکھوں سے اس دعویٰ کو ملاحظہ فرمائیں، میں فاضلِ مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی بدولت کتبِ رجال کی ورق گردانی کا موقع ملا۔ فاضلِ استرآبادی کا پورا نام ہے ”مرزا محمد بن علی بن ابراہیم استرآبادی“ کتاب

سے تھا، تو اس سے ذاتِ علیؑ یا دیگر اصحابِ علیؑ یا تشیع پر کیا الزام؟ بات دور جاتی ہے اور میں اس عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اب میں اس ایراد کی طرف توجہ کرتا ہوں جسے طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیعہ مسلک کی بنیاد دھروں سے نفرت پر قائم ہوئی ہے۔

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ مذہبِ شیعہ کے اصول یہ ہیں :-

۱) خدا کو واحد و کیا ماننا (۲) خدا کو عادل ماننا (۳) نبوت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور انبیاء کو معصوم بنانا (۴) خلافت و امامت کو من اللہ قبول کرنا (۵) روزِ جزا پر اسی حیثیت سے ایمان لانا جس حیثیت سے پیغمبر نے تعلیم دی ہے۔

ان اجزاء پر نظر کرتے ہوئے مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ کس دلیل کی بنا پر مذکورہ بالا الزام درست ہو سکتا ہے۔

ہاں خلافت کے معاملہ میں وہ لوگ جو دنیوی حیثیت سے مسلمانوں کے حاکم بنے شیعوں کے نزدیک انھیں مذہباً کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ایسے چند اشخاص کے خلاف جو مبعوث یا منصوص من اللہ نہیں وہ اپنے نقطہ نظر سے مخالفانہ اظہارِ خیال پر مجبور ہیں۔

یہ ایک فطرتِ انسانی ہے کہ انسان جس شے کو اچھا نہیں سمجھتا، اس سے اظہارِ بریت کر ہی دیتا ہے۔ اگر انبیاء کا فعل قابلِ اقتدار ہے تو سورۃ توبہ کی اس آیت کو پڑھیے :-

”وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لَابِيهِ اِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَوَّابًا مِنْهُ اِنَّ اِبْرَاهِيمَ لَآوَاهُ حَلِيمٌ“

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے دوست کا دشمن ہو اس سے اظہارِ
بِغَات کرنا حِلِّم کے خلاف نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی نظری حیثیت اتنی ہی ہے۔ اب دوسروں کے جذبات کا
احترام۔ البتہ یہ ضروری شے ہے، لیکن خصل مشہور ہے کہ ”اکرم تکرم“ اکرام کرو
تمہارا بھی اکرام کیا جائے گا۔ تالی دونوں باتوں سے بھرتی ہے۔ اگر کوئی طبقہ اپنی
کثرت کے اعتبار پر خود جس طرح چاہے عمل کرے اور قلت سے اپنے جذبات
کے احترام کا متمنی رہے تو یہ نباہ کی باتیں نہیں ہیں۔

ذاکر حسین

jabir.abbas@yahoo.com

۴۱

مسئلہ خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

سید احتشام حسین صاحب
ایم۔ اے

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

مدیر نگار کے نام ایک خط

محترمی نیاز صاحب تسلیم۔ ایک مدت کے بعد پھر آپ کا کچھ وقت لینا چاہتا ہوں۔

مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق مجھے بھی چند سطریں لکھ کر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت دیجیے۔ اس کا محرک برقی صاحب کا وہ مضمون ہے جو آپ کے یہاں جولائی میں شائع ہوا ہے۔ اس خط میں برقی صاحب کے مضمون کا جواب نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ آپ سے تبادلہ خیال چاہتا ہوں۔ کیا عقل عمومی اسی کا نام ہے جسے برقی صاحب نے پیش کیا ہے؟ کیا قرآن اور تاریخ اسی طرح پڑھنا چاہیے جیسے برقی صاحب نے پڑھا ہے؟ ایک صاحب سے آپ کے اعلان کی خبر مل چکی تھی کہ کوئی علوم مشرقی و مغربی کا عالم اس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہے۔ اس لیے کچھ انتظار بھی تھا۔ اس مسئلہ پر ایک سنجیدہ نقطہ نظر کی بڑی ضرورت ہے اس لیے بڑی امیدوں سے اُسے پڑھا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑی مایوسی ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنی قسم کے بہت سے مضامین کی طرح ایک مضمون ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ”شور“ کے لحاظ سے ”دل“ کو ایک ”قطرہ خون“ پاکر جو مایوسی ہو سکتی ہے وہی ہوئی۔

میں بھی مشرقی و مغربی کا عالم تو نہیں۔ ہاں ایک طالب علم ضرور ہوں

میں اپنی قابلیت اور معلومات کے حدود سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے چاہتا تھا کہ اس مباحثہ میں شریک نہ ہوتا۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ عقل عمومی کے بھیس میں کچھ اور پیش کیا جا رہا ہے تو مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ جب درایت اور عقل کا غلط استعمال دیکھتا ہوں تو مجھے بھی کچھ کہنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ تاریخ اور نفسیات کے ایک متعلم کا نقطہ نظر ہے۔ چاہے وہ شیعوں کے لیے مفید مطلب ہو یا اہل سنت والجماعت کے لیے۔ چاہے اس کے جواب میں دونوں طرف کی گالیاں ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا کہ بڑی صاحب کی طرح قسین کھا کھا کر اپنی بے تعصیتی اور غیر جانبداری کا یقین پڑھنے والوں کو دلا دوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ تعصب اور حنبلیہ داری کا تعلق بعض اوقات شعور کی اس منزل سے ہوتا ہے جس سے ہم خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ میں نے دیکھا اور غالباً آپ نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ کبھی کبھی بڑی صاحب کی لہجہ کی تلخی اور طنز، شعوری یا غیر شعوری طور پر شیعہ جذبات نفرت کا پہلو بہت زیادہ نمایاں ہو کر ان کے دعویٰ خلوص کی غمازی کرنے لگتا ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اب سے دو برس پہلے جب مسئلہ خلافت وامامت پر ہزنام صاحب کا مضمون شائع ہوا تو اس جولائی ہی کے مہینہ میں بڑی صاحب کا ایک مقالہ بھی اس کے جواب میں نکلا تھا۔ میں نے اسے پڑھا تھا۔ اس میں منصب رسالت اور کائنات کی جی کھول کر توہین کی گئی تھی شیعوں کے لیے لکھا گیا تھا کہ سیاست کو مذہب سے علیحدہ جانتے ہیں۔ امام حسنؑ عالم تھے کیونکہ انہوں نے ایک قاتل کو سزا دی اور پھر مضمون ان تاریخی الفاظ پر ختم کیا گیا تھا (اور میں اسے کبھی نہ بھولوں گا) کہ شیعیت اسلام کا

کوئی فرقہ نہیں۔ جولائی ۱۹۳۷ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ جب وہ مضمون میں نے دیکھا۔ آخری جملہ پر میں نے کچھ لکھا۔ پہلے تو یہی خیال تھا کہ نگار میں بھیجوں گا۔ مگر پھر دیر میں شائع ہونے کے خوف سے میں نے ایک دوسرے اخبار میں بھیج دیا۔ (اخبار اسد لکھنؤ) ۲ اگست ۱۹۳۷ء معلوم نہیں وہ آپ کی یا برہمی صاحب کی نظر سے گزرا بھی یا نہیں۔ اس میں میرا ہجر جذباتی ضرور تھا لیکن شاید غیر معقول نہ تھا۔ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے (جس میں کاہلی سب پر بالا ہے) میں پھر اس سلسلہ کا مطالعہ باقاعدہ نہ کر سکا۔ اور صرف دلچسپی لینے والوں سے خبریں ملتی رہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں آپ کے محاکمہ کے بعض اجزاء رجسٹر میں دیکھے لیکن وہ بادل کے سایہ کی طرح دماغ میں رہے۔ جنوری ۱۹۳۷ء کے شمار میں کسی آزاد خیال شیعہ کے قلم سے کوئی مضمون شائع ہوا۔ اس کی بڑی تعریفیں سنیں مگر بد قسمتی سے آج تک پڑھنے پر قارئین در نہ ہو سکا۔

یہ سب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر اس خط میں کوئی ایسی بات لکھ جاوے جو زیر بحث آکر ختم ہو چکی ہو تو اس تکرار پر آپ یا کوئی اور صاحب خفا نہ ہوں مگر جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں اس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس طرح اب تک اس مسئلہ پر ردِ شنی نہ ڈالی گئی ہوگی۔ ورنہ بحث کی زیادہ گنجائش ہی نہ ہوتی۔ میں خود نقل سے زیادہ عقل اور معتقدات سے زیادہ استدلال کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن نقل کو صرف نقل ہونے کی وجہ سے غلط نہیں سمجھتا۔ روایت اور تاریخ کو محض اس لیے نہیں جھٹکا سکتا کہ وہ روایت کیوں ہے اور ہر روایت کو بے اعتبار سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں دیکھتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو ماضی ہمارے لیے بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ یہ اور بات

ہے کہ ہم بعض موجودہ فلسفیوں کی طرح ماضی کی ضرورت ہی سے انکار کر دیں اور گزشتہ زمانہ کی باتوں کا تذکرہ ہی فضول سمجھیں۔ پھر اس حالت میں تو میری اور آپ کی ہر نام صاحب اور برمی صاحب کی ساری کوششیں مسئلہ خلافت کے سلجھانے میں بیکار محض ہوں گی۔ لیکن چونکہ اس بحث میں آپ لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کے مسائل پر تازہ بخ اور تنقید کی روشنی میں کچھ گفتگو کرنا بے وقت کی راگنی نہیں ہے۔ اسی لیے میں بھی اظہار خیال کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ کو واقف ہی ہوں گے۔ لیکن میں دوسروں کے لیے کیوں نہ بتاتا چلوں کہ ۱۹۳۷ء کے بعد فن تارویج نویسی میں ایک اہم انقلاب ہوا۔ کارل مارکس (Karl Marks) اور اس کے شریک کار (Engels) نے فلسفہ تاریخ کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کا نام تاریخی واقعات کی مادی یا اقتصادی ترجمانی

(Materialistic of Economic Interpretation of History)

لکھا اور یہ بتایا کہ کوئی واقعہ اور کوئی تاریخی انقلاب جب کبھی ہوتا ہے اس میں سرمایہ اور مزدوری کی کشمکش، امارت اور افلاس، دولت کی غلط تقسیم اور طبقہ کی جنگ کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہ سکیں مگر اس کا وجود ضروری ہے اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں لیکن اقتصادی اور معاشی سبب بڑھ کی ہڈی کی طرح، تاریخ چند بکھرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں، تاریخ ایک وسیع معنی میں انسانوں کی مادی کشمکش کا مرقع ہے۔ تاریخ چند بڑے آدمیوں کی سوانح حیات بھی نہیں بلکہ انسانیت مجموعی طور پر کہیں عوام و خواص کی جنگ کی شکل میں، کہیں سرمایہ دار اور مزدور کے حقوق کے تعین کی صورت میں متحرک اور لرزاں رہتی ہے چند

موسلمہ زندانوں کی انفرادی خواہشات بعض اوقات بڑی بڑی تبدیلیوں کا سبب بن سکتی ہیں۔ لیکن ایک مکمل تبدیلی کی تہ میں کوئی اہم معاشی یا اقتصادی مسئلہ نہ دیکھا جاتا ہو۔ لیکن یہ سبب ہے۔ سرمایہ دار کی ذہنیت اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک اس کے خون میں ذرا بھی حرارت باقی ہے جب تک کہ اسے بالکل یقین نہ ہو جائے کہ اب وہ دور ہی ختم ہو گیا اور اب کوئی امید پھیلنے کی نہیں۔ عوام جو ہر طرح پریشان رہتے ہیں وہ اور زیادہ دیریں اپنی حالت کا اندازہ کرتے اور تبدیلی چاہتے ہیں۔ لیکن جب یہ پہلے ہی تو دہی انقلاب کے علمبردار بن جاتے ہیں۔

فلسفہ تاریخ کا یہ نیا نظریہ بہت سے لوگوں کو عجیب معلوم ہو گا لیکن جب واقعات اس پر منطبق کر کے دیکھے جائیں گے تو اس کی صحت اور جامعیت کا یقین ہو جائے گا۔ اس نے اس پر ذرا آپ کا زیادہ وقت لے لیا۔ مگر میں آگے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔

شاید معمول جاذب اس لیے ایک اصولی بات اور کتا چلوں، قرآن مجید کو اگر ہم الہامی کتاب مانیں تو کوئی بات ہی نہیں رہتی۔ اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتبیں تو بھی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آیت کے صرف اتنے ہی معنی نہیں ہیں جو اردو ترجمہ میں مولوی نذیر احمد صاحب یا مولوی مقبول احمد صاحب نے لکھ دیے ہیں۔ میں بڑی صاحب کی طرح الفاظ کے ترجمہ ہی کو کافی نہیں سمجھتا۔ کبھی کبھی تشریح اور تفسیر بھی چاہتا ہوں جب یہ پڑھتا ہوں کہ قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم ہے تو میں یہ بھی جانتا چاہتا ہوں کہ کس طرح پڑھوں اور یہ مجھے قرآن میں نہیں ملتا۔ میں جب یہ پڑھتا ہوں کہ رسولؐ نے ایک ساتھی کے ساتھ ہجرت کی تو واقعہ کی تفصیل اور ساتھی کا نام بھی جانتا چاہتا ہوں۔ اور وہ قرآن میں موجود نہیں۔ میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ رسولؐ کی کسی فتح کے لیے "فتح مبین" کے الفاظ استعمال کیے گئے تو ایک تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کی

حیثیت سے میں وہ موقع جاننا چاہتا ہوں۔ بڑی صاحب نہ جانے کیوں اس پر مصر ہیں کہ الفاظ قرآن میں علیؑ کی خلافت کا ذکر نہیں آیا ہے۔ انہیں اختیار ہے کہ آیات کو مانیں یا نہ مانیں۔ کیونکہ ان میں علیؑ کا نام نہیں آتا۔ وہ ماننے پر بھی مجبور نہیں کیے جاسکتے۔ لیکن یہ آپ پر چھو کہ وہ تاریخی واقعات سے کیوں انکار کرتے ہیں جبکہ وہ شیعوں کی گھڑی ہوئی روایتیں نہیں بلکہ علمائے اہل سنت کی تحریروں میں موجود ہیں۔

بہر حال ان مبادیات کی روشنی میں ہمیں اس مسئلہ کو دیکھنا ہے۔ میں پھر پہلے حصہ کی جانب آجاتا ہوں کہ فلسفہ تاریخ سے کام لے کر ہمیں اسلام کی ابتدا اور اشاعت پر غور کرنا چاہیے۔ اسلام کی موجودہ شکل رسول مقبولؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی اور سب سے پہلے عرب میں وہ اصطلاح میں تو مذہب تھا لیکن عالم انسانیت کے نام آزادی اور امن و امان کا ایک چارٹر تھا، سیاست، معاشرت اور روحانیت کا یہ نظام تیرہ سو سال قبل ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہوتا ہے۔ اسے ہم ایک طرح کی اشتراکیت کہہ سکتے ہیں جو موجودہ اجتماعیت اور اشتراکیت کی طرح بہت زیادہ انتہا پسند تو نہیں لیکن اس سے مماثل ضرور ہے۔ حریت، مساوات اور آزادی کا یہ پیام دنیا کے سامنے بالکل نیا تھا۔ افلاطون، تھینک کے ذور پر دنیا کو ایک حسین نظام ضرور دے چکا تھا لیکن رسولؐ اپنے عمل اور کردار سے اپنے فلسفہ حیات اور طریق معاشرت سے دنیا کو بالکل نئی چیز دے رہے تھے اگر سختی سے دیکھا جائے تو رسولؐ کو صرف ۲۳ برس کی مدت ملی جس میں انہیں حرب کے بہت سے بتوں کو نیت و نابود کرنا تھا۔ پتھر کے بُت جو طاقِ کعبہ میں تھے وہ تو آسانی سے گر سکتے تھے لیکن جو دل میں گھر بنا چکے تھے ان کا ڈھانپنا بھی رسولؐ کا فرض تھا۔ عربوں کو ایک مشترک دشمن کے مقابلہ میں جاکر کھڑا کر دینا آسان تھا، لیکن ان کے دلوں سے قبیلہ پرستی اور شخصی امتیازات کا مٹانا کھیل نہ تھا۔ رسولؐ نے ان میں یکجہت اور یکجہتی کی روح پھونکی، قبیلہ پرستی پر کاری ضرب لگائی، انسانی امتیازات کی بنیاد اکھاڑ دی۔

وہ امیر اور غریب سب کو ایک سطح پر لا کر انسانیت کو بلند کرنا چاہتے تھے وہ ایک ایسی دنیا چاہتے تھے جہاں کوئی مخصوص طبقہ نہ ہو۔ بلکہ صرف کارآمد اور مفید انسان ہوں مختصر یہ کہ وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے اور اسے خدا کی جانب سے اپنے اوپر ایک فرض سمجھتے تھے۔ رسولؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی گردنیں جھک گئیں قبیلہ اور نسل کا تفوق مٹنے لگا۔ اور بزرگی کی علامت یہ رہ گئی کہ جو خدا سے جتنا زیادہ ڈرتا ہے اتنا ہی شریف ہے۔ تاریخ ایسے کم انسان پیش کر سکتی ہے۔ جو اتنی مدت میں اس قدر کامیاب رہے ہوں۔ عرب کی وحشت و بربریت صدیوں کی خود دانہ فہمیت کا اندازہ لگائیے اور محمد عربیؐ کے کام پر نظر ڈالیے تو یہ معلوم ہو گا کہ وہ اسلام کو صرف اپنی زندگی تک کے لیے نہیں بلکہ آنے والی دنیا کے لیے ایک برکت و بہبود کی چیز سمجھ کر پھوڑنا چاہتے تھے۔ وہ خود تو کامیاب رہے مگر ساتھ ہی اس کامیابی کو مستقل شکل دینے کے لیے یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کا نظام قائم رہے بالکل اسی طرح لوگ نسلی امتیاز شخصی جاہ و نمود سرمایہ داری اور امیرانہ تفوق سے نفرت لیں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ پھر یہی چیزیں عرب میں پیدا ہو جائیں جس طرح رسولؐ کا اس دنیا سے اٹھ جانا ضروری تھا۔ (چاہے کسی کو یقین ہو یا نہ ہو) اسی طرح اسلام کا اصلی شکل میں باقی رہنا اور دنیا کے لیے ایک پیام ربانی کی حیثیت سے باقی رہنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے رسولؐ کے پیش نظر اپنی یا کسی کی زندگی سے زیادہ خدا کا پیام عزیز تھا۔ اسلام سے زیادہ انھیں کسی سے محبت نہ تھی۔ رسولؐ کسی شخص کی کامیابی اور خلافت سے زیادہ اپنے مقصد کی کامیابی چاہتے تھے۔ اور اس کے مستقبل کے لیے انھیں انتظام کرنا تھا۔

اس وقت یہ بحث پھیڑنا بیکار رہے کہ رسولؐ عالم الغیب تھے یا نہیں۔ ان سے عطی ہو سکتی تھی یا نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ معمولی معمولی تاریخ کے جمانے والے اور

واقعات کی رفتار سے دلچسپی لینے والے بہت آگے کے واقعات صحیح صحیح بتا دیتے ہیں رسول عربؐ نے اپنی زندگی ہی عربوں کے مطالعہ میں صرف کر دی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں کس طرح سدھارا جاسکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ عربی ذہنیت میں کس طرح انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہی ہوں گے کہ بہت سے لوگ کس طرح محض ضرورت وقت کے لحاظ سے اسلام قبول کر رہے ہیں، وہ حقیقتاً مارا ستین ہیں، وہ موقع ملنے پر رسولؐ کے سارے نظام کو الٹ دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کریں گے وہ ان لوگوں سے نادانیت نہ تھے جو اسلام کی حقیقت سے بے خبر ہو کر کسی مصلحت سے اس جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔ وہ ان سے بھی واقف تھے جن میں روح اسلام پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھی۔ وہ اپنے اعتماد کی قدر و قیمت جانتے تھے اور اپنے سچے ساتھی تلاش کرنے میں کوئی اہم غلطی نہ کر سکتے تھے۔ جب کوئی انقلاب شروع ہوتا ہے تو قدم چھونک چھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ دوس میں صرف اشتراکیوں کو اہم جگہ پر رکھا جاتا ہے۔ جرمینی میں نازی ہی سب سے قابل اور لائق ہیں۔ کیونکہ وہی سٹیل کے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ اٹلی میں فاسسٹوں کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ فاسسٹی نظام کے بقا کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ذہنیت بنانے کے لیے ایک اچھی مدت درکار ہے۔ الدین کا چراغ اس سلسلہ میں کام نہیں آسکتا۔ رسولؐ بھی اسی پر عمل کر رہے تھے اور غالباً ہر ذی ہوش یہی کرے گا۔ عرب میں پریس اور پروپیگنڈے کی آسانیاں نہ تھیں اور رسولؐ کو مساوات، اخوت اور آزادی کا بیج بوائے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا اس لیے اسی پالیسی کے تسلسل (Continuity) کی ضرورت تھی۔ ابھی عوام کی ذہنیت اپنے پرانے رنگ پر فریفتہ تھی۔ ابھی وہ اپنے سرداروں کے ہاتھ میں تھے۔ ابھی ان کی آنکھیں اپنے قبیلوں کے رہنماؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ کم لگ ایسے تھے جنہوں نے اسلام کی بھی روح کو سمجھا تھا۔ رسولؐ کو کام جاری رکھنے کے لیے ایک اپنے جیسے انسان کی تلاش تھی۔

میں بزنی صاحب سے اس معاملہ میں متفق نہیں کہ رسولؐ نے کبھی علیؑ کی خلافت کا ذکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ میں آپؐ کی تحقیق کی تائید کرتا ہوں۔ ایک سے زیادہ مواقع ایسے آتے ہیں جہاں رسولؐ کا فشاء و صاف صاف علیؑ کو خلیفہ بنانے کے متعلق ظاہر ہوگا۔ غالباً بزنی صاحب آزاد خیال ہونے کی وجہ سے اسے بُرا سمجھتے ہیں کہ رسولؐ ہی کے خاندان کا کوئی شخص رسولؐ کا خلیفہ ہو۔ لیکن اس کی کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی کہ کیوں نہ ہو۔ علیؑ کو اپنا جانشین بنانے میں نسلی امتیاز اور کتبہ پروری کا جذبہ کارفرما نہ تھا۔ یہ داماد کی محبت بھی نہ تھی (کیونکہ بقول حضرات اہل سنت حضرت عثمانؓ بھی تو داماد تھے اور پھر دوہرے! ان سے محبت کے اظہار میں یہی سلوک کیا ہوتا)۔ یہ بھائی کا خیال نہ تھا، یہ بنی ہاشم کو بڑھانے کی ہوس نہ تھی جن چیزوں سے دُرُکِ بزنی صاحب تمام تاریخی حقائق سے انکار کیے دیتے ہیں، اُن میں سے کوئی نہ تھا۔ انھیں یہ خیال ہے کہ اگر ہم علیؑ کو خلیفہ مان لیتے ہیں تو نبی پر کتبہ پروری کا الزام آجائے گا۔ یہ رسولؐ سے انکارِ محبت کا بہت غلط طریقہ ہے کیونکہ غیر جانبدار تاریخ پڑھنے والے اور یورپین مورخ یہ تو مانتے ہی ہیں کہ رسولؐ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ چاہے اس کے بعد وہ یہ بھی لکھ دیں کہ علیؑ میں خلافت کی اہلیت نہ تھی۔ ان کی تحقیقات کا پہلا حصہ تاریخی حقیقت ہونے کی وجہ سے ماننا چاہیے اور دوسرا انکڑا محض رائے ہونے کی وجہ سے قابلِ بحث و نظر ہے۔ اس وقت انکی قابلیت کا سوال بھی اچھی نہیں ہے۔ پہلے تو یہ طے کرنا ہے کہ رسولؐ علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے بھی تھے یا نہیں۔ تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ مسلمان مورخوں کی زیادہ تر کتابیں اور غیر مسلم مورخین کی کم و بیش تمام کتابیں اس اعتراف سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بزنی صاحب اس سے کیوں انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ آپؐ نے اور ہر نام صاحب نے اس کے کافی ثبوت بہم پہنچا دیے ہیں۔ اگر اس موقع پر بزنی صاحب کے خیالات کی نفسیاتی تحلیل کر دی جائے تو زیادہ غیر سوزوں نہ ہوگا۔ اُن

کو یقین ہے کہ رسولؐ نے علیؑ کے خلیفہ بنانے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ اسے یوں سوچنے میں آئے ان لیا جائے یا اس سے انکار کیا جائے۔ پہلی صورت وہ صحیح مان ہی نہیں سکتے کیونکہ شیعہ بھی یہی کہتے ہیں اور وہ اس غیر مسلم فرقہ کے مہنوا نہیں ہو سکتے (ملاحظہ ہو ان کا مضمون جو لائی ۱۵۵ ع) لہذا انکار ہی پر سارا زور استدلال صرف کر دینا چاہیے شیعوں سے دامن بچانے کے لیے انھوں نے تاریخی حقائق بھی پس پشت ڈال دیے۔ اس کے لیے انھیں نسلی امتیاز اور مطلق العنان حکومت کے نظریے قائم کرنے پڑے۔ انھوں نے یہ نہ سوچا کہ علیؑ کا خلیفہ ہونا صرف شیعوں کا عقیدہ نہیں بلکہ رسولؐ کی خواہش کی تکمیل ہے۔ بغیر یہ تو حکمہ مغترضہ تھا حقیقت یہ ہے کہ بزعی صاحب تمام دنیا کے مومنین کے خلاف اب تیرہ سو برس بعد ایک نئی بات کہہ کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ رہا علیؑ کی اہلیت کا سوال۔ میں اس کی طرف اشارے کرتا ہوں گا۔ میرا مسئلہ مضمون سرفراز لکھنؤ تیرہ جیب ۳۵۵ میں موجود ہے وہ دیکھا جاسکتا ہے۔

اگر مجھے معاف کیجیے تو میں یہ کہوں گا کہ فاضل مضمون نگار فلسفہ تاریخ اور سیاست کے بادیات سے بھی چشم پوشی کرنا چاہتے ہیں۔ علیؑ کے خلیفہ ہونے میں اسلام کا کوئی اصول نہیں مٹتا کہ وہ رسولؐ کے منشا ہی پر پردہ ڈال رہے ہیں میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ علیؑ اور اولاد علیؑ کے خلیفہ ہونے میں اسلام سے کوئی انحراف نہیں ہوتا۔ وہ تو علوم شرعی و مغربی کے عالم ہیں۔ انھیں مشرق کی تاریخ کو مغرب کے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ تاریخی حقائق جھٹلانے سے اسلام کی برتری ثابت نہیں ہو سکتی۔ نئی تاویلات قائم کر کے عقل عمومی کہہ کر بیش کرنا کمال نہیں بلکہ واقعات کی صحت اور غلطی پر حکم لگا کر بزدلوں کی غلطی (اگر کوئی ہوئی ہو) کا مان لینا ہی اسلام کی صداقت کو روشن کر سکتا ہے۔ رسولؐ کے منشا کو منشا نہ سمجھنے سے بہتر یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے جذبات و خواہشات عقل کی گسٹری پر رکھ لیے جائیں کہ انھوں نے ایسا کیوں نہ ہونے دیا۔

میں کتابوں کے رسول اپنے بھائی کو مسلمانوں کا رہبر دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے معقول وجوہات تھیں۔ مذہبی سیاسی اور نفسیاتی۔ علیؑ ہی کے خلیفہ بننے میں اسلام کی بہتری تھی۔ اسی طرح رسولؐ کی حکمت عملی کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ اسی طرح عوام کی داخلی اصلاح ہو سکتی تھی۔ کچھ دنوں تک اس کی ضرورت تھی۔ سیریا، ایران اور یروشلم کچھ دن بعد فتح ہو سکتے تھے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کا پیغام پہنچنا ضروری تھا تو اس کے دوسرے ذرائع ہو سکتے تھے۔ پہلے جتنے لوگ اپنے پاس تھے انھیں حقیقی اسلام سے باخبر کر کے ان عظیم الشان جمہوریت کا ممبر بنانا تھا جو آزادی اور سادات کی پیامبر تھی پھر بعد میں دوسری جگہ کے لوگ بھی اس سے اچھے طرح واقف نہ ہوتے (اس موقع پر اسٹالن اور ٹراٹسکی کے سیاسی عقائد کے تنبیہ کی جا سکتی ہے) علیؑ کی شکل میں دنیا کے سامنے وہ شخص پیش کیا گیا تھا جس سے اسلام سے غداری کا امکان نہ تھا۔ علیؑ میں کوئی خرابی نہ تھی۔ ان کی ساری عمر انقلاب پیدا کرنے والے کے ساتھ گزری تھی۔ اور کہیں بھی رسولؐ نے ان کی وفاداری پر شک نہیں کیا۔ جہاں اعتماد کی سب سے بڑی ضرورت تھی (ہجرت کی رات کو بستر پر تلواروں میں سونا) وہاں انھیں پر بھروسہ کیا۔ علیؑ سب سے زیادہ رڑائیوں میں شریک رہ کر اسلام کی حفاظت کرتے رہے۔ ہاں جب رسولؐ کے بعد کی رڑائیاں و فارغ سے سر ہٹ کر جابرہ بن گئیں تو علیؑ تعاون نہ کر سکے۔ اور اس فتنہ اعظم کی تلوار مدت تک زندگ آلود ہو گئی تھی۔ انھوں نے رسولؐ کی جانب سے صلح نامے لکھے۔ انھوں نے مختلف ممالک کو فتنہ بھیجتے ہوئے رسولؐ کی طرف سے خط لکھے۔ انھوں نے مین جا کر اسلام کا پیغام اور آیات قرآنی پہنچائیں۔ انھوں نے رسولؐ کے افعال اور کردار کی پیروی اس طرح کی جیسے اونٹ کا بچہ اپنی ماں کی پیروی کرتا ہے (بقول علیؑ) رسولؐ کے بعد ان سے غداری نہ ہوئی کیونکہ یہ ان کی فطرت ہی میں نہ تھی۔ وہ اصول اسلام سے اختلاف نہ کر سکتے تھے۔

چاہے انھیں مسلمانوں سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہو جانے پر جب ابوسفیان علیؑ کی طرفداری میں مدینہ کی گلیاں ہواؤں اور پیادوں سے بھر دینے کا وعدہ کر رہے تھے تو علیؑ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ابوسفیان (اسلام کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس نے انقلاب میں جسے ہم اور آپ اسلام کہتے ہیں رسولؐ کے بعد علیؑ کا ہاتھ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ وہ اس کے معمولی سے معمولی اجزاء سے واقف تھے۔ پھر اگر ان کے لیے کچھ کہا تو کیا بُرا کیا؟

اسے دوسری طرح بھی دیکھیے، رسولؐ کس کے خلیفہ ہونے میں عالم اسلام اور انسانیت کا بھلا دیکھ سکتے تھے۔ گنتی کے نام میں۔ ہم انھیں دمنٹ میں دیکھ سکتے ہیں حضرت ابوبکرؓ بڑے تھے، اور رسولؐ کے ہم عمر، ہجرت میں رسولؐ کے ساتھ مومنوں کے علاوہ ان کا کوئی ایسا زبردست کارنامہ نہیں جس سے ان کی علمی، سیاسی یا علمی قابلیت کا پتہ چل سکے۔ حضرت عمرؓ اپنے انتہائی انہماک اور جوش کی وجہ سے مقاصد اسلام کی ترویج کے لیے وہ ذرائع اور حکمتیں اختیار نہ کر سکتے تھے جو رسولؐ کا منشا تھا۔ وہ مسلمان تو بہت بنا سکتے تھے لیکن روشنی اسلام دھندلی ہوتی جاتی تھی مسلمانوں کی یہ زیادتی غیر منہضم غذا کی طرح تھی مفتوح ممالک کے زیادہ تر لوگ یوں ہی مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے فلسفہ اسلام کی خوبیاں نہ تھیں۔ رسولؐ کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں اور حضرت عمرؓ کی لڑائیاں ملک گیری کے جذبات سے معمور تھیں۔ رسولؐ ایک نفسیات کے جانتے والے کی طرح حضرت عمرؓ کی یہ صلاحیتیں چارچھ سال پہلے دیکھ سکتے تھے۔ حضرت علیؑ عمرؓ کم ہونے کے علاوہ مجموعی حیثیت سے سب سے زیادہ رسولؐ کے مشابہ تھے۔ رسولؐ انھیں پر زیادہ بھر دے رکھتے تھے بڑی صاحب نہ نائیں گے ورنہ بہت سی حدیثیں پیش کرتا جو رسولؐ کی زبان فیضِ زمان سے علیؑ کے لیے نکلیں اور جنھیں نبی امیہ کے ستر ہزار ممبروں اور مسجدوں کے پردیگنوں سے بھی

نہ مٹا سکے۔ رسول غلط یا صحیح علیٰ کسب سے زیادہ اہل جانتے تھے۔ اور انہیں کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اہل عرب کو اسلام کی تعلیمات سے اچھی طرح باخبر بنا سکیں، انہوں نے مساوات سے سرشار کر دیں، میں پھر کہتا ہوں کہ ابھی رسول کی پالیسی کے جاری رہنے کی بڑی ضرورت تھی۔ معمولی سی تبدیلی بھی عوام کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر دوسری طرف لگانے کے لیے کافی تھی۔ مثال کے طور پر لیجیے۔ رسول کے زمانہ میں باقاعدہ فوج نہ تھی۔ ہر مسلمان (ہر وہ شخص جو اس انقلاب کا حامی تھا) اپنی عمر کے لحاظ سے فوج کا سپاہی تھا۔ اور ضرورت کے وقت کہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ آج کل بھی روس وغیرہ میں ہر شخص سپاہی ہے، حضرت عمرؓ نے اسلام کو ایک عسکری نظام دیا۔ اور اسے مولانا شبلی مرحوم نے بہت خاص طور پر پیش کیا ہے۔ میں اس تبدیلی کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ اب گویا اسلامی جماعت، باقاعدہ ایک سرمایہ دار اور استعماریت پسند حکومت بن گئی تھی جو اہل عالم پر عرصہ زندگی تک کر سکتی تھی۔ رسولؐ اپنی پالیسی کو جاری رہنا چاہیے تھا۔ اور علیؓ سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا۔ رسولؐ کے اس منشا کو عرب کے لوگ نہ سمجھ سکے اور غالباً اس ابتدائی حالت میں سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ مگر مجھے تو رونا اس کا ہے کہ ہم آج بھی جبکہ دنیا نے ترقی کی بڑی منزلیں طے کر لی ہیں اس اعتراض سے گھبراتے ہیں۔ عرب کے عوام رسولؐ کی اس مصلحت سے بے خبر تھے، وہ عرب کے سربراہ درودہ حضرات کو سرداری پر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں اہلیت کا سوال نہ تھا بلکہ رسولؐ کے اٹھتے ہی ان کی نگاہیں بڑے بڑے قبیلوں کے بوڑھے سرداروں کی طرف اٹھ گئیں اور جس بے لوث اور پرجوش طریقہ پر رسولؐ نے قبیلہ پرستی پر تیشہ زنی کی تھی اور اسے اپنی سیاسی پالیسی بنا رکھا تھا وہ منسل طریقہ پر ذہن نشین نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کو یہ دھوکا ہرگز نہ کھانا چاہیے کہ اسلامی جمہوریت کے لیے اس وقت انتخاب ضروری تھا۔ اگر انتخاب انتخاب کی طرح ہوتا تو کوئی رونا نہ تھا، عوام پر یہ مسئلہ رسولؐ نے چھوڑ دیا ہوتا تو کوئی بات

نہ تھی۔ مگر ہاں تو تھوڑے سے لوگ عوام کی باگ باٹھ میں مکتھے تھے جب ان سرداروں نے ایک رائے قائم کئی تو عام افراد نے بھی اسی کو منظور کر لیا۔ ان کی نہ تو انفرادی رائے تھی اور نہ وہ رائے کے قابل سمجھے گئے۔ ہمارے سامنے تاریخ وہ چند نام پیش کر دیتی ہے جنہوں نے حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اس کے بعد عوام ساتھ ہو گئے۔ یہ انتخاب کوئی جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے نہیں کیا جا رہا تھا۔ بلکہ رسولؐ کا منشا بدلنے اور فیصلہ مسترد کرنے کے لیے پہلے ہی روز انصار و مہاجرین کی تفریق پیدا ہو گئی اور مقصد رسولؐ کی توحید کرنے والے اسلام کی روح سے لوگوں کو آشنا بنانے والے کی تلاش نہ ہوئی۔ **۱۔ ابن اثیر اور طبری** دونوں میں مل جائے گا کہ انصار و مہاجر کے اس جھگڑے میں حضرت ابو بکرؓ نے اٹھ کر کہا کہ قریش پر قریش کے علاوہ کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔ اگر نیسویں امتیاز اور ذاتی تفوق نہ تھا تو اور کیا تھا؛ حضرت ابو بکرؓ کے پد بزرگوار نے اس انتخاب کی خبر سن کر پہلا سوال یہی کیا تھا "کیا بنی عبد شمس اور بنی مغیرہ اسے مان جائیں گے؟" دیکھیے عام افراد کے ذہن کتنی تیزی سے قبیلوں کی طرف اب بھی جاتے تھے۔ بنی عبد شمس اور بنی مغیرہ دونوں مسلمان تھے۔ لیکن جناب ابوقحافہ کو اندیشہ تھا (سیوطی)، اور پھر اگر یہ انتخاب کا سلسلہ بھی باقی رہتا تو ایک بات ہوتی۔ مگر حضرت ابو بکرؓ کے بعد پھر وہی نامزدگی ہوئی جس سے جمہوری دماغ گھبراتے ہیں۔ افسوس ہے کہ علیؓ کی نامزدگی کو تو آپؐ رسولؐ کا ایک ووٹ کہہ کر ختم کر دیں اور حضرت عمرؓ کی نامزدگی پر ایک لفظ نہ کہیں! کیا حضرت عمرؓ کا نامزد ہونا مطلق العنانی کے سوا کچھ اور تھا؟

آپؐ نے کسی جگہ پر خود دو وجہیں لکھ دی ہیں جو علیؓ کی دشمنی کا سبب بن گئیں میں دو ایک کا اور اضافہ کرتا مگر وہی کیا کم میں جو آپؐ نے لکھ دیں۔ میں آپؐ سے متفق ہوں

رسولؐ کا اپنے مشن کی کامیابی کے لیے کسی اور کا نام لینا ممکن نہ تھا اور یہ نام لینا جذباتی نہ تھا۔ بلکہ اس کے سیاسی وجود بھی تھے۔ اس انقلاب کی تکمیل اسی طرح ہو سکتی تھی۔ اگر رسولؐ علیٰ کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچتے یا بالکل نام ہی نہ لیتے تو ہم یہ سمجھتے کہ رسولؐ نے اسلام کے استحکام اور اپنے سیاسی اور مذہبی روحانی اور معاشرتی نظام کی بقا کے لیے کچھ نہ کیا۔ اگر اسلام بجا مذہب تھا اور اس کی اشاعت محمد عربیؐ اپنا فرض سمجھتے تھے، تو اُسے پھیلنا چاہیے تھا۔ چاہے اس پر جمہوریت کے چترِ رادنی اصول قربان ہی ہو جائیں کیونکہ وہ تو مردِ زان بننے لگے رہتے ہیں اور مقصدِ دل کی کامیابی کے لیے ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ میرے اس جملہ کی صدائے بازگشت، آپ کو لینن اور ٹراٹسکی کی تحریروں میں سنائی دے گی۔ اور ایک عملی مثال حضرت عمرؓ کی نامزدگی میں ملے گی۔

ہلہٗ بانیّت کی ترقی کے لیے مرث گو فونگ اور گونسلس پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ عوام کی ذہنیت سے اسے خطرہ ہے اس لیے ان پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ رسولؐ عوام کی لاعلمی سے ناواقف نہ تھے۔ وہ اتنا بڑا کام غیر تعلیم یافتہ طبقہ اور اسلام کی حقیقت سے بے خبر عوام پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ اپنی اچھی سے اس شخص کی جانب اشارہ کرتے جائیں جو سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔ اور انھوں نے یہی کیا بھی۔

رسولؐ کا یہ تعیین خلافت اور نامزدگی نتائج کے لحاظ سے بہت بڑی باتیں ہیں کیا آپ پر نشانے رسولؐ سے اس اخراجات کا اثر واضح نہیں؟ حضرت ابو بکرؓ کا زمانہ رسولؐ سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے کسی قدر خاموش تھا۔ اگرچہ سوادِ دہس کی مدت میں بغاوتیں بھی ہوئیں اور اسلام کی خدمت بھی۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے قدم بھی جما دیے اور علیؓ اور فاطمہؓ کی توہین بھی کی گئی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اسلام کی خدمت پر کمر باندھی لیکن ملک گیر شروع ہو گئی۔ بدو عربوں میں اسلام کے مقاصد کے خلاف سرمایہ داری اور مشنِ تجارت کا شروع ہوا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بنی امیہ نے اپنا پورا سر زمین اسلام پر مضبوط طور پر لگایا۔ ممکن ہے آپ یا بزجی صاحب بنی امیہ کے اس دخل کو نظر انداز کر جائیں لیکن نتائج پر نظر کر کے میں اسے بہت اہم سمجھتا ہوں۔ بنی امیہ کی نسلی ذہنیت کو اپنے تصور میں رکھ کر تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجیے۔ رسول کو ان لوگوں سے نسلی یا ذاتی دشمنی نہ تھی۔ وہ صرف ظاہر داریوں پر نہ جاتے تھے۔ ان کی تیز نگاہ باطن کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ وہ بنی امیہ میں اپنے سیاسی اور معاشرتی نظام سے اختلاف کرنے کی پوری قوت دیکھ رہے تھے۔ اس لیے ہمیشہ ان سے بچنے کی تاکید کرتے تھے۔ مگر مئے کون؟ اور پر عمارت بنتی جا رہی تھی مگر بنیادوں میں دھبہ اپنا کام کر رہے تھے۔ حضرت عثمان کی خلافت کا پوچھنا ہی کیا! زمین اور آسمان سب کچھ بنی امیہ کا تھا۔ اور جب بنی امیہ کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اسلام کو اسلام ہی کے خلاف آلہ کار کے طور پر اسلام کرنا چاہتے تھے۔ جنہیں حصول جاہ کے سامنے اسلام کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اور یہ بنی امیہ ہی ہیں۔ اگر آپ کو میری بات ماننے میں تامل ہو تو ڈوزی یا پردیسر براؤن میوور یا کسی اور یورپین صاحبِ قلم کی تصنیف دیکھ لیجیے۔ وہ سب مجھ سے متفق ہیں کہ اسلام کی باگ کا بنی امیہ کے ہاتھ میں آنا حقیقتاً اسلام کی شکست اور پرانے عربی طرز معاشرت کی فتح تھی۔ رسول اسلام کو اسی چیز سے بچانا چاہتے تھے۔ علی کے سوا اسے کسی نے نہ سمجھا تھا۔ مسلمانوں کا جھنڈا ایوان اور شام میں لہرائے یا اسپین اور مصر میں، مگر رسول کے حقیقی مقصد سے بے خبری قدم قدم پر ظاہر ہو رہی تھی۔ ردیہ تھا، دولت تھی، قہر و کسریٰ کی شان، شکوہ تھی، فوجیں تھیں، لیکن اسلام نہ تھا۔ صرف ایک ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا روح مردہ ہو چکی تھی۔ مسادات اور اخوت کی کمی کو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی

سادہ زندگی نے پرانا نہ کیا۔ رسولؐ ان چیزوں کو کچھ دل پہلے سے دیکھ رہے تھے۔ اور اس کے لیے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ وقتِ نظر کافی تھی۔ ان تبدیلیوں سے بچانے کے لیے رسولؐ نے علیؑ اور آلِ علیؑ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تھا۔ اسی لیے وہ اپنا اعتماد ان لوگوں کو سونپنا چاہتے تھے۔

معلوم نہیں بڑی صاحبِ عقل عمومی کو بیچ میں لاکریوں بدنام کر رہے ہیں وہ کیوں اسے نسلی استیلاز سمجھتے ہیں۔ وہ اسے اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ جو رسولؐ کے مقاصد کو سب سے اچھی طرح اجاگر کر سکے وہ خلیفہ ہو۔ رسولؐ کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ ان کے خاندان والے اس کے سب سے زیادہ موزوں ہوں گے۔ انھوں نے کہہ دیا اور دنیا اسے جھٹلا نہ سکی۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان کے خاندان کے لوگ کم سے کم بارہ پشت تک دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ جس وقت وہ تھے ان کے مقابل میں کوئی دوسرا نہ آسکتا تھا یہ اور بات ہے کہ انھیں موقع نہ ملا اور ان کی عمریں قید خانوں کی تاریکیوں میں ختم ہو گئیں۔ یہ تو کسبہ پروری اور نسلی تفوق نہ ہو بلکہ ایک بہت بڑی بات ہوئی اور وہ یہ کہ جو سب سے زیادہ اہل ہو وہی میرا جانشین ہو۔ انھوں نے دوسری طرح کہا کہ میرے خاندان کے لوگ میرے جانشین ہوں گے۔ کیونکہ وہی اس کے اہل ہیں۔ صرف کسی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دشمنی کا پیدا ہو جانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ ایک مدت مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جس میں الکاحیال تھا کہ اسلام کی روح اور حقیقت عوام کی سمجھ میں آجائے گی۔ اور وہ ان کے مطالعہ وقت کے حساب سے بارہ پشتوں تک جاتی تھی۔ غالباً یہ مدت ایک انقلاب کی کامیابی کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس لیے انھوں نے بارہ خلفائوں کا تذکرہ بھی کر دیا۔ بڑی صاحبِ اسے غور سے نہیں دیکھتے اور اگر دیکھتے ہیں تو کہنا نہیں چاہتے۔ بلکہ حسد

پیش پا افتادہ الفاظ سے کام لے کر جن سے آج نفرت کی جاتی ہے۔ رسول کے اس اہم فیصلہ کی وقعت۔ پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں۔ نسلی استیلا اور خاندانی تفوق غلطیت پرستی اور قبیلہ پرستی کا اسلام دشمن تھا، لیکن قابلیت اور عمل کا نہیں اہلیت اور علم کا نہیں، رسولؐ اس پرست کو دیکھتے تھے الفاظ کو نہیں، برتری صاحب الفاظ کو دیکھتے ہیں، وہ اس پر قائم کرتے ہیں کہ رسولؐ کے خاندان کے لوگ خلیفہ کے جلتے ہیں اس پر نہیں روتے کہ رسولؐ کے مرتے ہی پھر قبیلہ پرستی یعنی بھیانک شکل میں آگئی وہ اس پر افسوس کرتے ہیں کہ رسولؐ نے اپنے خاندان کے قابل افراد کا نام کیوں لے لیا۔ انھیں اس کا رنج نہیں کہ تخت خلافت پر کیسے کیسے لوگ جلوہ افروز ہوئے، اور اسلام کی کیا شکل ہوگئی کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے حقوق کا سلب ہو جانا عصر حاضر میں سمجھ میں آنے کی بات نہیں، میں پھر عرض کرتا ہوں کہ رسولؐ کا منشا علیؑ کو اپنا جانشین بنانے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ اپنی پالیسی کا تسلسل چاہتے تھے عرب کے لوگوں نے علیؑ کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ وہ دوسری طرف جانا چاہتے تھے۔ اور خلفائے اسلام انھیں اسی طرف لے گئے۔ رسولؐ عوام پر بھروسہ نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ان میں ذہنی بیداری اور سیاسی عقل نام کو نہ تھی۔

رسولؐ کے اس منشا کو الوہی خلافت سمجھا جائے۔ اس پر میں کچھ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ میرے پیش نظر قرآن کی وہ آیت ہے جس میں صاف لکھا ہے کہ رسولؐ کا ہر کام خدا کے حکم کے بعد ہوتا ہے۔ وما یَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی۔ اگر ہم قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہیں تو رسولؐ کا الہی پیام ہونا بھی ممکن ہے اور علیؑ کا الوہی خلیفہ بھی۔ ورنہ یہ بحث ہی باقی نہیں رہتی۔ جب قرآن حُسنِ اِکلام ہی نہیں تو پھر نہ کوئی خدا کا رسولؐ ہے اور نہ الہی خلیفہ۔

۔۔۔ بزنی صاحب نے ایک دلچسپ مگر غیر ضروری بحث اور چھیڑ دی ہے۔ انھوں

نے ڈکٹیٹر "Dictator" یعنی آمر اور آٹو کریٹ رولر "Autocrat Ruler" یعنی مطلق العنان بادشاہ کا جو امتیاز پیش کیا ہے وہ ان کے وسعت مطالعہ کا پتہ دیتا ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سیدھے سادے مسلمان کو ان چیزوں سے مرعوب کرنا کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اسلام کے حلقہ کار کو نہ تو ڈکٹیٹر بننا تھا اور نہ آٹو کریٹ رولر۔ وہ جو کچھ بن جائیں یہ دوسری بات ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی سیاست کا تعلق ہے وہ ڈکٹیٹر نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ عوام کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے، بلکہ اپنی قوت عمل اور علم سے عوام کو اس سطح پر لانے پر مامور تھے، جہاں اسلام ہر فرد بشر کو لے آنا چاہتا ہے۔ وہ آٹو کریٹ رولر بھی نہ تھے کیونکہ ان کے لب و لہجہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون نہ بن سکتے تھے۔ ان کو قانون (قرآن) اور احادیث رسول کا پابند ہونا بھی ضروری تھا۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ علیؑ اور آل علیؑ بارہ پشتوں تک کے لیے رسولؐ کے حکم کے مطابق ایک انقلاب کے حامی اور کارکن بن کر مطلق العنان بادشاہ نہ بن سکتے تھے، اور نہ رسولؐ ابد الابد تک نسلی امتیاز قائم کر گئے تھے۔ اسلام ترقیوں اور تبدیلیوں سے نہیں روکتا۔ لیکن اسلام اسلام کو مٹانے سے ضرور روکتا ہے۔ بڑی صاحب نے اور بہت سی باتیں ضمناً کہی ہیں جو جواب چاہتی تھیں۔ لیکن میں اُنکے مضمون کا جواب نہیں بلکہ آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ یہ تو ان کا مضمون پڑھ کر بعض خیالات کے پیدا ہونے پر جی چاہا کہ آپ ہی سے گفتگو کر لوں۔ اور اگر آپ بہت زیادہ غیر مناسب نہ سمجھیں تو "نگار" کے پڑھنے والوں کو بھی شریک کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ جو نقطہ نظر میں نے پیش کیا ہے وہ عقل اور اسلام کے مطابق ہے۔

خدا کرے اس مسئلہ پر کچھ بے لوث سوچنے والے مل جائیں، کیونکہ یہ محض ۔

ایک تاریخی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس طرح اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ ہم ایک نظریۂ انقلاب کو (جو رسولؐ نے پیش کیا تھا) قبول کر کے چلانا بھی چاہتے ہیں یا نہیں اگر واقعی رسولؐ مقبول کوئی اچھی چیز دے رہے تھے تو ان کے منشاء کے مطابق اس کی اشاعت کے ذرائع پر عمل بھی مندرجہ تھا۔ ورنہ یوں تو جو کچھ ہو گیا اس کی بحث ہی بیکار ہے۔ بزنی صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ یہ تمام مضمون نگاری علماء اور عوام پر ذرا بھی اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہم اپنے بزرگوں کی غلطیوں کا احترام کرنے میں سبکدوش ہیں۔

میں نے آپ کا بڑا وقت لیا، اور اگر آپ نے اسے نگار کے حوالہ کر دیا تو تمنا کے کئی صفحے بھی لے گا۔ مگر کیا کر دل چپ بھی نہ رہا گیا۔ میرے پاس علاوہ بزنی صاحب کے مضمون کے کوئی کتاب نہ تھی۔ زیادہ تر یادداشت پر بھروسہ کر کے لکھا ہے خدا کرے آپ کو پسند آئے۔

اسید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

نیا زمند:-

احتشام رضوی ماہلی ایم۔ اے

مسئلہ خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت



”نگار“ کی بساط بحث پر اس مسئلہ کو آئے ہوئے ڈھائی برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے سب سے آخر میں گذشتہ جنوری کے پرچہ میں میرا مسوط مقالہ اس موضوع پر شائع ہوا تھا جس کے بعد نگار کی طرف سے علمائے اہلسنت کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ اس سلسلہ میں دو مضمون شائع ہوئے۔ ایک جناب ابوسعید بنی امیہؓ کا جو اس موضوع پر اس سے پہلے بھی ”ہر نام“ کے ابتدائی مضمون کے جواب میں غار فرمائی فرما چکے تھے، اور دوسرا مضمون ”م. ح.“ کا ہے جو نسبتاً طولانی ہے اور بعد کو شائع ہوا ہے۔

جس شخص نے نگار میں اس بحث کا شروع سے مطالعہ کیا ہو اور ہر نام صاحب کے ابتدائی مضامین نگار کا محاکمہ اور ادارتی تبصرے اور آزاد خیال شیعہ کا شائع شدہ مضمون پڑھا ہو اور اس کے بعد ان دونوں آخری مضمونوں کو دیکھے وہ اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس بحث کا جو معیار آزاد خیال شیعہ کے مضمون تک قائم رہا ہے وہ ان آخری مضامین سے مختلف ہے۔ جناب بنی امیہ صاحب کا مضمون تو مغز استدلال کے اعتبار ہی سے اس قدر ہلکا ہے کہ اسے نگار کے معیار پر منطبق نہ ہونا چاہیے تھا، لیکن ”م. ح.“ کا مضمون تو مناظرہ تفریعات غیر متعلق الزامات اور فریق مخالف کے خلاف بیجا نکتہ چینیوں اور تشنیعات نیز درشت و ناگوار تعبیرات سے اس درجہ ملر ہے کہ وہ نگار کے بجائے ”انجم“ کے صفحات پر ظاہر ہوتا تو بجا اور مناسب تھا۔

سابقہ مقالات کا متین پہلو اس درجہ وزن رکھتا ہے کہ اس کا اقرار و اعتراف

کام لیا گیا ہے ”تمذیب مانع ہوتی ہے“ کافقرہ خود احساس بدتمذیبی کا
 آئینہ دار ہے جس سے معلوم نہیں جرم سنگین جتنا ہے یا سبک) —
 ”محض فریب دینے اور نادانفت کو گمراہ کرنے کے لیے دو درجن کتابوں
 کے نام نقل کر دیے کہ ان لوگوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے پہلے
 وہ جعلی ہی کیوں نہ ہو۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ روایت قطعی صحیح
 اور جعلی ہے۔ اس کی صحت کا ثبوت قیامت تک پیش نہیں کیا جا
 سکتا۔“ — (ان فقرات میں انتہائی مغیظہ و غضب اور قصہ سنات
 کا ظاہر ہے۔ یہ چیز سنجیدگی بحث کے لیے سم قاتل ہے)

”کیا قرآن میں یہ بغویت ہو سکتی ہے“ ————— ”مان لو کہ اس سے حضرت علیؓ کی مخالفت کا ثبوت ملتا ہے لیکن (حج) یہ تو سوچو کہ فلک ٹوٹ پڑے مگاس پر“ ————— ”آیت کے شان نزول میں غدیر خم کی روایت کی اختراع کی گئی۔ نتیجہ یہ رہا جو سامنے ہے اور میں بجز اس کے کیا لکھوں (حج) در کفر ہم ثابت نہ زنا را رسوا کن“ ————— ”استدلال کی ماہیت پر غور کرو جس میں خدا اور رسولؐ کے ساتھ کس قدر گستاخیاں ہیں اور اسلام کے ساتھ کیسا کھلا ہوا تمیز ہے“ ————— ”افسوس نام نہاد بردن و دین یہودی داشتن“ ————— ”جوہر لطیف سے بہرہ مند اشخاص ان کی استدلالی حیثیت کو ذرہ برابر بھی وقعت نہیں دے سکتے، ہٹ دھرمی اور کج بردی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اس کا معاملہ صرف خدا پر ہے“ ————— ”ادعائے باطل کے اثبات کے لیے جب دلائل و حجج کی دنیا میں قدم رکھا گیا تو ہر قدم پر بے کسی نے فریاد کی۔ اور ہر برگام یہ تہی مانگی نے مرثیہ پڑھا، ادایت نے دامن

تقدما اور مستقل نے ہاتھ پکڑ لیا۔ غرض بے چارگی کی جس قدر مایوسیاں ہو سکتی ہیں وہ خود مزمن دلائل کے حق میں برق و شر ثابت ہوئیں۔

”خلافتِ علی۔۔۔۔۔ بعض مفسدین کا اختراعی مسئلہ ہے۔ اور اس قدر مہلک و خطرناک کہ اس کی بدولت قرآن کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے“

یہ اقتباسات تجسیدہ طبقہ کے غور و سکون کے لمحوں کے لیے سامنے ہیں۔ یہ اس بحث کا حسرت خیز انجام ہے جس میں ستانت نگاری کو منکب اساسی قرار دیا گیا تھا۔

ان اقتباسات کے متوازی الفاظ و تعبیرات اس کے پہلے کے مضامین میں موجود ہیں۔

سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔ موجودہ اقتباسات کی سپرٹ کا جہاں تک اندازہ کیا جاسکتا ہے گفتگو کم از کم ”آپ“ سے ”تم“ کے درجہ تک پہنچ گئی ہے اور ”تو“ کا درجہ بہت قریب ہے۔ عام افراد کی افتاد طبع کے مطابق اور عام اصول منظرہ کے موافق جہاں ”کلوتج“ و ”منگ“ کا تبادلہ آئینی حیثیت سے ”منصفانہ“ قرار دیا گیا ہے اور ”البادی الظلم“ کا عام سارٹیفکیٹ اس کی صفائی میں دے دیا گیا ہے۔ اگر کسی بھی اس مضمون کا حقیقتاً جواب لکھوں تو پھر اھوا! حضرت نیاز کو بھی نہ فریاد کا حق ہوگا اور نہ مضمون کے ایسے اجزاء پر فہم آنج پھیرنے کا۔ مگر میں خود اس طریقہ تحریر کو نہ پسند کرتا ہوں اور نہ اثبات مطلب کے سلسلہ میں مفید اور حقیقتاً ذاتی طور سے اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں جسے مدیر نگار نے اپنے ایک نوٹ میں مایں الفاظ روشن کیا ہے کہ گالی کا جواب گالی سے دینا بڑا نہیں، لیکن اسی وقت جب ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ سب سے پہلے جس نے گالی دی اس نے کوئی اچھا کام کیا تھا۔“

اس لیے مجھ سے اس امر کی توقع نہ کرنا چاہیے کہ میں اپنے زیرِ غریب مقالہ میں کسی سوالات کا جواب دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ کا اس طرح کی ضرورت نہ رہی ہے۔

آسکتی تھی جب میرا استدلالی پہلو کسی طرح کمزور ہوتا، لیکن جبکہ مجھے اپنی حقانیت پر اعتماد ہے اس استدلال کی طاقت پر پورا بھروسہ تو اس طرح کا اندازہ تحریر اختیار کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

غرض یہ ہے اس مضمون کی پہلی کمزوری جو بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہے دوسری بات غیر متعلقہ مباحث کا چھیڑنا۔ یہ بھی عام فن مناظرہ کا دلچسپ کرتب ہے۔ اس نے مقصود یہ ہا کرنا ہے کہ مخاطب کو ان اجنبی مباحث میں الجھا کر اصل بحث میں گفتگو سے باز رکھا جائے۔ اس کا انتخاب بھی زیادہ تر اس وقت کیا جاتا ہے جب اصل موضوع میں اپنی وضاحت بیان اور طاقت استدلال پر اعتماد نہ ہو۔ یہ جوہر اس مضمون میں کافی درخشاں ہے۔ بیا جانے کا جاسکتا ہے کہ سوائے چند سکول کے تمام وہ الزامات جو فرقہ شیعہ کے اوپر مختلف مسائل میں عائد کیے جاتا کرتے ہیں اس مقالہ میں سب درج ہیں مثلاً بدام افکار ختم نبوت، افتناء ابن سبا، تحریف قرآن، غور کیا جائے تو یہی انہی نئی چند باتیں ہیں جن کے الفاظ بدل بدل کر رٹ لگانے میں ”انجم“ کی ساری عمر ختم ہوتی۔ ایک تو فرقہ شیعہ پر ان میں سے اکثر الزامات کا عائد کرنا ہی بالکل غلط ہے کیونکہ بدام سے سنہ میں احادیث اور علمائے شیعہ کے اقوال و دلوں اس بات پر متفق ہیں کہ وہ اسے بمعنی لغوی ”طہر لہ مالم یظہر“ حضرت احادیث کے لیے غیر ممکن سمجھتے ہیں جس چیز کو بدام کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ اہل سنت کے متفقہ احادیث و روایات میں بھی موجود ہے اور قرآن میں بھی مندرج ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہل سنت اس کو بدام نہ کہیں کسی اور لفظ سے اس کو یاد کریں۔ پھر ایسے تعبیری اختلاف کی بنیاد پر یہی حق کہاں پیدا ہوتا ہے کہ شیعہوں کی نسبت اس خلاف واقعہ انہما سے کام لیا جائے کہ وہ ”بدام“ بمعنی لغوی کے قائل ہیں۔ اسی طرح ختم نبوت کے مسئلہ

سے بالکل سادی تھے۔ پھر اس چیز کو پیش کرنے اور اس پر زور قلم سرت کرنے سے حامل۔
 ابن مبارک یہودی کے عقائد سے شیعیت کا مانخو ہونا۔ یہ بھی ایک ایسی بے بنیاد
 روایت ہے جس کا درایت سے کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے۔ قاعدہ ہے کہ کسی مذہب کے افراد
 اس اپنے پیشرو کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں جو ان کے
 عقائد کا اصلی بانی ہو۔ میں علامت ہوتی ہے جس سے کسی فرقہ کے لوگ اپنے پیش رو کی
 کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ لیکن ابن سبأ کو محدثہ شیعہ کا فر ملعون، مطرود و مردود لکھا
 کیے اور کہتے رہے۔ پھر اس کے کیا معنی کہ شیعہ عقائد کا بانی ابن سبأ کو قرار دیتے۔
 اس کے برخلاف عبداللہ ابن سلام اور کعب الاحبار نو مسلم یہودیوں کے روایات
 کو اہل سنت سرانگھول پر رکھتے ہیں اور عبداللہ فاروقی میں دربار خلافت کے اندران کو
 وہ عزت حاصل تھی کہ بہت سے صحابہ کبار کو شامیہ عزت حاصل نہ تھی۔ اسی کا
 نتیجہ ہے کہ آیات قرآنی کی تفسیر میں جہاں تک قصص کا تعلق ہے ان لوگوں کے
 بیان کردہ روایات (اسرائیلیات) کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ اسلام کے پاکیزہ روایات
 یہودیوں کے مزعمہ خرافات میں مل کر گم ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا اثر شرعی احکام
 پر بھی پڑا۔ چنانچہ روزِ عاشورہ کے روزہ کی تشریح یہودیت ہی کے زیر اثر پایہ تکمیل
 کو پہنچی، اور عقائد پر بھی۔ چنانچہ یہود کا عقیدہ ہے کہ ید اللہ مغلولتہ یعنی خدا
 جو کچھ قصداً و قدر کرنا تھا کر چکا، اور اب اس کے ہاتھ بالکل بندھے ہیں۔ کسی طرح کی
 کارگزاری کا موقع باقی نہیں ہے۔ اہل سنت کے اندازِ انکار ”بداء“ کی صورت
 سے ظاہر ہوا۔

مورخانہ تحقیق و تفتیش اور واقعات کی فلسفیانہ تحلیل اس کا سبب یہ بتلاتی
 ہے کہ خود حضرت عمر کو مدینہ میں آنے کے بعد یہودیوں کے مقدس روایات کے ساتھ
 خاص شغف ہو گیا تھا، جس کا مظاہرہ رسالتِ نبی کے سامنے نک ہوا اور حضرت

کو تنبیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت سے اجازت مانگی کہ میں یہود کے احادیث کو لکھا کروں، کیونکہ میں سنتا ہوں تو وہ مجھے بہت پسند آتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا، کیا تم لوگ اسی طرح گمراہ ہونا چاہتے ہو جس طرح یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے؟ دوسری روایت میں ہے کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کتاب لائے جسے آپ نے بعض اہل کتاب سے حاصل کیا تھا تو حضرت غضبناک ہوئے اور فرمایا تم لوگ ضرور اسی طرح گمراہ ہو گے جس طرح یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے۔ تیسری روایت میں یہاں تک ہے کہ آپ حضرت کے پاس تو ریت کا ایک نسخہ لے کر آئے اور بڑے ذوق و شوق سے کہا، کہ ”یہ تو ریت کا نسخہ ہے“ حضرت نے سکوت فرمایا، آپ نے پڑھنا شروع کر دیا اور رسالت کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ لیکن آپ کو کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا، اے خدا تجھے غارت کرے تو دیکھتا نہیں کہ رسالت کے چہرہ کا کیا عالم ہے؟“ — ممکن ہے کہ رسول اللہ کی تنبیہ کا اس وقت آپ پر حقیقی اثر ہوا ہو مگر واقعات بتاتے ہیں کہ آپ کی دلچسپی یہود کے لٹریچر کے ساتھ برابر قائم رہی جس کا پورا مظاہرہ آپ کے دور حکومت میں ہوا اور کعب الاحبار کے روایات کو آپ کی بدولت وہ اہمیت حاصل ہو گئی کہ وہ احادیث کی ہم پلہ سمجھی گئیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ فاسٹو اہل الذکر ان کتھ لا تعلمونؑ کی شرح میں اسلامی تفاسیر علمائے اہل کتاب کی طرف رجوع کا فتویٰ دے رہے ہیں۔ جس کی رد شیعوں کے امام محمد باقرؑ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کریں تو وہ اپنے مذہب کی

۱۔ مشکوٰۃ مطبوعہ اصح المطابع ص ۳۳ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۲۔ کنز العمال مطبوعہ

حیدر آباد جلد ۱ ص ۳۳۔ ۳۔ مشکوٰۃ مطبوعہ اصح المطابع ص ۳۳ ۴۔ سورتہ انبیاء ۵۔

۶۔ باب الناذل خازن جلد ۴ ص ۲۳۳ معالم التنزیل لغوی بحاشیہ تفسیر خازن صفحہ مذکورہ

دعوت دیں گے مسلمانوں کو صحیح راستہ کب بتلائیں گے۔۔۔ ان حقائق کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک بجا ہے کہ شیعیت یہود سے ماخوذ ہے۔ اور سنت اس طرح نہیں ہے۔ کیا اس کے لیے رجال کشی کا ایک مجہول الائم نقل قول اور مخالفین شیعہ کی طرف منسوب شدہ مزعومہ ثبوت کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ جبکہ خود کشی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ "مردی عن الضعفا کثیرا" انھوں نے ضعیف انتخاب سے بہت روایات نقل کیے ہیں اور ان کی کتاب رجال کی نسبت معلوم ہے "ان فیہ اغلاط کثیرا" یہ کہ اس میں بہت سی غلطیاں ہیں۔ اسی طرح تحریف قرآن کے متعلق جمہور شیعہ کا یہ عقیدہ بار بار روشنی میں آچکا ہے کہ وہ اس میں کمی زیادتی کے فائل نہیں ہیں اور تائیدیں تحریف بعض اخباری علماء ہیں جو شیعوں میں اہل حدیث کی حیثیت رکھتے ہیں اور محققین کے ذمہ میں نہیں شامل ہیں۔

جمہور شیعہ کی طرف تحریف قرآن کی نسبت یہ ایک ایسا غلط تخیل ہے جس کی غلطی کا احساس بعض اصناف شیوخ محقق علمائے اہلسنت نے بھی کیلئے ہے چنانچہ علامہ مہاجر شیعہ رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب اخبار الحق میں اس سلسلہ میں متقدمین و متاخرین علمائے شیعہ کے اقوال نقل کرنے کے بعد صاف تحریر کیا ہے کہ "فظهر ان المذہب المذہق عند علماء الفرقۃ الامامیۃ الاثنی عشریۃ ان القرآن الذی انزل اللہ علی نبیہ ہوما بین الدفتین و ہوما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک" "گذشتہ تصریحات سے ظاہر ہوا کہ تحقیقی مسلک علمائے فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کا یہی ہے کہ قرآن جسے خدا نے اپنے نبی پر نازل کیا ہے وہ یہی ہے جو دونوں دفتروں کے درمیان موجود ہے اور وہ ہی ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ اصل میں اس سے زیادہ نہیں ہے" پھر لکھا ہے "والشیر ذمۃ القلیلۃ منهم الّتی قالت بوقوع التغیر فقولہم مردود عندہم ولا اعتد ادبہ فیما بینہم"۔ "ایک بہت چھوٹی جماعت ان میں

بتولغیر واقع ہونے کی قائل ہے ان کا قول علمائے شیعہ کے نزدیک ناقابل قبول ہے اور لائق اعتبار نہیں ہے۔

عصر حاضر کے مشہور امیر البیان کا تب الشرق امیر شکیب ارسلان نے بھی لکھا ہے :-
 ”ان بعض الخلافة من الشيعة لاجمهورهم يزعمون ان القرآن الكريم ايضا
 حذفت منه واضيف اليه“ بعض اشخاص غلاة شیعہ میں نہ جمہور اس کے قائل ہیں
 کہ قرآن کریم میں بھی کمی و زیادتی ہوئی ہے۔“

جناب سید العلماء مولانا ہستی علی نقی صاحب قبلہ کا رسالہ تحریف قرآن کی حقیقت
 جو امامیہ شن لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اس باب میں سنہ ۱۳۵۱ھ کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے جناب خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ :- ”نماہمہمہور شیعہ موجودہ قرآن مجید
 کو کامل و اکمل اور صحیح مانتے ہیں چنانچہ میں نے لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب کی ایک
 واضح کتاب موجودہ ترتیب کی تائید میں پڑھی ہے جو اردو زبان میں ہے اور اس کے
 مصنف بھی موجود ہیں اور وہ کتاب بھی موجود ہے۔“

اس حقیقت کی موجودگی میں اس مسئلہ کو اٹھانا اور فصل الخطاب کی عبارت کو جس
 کے مصنف خود اہل حدیث میں سے تھے اور مجتہد نہیں تھے اپنا مستند قرار دینا بعض
 روایات سے حین کی سند و ولایت شیعہ کے نزدیک تسلیم نہیں ہے تمسک کرنا صرف
 مناظرہ سخن پروری ہے۔ حالانکہ خود اہل سنت کے روایات سے قرآن رسالت
 کے زمانہ میں جمع نہیں ہوا تھا۔ اور وہ مجموعی طور پر اس وقت کسی کو یاد بھی نہیں تھا اور اس میں
 ایسی آیتیں بھی موجود ہیں جو متواتر نہیں ہیں بلکہ صرف کسی ایک صحابی کے پاس تھیں اس کے اعتماد پر کسی بھی آیت میں

۱۔ اظہار الحق جلد ۲ ص ۵۹ ۲۔ مقدمہ کتاب النقد التحلیلی کتاب الادب الجاہلی الاستاذ

محمد احمد الغمادی مطبوعہ قاہرہ ص ۳۱ ۳۔ منادی دہلی ۲۷ اگست ۱۹۷۷ء

۴۔ صحیح بخاری مطبوعہ کزن گزٹ پریس دہلی ص ۷۵۔

۱۰ اتقان جلد ۷ مطبوعہ مصر ۲ اتقان جلد ۵۹ ۳ اتقان جلد ۶۶

۵۵ بخاری کرزن گزٹ پریس مکہ، تفسیر جامع البیان طبری مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۲۷۰ بخاری ص ۲۷۰

۴۶ جامع البیان لطیفی مطبوعہ مصر ۴۷ جامع البیان طبری مکتبۃ ۴۸ جامع البیان ۴۹

نیز اس کے الفاظ میں تحریف ہوئی ہے بلکہ عکاس اور سعید بن جبیر بھی اس کے قائل تھے
نیز یہ کہ اس میں حضرت عثمان کے ماتحتوں تغیر و تبدل ہوا ہے اور قرآن کا کثیر حصہ حضرت
عثمان کو نہ مل سکا۔ اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہمیں سب قرآن مل گیا کیونکہ اس کا کثیر حصہ تلف
ہو چکا ہے۔

اب ان روایات کی موجودگی میں کیا یہ کہنے میں کسی طرح کی شرمندگی نہ ہونا چاہئے۔
کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور اہلسنت نہیں ہیں۔ اگر صرف روایات ہی کا موجود ہونا
عتیدہ تحریف کی دلیل ہے تو اہل سنت بھی تحریف کے معتقد ہیں اور اگر اعتقاد پر مبنی ہے تو شیعہ
بھی تحریف قرآن کے عقیدہ سے بالکل بری ہیں اور ان کے جھوٹ کی طرف اس اعتقاد کی
نسبت ہرگز درست نہیں ہے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان تمام الزامات کو فرقہ شیعہ کے بارے میں صحیح مان لیا
جائے تو بھی اس کا نفس مسئلہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ بحث خلافت امیر المؤمنین
سے ہے۔ فرض کریں کہ شیعہوں کا عقیدہ بدار کے بارے میں غلط ہے۔ امیر کو مساوی
رسول سمجھنے میں باطل تحریف قرآن کے بارے میں ناقابل قبول۔ لیکن پھر بھی اس سے
یہ تو لازم نہیں آتا کہ امیر المؤمنین رسول کے خلیفہ بلا فصل ہونے کے مستحق نہیں تھے، اور
عتیدہ امامت غلط ہے جبکہ نگار کے بحث کی شان نزول یہ ہے کہ ایک ہندو ہزن نام
نے اس حقیقت پر تبصرہ کیا اور ایک وسیع اخیال انسان مدیر نگار نے اس پر ملاحظہ کیا
اور ایک ایسے آزاد خیال شیعہ نے اس پر اظہار خیال کیا جو خلافت امیر المؤمنین کے
مسئلہ میں باقی گیارہ اماموں کی امامت کو بھی معرض بحث میں لانے پر آمادہ نہیں ہے۔ اور
غیبت مہدی موعود ایسے مسئلہ کی تفصیل کی ذمہ داری تک اپنے سر نہیں لیتا تو بتائیے

۱۔ اتفاق جلد ۱ صفحہ ۱۸۴ - ۲۔ اتفاق جلد ۱ ص ۲۵ ۳۔ اتفاق جلد ۲ ص ۲۵
۴۔ اتفاق صفحہ مذکور۔

اس جگہ شیعوں کے دیگر صحیح یا غلط عقائد کو جو مختلف فیہ ہیں، محل بحث میں لانے سے فائدہ بہت ممکن ہے کہ وہ شیعہ تبصرہ نگار یا ہندو محقق ان تمام شیعہ عقائد کو واقعی غلط سمجھتا ہو لیکن پھر بھی اس حقیقت کو ماننا ہوں کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو اپنے بعد کے لیے خلافت کے واسطے نامزد کیا۔

مسئلہ خلافت و امامت کی بحث میں جو ایک مخصوص موضوع ہے ان مباحث کا چھیڑنا ہرگز ہرگز اپنے موضوع بحث کی کوئی صحیح خدمت نہیں قرار پاسکتی بلکہ یہ شبہ پیدا کرنے کا موجب ہے کہ اصل موضوع میں اپنی استدلالی بے مائیگی کا احساں تھا اس بنا پر ان سے متعلقہ مباحث کو بیچ میں لایا گیا۔

تیسری کمزوری مناظرانہ تعرضیات پر مشتمل ہونا۔ یہ بھی اس مضمون میں موجود ہے چنانچہ عصمت کی بحث کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے :-

چونکہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات بہت کم پائے جاتے ہیں اس لیے میں ان کی کتابوں سے رسولؐ کے سہو و نسیان کی بابت کوئی ثبوت نہ پاسکا۔

مجھے اس تعرض کے سلسلہ میں افسوس کے ساتھ یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ شیعہ کی کتابوں میں رسول اللہؐ کی نسبت ایسے حالات ہرگز نہیں پائے جاتے کہ :-

”رسول اللہ قبل بعثت خود بھی اصنام کی قربانی کے ذبیحہ کو کھاتے تھے اور اپنے مہمانوں کو پیش کرتے تھے جس پر بعض مہمانوں نے (جو محدث تھے)

عذر کیا کہ ہم اصنام کے ذبايح کا استعمال نہیں کر سکتے“ (بخاری مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ و ۲۰۷) آنحضرتؐ کے پاس بعثت کے موقع

پر فرشتہ آیا تو آپؐ ڈر گئے اور بدحواسی کی باتیں کرنے لگے اور کسی طرح یہ نہ سمجھے کہ آپؐ معوث و مرآت کے گھر سے، مہانک کے آب سے امنی

نہجہ حضرت خدیجہؓ سے آکر فرمایا۔ اب مجھے اپنی جان کی غیر معلوم نہیں ہوتی؟
 (بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۲) ”رسول اللہؐ نے مشرکین کے خوش کرنے کے لیے اس
 بات کی تمنا کی کہ کچھ آیات ان کی مرضی کے مطابق بھی نازل ہو جائیں اور
 شیطان نے اس سلسلہ میں بتوں کی تعریف کی۔ آیتیں آپؐ کی زبان پر جاری
 کر دیں جنہیں آپؐ نے قرآنی آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ اور سب نے
 سنا (تفسیر طبری مطبوعہ مصر جلد ۷ صفحہ ۱۳۱-۱۳۲ جلالین مطبوعہ نوکلشور
 پریس لکھنؤ صفحہ ۲۸۲ رکشاف مطبوعہ مطبع شرقیہ مصر ۱۳۰۳ء جلد ۱ صفحہ ۶۵)
 ”رسول اللہؐ نے عرب کی ایک عودت کے حسن و جمال کا تذکرہ سن کر اسے
 مدینہ سے باہر ایک جگہ بلا لیا اور اس سے اپنے مطلب کا اظہار کیا تو
 وہ تندگی دہائی دینے لگی“ (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر ۱۳۲۸ء ج ۳
 ص ۲۸) آپؐ نے جوئیہ کو مدینہ کے باہر ایک باغ میں بلوایا اجمال وہ اپنی دایہ
 کے ساتھ آئی۔ آپؐ نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنا نفس آپؐ کو ہبہ کرے
 تو اس نے کہا کہ ایک شاہزادی کی شان یہ نہیں ہے کہ ایک بازاری آدمی
 کو اپنا نفس ہبہ کر دے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ دہائی
 دینے لگی“ (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر ۱۳۲۸ء جلد ۳ صفحہ ۱۶۹)
 ”آپؐ نے کعبہ کی تعمیر کے موقع پر اپنی ٹنگی کھول کر اپنے کانہ وصل پر رکھ لی اور
 برہنہ ہو گئے تو خوش کھا کر گر پڑے، اس کے بعد آپؐ کبھی برہنہ نہیں ہوئے“
 (بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۳)

”آنحضرتؐ بہت سی آیتیں کو بھول گئے جو بعض صحابہ کے پڑھنے سے آپؐ کو
 یاد آئیں“ (صحیح بخاری مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر ج ۳ ص ۱۵۵) ”حضرتؐ نے
 منافق کے حنا زہ کی نماز پڑھائی۔ جس پر حضرت عمرؓ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر

کھینچا کہ آپ نماز نہ پڑھائیے مگر رسول اللہ نے سماعت نہ کی آخر قرآن کی آیت حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نازل ہوئی (بخاری طبع مصر جلد ۱ ص ۹۲) آپ اپنی بیوی حضرت عائشہؓ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے حبشیوں کا ناچ دکھاتے تھے۔ (بخاری جلد ۱ ص ۶۳)

”رسول اللہ روزہ کی حالت میں حضرت عائشہؓ کے بوسے لیتے تھے (بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۹) وغیرہ وغیرہ اور ایسے بہت سے حالات جن سے ”نگار رسول“ ایسی رسوائے عالم کتاب تیار ہو گئی جس کا جواب مسلمانوں کی جانب سے اس کے مصنف کو سزائے موت دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بیشک شیعوں کی کتاب میں رسول اللہ کے اس طرح کے حالات سے خالی ہیں۔

چوتھی کمزوری یہ ہے کہ اس مضمون کو ان تنقیحات کا پابند بنا کر نہیں لکھا گیا ہے جو جناب مدیر نگار نے سوالات کی صورت سے قائم کیے تھے اور جن کی پابندی کے ساتھ آزاد خیال شیعہ نے جواب تحریر کیا تھا معاملہ فہمی اور تحقیق پسندی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ انہیں تنقیحات کی بنا پر بحث کی جاتی۔ لیکن یہ صورت بحث کو محدود بناتی تھی۔ اس لیے ترمذی صاحب نے بھی سہولت اسی میں سمجھی کہ خود مستقل تنقیحات قائم کر کے ان پر گفتگو کریں۔ اور ”م۔ ح“ صاحب نے بھی فلاح و نجات کا رمز اسی میں مضمر خیال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے مقالہ کے اکثر اجزاء بالکل نظر انداز کر دیے گئے اور ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا مجھے چونکہ ترمذی صاحب اور ”م۔ ح“ دونوں بڑا گواروں کے ارشادات پر نظر ڈالنا ہے اس لیے میں ان دونوں مقاموں سے باعتبار مجموعی جو مباحث پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں تنقیحات کی صورت سے درج کرتا ہوں۔ اور پھر ان پر ترتیب وار تبصرہ کر دوں گا۔



تنقیحات

(۱) عصمتِ انبیاءؑ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہونا چاہیے یا اس میں تفریق کی گنجائش ہے
 (۲) نظامِ خلافت کے متعلق "عقل عمومی" یا "حساسہ اجتماعیہ" کا تقاضا کیا ہے اور کیا شیعہ اصول
 اس کے خلاف اور حق اصول اس کے مطابق ہے۔ (۳) استحقاقِ خلافت کے شرائط کیا ہیں
 اور کیا وہ خلفائے ثلاثہ میں مجتمع تھا اور حضرت علیؑ میں منفقہ (۴) آیات سے استدلال
 کا معیار اور انصار و احادیث کا درجہ (۵) حضرت علیؑ کی رائے خلفائے ثلاثہ کے بارے میں
 (۶) سنی شیعہ اختلاف میں سیاسی اغراض کی کارفرمائی (۷) کیا نفرت و عناد کی اسپرٹ شیعہ
 مذہب کی وہ خصوصیت ہے جو اس کے اصلاحی یا الہامی ہونے کے خلاف ہے۔



تنقیح اول

عصمتِ انبیاءؑ میں تعمیم و تخصیص

نبیؑ کا صاحب نے اپنے محاکمہ میں اس کا اقرار کرتے ہوئے کہ رسول اللہؐ ضرور چاہتے
 تھے کہ ان کے بعد جنابِ امیرِ خلیفہ قرار پائیں یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ رسولؐ سے اس بارہ میں
 خطائے اجتہادی ممکن ہے۔ انھوں نے عصمت کے مفہوم کو گناہوں سے محفوظ ہونے میں محدود
 قرار دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسانی کمزوری سے جو بھول چوک اور اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے
 اس سے رسولؐ بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

میں نے اپنے تبصرہ میں جو اس محاکمہ سے متعلق تھا بالکل عقلی حیثیت سے یہ ثابت کیا
 تھا کہ رسولؐ کا ہر طرح گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے اسی طرح انھیں اس طرح کی

غلطیوں سے بھی محفوظ ہونا چاہئے۔

میں نے واضح کیا تھا کہ دنیا کے ہر شعبہ میں جس طرح کی عصمت دھوئیں جاتی ہے وہ یہی عصمت ہے اور اس طرح اسی کو رسول میں مکمل طور پر ہونا چاہیے۔ آخر میں میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو لوگ رسول سے خطائے اجتہادی کو ممکن قرار دیتے ہیں وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا رسول کو اس غلطی پر برقرار نہیں رہنے دیتا بلکہ اصلاح کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر خلافت علمی بن ابیطالب کے متعلق رسول کی ذاتی رائے بھی تھی تو خدا کو اس کی اصلاح کرنا چاہیے تھی نہ کہ رسول کی اس خطائے اجتہادی کی اپنی جانب سے اور نقویت کی بناءً۔ بزری صاحب نے تقریباً میری اس بحث سے بالکل اتفاق کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مدیر نگار کی رائے کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:-

"مکن ہے یہ دلیل صحیح ہو لیکن اسے موجودہ بحث سے متعلق کرنا میرے نزدیک صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انبیاء سے بھول چوک ہو سکتی ہے تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ کسی ایسے اہم مسئلہ میں بھی انبیاء سے مسلسل غلطی ممکن ہے جس کا تعلق مذہب کی اساس سے ہو اور جس غلطی کی وجہ سے ملت کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ تلواریں نیام سے کھینچ جائیں اور ابدال آباد ملک کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا افراق و انتشار کھڑا ہو جائے۔"

جناب "م۔ ح" کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں میری بحث کی کامیابی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک پہلو افراق کا نکال کر خود انہما خبیال فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

"اخفا حقیقت ہوگا اگر میں اس کا اعتراف نہ کروں کہ اس مسئلہ پر صاحب تبصرہ نے معقولیت کے ساتھ بحث کرنے میں بہت کامیاب کوشش کی ہے اگرچہ ذاتی طور سے مجھے ان خیالات سے چنداں اتفاق نہیں ہے اور

میں اس مسئلہ میں ایک حد تک نیاز صاحب کے نظریہ کی تائید کروں گا۔
 ”درحقیقت اس مسئلہ میں الفاظ کی نزاکت کے باعث التباس پیدا ہو گیا ہے صرف
 دو چیزیں ہیں۔ گناہ اور خطائے اجتہادی، بھول چوک کو بھی اسی خطا میں داخل سمجھا گیا ہے۔
 حالانکہ یہ ایک علیحدہ امر ہے۔ گناہ کی بابت محاکمہ اور تبصرہ دونوں میں بالاتفاق اختلاف کیا
 گیا ہے کہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی یہ درست ہے خطا
 اجتہادی اور بھول چوک میں اختلاف ہے۔ نیاز صاحب کے نزدیک انبیاء سے خطا اجتہادی
 کا وقوع وہ مدور ممکن ہے۔ اور بھول چوک بھی منافی عصمت نہیں۔ صاحب تبصرہ کو اس سے
 اختلاف ہے، وہ خطا اجتہادی کو بھی ناممکن الوجود سمجھتے ہیں (میں ناممکن کا اسی معنی میں استعمال
 کر رہا ہوں جو صاحب تبصرہ نے بیان کیے ہیں) ان کے پاس اس کے لیے سب سے بڑی دلیل
 یہ ہے کہ اگر نبی سے امکان خطا و نسیان اور اس کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو سارا دین مشکوک
 ہو جاتا ہے۔ شریعت سے اطمینان و اعتماد بار ساقط ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ سارا بنابنایا
 گھونڈہ دم کے دم میں ڈھیر نظر آئے گا۔ حالانکہ یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔

رسول کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو خالق سے وابستگی کی صورت میں ہوتی
 ہے اور دوسری وہ جو حیثیت اس کے بندہ ہونے کے بندوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے
 خالق سے اس کے تعلقات کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الہیہ کو صحیح طریقہ سے
 حاصل کر کے باحسن وجہ اس کو بندوں تک پہنچا دے۔ اسی حیثیت کا اصطلاحی نام رسالت
 ہے۔ لیکن اس رسالت کے مسئلہ میں اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ
 رسول کے لیے دو امر ضروری ہیں۔ اول اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح۔ یعنی احکام الہیہ کو اچھی
 طرح سمجھ کر لینا اور پھر اس کی صحیح طریقہ پر نشر و اشاعت کرنا۔

دوسری حیثیت نبی کی وہ ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان اور جملہ

انسانوں کے لیے نمونہ و مثال ہے۔ اس لیے کہ نبی کی حیثیت کے تحت اس کے لیے

امر کے واضح ہونے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ عصمت نبی کی کس حیثیت کے لیے ضروری ہے۔ کیا رسالت اور بشریت دونوں کے لیے یا صرف رسالت کے لیے۔

”میرے خیال میں رسالت کے لیے عصمت ضروری ہے اور اس کا اعتراف سب کو ہے۔ وہ گناہ نہیں کر سکتا۔ وہ خدا سے غلط احکام نہیں حاصل کر سکتا اور نہ اس کو غلط طریقہ

سے وہ دوسروں تک پہنچانے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ البتہ بشریت کے لیے میرے

نزدیک عصمت ضروری نہیں ہے۔ یعنی نبی کے وہ ذاتی امور کہ جو اسی حیات دنیویہ یا صرف

ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں کبھی لغزش ہو جائے تو اس کا کوئی مضر اثر

عصمت رسالت پر نہیں مرتب ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ صاحب تبصرہ نے قابل

دلیل اور حاذق طبیب کی تمثیل پیش کی ہے۔ بے شک ماہر قانون دان وہی سمجھا جائے گا

جو پیروی مقدّمات کے بارے میں غلطی کرتا ہی نہ ہو یا غلطی ہو جاتی ہو۔ لیکن کم از کم طبیب

حاذق کے لیے ضروری ہے کہ وہ تشخیص امراض و تجویز علاج میں خطا نہ کرتا ہو یا بہت کم

کرتا ہو یقیناً کم کی قید ہم اپنی انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں۔ اگر خدا کسی طبیب

حاذق کو معین کرے تو یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ ایسا طبیب ”کم از کم“ بھی غلطی نہیں کر

سکتا۔ تشخیص امراض میں نہ تجویز علاج میں۔ لیکن ایسے طبیب کے لیے یہ تو ضروری

نہیں قرار دیا جائے گا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں غلط روی سے معصوم ہو۔ جہاں تک اس

کی حذاقت طبابت کا تعلق ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا کوئی قدم جاہل نہایت و اعتدال

سے نہیں ہٹ سکتا، باوجود اس کے وہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں اگر لغزش کرتا ہے

تو اس سے اسکی حذاقت طبابت پر کوئی حرج نہیں آ سکتا ہے۔ اس تقریر پر پیرا صرف

یہ مقصد ہے کہ انسان کے لیے کسی امر واحد میں کمال اسکو مستلزم نہیں کہ وہ جملہ کمالات

کا حامل ہو ٹھیک اسی طرح رسالت کا مسئلہ ہے۔ رسول خدا سے احکام حاصل کرتا ہے

اور ان کے لیے عصمت لازم مسئلہ ہے اور اس عصمت

کوئی دھبہ نہ آئے گا۔ اگر وہ اپنے دنیاوی امور بشریت میں کوئی لغزش کر جائے۔ بشریت کی بار بار قید کا بار بار اضافہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ کہیں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ نبی اخلاقی غلطی مثلاً کذب و سرقہ وغیرہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ میرا یہ مقصد نہیں ہے اخلاقی غلطی کو گناہ کے حدود میں داخل ہے اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ امر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نبی معصوم رہتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کی حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے جس کو میں اوپر پیش کر چکا۔

ان خیالات کا جائزہ لینے میں مجھے اندیشہ ہے کہ بعض ان مطالب کے اعادہ کی ضرورت پڑے جو گذشتہ مقالہ میں توضیح کے ساتھ لکھے جا چکے۔ اس لیے ناظرین سے پُر زور استدعا کرتا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ اس مقالہ کے اس حصہ کو غور سے ملاحظہ فرمائیں شاید بعض ایسے نکات کی طرف خود ان کا ذہن منتقل ہو جائے جو اس بحث میں مفید نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں۔ حقیقتاً لائق مضمون نگار نے مدیر نگار کے نظریہ کی تائید نہیں کی ہے بلکہ ایک بن بن راستہ اختیار کرنا چاہا ہے جو مدیر نگار اور آزاد خیال شیعہ دونوں کے مسلک سے علیحدہ ہے۔ مدیر نگار گناہ اور خطائے اجتہادی میں تفریق کرتے تھے، پہلی صورت کو نبی کے لیے غیر ممکن اور دوسری صورت کو قابل وقوع قرار دیتے تھے۔ انھوں نے خطا، اجتہادی یا عمول چوک کو خود لازم انسانیت بتایا تھا اسی لیے وہ نبی کی انسانی حیثیت کو جو از وقوع خطا و نسیان کی سند بتا رہے تھے۔

آزاد خیال شیعہ نے جو کچھ لکھا تھا وہ ان کے مقابلہ میں اس امر کو ثابت کر دینے کے لیے کافی تھا کہ جس طرح ایک نبی کو گناہ سے محفوظ ہونا چاہیے۔ اسی طرح خطا، اجتہادی سے بھی، اور یہ دکھلایا تھا کہ خطا، اجتہادی کا عدم وقوع یا غیر ممکن ہونا رسول کی انسانی حیثیت میں کسی نقص کا باعث نہیں ہے، بلکہ اسی انسانی حیثیت کے کمال

کا نتیجہ ہے۔ جناب "م۔ح" خطائے اجتہادی کے بارہ میں زندگی کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے تفریق کر رہے ہیں، وہ مسألی شرعیہ اور احکام مذہبیہ میں جو رسالت کی حیثیت سے متعلق ہیں خطا اجتہادی کو غیر ممکن بتاتے۔ لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو رسول کی انسانی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اس کو ممکن قرار دے رہے ہیں۔ یہ مسلک ممکن ہے ظاہری حیثیت سے خوش آئند یا دل کو لگتا ہوا معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ استمالی و محتملی حیثیت سے وہ اس سے زیادہ کمزور ہے جتنا کہ نفی مطلق یعنی خطا اجتہادی کو کلیۃً رسول کے لیے ممکن قرار دینے کا مسلک۔

رسالت اور انسانیت بدیشک دو مختلف حیثیتیں ہیں لیکن چونکہ ان دونوں کا اجتماع ایک شخص میں ہوتا ہے جسے کہتے ہیں رسول اس لیے اس شخص کی انسانیت کا معیار وہ قائم ہونا چاہیے۔ جو اس کی رسالت کے درجہ کے منافی نہ ہو۔ چونکہ ایک پست انسان جو بہت سے ان نقائص و عیوب میں مبتلا ہو جنہیں کمال انسانیت کی صورت میں نہ ہونا چاہیے تھا، ہرگز یہ مستحق نہیں رکھتا کہ اسے رسالت کا ایسا ذمہ ادا نہ منصب عطا کر دیا جائے اس لیے رسول کی انسانیت اس درجہ کی ماننا پڑے گی جو ان نقائص سے بلند ہو۔ جبکہ خطا اور غلطی ایک انسان کے نقائص میں ضرور داخل ہے اور اس لیے ایک رسول کے لیے مدینہ نگار کو بھی اسے "بہت کم" قرار دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کی کمی اسی انسانیت کے درجہ کے کمال کا نتیجہ ہے جو رسول کے لیے ہر انسان ماننے پر مجبور ہے اور یہ بات مضمون نگار نے تسلیم کی ہے کہ "کم کی قید ہم انسانی کوتاہی کے باعث لگاتے ہیں۔ اگر خدا کسی کو عہدہ عطا کرے تو یقیناً وہ عہدار "کم سے کم" بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول کو "کم از کم" غلطی بھی نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ اس کے درجہ انسانی کا نقص ہوگا جو اس کی رسالت کے نشانیاں نہیں ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ رسول کی ذات میں مفہوم منطقی

کے لحاظ سے اگرچہ رسالت اور انسانیت دو مختلف حیثیتیں ہیں۔ لیکن رسالت کے مفہوم کو ”مرسل ایہم“ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ان کے انسانی زندگی ہی کے شعبوں سے متعلق ہے کیونکہ ان میں علاوہ انسانیت کے اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یعنی رسالت کا مفاد ان تمام انسانوں کی انسانیت ہی کی اصلاح ہے۔ اس لیے رسول کی انسانی زندگی ہی کے حالات اقوال و افعال ان تمام اشخاص کے لیے نمونہ بن سکتے ہیں۔

اب اگر رسول اپنی عام زندگی کے حالات میں عام اشخاص ہی کے مانند ہوئے اور انھیں کوئی بلندی حاصل نہ ہوئی تو اگرچہ وہ رسالت کی حیثیت سے کوئی مخصوص بات رکھتے بھی ہوں تو اسے عام اشخاص پر حجت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ انسانی ہی زندگی کے حامل ہیں اور رسول کی پیروی انسانی ہی زندگی کے شعبوں میں کر سکتے ہیں۔ جبکہ ان شعبوں میں رسول سے غلطیاں ممکن ہوں اور بے راہ روی کا احتمال پیدا ہوتا تو مفاد رسالت خستہ ہو گیا اور رسول کی ذات انسانی زندگی کے شعبوں میں رہنمائی سے قاصر رہی۔

اس بات میں قابل وکیل اور حاذق طبیب کی تمثیل درست نہیں ہے۔ اس بناء پر کہ قابل وکیل اور حاذق طبیب کا کام صرف کسی ایک شعبہ سے متعلق ہے۔ اور رسالت زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہوتی ہے۔

بے شک چونکہ قابل وکیل اور حاذق طبیب کی نسبت مضمون نگار نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر اسے خدا مقرر کرے گا تو وہ اس شعبہ میں کم سے کم ”بھی غلطی نہیں کر سکتا“ اور اس کا کوئی قدم جادۂ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ لہذا اس تغیل کا نتیجہ یہ بنا کر ناچاہیے کہ چونکہ رسالت زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے اور وہ خدا کی جانب سے ہوتی ہے اس لیے رسول سے کسی شعبہ زندگی میں غلطی نہیں ہو سکتی اور اس

کا کوئی قدم جادہ صحت و اعتدال سے نہیں ہٹ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ رسول کے لیے دو امر ضروری ہیں۔ اول اخذ صحیح دوسرے نشر صحیح۔ لیکن یہ امر نظر انداز ہو گیا کہ نشر کے دو طریقے ہیں۔ ایک قول دوسرے عمل اور رسول کی تمام زندگی منقسم ہے۔ ان ہی ابواب پر حجب ان میں صحت ضروری ہوئی تو اب آخر غلطی قدم کہاں رکھے گی۔



اس صورت میں کہ حجب مذہب اور شریعت میں فرق قرار دیا جائے یعنی مذہب تمام ان عقیدت مندانہ نظام ہرات کا ہو جو بندہ کو اپنے خدا سے وابستہ کرتے ہیں اور شریعت قوانین اجتماعی اور معاشرتی کا جنہیں مدیر نگار ایسے بہت سے روشن خیال افراد اسلام کے قابل تبدیلی احکام میں داخل سمجھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک شعبہ منظم کیا جائے سیاسیات کا۔ جو جمہوریت اسلامیہ کے داخلی و خارجی انتظامات و تعلقات سے متعلق ہے جس کے ایک مستقل چیز ہونے کا ترشح بھی جناب نیاز کے مختلف تحریرات اور نیز موجودہ بعض مضامین کے رجحانات سے ہوتا ہے۔

اس صورت میں بے شک رسول کے لیے منہجہ حیثیتیں حاصل ہو جاتی ہیں وہ عقائد اصول مذہب کے پہنچانے کی حیثیت سے ایک مبلغ ہیں۔ قوانین اجتماعی و معاشرتی کے اعتبار سے ایک نقض اور سیاسیات کے اعتبار سے ایک حاکم و ناظم۔ لیکن بہر حال حیثیتیں تمام ان کی رسالت ہی کے اندر مضمر ہیں یعنی منجانب اللہ ہی ہیں۔ اس لیے اگرچہ دوسری دونوں قسموں کے قوانین و احکام کو رسول مل کے بعد آئے والے اوقات و حالات میں کبھی قابل تبدیلی بھی خیال کیا جاسکتے۔ لیکن اس کا شاید کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ اگر رسول کی حیات میں کوئی دوسرا شخص کوئی قانون نافذ کرے تو وہ رسول کے حکم کے مقابلہ میں قابل عمل ہو گا یا کوئی دوسرا شخص رسول کو مقہور و مغلوب بنا کر مسلمانوں پر تسلط حاصل کرنا چاہے تو اس کا یہ فعل صحیح و جائز ہو گا۔

تیسری حیثیت رسول کی کم از کم وہ ہے جیسے طاوت کو خدا نے بادشاہ مقرر کیا جس کا تذکرہ قرآن میں ہے :- (قاتل نبیہم ان اللہ قد بعث لکم طاوتاً ملکا) اور جس کو مضمون نگار نے بھی اپنے اسی مقالہ میں درج کیا ہے - فرق اتنا ہے کہ طاوت کو صرف وہی حیثیت حاصل ہوتی اور رسول کو اس کے ساتھ دو حیثیتیں اور بھی حاصل ہیں - ایک تبلیغ عقائد کی اور دوسرے اجر لے احکام کی -

اب چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا جس عہدہ پر کسی کو مقرر کرے گا وہ کم از کم اپنے شعبہ میں غلطیوں سے ضرور بری ہوگا - لہذا جب رسول خدا کی طرف سے مبلغ عقائد میں تو عقائد کے بارہ میں غلطی کے مرتکب نہیں ہو سکتے اور جب احکام شرعیہ کے مقتضی ہیں تو شرعی احکام میں غلطی نہیں کر سکتے - اور جب خدا ہی کی طرف سے ایک سیاسی فرمانروا یعنی بادشاہ ہیں تو سیاسیات میں بھی ان کا کوئی قدم عبادہ صحت و اعتدال سے نہیں ملے سکتا -

اس طرح اگر خلافت کے مسئلہ کو سیاسی نیز بھی مانا جاتے تب بھی اس میں غلطی کا امکان رسول سے نہیں ہے اور یہی اس بحث کی اصلی بنیاد ہے -

سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر شعبوں کی تفریق خطا راہنمائی اور غلطی میں فائدہ بخش ہو سکتی ہے تو گناہ کے لیے کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ رسولؐ نہ بالکل نہیں کر سکتا -

بالکل اسی طرح جیسے دماغ مثال پیش کی گئی ہے پیشک ایک حافظ طبیب کا علاج اس وقت نہ کرنا چاہیے جب وہ جان بوجھ کر نسخہ غلط لکھتا ہو یا تشخیص مرض میں کوتاہی کرتا ہو اور ایک قبل وکیل کی طرف اس وقت جوع نہ کی جائے جب وہ پیری میں عداوت خرابی کر رہا ہو اور وکیل غصہ پہنچا دینا ہو لیکن اگر ایسا نہیں ہے پیری غصہ یا کوئی خرابی نہ تو شخص اخص و تجوز علاج میں کسی کوتاہی یا ضرر رسانی کا ارتکاب نہ کرتا ہو لیکن اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ ایک گناہگار انسان ہو - وہ بہت سے اخلاقی معاصی کا مرتکب ہو تو اس سے اس کی نکالت یا طبابت پر کوئی حرج نہیں آ سکتا - اسی طرح جبکہ ایک نبی کے لیے بس ضروری سے اخذ معجز اور

فشریح تو اس کی صداقت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ وہ اخذ و نشر میں تقصیر و کوتاہی غلط بیانی سے کام نہ لیتا ہو۔ لیکن اپنے ذاتی امور میں جو اسی حیات، دنیاویہ یا صرف ضروریات بشریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اگر کبھی گناہ ہو جائے تو اس کا کوئی مفراذ و عصمت رسالت پر مرتب نہیں ہونا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ گناہ چونکہ ارادی و اختیار پر مبنی ہے۔ اس لیے اس میں تو یہ تفریق ممکن بھی ہے کہ کوئی انسان ایک شعبہ میں گناہ کا مرتکب ہو اور دوسرے میں نہ ہو لیکن خطا و اجتہادی یا سہو و نسیان میں اس تفریق کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

بھول چوک اور غلطی کوئی ارادی فعل نہیں ہے جس کا ارتکاب و عدم ارتکاب اور اس کے دائرہ کا تعین کسی کے اختیار سے متعلق ہو۔ بلکہ وہ تو حقیقتاً بعض انسانی طاقتوں کے کمال کا ایک سی نتیجہ ہے جو اس طاقت کی کمی اور زیادتی کی صورت میں اسی اعتبار سے مرتب ہوتا ہے۔

انسان کا ایک جوہر ہے اصابت رائے اس کا نتیجہ ہے خطا و اجتہادی کا نہ ہونا۔ ایک صفت ہے تحفظ و تذکر اس کا نتیجہ ہے نسیان و سہو سے محفوظ رہنا۔ اب اگر اصابت رائے کی طاقت انسان میں مفقود ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوگا اور ہر بات میں خطائے اجتہادی کرے گا۔ اور اگر یہ طاقت موجود ہے تو جس درجہ پر وہ مکمل ہوگی اتنی ہی خطائے اجتہادی کم ہوگی۔ اور بالکل کامل ہونے کی صورت میں خطا بالکل نہ ہوگی۔

اسی طرح تحفظ و تذکر جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی سہو و نسیان کم ہوگا اور جب یہ طاقت مکمل ہوگی تو سہو و نسیان معدوم ہو جائے گا۔ اب اگر ایک شخص ایسا ہے کہ اس کی اصابت رائے یا تحفظ کی طاقت ایک متوسط درجہ پر نقص و کمال کے درمیانی حدود میں ہے اور اس کا توقع ہر شعبہ میں ہو سکتا ہے۔ اس میں یہ گمانی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ اس شعبہ میں خطا اور بھول میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اس شعبہ میں نہیں — زیادہ

سے زیادہ یہ کہ وہ اس خطا اور غلطی میں معذور ہوگا۔ کیونکہ اختیاری طور پر نہیں ہے۔ لیکن اسے پابند بنانے کے کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ جیسے مجتہد، چونکہ وہ غیر معصوم ہے اس لیے احکام شرعیہ کے سمجھنے میں بھی اس سے غلطی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ صواب و خطا دونوں صورتوں میں معذور ہو۔ اگر رسول کی بھی یہی صورت ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ دنیاوی امور میں تو خطا و نسیان میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لیکن امور رسالت میں نہیں۔

یہ توصیف الفاظ کا ایک سراہی منظر ہے جس میں عقلی اعتبار سے حقیقت ہرگز نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول مبعوث ہوتا ہے، رسالت کے ساتھ اپنی عمر کی ایک کافی مدت اسی قوم میں گزارنے کے بعد رسول پر شوق و اطمینان پیدا ہوتا ہے اس کے ان حالات کی بنا پر جو رسالت کے قبل دیکھے جاتے تھے۔ یہی رمز ہے ہر قوم کی طرف رسول خود اسی قوم میں سے مبعوث کرنے کا۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ اُنجب پچاس سال اپنی عمر کے ختم کر چکے یعنی شباب کا دور جو عام طور پر لڑکائیوں اور بے اعتنائیوں کا بنتا ہے۔ اپنی قوم کی آنکھوں کے سامنے صرف کر کے کہوت کے دور میں قدم رکھ چکے تو مبعوث بہ رسالت ہوئے۔ اس دور میں آپؐ نے اپنی سچائی اور امانتداری کا وہ سکھ دلوں پر قائم کیا کہ "صادق و امین" کے لقب سے ملقب ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے قبل کے حالات رسولؐ کے صرف انسانی ہی زندگی سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ دوسری حیثیت یعنی رسالت تو ابھی حاصل ہی نہیں ہوئی ہے اب اگر رسولؐ کے ذاتی حالات اپنی انفرادی زندگی میں اس کے قبل یہ بتلاتے ہیں کہ وہ سادہ لوح ہے یعنی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جسے خطا و اجتہادی کہتے ہیں اور تحفظ و تذکر کی طاقت بھی اس میں ناقص ہے جس کی بنا پر سہو و نسیان سے دوچار ہو جاتا

ہے تو مجھ! اس کے ادعاء رسالت کے ساتھ اس پر یہ وثوق و اطمینان اور بھرپور مایوس کن کر پڑا ہو سکتا ہے کہ یہ امور رسالت یعنی اخذ و نشر احکام میں غلطی اور سہو و سیان میں ہرگز مبتلا نہ ہوگا۔۔۔ یہ تو اسی وقت اعتماد پیدا ہو سکتا ہے جب اس کی زندگی کے عام حالات یہ بتلاتے ہوں کہ اس میں اصابت، لے لے اور تحفظ کے جوہر مکمل طور پر موجود ہیں۔ اس لیے اس کے اقوال و افعال میں اس قسم کا احتمال نہیں پایا جاتا۔

یہ ہے اس بحث کی تحقیقی حیثیت جو بغیر کسی مناظرانہ آدریش کے واقعہ حقیقت کی ایسے بردار ہے لیکن انسوس ہے کہ (م-ج) مضمون نگار نے اسی موقع پر مناظرانہ انداز اختیار کر کے حسب ذیل تراویح شروع فرمادی:-

”تعجب ہے کہ آزاد خیال شیعہ صاحب نے اپنے مذہب سے غماض کرتے ہوئے عصمتِ انبیاء کے مسئلہ میں اس قدر غلو سے کام لیا ہے حالانکہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں عرض کر دے کہ یہ عقیدہ میں تو عصمتِ نالوہیت کے لیے ضروری ہے نہ رسالت کے لیے لازم نہ امامت کے لیے واجب۔“

اس کے بعد روایات نقل کیے گئے ہیں جنہیں اس ادعا کے شواہد میں پیش کرنے کے قابل خیال کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی مذہب کی طرف کسی عقیدہ کو منسوب کرنے کی سند اسی مذہب کے معتقدین کے تصریحات و بیانات ہو سکتے ہیں۔ نہ کوئی ایسی روایت جو خود نکالی گئی ہو اور اسے اس عقیدہ کی سند قرار دے لیا جائے کیونکہ ممکن ہے اس مذہب کے معتقدین اس روایت پر حامل نہ ہوں اور وہ اس کی کچھ تاویل کرتے ہوں۔

بے شک وہ روایت اس مذہب کے معتقدین کے خلاف ابطور دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ انھارا عقیدہ مثلاً اس روایت کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہو کہ

وہ معتقدین جواب دیں اس کے سننے کا انتظار کرنا چاہیے جو ممکن ہے، صبح ہو اور ممکن ہے غلط۔ لیکن اس روایت کے مفاد کو اس مذہب والوں کی جانب بطور عقیدہ منسوب کرنے کا حق کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر یہ ہے کہ شیعہ ہمیشہ خلافت حضرت علیؑ کے دلائل منیٰ احادیث و روایات سے پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس بحث میں ہر نام صاحب کی جانب سے ایسا کیا گیا اور ہم نے بھی اپنے گزشتہ مقالہ میں اس طرح کے استنادات کیے۔ لیکن کیا ہم یہاں پر یہ صورت بھی اختیار کر سکتے تھے کہ ہم مذہب سنی کی طرف یہ امر منسوب کر دیں کہ وہ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہیں۔ اور حضرات خلفائے ثلاثہ کو خلیفہ ناسحق قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے یہاں حسب ذیل روایات موجود ہیں۔

اگر ہم ایسا کرتے تو یقیناً ایک کھلے ہوئے بہتان، افتراء اور مرتجح جھوٹ کے مرکب تھے جس کے لیے اگر ہم فریقِ مٹاوت سے "معاف کیا جائے" کے الفاظ میں معافی کی درخواست بھی کرتے تو حق و انصاف کی بارگاہ سے وہ قابلِ معافی جرم نہ تھا۔

خدا سے غلطی کے وقوع کے لیے بلا کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور خود ہی اس کے معنی لکھے ہیں "ظہر لہ ما لم یظہر" (یعنی جو بات معلوم نہ تھی وہ معلوم ہو جائے) لیکن اس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ شیعہ اس معنی سے بلا کو خدا کی ذات کے لیے ہرگز جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں بعض تصریحات :-

شیخ صدوق محمد بن بابویہ قمی کتاب التوحید میں لکھتے ہیں :-

لیس البداء کما یظنہ جہال بلا اس طرح نہیں ہے جس طرح
الاناس بانہ بداء ندامة لعالی واقف افراد خیال کرتے ہیں کہ وہ پشیمانی
اللہ عن ذالک علیٰ کبراً کا نتیجہ ہو خدا کی ذات اس سے بہت

بلند و برتر ہے۔

اور حُجّۃ الطائف محمد بن الحسن الطوسی نے کتاب الغیبہ میں ہدایہ کی روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :-

والوجه فی هذه الاخبار ما قد منا ذكره من تغير المصلحة فيه واقتضاءها تأخير الامر الى وقت اخر على ما بيناه دون ظهور الامر له تعالى فاننا لا نقول به ولا نجوزها تعالى من ذلك علما كبيرا

ان احادیث کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں کہ مصلحت کے بدلنے کے ساتھ احکام میں تبدیلی ہوتی ہے، نہ یہ کہ خدا کو جو بات معلوم نہ تھی وہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے نہ ہم قائل ہیں نہ جائز سمجھتے ہیں۔ خدا کی ذات اس سے بہت بزرگ و برتر ہے۔

ہندوستان میں مذہبِ شیعہ کے سب سے بڑے مجتہد مولانا السید دلدار علی طاب ثناء غفران مآب تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "عماد الاسلام" میں اس کو نہایت وضاحت سے لکھا ہے :-

البداء ممدودا فی اللغة بمعنی ظهور رأی لم یکن یقال بداء فی هذا الامر بداء ای نشاء لم یفیه رأی کما ذکرہ الجوهري فلذا یثقل القول بذلك فی جناب الحق تعالیٰ لشیئی بعد جهله وهذا محال ولهذا اشتق کثیر عن المخالفین علی الامامية فی ذلك نظراً الی

بداء الف ممدودہ کے ساتھ لغت میں اس کے معنی ہیں۔ ایک ایسی رائے کا ظاہر ہونا جو پہلے ظاہر نہ تھی۔ یہ معنی ہدایہ کے صحاح جوہری میں مذکور ہیں اور یہ وہ معنی ہیں جن کے لحاظ سے ہدایہ کی نسبت، خداوندِ عالم کی طرف دشوار ہے۔ کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ خدا کا علم حادث ہو اور وہ اس سے پہلے واقف ہو

ظاہر اللفظ من غیر تحقیق مرہم
 فنقول فی الجواب وباللہ التوفیق
 ان تشیعات المخالفین علینا
 اما باعتبار المعنی الظاہر اللفظ
 ابداء کما هو الظاہر اما باعتبار
 ان لفظ ابداء لم یطلق فی الشرع
 علی علمہ او فعلہ تعالیٰ واما
 باعتبار عدم صحۃ المعنی المجازی
 بالنسبۃ الیہ تعالیٰ اما تشیع
 بالاعتبار الاول فہد فوع فان احدا
 من علماء الامامیۃ لم ینہب
 الیہ کیف وقد نطقت اخبار
 الائمتہ علیہم السلام واقوال قد ملکہ
 الامامیۃ علی خلافہ ۔

اسی بنا پر اکثر مخالفین نے اس سے
 فرقہ امامیہ کے خلاف طعن و تشنیع سے
 کام لیا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے
 صرف اس لفظ کے ظاہری معنی کا لحاظ
 کیا اور اصلی مقصود کی تحقیق نہیں کی۔
 جواب ان کا یہ ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض
 ہم پر یا تو لفظ بداء کے ظاہری معنی کے
 اعتبار سے ہے اور بظاہر حقیقت یہی ہے
 اور یا اس اعتبار سے ہے کہ شرع میں
 لفظ بداء کا (چاہے وہ کسی دوسرے معنی
 سے ہو) خدا کے علم یا اس کے فعل کے
 بارے میں اطلاق نہیں ہوتا ہے اور یا
 اس لحاظ سے ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی
 بھی خدا کے حق میں درست نہیں ہیں۔
 اگر پہلی صورت کے لحاظ سے اعتراض ہے
 تو وہ بالکل غلط ہے کیونکہ کوئی شخص علما
 امامیہ میں سے اس کا قائل نہیں ہے اور
 ائمہ معصومین علیہم السلام کے احادیث
 اور متقدمین علماء شیعہ کے اقوال اس کے
 خلاف ظاہر کر رہے ہیں۔

بقیہ کلمات کے مارجو کیا یہ ائمہ سے کتب صحیحہ و معتبرہ کی عبارت کہ

جو بدار کے ثبوت میں ہے تشریح کی جاتی ہے ان الفاظ میں کہ:-

”نعوذ باللہ من ذلک خدا سے جہل کے باعث غلطی ہوئی“ اور اس سے نتیجہ

نکالا جاتا ہے کہ ”اس سے عصمت الوہیت باطل ہوئی۔“

شیعی فرقہ کی معتبر احادیث یہ ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:-

مِنْ نَرَعُمُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ جو شخص گمان کرے کہ خدا کی رائے میں

بید ولہ فی شیعہ لم یعلمہ امس تبدیلی ہوتی ہے اس طرح سے کہ اسے

فابراء منہ۔ کسی شے کا علم حاصل ہو جاتا ہے جو پہلے

حاصل نہ تھا اس سے میں برأت کرتا ہوں

دوسری حدیث میں آپ ہی کا ارشاد ہے:-

کل امریرید اللہ فہو فی علمہ جس امر کا خدا ارادہ کرتا ہے وہ اس کے

قبل ان یصنعه ولیس شیئ یدلہ علم میں ہوتا ہے، اس کام کے کرنے

الا وقد کان فی علمہ ان اللہ سے پہلے اور کوئی تغیر وہ کائنات میں

لا یبدولہ من جہل۔ نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ اس کے علم میں پہلے

سے ہوتا ہے۔ بیشک خدا کو بدار جہالت

کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا۔

تیسری حدیث:-

ما بداء اللہ فی شیئ الا کان خدا کے مقرر کردہ نظام میں کسی شے کی

فی علمہ قبل ان یبدولہ نسبت تغیر نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس کے

علم میں ہوتا ہے، اس تغیر کرنے سے

پہلے۔

چوتھی حدیث امام رضاؑ کی جس میں آپ فرماتے ہیں:-

من قال بان الله تعالى لا يعلم الشيء الا بعد كونه فقد
 جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ خدا کو
 کسی شے کا علم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ
 شے موجود نہ ہو جائے گا فرہے۔

اس قسم کے روایات مسانید احادیث و اخبار میں بہت ہیں۔

اب کیا یہ حقیقت پرورانہ شیوہ ہے کہ ان تمام اقوال علماء اور ان متعدد احادیث کو پس پشت ڈالتے ہوئے کسی ایک ایسی مجہول سند روایت کے مضمون کو فرقہ شیعہ کا عقیدہ بنا دیا جائے جو فرقہ شیعہ میں ہرگز درخور قبول نہیں ہے۔ اتنا ہم نے صرف ایک حقیقت کی پردہ کشائی کے لیے ضروری سمجھا، ورنہ موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ بعقیدہ اہل سنت خدا فاعل مطلق ہے۔ "لا یسئل عما یفعل وہم لیسئلون" کی بنا پر اس کے افعال میں وہ پابندیاں حائل نہیں ہیں جو بندوں پر عائد کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے بندوں کے لیے ظلم، فعل قبیح، کذب وغیرہ ناجائز ہے۔ لیکن خدا کے لیے یہ تمام باتیں جائز الوقوع ہیں، اور عدالت، انصاف، سچائی، راست کرداری وغیرہ کچھ ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ ترک فرائض اور اس قسم کے قباح سے انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ پھر جبکہ قباح اور اختیاری بدکرداریوں سے انبیاء کے معصوم ہونے کے باوجود خدا کی عصمت ضروری نہیں ہے تو اگر نادانی کی غلطی سے خدا کی عصمت (نعمت باللہ) باطل بھی ہو جائے تو اس کا اثر عصمت رسالت پر کیا پڑ سکا، جو محل کلام ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرقہ شیعہ وہ ہے جو خدا کو ان قباح کے صحت و جواز سے بھی بری سمجھتا ہے اور جہالت و غفلت وغیرہ کے نقائص سے بھی اس کی ذات کو بالاتر قرار دیتا ہے۔ اب رہا انبیاء کی عصمت کا مسئلہ، تو اس کے لیے بھی علمائے شیعہ کے اقوال ملاحظہ فرمائیے :-

شیخ صدوق اپنے اعتقاد میں لکھتے ہیں :-

ان اعتقادنا فی الانبیاء
دارسل والاثمۃ والملائکۃ صلوات
اللہ علیہم انہم معصومون
مطہرون عن کل دنس وانہم لا
یدنبون ذنباً صغیراً ولا کبیراً ولا
یعصون اللہ ما ابرہم ویفعلون
ما یومرون ومن نفی عنہم العصمة
فی شئی من احوالہم فقد جہلہم
واعتقادنا انہم انہم مرصونون
بالکمال والتمام والعلم من ادائل
امورہم الی اواخرہا لا یوصفون فی
شیئ من احوالہم بنقص ولا
جہل -

ہمارا اعتقاد انبیاء، مرسلین، ائمہ اور
ملائکہ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ہر طرح
کی اخلاقی پستی سے معصوم اور پاک ہیں اور
یہ کہ وہ گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں کرتے اور
کسی حکم خدا کی مخالفت ان سے نہیں
ہوتی اور جو ان کے خلاف منصفی ہوتے
ہیں انہیں بجالاتے ہیں اور جو ان سے
کسی حالت میں بھی عصمت کی نفی کرے وہ
ان کے مرتبہ سے حقیقتاً واقف نہیں ہے
اور ہمارا اعتقاد ان کے بارے میں یہ ہے
کہ وہ تمام کمالات سے متصف ہوتے
ہیں، ایسا بتائے امر سے آخر تک
کسی وقت کسی نقص اور بھالت سے
متصف نہیں ہوتے۔

علامہ حلی کشف الحق میں تحریر فرماتے ہیں :-

ذهب الامامیۃ کافۃ الی
ان الانبیاء معصومون عن الصفات
والکبار مترہون عن المعاصی قبل
النبوۃ وبعدھا علی سبیل العہد
والنہی عن کل ذلۃ ومنقصۃ

فرقہ امامیہ تمام و کمال اس بات کا
قائل ہوا ہے کہ انبیاء صغائر و کبار
سب گناہوں سے معصوم ہیں اور معاصی
سے بری ہیں، نبوت کے قبل بھی اور بعد
میں، عہد اور سہو اور بری میں برکت

ما تادل علی الحسنة والضعفة
اخلاقی اور نقص سے اور ان چیزوں سے
جو نفس کی سبکی اور فخارت کا پرتی ہیں
علامہ محبتی نے بجا میں لکھا ہے :-

ان العمدة فيما اختاره
احبابنا من تربية الانبياء والائمة
عليهم السلام عن كل ذنب ودناءة
ومنقصا قبل النبوة وبعد ما قول
اؤمتنا سلام الله عليهم بذات العلم
لنا قوما ياجماع احبابنا رضوان الله
عليهم معقدا كذا بالنصوص المتطابقة
حتى صا ذلك من قبيل الضرورية
في مذهب الامامية -

سب سے بڑا مستند اس مسلک کا جو
ہمارے فرقہ کے علماء نے اختیار کیا ہے
کہ انبیاء و ائمہ ہر گناہ و نقص سے بری
ہوتے ہیں قبل نبوت بھی اور بعد نبوت
بھی۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام کے اقوال میں
جو ہیں اپنے علماء کے متفقہ بیانات سے
معلوم ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ
نصوص جو کثرت کے ساتھ موجود ہیں یہاں
تک کہ فرقہ امامیہ کے ضروریات مذہب
میں داخل ہو گیا ہے۔

جناب غفران مآب مولانا سید دیدار علی طاب ثرا نے عماد الاسلام میں اس کی
تشریح اس طرح بیان فرمائی ہے کہ وہ معاصی و نقائص جن سے عصمت حمل گفتگو
قرار پاسکتی ہے میں ختم کے ہو سکتے ہیں :-

۱) وہ معصیت جو منافی تبلیغ ہے۔ یعنی غلط بیانی کرنا امور تبلیغ میں عدا بعد
بعثت (۲) ایسی ہی صورت مگر عدا نہیں سہواً (۳) پہلی صورت قبل بعثت -
(۴) دوسری صورت قبل بعثت (۵) کفر بعد بعثت عداً (۶) کفر بعد بعثت سہواً
(۷) کفر قبل بعثت عداً (۸) کفر قبل بعثت سہواً (۹) گنہ کبیرہ بعد بعثت عداً
(۱۰) گنہ کبیرہ قبل بعثت عداً (۱۱) گنہ کبیرہ بعد بعثت سہواً (۱۲) گنہ کبیرہ قبل بعثت سہواً

سبکی کا باعث ہو بعد بعثت عمداً (۱۴) سوواً (۱۵) ایسا گناہ قبل تبلیغ عمداً (۱۶) سوواً (۱۷) گناہ صغیرہ (جو عمومی سبکی کا باعث نہیں ہے) بعد بعثت عمداً (۱۸) سوواً (۱۹) ایسا گناہ قبل تبلیغ عمداً (۲۰) سوواً -

ان اقسام کے درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

فقرۃ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء و
اوصیاء کا ان تمام صورتوں سے معصوم
ہونا ضروری ہے۔

ان تصدیقات کی موجودگی میں یہ کہنے کا حق اپنے لیے قرار دیا گیا ہے کہ فرقہ شیعہ میں اہل باور و سرسلین کے لیے عصمت ضروری نہیں ہے۔

تکما جاتا ہے کہ حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں اس قسم کی کثرت تصریحات ملتی ہیں جن سے انبیاء کی غلطی و غلط فہمی اور لغزش و خطا اور اجتہادی کثرت ملتا ہے۔“

لطف یہ ہے کہ اس کے لیے جو شواہد ذکر کیے گئے ہیں ان میں - حضرت موسیٰ کا قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارونؑ پر نفا ہونا اور سختی کے ساتھ پیش آنا حضرت خضرؑ و موسیٰؑ کا واقعہ اور موسیٰؑ کی بے صبری وغیرہ وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآن مجید کو بھی مخصوص حضرات شیعہ کی مذہبی کتابوں میں داخل سمجھا گیا ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ - ”یہ دیگر انبیاء کے متعلق حضرات شیعہ کے مذہبی معتقدات ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کا اعتقاد شیعوں سے مخصوص ہے اور

THE UNIVERSITY OF CHICAGO

کیا جائے گا کہ شیعہ قرآن کو محرف مانتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

یہ "یک بام و دود ہوا" کا مضمون کیا صرف مناظرانہ ہنر آفرینی نہیں ہے۔ اور اس کو کیا حقیقت پروری سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے؟

حقیقت امر یہ ہے کہ اگر عقلی حیثیت سے انبیاء کے لیے عصمت ضروری ثابت ہوگئی تو جتنے آیات و احادیث کچھ ایسے مضامین پر مشتمل ہوں جن سے ظاہری طور پر انبیاء کی عصمت کو دھچکا لگتا ہو ان کی تاویل کے لیے اہل سنت بھی مجبور ہیں (اگر وہ عصمت کو کوئی ضروری چیز سمجھتے ہوں۔ جیسا کہ ہم۔ ح) صاحب مدعی ہیں) اور انبیاء بھی جیسے خدا کے جسم و ہمایات سے منزہ ہونے کے عقیدہ کی بنا پر الوحش علی العرش استوی۔ — جاء الرب والملك صفا صفا۔ — یداه مبسوطتان — ان السموات والارض مطويات بميثته۔ — الی رہبھا ناظرۃ وغیرہ وغیرہ آیات کی تاویل لازم ہے۔

پھر بس طرح ان آیات کی بنا پر مسلمانوں کی جانب عموماً اس عقیدہ کا انتخاب صحیح نہیں ہے کہ وہ خدا کو اعضاء و جوارح سے مرکب اور مجسم مانتے ہیں، اسی طرح ان آیات قرآنی یا احادیث سے شیعوں کی طرف اس عقیدہ کی نسبت درست نہیں ہے کہ وہ انبیاء کو معصوم نہیں بلکہ خطا کار سمجھتے ہیں۔

روایات جو اس سلسلہ میں وارد ہوں وہ اگر بحیثیت سند غیر معتبر ہوں تو قصہ پاک ہے اور اگر معتبر ہوں تو ان کی صورت بھی وہی ہے جو آیات قرآن کی۔

ماریہ قطیبہ دالی روایت در صورت صحت سند حقیقتہً "علم غیب" کے سلسلہ سے مربوط ہے، چونکہ شریعت کے احکام اسباب ظاہری پر مبنی ہیں اس لیے ان قرآن شہادت کی بنا پر جو اس قطبی کے خلاف جمع ہو گئے تھے، رسول کا حکم قتل دینا، بالکل درست تھا اور حقیقت امر کے ظاہری طور پر منکشف ہونے کے بعد قرآن سے

باز رہنا بھی بالکل صحیح — علم غیب کے معتقد یہ کہتے ہیں کہ رسولؐ کو بھی اس حقیقت کا علم تھا۔ لیکن دوسرے لوگوں پر دافعہ کے انکشاف اور انہی نکتہ جینیوں اور غلط بیگمانیوں کے رفع کرنے کے لیے اس قسم کا حکم ضروری تھا جس کا نتیجہ یہی ہوا جس کا رسولؐ کو پہلے سے علم تھا اور اسی لیے آپؐ نے شکرِ خدا ادا کیا۔

جناب امیرؒ نے اپنی رائے میں خود تبذیلی کبھی نہیں فرمائی۔ لیکن وہ لوگ جو آپؐ کی ہدایت سے مخرت تھے ان کو بھر اپنی رائے کا پابند بننے کی مصلحت نہ تھی اور داخلی جنگ کا اندیشہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے اپنی رائے کے تسلیم کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ اور ”ہذا اجزاء من تولى العقدہ“ کا فقرہ ان ہی سے متعلق تھا۔ چنانچہ انہی سے مخاطب ہو کر آپؐ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔

امر نکھ امری بمنعرج اللوی فلم تستبینوا النصح الا صحی الغد

یہ آپؐ کی اصابت رائے کا ایک مکمل ثبوت تھا جسے غلطی سے خطا را اجتہادی کے ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ تعجب ہے کہ م۔ ح صاحب نے اپنے ہیل کے روایات و اقوال سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ ”اہل سنت کے نزدیک مسئلہ عصمت میں رسالت و بشریت کے حیثیات کی وہ تفریق موجود ہے جس کی عقل مقتضی ہے۔“

لیکن ذرا ملاحظہ ہو۔ شرح مسلم الثبوت اصل اول باب النسخ مطبوعہ نولکشور صفحہ

۳۵۹ میں ہے۔

اس شخص کی بات ہرگز نہ سنبھالو یہ
کہتا ہو کہ انبیاء احکام خدا میں غلطی
نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ قول ظاہر ہوا
ہے شیاطین اہل البدعت و اہل الضلالت

ولا تصنع الی قول من یقول ان
الانبیاء کیف یخطئون فی احکام
اللہ تعالیٰ فان هذا القول صدق
من شیاطین اهل البدع و اهل الضلال

وغيرهم الم تراهل الحق من السنة
والجماعة القاصين البعثة اكثرهم
الله تعالى يجوزون على الانبياء
الخطاء كما ظهر في اسارى بدر من
سيد العالم صلوات الله عليه و
سلامه۔

فقرن سے ہے اور اہل سنت یعنی اہل سنت
جماعت جو بدعت کے اکھاڑنے والے
ہیں خدا ان کی تعداد کو زیادہ کرے وہ
انبیاء سے غلطی کو جائز سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ
بدر کے قیدیوں کے بارے میں سرور کائنات
صلوات اللہ علیہ و سلامہ سے غلطی

دلالت ہوئی۔

اب دیکھیے کہ بچارے شیعوں پر گالیاں پڑ رہی ہیں۔ کس لیے؟ کہ وہ انبیاء
کو غلطی سے محفوظ جانتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اہل سنت و جماعت کا مذہب
کیا بتایا جا رہا ہے؟ یہ کہ احکام خدا میں بھی انبیاء سے غلطی ہو سکتی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کسی کو شرم و استغیثہ ہونا چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے کہ شیعہ
انبیاء کو معصوم نہیں سمجھتے۔ اور اہل سنت احکام خدا میں انبیاء کو معصوم سمجھتے
ہیں؟ — کیا رسالت کی حیثیت میں قرآن کی تبلیغ داخل نہیں ہے۔ اور کیا اسلام
میں شرک اور ستائش اصنام سے بڑھ کر کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ لیکن مذکورہ سابق
حوالوں کے ساتھ اہل سنت کی وہ روایت دیکھو جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب
رسول اللہ نے جان لیا کہ قریش مجھ سے بگڑے ہوئے ہیں تو آپ کو آرزو پیدا ہوئی
کہ کوئی قرآن کی آیت ایسے اترے جس کی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے راضی ہو جائیں
اس بر وقت تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک دن قریش کے مجمع میں سورہ "ناجم" نازل ہوئی
آپ اس کو پڑھنے لگے اور اس آیت تک پہنچے کہ (اقرأ بآیات اللات والعزى و
المناة الثالثة الاخرى) تو یکایک شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات
جاری کر دیے کہ (تانا الغرانیق العلی وان شفاعتھن لتعجز) یعنی یہ

بزرگان بلند مرتبہ میں سے ہیں، ان کی شفاعت کی یقیناً اسید رکھنا چاہیے، یہ سن کر تمام مشرکین مجاہدہ میں گر گئے اور خوش ہوئے کہ محمدؐ اب ہمارے دین پر آگئے۔ کیا اس کے بعد یہ حق ہے کہ کسی غیر مستند روایت کی بنا پر شیعوں کی جانب پر عقیدہ منسوب کیا جائے کہ وہ انبیاء و مرسلین کے لیے خطرہ اجتہادی یا سہو فیسیان کو جائز سمجھتے ہیں اور انھیں معصوم نہیں سمجھتے۔ لیکن اہل سنت انبیاء کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے روایات اہل سنت کے یہاں انتہائی کثرت سے ہیں۔ سہو کے بارے میں خود رسول اللہؐ کا نماز کی رکعتوں میں غلطی کرنا اور ذوالشمالین یا ذوالحجہ کا ٹوٹنا بخاری میں موجود ہے۔ اور خطرہ اجتہادی کی بھی بہت سی روایتیں ہیں جن میں اسلام شرعیہ کی مثال بھی موجود ہے۔ لیکن اس سب کے نقل کرنے سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ مضمون نگار کے اس غلط طریقہ استدلال کو روشن کر دیں جو انھوں نے شیعوں کے خلاف اختیار کیا ہے۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ مذہب اہل سنت عموماً انبیاء کو معصوم نہیں سمجھتا کیونکہ بہت ممکن ہے ان میں سے بعض محققین ان تمام روایات کو سند کے اعتبار سے ناقابل قبول قرار دیتے ہوں یا اس کی کوئی تاویل کرتے ہوں۔

بحث کے آخر میں پھر پھر مضمون نگار اسی نقطہ پر آگئے ہیں جو ہم نے اپنے تبصرہ میں اس بحث کے آخر میں درج کیا تھا کہ اہل سنت کا یہ خیال ہے کہ انبیاء سے اس قسم کی لغزشیں ہو جاتی ہیں تو ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ اللہ کسی صورت سے متنبہ کر دیتا ہے۔

نتیجہ کیا ہوا؟ کوہ کندان دکاہ برآوردن "وہی جو ہم نے اپنے تبصرہ میں لکھا تھا کہ خلافت کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ حضرت رسولؐ نے خطرہ اجتہادی کی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کو اس غلطی پر باقی نہ رہنے دیا جاتا۔ بلکہ اس غلطی پر متنبہ کر دیا

جاتا۔ اور جب ایسا نہیں ہوتا تو معلوم ہوتا کہ رسولؐ نے جو کچھ چاہا تھا وہ بالکل صحیح تھا اور خدا کی مرضی کے مطابق۔

پھر جب نتیجہ یہی رہا۔ تو مضمون نگار کو اس حصہ پر زور قلم صرف کرتے سے کیا ”تبیین مذہب شیعہ“ کے شوق پورا ہونے کے سوا کوئی علمی و تحقیقی فائدہ بھی ہوا؟



دوسری تنقیح

نظام خلافت کے متعلق ”عقل عمومی“ یا ”حاشہ اجتماعیہ“ کا تقاضا کیا ہے؟
اور کیا شیعہ اصول اس کے خلاف اور سنی اصول اس کے مطابق ہے؟

اس تنقیح کی مثال و کمال نشو و نما بڑی صاحب کے مضمون سے ہے جس میں یہ دعویٰ یا محاکمہ ”کیا گیا ہے۔“

۱۔ رسول اکرمؐ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں۔ اور پھر یہ سلسلہ شاہان خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسل قائم ہے۔
۲۔ حضرت علیؑ کی ”الوہی امامت“ کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں، وہ سب یا تو موضوع یا جعلی یا خود ساختہ ہیں یا اس کا مفہم حقیقتاً وہ نہیں ہے جو ”الوہی امامت“ کی تائید کرتا ہو اور جس کے ماتحت خلافت کے حقدار صرف علیؑ اور آل علیؑ قرار پائیں۔

اسی دعوے کی تائید میں ایک مبسوط بحث کی گئی ہے جس سے مندرجہ

بالا تنقیح سے مراد ہے۔

چونکہ برّی صاحب کے مضمون کے جواب میں اخبار "اسد" کی متعدد اشاعتوں میں ایک غیر مکمل مضمون ایک شیعہ صاحب قلم کے قلم سے "شائع ہوا ہے اور اس مضمون میں اس حصہ بحث کے متعلق بہت سی سوچنے اور سمجھنے کی باتیں مندرج ہیں اس لیے ناظرین نگار کی اطلاع کے لیے اتنا جزو اس مضمون کا یہاں نقل کیا جاتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ مجھ کو کہنا ہے وہ میں کہوں گا۔

برّی صاحب نے اپنے دعویٰ یا محاکمہ کی تائید کرتے ہوئے پہلے چار تنقیدیں قلم فرمائی ہیں اور ان کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے نتائج مرتب فرمائے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

۱۔ تمام مذاہب عالم اور بالخصوص اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر بننے والے انسانوں کی دینی اور اخروی صلاح و فلاح کا پیغام لے کر آیا ہے اور اکیسا پرگرام خدا کی طرف سے لے کر آیا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان دینی و اخروی ہر اعتبار سے نشو و اتقا کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔

۲۔ کسی مذہب کی حقانیت کا پہلا اور آخری ثبوت یہ ہے کہ وہ انسان کے انفرادی معاشرتی اور ملی تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت کرتا ہے اور کسی مذہب کا معیار صداقت یہی ہے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا کوئی حق غصب نہ ہوتا ہو۔

۳۔ کوئی ایسا مذہب الہامی نہیں ہو سکتا جو معصومہ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے یکساں مفید اور قابل عمل نہ ہو اور جس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور مجاز مطالبہ اور خواہش پر ضرب لگتی ہو۔

۴۔ کوئی ایسا مذہب الہامی ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا جس کا کوئی اہم ترین بنیادی فیصلہ دنیا و عقائد کے خلاف ہو اور دنیا کے بسنے والوں کے کئی حق و حقوق سے

محروم کرنا چاہتا ہو۔

مذکورہ تفتیحات اور ان کی تشریح میں چار صفحے نگار کے پُر کیے گئے ہیں۔ حالانکہ مذکورہ تفتیحات دو جلد ہیں جن میں کورسہ کور الفاظ بدل کر تفتیحات کی صورت سے دہرایا گیا ہے۔

۱۔ یہ کہ مذہب کو تمام افراد انسانی کے صلاح و فلاح کا ذمہ دار ہونا چاہیے اور کسی کی حق تلفی اس سے نہ ہوتی ہو۔

۲۔ مذہب کا کوئی فیصلہ دنیا کی عقل عمومی کے خلاف نہ ہو۔

عقل عمومی سے وہ معمولی فہم و فراست مراد لی گئی ہے جس سے انسان روزمرہ کے کاروبار میں کام لیتا ہے اور جس کے ذریعہ سے بہت سی صداقتوں کو پہچانتا ہے۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان جمہوریت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں مثلاً سچ بولنا اچھا ہے۔ انسان کا قتل کرنا وحشیانہ فعل ہے۔ جھوٹ بولنا بُری بات ہے وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک اس بحث کا مفہوم پہلو ہے اس میں کسی کو اختلاف کی کمال گنجائش ہے۔ لیکن اس کا وقوعی پہلو انتہائی تاریک اور مایوس کن ہے۔

مذہب ہر انسان کی دنیوی اور اخروی صلاح و فلاح کا پیغام ہے کرایا ہے لیکن یہ صلاح و فلاح کس کے نقطہ نظر سے؟ کیا خود عام انسانوں کے نقطہ نظر سے؟ مگر دشواری تو یہ ہے کہ منادِ عام اور صلاح خلق کی تعیین میں خود انسانی نظریے جھلکتے رہتے ہیں اور بوقتِ واحد بھی سب کبھی ایک نقطہ پر مجتمع نہیں ہوتے۔

• کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ اور خواہش پر ضرب نہ لگتی ہو۔“

بہت ٹھیک، مگر اس صحیح اور جائز کی تشخیص کون کرے گا؟ خود جذبات کی ہوا میں اٹھنے والے افراد جن میں سے ہر ایک اپنے مطالبہ اور خواہش کو صحیح اور جائز

ہی بتلاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی ناجائز اور غیر صحیح کیوں نہ ہو۔
 ”دنیا کے بسنے والوں کو مان کے کسی جائز حق سے محروم نہ کرنا چاہتا ہو۔“
 ضرور۔ مگر جائز حق کی حد بندی کس طرح ہو؟

”برہنہ کلب“ کا ہر ممبر عربیہاں حالت میں بازاروں، شاہراہوں اور عام تفریح گاہوں میں پھرنے کو اپنا جائز حق بتلاتا ہے۔ صنف نازک کا کلتا بڑا طبقہ مردوں کی طرح طلاق کے معاملہ میں صاحب اختیار ہونے کو اپنا جائز حق بتلاتا ہے۔ ایک فریج جو بیرون ملک ہے اپنے روپے کی منفعت یعنی سود لینے کو اپنا جائز حق تصور کر رہا ہے۔ مانی اور مزدک کے پیرا سوال کے ساتھ صنف اثاث میں تمام افراد کو مشترک قرار دیتے ہوئے ان سے بہرہ ور ہونے کا حق ہر شخص کو عطا کرتے ہیں۔ اشتراکی جماعت ملکیت و میراث کے تمام احکام کو معورہ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لیے غیر مفید اور عوام کے حقوق پر ضرب کاری سمجھتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے نقطہ نظر کو ”عقل عمومی“ یا بقول ”مدیر نگار“ ”حاضرہ اجتماعیہ“ کے مطابق قرار دیتا ہے۔ عربیہاں پسند طبقہ عربیہاں کو عقلی حیثیت سے مفید اور ضروری قرار دیتا ہے۔ اشتراکیت پرورد اپنے معتقدات کو عقل عمومی کے عین مطابق دکھاتا ہے۔ اب اگر دنیا کی ہر جماعت اور ہر خیال کے مطابق اس کے جائز مطالبہ کے حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور حقوق عطا کیے جائیں۔ تو دنیا میں کسی قانون اور نظام کا نفاذ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور مذہب کی تواریخ سے اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ ”صحیح اور جائز کی تشخیص اگر عام افراد انسانی کے جذبات ہی پر چھوڑ دی جائے تو مذہب کی مزدت ہی باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ مذہب تو درحقیقت انسانی افراد اور اقوام کے مطالبات اور توقعات میں جائز اور صحیح“ کی حد بندی کے لیے آیا ہے۔ اس کی حد بندیاں خود انسانی طبائع پر ایک بارگراں میں اور اس لیے ان کی حد بندی اور مطالبہ حرمت و رخصت کی تحقیق کے لیے

عقل عمومی "یاسائے اجتماعیہ" کی مطابقت کا دعویٰ بہت آسان ہے۔ لیکن اسکی واقعی تشخیص بہت مشکل ہے۔ سوشلزم، نیشنلزم، کمیونزم وغیرہ تمام نظریے عقل عمومی ہی کی بنیاد پر اختیار کیے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا حامی اپنے ہی مسلک کو حاسہ اجتماعیہ کے مطابق سمجھتا ہے اور مبتلا ہے۔ یورپ میں تعداداً زولج جس بڑی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ ایک عیسائی سے پوچھئے تو وہ متعدد شادیوں کرنے کو بالکل عقل عمومی کے خلاف بتائے گا جبکہ ایک مسلمان پورے طور پر اس کی حمایت کرتے ہوئے عقلی حقیقت سے اس کو معزوری قرار دینگا۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ یہ تمام مختلف راستے سب ہی صحیح نہیں ہیں۔ دنیا میں اکثریت کے ساتھ کسی خاص ہوا کا چلنا کبھی "عقل عمومی" کا معیار نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس کو لطیف پیرایہ میں اس طرح ظاہر کر دیا ہے کہ "لَوَاتَّبَعْتَ الْكَثْرَ مِنْ فِي الْأَرْضِ يَضْلُوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" یعنی اہل زمین کی اکثریت کی اگر پیروی کرو تو تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دے گی۔

انسانی طبائع و حالات میں جزو مدہ ہوتا ہے ایک وقت میں جو مسلک اکثر افراد یا جمہور خلق کا ہے، دوسرے وقت وہی اقلیت کا ہو جاتا ہے اور اس کے خلاف مسلک اکثریت کی تائید حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اگر اکثریت ہی کو معیار حقانیت سمجھا جائے تو چاہیے کہ یہ دونوں متضاد مسلک برحق ہوں۔ کیونکہ ہر ایک کو بجائے خود اکثریت کی تائید حاصل ہے یا یہ کہا جائے کہ خود نقطہ حقیقت اختلافِ نظریات سے بدلتا رہتا ہے۔ یعنی جب اکثریت اس مسلک کے موافق نہ ہو تو بالکل غلط ہے۔ حق ایک ہے اور وہ بدلتا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس سے پہلے دنیا میں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا عام ہوا یہی چل رہی تھی اور دنیا اسی راستے کی سالک تھی۔ لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ "عقل عمومی" اندھاسہ اجتماعیہ اسی کو صحیح سمجھ رہے تھے اس کے بعد انقلاب ہوا اور دنیا کا نقطہ نظر بدلا جس کے بعد مختلف نظریات پیدا ہو گئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس مسلک کا غلبہ دنیا میں آج ہے یہ سو برس کے بعد بھی اسی صورت سے رہے گا۔

ہسپانیہ میں اشتراکیت کے خلاف جدوجہد جاری ہے۔ جس کا نتیجہ کامیابی سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ روس میں خود اہل ملک کے اندر اس نظام کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور سٹالین کی زندگی اسی طرح ہر لمحہ خطرہ میں ہے جس طرح موسولینی اور ہٹلر کی۔ وہاں بہت سے وہ قدم پیچھے ہٹائے جا چکے ہیں جو اس کے پہلے آگے بڑھائے گئے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی نظام زندگی کی ریگس اس اجتماعی نظام سے کبھی نہیں ہے۔ بحیرہ کیسے سمجھا جاسکتا ہے کہ جس رنگ پر دنیا آج جا رہی ہے یہی عقل عمومی کا اصلی تقاضا اور حاکم اجتماعہ کا حقیقی مطالبہ ہے۔ اس وقت تو خود مذہب کے خلاف جو عام ہوا چل رہی ہے اس کی بنا پر خود مذہب ہی کو عقل عمومی کے خلاف سمجھا جا رہا ہے۔ خدا کو ایک ہی شعور ارادہ، قادر و فاعل مختار سب کی حیثیت سے ماننے میں دنیا کو عندہ ہے۔ وہ اس کی طرف سے وحی اور بعثت ابیاس کے کوئی معنی نہیں سمجھتی تو منصب من الہ ہونے کا کیا مفہوم اس کے ذہن میں آسکتا ہے۔ اگر اسی طرح کے عقل عمومی "ادحائہ اجتماعہ" کی بنیاد پر گفتگو کرنا منظور ہے۔ تو امارت کے مسئلہ تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔ مذہب اور اس کا عقیدہ الوہیت اور نبوت سب ہی غائب ہو جائے گا۔ اور اسی لیے "نشدیم زاد خیال شیعہ" نے اپنے مقالہ میں مدیر نگار کو مخاطب کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "اب اس بحث نے

جو صورت اختیار کر لی ہے وہ

مذہبی و اعتقادی ہے جس کے دلائل و اصول کا بہت کچھ تعلق بالبعد الطبیعیاتی مسائل کے ساتھ ہے۔ لہذا اس بحث کا جو فیصلہ کیا جائے وہ ان ہی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو عام مسالوں میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں۔

اپنی طول طویل تمہید یا چار تنقیحات کی تشریح کے بعد برقی صاحب نے جو سنگ بنیاد اپنی آئندہ بحث کا رکھا ہے وہ انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ "اب آپ حضرت علیؑ کی الوہی خلافت" کے عقیدہ پر غور کیجیے۔ دیکھیے "الوہی خلافت" کا مطلب یہ ہے کہ

”خداوند کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریم کے بعد ان کے داماد حضرت علیؑ خلیفہ ہوں۔ اور علیؑ کے بعد ان کی اولاد میں سے کسی کو یہ منصب جلیل تفویض کیا جائے اور اس طرح سلسلہ تاقیامت جاری رہے۔ (برقی صاحب فرماتے ہیں) اب اگر آپ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) خلافت و امامت علیؑ کی نسل کے لیے مخصوص ہے۔ (۲) خلیفہ (یا امام) کی وفات پر اس کی جانشینی کے لیے پیش رو کا بیٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں پیش رو کا کوئی قریب ترین عزیز ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح شاہان خود مختار کے یہاں ولیعهدی کے لیے (۳) اگر روئے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی مستند کا مستحق قرار نہیں پاسکتا۔ (۴) دنیا کے تمام مسلمان حضرت علیؑ کی نسل کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ (۵) چونکہ رسول اللہ کے بعد علیؑ ان کی اولاد ہی خلافت و امامت کی حقدار ہے اور وہی ”اولوالامر“ آقا اور مولا ہیں ان لیے روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلمان کے لیے یہ فرض ہے کہ وہ ابداً آباد تک اہل علیؑ کے ہر اشارہ پر بلا چون و چرا تسلیم و خضوع کرنا ہے۔ (۶) اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باحسان، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ بلکہ علیؑ کی اولاد میں سے ولیعهدی کے مروجہ اصول کے بموجب کسی حقدار کو مستند خلافت و امامت پر متمکن کر دیا جائے۔

یہ ہے وہ استنباط اور امامت کے بارے میں عقیدہ اہل تشیع کی تحلیل و تشریح جو برقی صاحب کے نکتہ میں نگاہ کی مرہون منت ہے۔ لیکن کیا وہ حقیقت واقعہ کے بھی مطابق ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ذی علم انسان کو اپنے مسلک و خیال کی حمایت میں اس کی جرأت کس لیے ہوتی ہے کہ وہ اپنی عبارت آرائی سے دوسرے فریق کے عقائد کو بھی غلط صورت میں پیش کرے۔ اور توہم روڈ کر ایسا نظریہ اسکی طرف منسوب

کرے جس کا مصنف وہ خود ہے اور پھر اس کی رد میں صفحے کے صفحے سیاہ کر کے غلط اندیش
افراد کو یہ رائے قائم کرنے کی دعوت کہ فریقِ مخالفت کا جواب ہو گیا اور اس کے عقیدہ
کی عمارت مسمار ہو گئی۔ ”معیارِ امامت“ کو جو کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے ”تبعینِ اشماع“ کے
ساتھ جو خصوصی دلائل کا جزئی نتیجہ ہے غلط کر دیا ایک ایسی مناظرہ تدلیس اور فریب کاری
ہے۔ جو بخجیدگی اور انصاف کی طرف سے انتہائی نفرت و طامت کی مسخر ہے۔ ”ابوہی
خلافت“ کا مطلب ہرگز شخصیت پروری نہیں ہے جس میں اوصاف سے کوئی بحث
نہ ہو۔ خلیفہ یا امام کے لیے اصولی حیثیت سے ہرگز یہ مزید نہیں قرار دیا گیا ہے کہ وہ
پیش رو کا جیسٹا یا بیٹے کی عدم موجودگی میں ان کا کوئی قریب ترین عزیز ہو۔ امامت کے
بنیادی شرائط میں ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ آلِ علیؑ میں سے کسی کے لیے عام مسلمانوں
کی جانب سے قرار دی جائے اور نہ بحیثیت ”علیؑ“ کی اولاد ہونے کے کسی کو بھی سادات
میں سے بیعت پہنچنا ہے کہ وہ امامت و خلافت کا حقدار بنے اور اولوالامر آقا اور مولا
ہونے کا دعویٰ کرے۔ اور ہرگز یہ درست نہیں ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان سب سے
زیادہ متورع، متقی، باحسد، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو اور پھر بھی وہ جانشینی
کا مستحق نہیں ہے اور علیؑ کی اولاد میں سے ولیعہدی کے مروجہ اصول کے موافق کسی کو
مسندِ خلافت پر متمکن کیا جائے گا۔

ان میں سے کوئی ایک بات بھی ذرہ بھر اصلیت نہیں رکھتی اور نہ اسے شیعہ عقیدہ
”خلافتِ اکبریہ“ سے کوئی واسطہ ہے۔ شیعوں کا اساسی عقیدہ خلافت و امامت کے
بارے میں صاف طور پر حسب ذیل ہے :-

۱۔ امام و جانشین رسولؐ ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس سے رسولؐ کی وفات کے
بعد حفاظتِ شریعت اور اصلاحِ خلافت کا مقصد پورے طور سے حاصل ہو
سکے اور خود اس کی غلط اندیشی، غلط بیانی یا غلط کاری سے فسادِ خلق کا اندیشہ

نہ ہو اور یہ اسی وقت ہوگا کہ جب وہ معصوم ہو۔

۲۔ امام دہی ہوگا جو اپنے زمانہ کے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ متوجہ متقی، باخدا، اور سب سے زیادہ عالم علم حقیقیہ، خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں افضل و اکمل ہو۔

۳۔ ایک ایسی ہستی کی تشخیص جو معصوم ہونے کے ساتھ تمام افراد مسلمین سے افضل و اکمل ہو۔ عام افراد انسانی کے دسترس سے باہر ہو، نیز عام افراد کا فیصلہ کر کے طور پر دروغایت اور جانبداری سے الگ بھی نہیں ہوگا تاہم اس میں خود غرضی مطلب برکادی کے لحاظ کا موقع ہے۔ اس لیے امام یعنی جانشین رسول کا انتخاب براہ راست خدا سے متعلق ہونا چاہیے۔ اور امام دہی ہوگا جس کو خدا مقرر کرے۔

۴۔ چونکہ خداوندی فشا کے معلوم ہونے کا ذریعہ عام انسانوں کو سوائے غیر الٰہی یعنی پیغمبر کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے امام یعنی جانشین رسول کی تعیین نفس رسول ہی سے ہو سکتی ہے۔ اور اس امام کے بعد دوسرے امام کی تعیین بھی یا اسی رسول کے نص سے ہوگی یا اس امام کے بیان سے جو رسول کی جانب سے نامزد تھا۔ کیونکہ یہ نفس بھی بواسطہ رسول خدا تک نہتی ہوتی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس معیار اور اصول اساسی میں کیسے کسی خاندان، کسی جماعت، کسی قوم و قبیلہ کی تخصیص ہے؛ حقیقت پروری کا واقعی تقاضا یہ ہے کہ عقلی و اصولی بنیادوں پر صرف اسی معیار اور اصول کی صحت کو جانچا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا یہ اصول درست ہے یا اس کے خلاف جماعت کا بنیادی عقیدہ جس کا تجزیہ کرنے پر مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط ہوتے ہیں:-

۱۔ خلافت و امامت یعنی جانشینی رسول کے مسئلہ کا خدا و رسول سے کوئی

تعلق نہیں۔ بلکہ یہ عام افراد کے اختیارات امتیازی سے متعلق ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ و جانشین رسول منتخب کر لیں۔

۲۔ خلیفہ کا انتخاب اجماع سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندے مجتمع ہوں اور کوئی آل درلد مسلم کا نفرس ہو، اور اس میں یہ مسئلہ طے پائے۔ بلکہ اگر کسی ایک اسلامی مرکز کے لوگوں نے مجتمع ہو کر کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا اور اس کی بیعت ہو گئی تو وہ خلیفہ مجتہد لیا جائے گا، اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی قسمت اس سے وابستہ ہو جائے گی۔

۳۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ ایک منتخبہ کمیٹی چند آدمیوں کی جو کسی جلسہ عام میں منتخب بھی نہ ہوئی ہو بلکہ کسی ایک شخص نے بنالی ہو وہ مجتمع ہو کر کثرت آراء سے کسی ایک کو خلیفہ بنادے تو بھی تمام مسلمانوں کا خلیفہ ہو جائے گا۔

۴۔ تیسری صورت یہ بھی ہے کہ سابق خلیفہ (جو معصوم بھی نہیں ہے) وہ کسی کو نامزدگی کے ذریعہ سے معین کر جائے تو وہ بھی خلیفۃ الرسول بن جائے گا اور تمام مسلمانوں کو اس کی اطاعت لازمی ہوگی۔

۵۔ چوتھی شکل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو لیکن ایک شخص کسی طرح اقتدار حاصل کر لے اور بڑے شمشیر دوسروں سے تسلیم ختم کر لے تو وہ بھی خلیفۃ رسول قرار پا جائے گا۔

۶۔ خلیفۃ رسول کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اگر ایک زمانی اور شرانجور بھی قمر و غلبہ حاصل کر لے تو وہ بھی جبراً اس کا جانشین سمجھا جائے گا اور اس کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہوگی۔

اب اس کا فیصلہ ارباب عقل کے ہاتھ ہے کہ کیا یہی عقائد عقل عمری کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے موافق ہیں؟ کیا ان ہی عقائد کو مان لینے سے تمام معمرہ ارض

بنے مائے تمام انسانوں کے انفرادی، معاشرتی اور ملی، تمام جائز حقوق کی مکمل نگہداشت ہو سکے گی؛ کیا اسی طرح مفادِ اسلامی حاصل ہو گا اور جانشینیِ رسول کا اصلی مقصد پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ کیا اسی طرح شریعتِ اسلام کی حفاظت ہو گی اور مسلمانوں میں روحِ سلامیت کی صحیح تربیت ہو سکے گی؟

یہ ہے پورا وہ تبصرہ جو فاضل "صاحبِ قلمِ شیعہ" نے اس بحث کے متعلق کیا ہے۔ اور اس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ محبت سے نکات اس تبصرہ میں اس طرح تشریح کے ساتھ درج ہو گئے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنا ممکن ہے اور نہ صرت باقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیعہ مذہب کے عقیدہ امامت کی تشریح میں بڑی صاحب نے بے اعتدالی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ اس پر نقد و ایراد کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تبصرہ کے الفاظ ذرا تیز ہو گئے ہیں جو کم از کم میرے مذاقِ طبعیت کے خلاف ہیں۔ لیکن پھر بھی جو کچھ جواب میں لکھا ہے وہ بالکل درست ہے شیعہوں کی طرف یہ امر منسوب کرنا کہ وہ اس میں مخصوص خاندان کی شرط لگاتے ہیں، ویسا ہی ہے جیسے مسلمانوں پر یہ ایراد عائد کیا جائے کہ وہ ختمِ نبوت کو قومِ عرب اور اس میں مخصوص اہلِ مکہ اور ان میں خاص قبیلہ قریش اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ بنی ہاشم اور پھر وہ بھی فرزندِ عبداللہ کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں۔ اور تمام دُنیا کے لوگوں کو مشرق و غربِ عالم میں اس نعمت سے محروم کرتے ہیں۔ جو تمام اہلِ عالم کے حقوق پر ایک کا دی ضرب ہے اور اس لیے عقلِ عمومی اور "حساسِ اجتماعیہ" کے بالکل خلاف ہے۔ شیعہ اور سنی مسلک میں خطِ فاضل یہ ہے کہ شیعہ تعینِ امام کا صرت ایک طریقہ قرار دیتے ہیں اور وہ نص یعنی استخلاف ہے۔ بڑی صاحب کے لیے اہل سنت کی جانب سے اس مسلک کی پوری نکتہ چینی اور ابطال کی کوشش اور اس امر کے اثبات کی جدوجہد کہ یہ مسلک "عقلِ عمومی" کے خلاف ہے، اس وقت جائز

مجھی جاسکتی تھی جب اہل سنت اس طریقہ کو غلط سمجھتے ہوتے اور معتز بن جندبہ۔ لیکن جب کہ یہ طریقہ باتفاق اہل سنت بھی ایک ذریعہ تعیین امام کا ہے جس کے بعد عام مسلمانوں کو کوئی اختیار انتخاب و اظہار رائے کا باقی نہیں رہ جاتا تو پھر اس مسلک کے خلاف اتنی عرق ریزی اور اس امر کی کاوش کہ وہ کسی طرح عقل عمومی کے خلاف ثابت ہو جائے اثبات حقیقت کے لحاظ سے کون سی سعی مشکور؟ مجھی جاسکتی ہے برائے اس کے کہ مذہب اہل سنت کی جانب سے اس کی ہمت افزائی یہ کہہ کر کی جائے:-

اقتلونی و ما لک و اقتلوا ما لکامعی

اور شکریہ اس طرح ادا کیا جائے:-

شکرست باریکیاں دامن کشاں گذشتی گوشت خاک مایم برادگشتہ باشد
لاحظہ بر علماء اہلسنت کے تحریر تھیں جو اس سلسلے سے متعلق ہیں۔ (امام شرح تفتاویٰ مطبوعہ زکھشور لکھنؤ ۱۳۲۷ھ)

و مقصد ثالث فیما یثبت بدالامامۃ تیسرا مقصد (بحث امامت) کا اُن

فان الشخص یجبر و صلوحہ الامامۃ طریق قول کے بیان میں جن سے امامت

وجہ مشرطہا لایصیر اماما بل ثابت ہوتی ہے کیونکہ امامت کی لیاقت

لابد فی ذلک من امر اخر و اما اور شرائط امامت کے اجتماع سے کوئی

ثبت بالنتیج من الرسل ومن امام ہو نہیں جائے گا۔ بلکہ اس کے

الامام السابق بالاجماع و لیے کچھ اور بھی ضروری ہے اس

تثبت فیما بیعتہ اهل الحل و کا ایک طریقہ رسول اور سابق امام کی

العقد عند اهل السنة والجماعہ نص ہے۔ یہ طریقہ بالاجماع درست ہے

والمعتزلة الصالحیۃ من النبیۃ اور دوسری صورت اہل حل و عقد کا بیعت

خلافا للشیعۃ ای اکثر جم قائل لا طریق کرتا۔ یہ اہلسنت و جماعت اور معتزلہ اور

الاہل النہ فرقہ زیدیہ کی جماعت صالحہ کا مسلک ہے

لیکن شیعوں کی اکثریت اس کے مخالف
ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی
طریقہ نہیں ہے۔

۲۔ مواعن محمد بن جریر - مطبوعہ مصر ۵۔

الامامة تثبت اما بنص
من الامام على استخلاف واحد
من اهلها واما بعقد هامن اهل
الحل والعقد لمن عقدت له من
اهلها واما بغیر ذلك كما هو
مبین فی محله۔
امامت ثابت ہوتی ہے یا تو امام وقت
کے نص سے کسی قابل شخص کو اپنے بعد
خلیفہ مقرر کرنے کے ساتھ اور یا اہل حل و
عقد کے مقرر کرنے سے کسی لائق شخص
کو اور یا دوسرے طریقوں سے جو اپنے
محل پر بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ معالم اصول الدین - امام فخر الدین رازی جو مصر میں محفل امام ملازی کے حاشیہ
پر طبع ہوئی ہے۔ اس میں (الباب العاشر فی الامامة) کا مسئلہ ”البعہ“ حسب
ذیل ہے۔ (ص ۱۵۸)

اجمعت الامّة علی انہ یجوز
اثبات الامامة بالنص وھل یجوز
بالاختیار ام لا قال اھل السنّة
والکعبیّة یجوز و قالت الاثناعشریّة
لا یجوز الا بالنص۔
تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے
کہ امامت نص کے ذریعہ سے ثابت ہوتی
ہے۔ لیکن عام افراد کے انتخاب کے
ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے یا نہیں، اہل
سنت اور معتزلہ قائل ہیں کہ ہو سکتی ہے
اور فرقہ اثنا عشریہ قائل ہے کہ بغیر نص کے
نہیں ہو سکتی۔

۴۔ ابطال الباطل میں لکھا ہے۔

انما ثبت بالنص من الرسول و
 من الامام السابق بالاجماع و
 ثبت ايضا ببيعة اهل الحلة و
 العقد عند اهل السنة والجماعة
 والمعزلة والصالحية من الزيدية
 خلافا للامامية من الشيعة
 فانهم قالوا لا طريق الا للنص
 امامت رسول اور گزشتہ امام کے
 نص سے اجماعاً ثابت ہوتی ہے اور اہل
 حل و عقد کی بیعت سے بھی اہل سنت و
 جماعت اور معتزلہ اور زید یہ صالحیہ کے
 نزدیک ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن فرقہ
 شیعہ امامیہ اس کا مخالفت ہے۔ وہ لوگ
 کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ
 نہیں ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ شیعوں کا مقررہ طریقہ (نص) سب
 کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ دوسرے طریقوں میں ہے۔ پھر اب
 اس بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ شیعوں کے مقررہ طریقہ کو "عقل عمومی" یا "حساسہ
 اجتماعیہ" کے خلاف قرار دیا جائے۔ شیعوں کا مقررہ طریقہ تو اس درجہ "عقل عمومی"
 کے مطابق اور دل کو لگتا ہوا ہے کہ جو لوگ حضرت ابو بکر کی خلافت کے قائل ہیں وہ بھی
 دل سے مطمئن ہیں کہ ان کی خلافت اس طریقہ پر درست ثابت ہو جائے اور اسکی گونشش
 بھی کرتے ہیں چاہے وہ ناکام ہو۔

تصنیف کے لیے ملاحظہ ہو شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی کی کتاب "منہاج السنۃ"
 (مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۲۸ھ) جلد ۱ صفحہ ۱۳۴۔

ذہبت طوائف من اهل السنة
 الى ان امامته ابى بكر ثبت بالنص
 والنزاع في ذلك معروف في مذهب
 احمد وغيره من الاثمة وقد ذكر
 اہل سنت کی بہت سی جماعتیں اس کی
 قائل ہیں کہ حضرت ابو بکر کی امامت بذریعہ
 نص ثابت ہوئی ہے اور اس مسئلہ میں امام
 احمد اور دوسرے علماء کے درمیان اختلاف

مشہور ہے اور قاضی ابوالعلیٰ وغیرہ نے اس بارے میں دو روایتیں امام احمد سے نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی امامت عابرۃً تاس کے انتخاب سے ثابت ہوئی ہے اور اس کی قائل ہوئی ہے، ایک جماعت اہل حدیث میں سے، اور معتزلہ اور اشاعرہ اور یہی مسلک ہے قاضی ابوالعلیٰ وغیرہ کا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ نص خفی اور اشارہ سے ثابت ہوئی ہے اور اس کے قائل ہوئے ہیں حسن بصری اور ایک جماعت اہل حدیث میں سے اور کبر ابن بنت عبد الواحد اور فرقہ خوارج میں بیسیہ اس کے قائل ہیں۔ اور شیخ ابو عبد اللہ بن ساد نے کہا ہے کہ اس اس کی دلیل کہ خلافت کے مستحق ابو بکر تھے۔ اور دوسرے اہل بیت اور صحابہ نہیں تھے۔ قرآن اور سنت دونوں سے ہے انھوں نے کہا کہ ہمارے علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ خلافت نص سے ثابت ہے یا استدلال سے۔ ایک جماعت ہمارے اصحاب میں سے اس کی قائل ہے کہ

القاضی ابوالعلیٰ وغیرہ فی ذلک روایتین عن الإمام احمد احدهما انها ثبتت بالاختیار قال وبهذا قال جماعة من اهل الحديث والمعتزلة والاشعرية وهذا اختيار القاضی ابی العلیٰ وغیرہ والثانیۃ انها اثبتت بالنص الخفی والإشارة قال وبهذا قال حسن البصری وجماعة من اهل الحديث وبکر بن بنت عبد الواحد والبیہسیۃ من الخوارج وقال الشیخ ابو عبد اللہ بن حامد فاما الدلیل علی استحقاق ابی بکر الخلافۃ دون غیرہ من اهل البیت والصحابۃ فمن کتاب اللہ وسنتہ نبیہ قال وقد اختلفت اصحابنا فی الخلافۃ هل اخذت من حیث النص والاستدلال فذهب طائفتہ من اصحابنا الی ان ذلک بالنص وانہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ذکر ذلک نصا وقطع البیان علی من حاکم من اصحابنا من

ان ذلک بالامستدلال الجلی - حضرت نے اس کو بطور نص بیان فرمایا۔ اور
 مخصوص حضرت ابوبکر کی قطعی طور پر تعین فرمائی
 اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ استدلال کے
 ذریعہ سے ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد مختلف روایات اپنے طرق سے اور اس طرح کے استدالات ذکر
 کیے ہیں جن سے کسی نہ کسی طرح ثابت ہو جائے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت نص رسولؐ
 سے تعلق رکھتی تھی۔ جن میں سب سے زیادہ اس محل پر قابل لحاظ یہ استدلال ہے کہ
 خلیفہ کا اطلاق اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک پیش رو شخص خود جانشین
 بنایا نہ ہو اور چونکہ تمام صحابہ نے باجماع حضرت ابوبکر کو خلیفہ رسولؐ کے نام سے یاد
 کیا اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ کی جانب سے ان کے متعلق نص ہو چکی تھی۔ اس سے
 صاف ظاہر ہے کہ "عقل عمومی" اسی طریقہ کو صحیح سمجھتی ہے جو شیعوں نے خلافت کے
 لیے مقرر کیا ہے۔ اور جس کی بنیاد پر وہ حضرت علیؑ کی خلافت کے مدعی ہیں شیعہ فرقہ
 کا عقیدہ اس بنا پر کہ اس میں خاندان پرستی کی بُو پائی جاتی ہے "عقل عمومی" کے
 خلاف بتلایا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ حقیقتاً نص رسولؐ پر مبنی ہے جس کے معنی یہ
 ہیں کہ اس میں بحیثیت اصول اساسی قرأت کا کوئی پہلو ملحوظ نہیں ہے یعنی اگر رسولؐ کا
 نص واستخلاص کسی اجنبی شخص کے متعلق مستند طریقہ سے ثابت ہو جائے، تو
 شیعہ عقیدہ کے لحاظ سے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے موجود ہیں۔ اور
 اس کا لحاظ ہرگز نہیں کریں گے کہ وہ اجنبی شخص ہے۔ اور غیر متعلق ہے۔ لیکن اہل
 سنت جو نص کے پابند نہیں ہیں اور عام افراد کو خلیفہ کے انتخاب کا حق دیتے ہیں
 انہوں نے جس صورت سے قوم و قبیلہ کی پابندی عائد کی ہے اسے سوائے
 خاندان پرستی کے اور کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اہل سنت خلافت کے لیے "عقل عمومی"

میں سے ہونے کی شرط قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ”م۔ح“ صاحب نے اس کمزوری کو محسوس فرمایا ہے اس لیے انھوں نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ ”اہل سنت خلافت کو کسی گردہ میں محدود نہیں رکھتے“ یہ دفع دخل کیا ہے کہ ”جن لوگوں نے اہل سنت کے نظریہ کو محدود سمجھا غلط سمجھا“ اور فٹ نوٹ میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ اہل سنت کے نزدیک خلافت کو صرف قریش کے لیے مختص سمجھتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ ”الائمة من القریش“ ضرور وارد ہوتا ہے لیکن یہ فرمان رسول اس وقت کے حالات اور ماحول کے لحاظ سے تھا کہ اس وقت طاقت و قوت کے اعتبار سے قریش ہی کا ایک ایسا قبیلہ تھا جو اور قبائل سے غیر معمولی امتیاز رکھتا تھا۔ اسی لیے امامت و خلافت کا اس کو مستحق قرار دیا ورنہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قریش میں امامت و خلافت منحصر ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ اس زمانہ میں ترکی کی بے پناہ عسکری طاقت کو دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ خلافت کا مستحق ترکی ہے۔ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ ترکی ابوالآباد کیلئے خلافت کا مستحق ہو گیا۔“

ممکن تھا کہ ”م۔ح“ صاحب اس رائے کو اپنے ذاتی اجتہاد کے طور پر درج فرماتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے ذاتی خیال کو جمہور اہل سنت کے سرعائد کرتا چاہتے ہیں۔ جلنے دیجیے اس کو کہ ان کا ذاتی اجتہاد درست ہے یا نہیں۔ اور انھوں نے جو تاویل فرمائی ہے وہ ”الائمة من القریش“ کے الفاظ کے ساتھ کہ (جس میں ”الئمہ“ جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے نہ الامام“ جس کے معنی یہ کہے جاسکتے کہ میرے بعد والا امام قریش ہی سے ہونا چاہیے) سازگار ہے یا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اہل سنت کی طرف اس عقیدہ کی نسبت جو دی ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ اس کے بے

لاحظہ ہر اہل علماء اہل سنت کے تصریحات :-

۱۔ علامہ ابن حزم نے کتاب الفصل فی الملل والنحل میں لکھا ہے :-

اختلفت القائلون بان الامامة لا تكون الا في صبيته قریش فقالت طائفة هي جائزة في جميع ولد فہر بن مالک بن النضر وهذا قول اهل السنة وجمهور المرجئة وبعض المعتزلة وقالت طائفة لا تجوز الخلافة الا في ولد العباس بن عبد المطلب وهم الراوندية وقالت طائفة لا يجوز الخلافة الا في ولد علي بن ابي طالب

وہ جماعتیں جو امامت کو نسل قریش میں منحصر کرتی ہیں ان میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک جماعت اس کی تائیل ہے کہ وہ قریش کے ایک بن نضر کی تمام اولاد میں جائز ہے۔ یہ قول ہے اہل سنت اور تمام مرجئہ اور بعض معتزلہ کا، اور ایک جماعت کہتی ہے کہ خلافت عباس بن عبد المطلب کی اولاد میں منحصر ہے یہ راوندیہ ہیں۔ اور تیسری جماعت اس کی تائیل ہے کہ خلافت اولاد علی بن ابی طالب میں منحصر ہے۔

۲۔ شرح موافق (مطبوعہ نوکشتور) صفحہ ۳۲ میں شرائط امامت میں لکھا ہے :-

ان يكون قرشياً اشقوطاً الاشاعرة والجبائيا ومنعه الخوارج وبعض المعتزلة

امام کو قرشی ہونا چاہیے۔ اس شرط کو معتبر قرار دیا ہے اشاعرہ نے اور فرقہ معتزلہ میں سے جبائیاں نے اور خوارج اور بعض معتزلہ اس کے خلاف ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اہل سنت تمام تر اشاعرہ ہی ہیں۔ جن کا یہ مذہب ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ ابطال الباطل میں لکھا ہے :-

شروط الامام الذي هو اهل الإمامة ومقتضى ان يكون شرائط الامام کے جو امامت کا اہل اور مستحق ہوتا ہے یہ ہیں کہ وہ اصول اور قروع دونوں میں

مجتہد فی الاصول والفروع ليقوم
بأمر الدين ذارئاً لبصاؤد بغير
الحرب وترتيب الجيوش شجاعاً
قوى القلب ليقوى على الذب
من الحوزة عدلاً لا يحوزان
العاسق رتباً يصرف الاموال
في اغراض نفسه والعدل عندنا
من لم يباشر الكبار ولم يصير على
الصغائر عاقلاً ليصلح للتصرفات
الشرعية بالغاً القصور عقل العبي
ذكر اذ النساء ناقصات العقل
والدين حرّاً قرشياً فمن جمع هذه
الصفات فهو اهل للامامة و
الزعامة الكبرى -

میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہو تاکہ دینی امور کا
انصرام کر سکے۔ جنگ کے تدابیر اور افواج
کی ترتیب میں صائب الرائے اور باخبر ہو۔
بہادر، قوی دل ہو تاکہ مرکز اسلام سے ولایت
پر قادر ہو۔ عادل ہو تاکہ جور و ظلم نہ کرے
اس لیے کہ اگر ناسق ہوگا تو ممکن ہے کہ مسلمانوں
کے مال کو اپنے نفسانی اغراض میں صرف کر
ے اور عادل ہمارے نزدیک وہ ہے
جس نے کہا نہ کہ انتخاب نہ کیا ہو اور صغائر
پر اصرار نہ کرتا ہو۔ عاقل ہو، تاکہ تصرفات
شرعیہ کے قابل ہو سکے۔ بالغ ہو، کیونکہ بچہ
کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو۔ کیونکہ عورتیں
عقل اور دین دونوں میں ناقص درجہ رکھتی ہیں
آزاد ہو، قرشی ہو۔ جس شخص میں یہ تمام صفات
جمع ہوں وہ امامت اور ریاست عالمہ کا مستحق ہے۔

۴۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج السنۃ (ج ۱ صفحہ ۱۲۰) میں لکھتے ہیں۔

اما كون الخلافة في قرشي فلما
كان هذا من شرعه ودينه
كانت النصوص بذلك معروفة
منقولة ماثورة -

خلافت کا قریش میں منحصر ہونا چونکہ رسول
اللہ کی شریعت اور دین کا ایک جزو تھا
اس لیے نصوص کے بارے میں مشہور و معروف
اور سب کے زباں زد تھے۔

۵۔ الخلفاء السنیۃ قائمہ لکھا ہے۔

یكون من قریش ولا يجوز
من غیرہم ولا یختص بنی
ہاشم وادلاد علی کرم اللہ
وجہہ۔

امام قریش میں سے ہوگا۔ اور کسی دوسرے
قبیلہ سے امام کا ہونا جائز نہیں ہے۔ اور
بنی ہاشم یا ادلاد علی بن ابی طالب سے مخصوص
نہیں ہے۔

۶۔ شرح عقائد نسفی میں ہے۔

یشترط ان یكون الامام قرشیاً
بقولہ الامۃ من قریش هذا وان
كان خبراً واحداً لکن سارطاً
ابو بکر محتجاً بعلی الانصار
ولحمینکرہ احد فصار مجعاً
علیہ لم یخالف فیہ الا
الخواارج وبعض المعتزلة

شرط ہے کہ امام قرشی ہو کیونکہ آنحضرت
نے فرمایا ائمہ قریش ہی سے ہوں گے اور
یہ اگرچہ خبر واحد ہے لیکن چونکہ اسے
حضرت ابو بکر نے انصار کے مقابلہ میں تسلل
میں پیش کیا اور کسی نے انکار نہیں کیا اس
لحاظ سے اجماعی حیثیت حاصل کر لی اور
کوئی اس کا مخالف نہیں ہے۔ سوائے
خوارج اور بعض معتزلہ کے۔

معلوم ہوا کہ اہل سنت اس امر پر متفق ہیں کہ امامت قبیلہ قریش سے ہونا
ضروری ہے۔ اور اس کو رسول اللہ ہی کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ کہ آپ نے ہمیشہ
کے لیے امامت کو اس قبیلہ میں جس سے آپ خود تھے منحصر قرار دیا ہے۔ اب دیکھئے
کہ شیعہ نقطہ نظر میں اداس مسلک میں کتنا زین و آسمان کا فرق ہو گیا شیعہ رسول اللہ
کی جانب سے مخصوص اشخاص کو مخصوص سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ چونکہ امامت کا معیار
عصمت کے ساتھ وابستہ ہے اور عصمت امر باطنی ہے۔ لہذا جن حضرات کے متعلق
رسول تنصیب کریں معلوم ہوگا کہ عصمت کی صفت ان ہی میں موجود تھی اور کسی میں نہیں
اب اگر رسول اللہ نے اپنی اولاد میں سے ایسے افراد کو نامزد کیا تو اتنا رسول پر ایمان

لانے کی بنا پر کم از کم حسن ظن سے کام لیا جائے۔ کہ آپ نے صرف اپنی اولاد ہونے کی بنیاد پر ان لوگوں کا نام نہیں لیا ہے۔ بلکہ ان میں آپ کو وحی الہی ایسے اوصاف کی موجودگی کا علم ہے جو ان کو خلافت کا مستحق بنانے کا سبب ہیں۔ لیکن جب کہ رسول اللہ کی جانب سے کچھ اشخاص نامزد نہ ہوں بلکہ افراد کا انتخاب ہمیشہ امت والوں کی جانب سے ہو، لیکن پھر بھی رسول اللہ کی جانب سے یہ پابندی عائد ہو جائے کہ امام ہمیشہ اسی قبیلہ سے منتخب کرنا جس سے میں خود ہوں اسے سوائے نسلی امتیاز اور قبیلہ پروری کے کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اب جناب بزمی صاحب کی "عقل عمومی" اور "میان صاحب کے" حاشیہ اجتماعہ" سے انصاف و صداقت کا واسطہ دے کر یہ سوال ہے۔ کہ کیا یہ صورت کسی طرح روج جمہوریت کے مطابق ہے؟ اور کیا اس اسلام کے اصولی مساوات پر کوئی ضرب نہیں لگتی۔ جناب بزمی صاحب کے لب و لہجہ اور انداز میں اہل سنت کے اس عقیدہ پر غور کیجیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریم نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ آپ کے بعد آپ ہی کے قبیلہ قریش میں سے کوئی خلیفہ منتخب کیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی ان ہی سے کسی کو یہ منصب جلیل تفویض کیا جائے اور اسی طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے۔ اب اگر آپ اس عقیدہ کا تجزیہ کریں تو اس سے مندرجہ ذیل ضمنی عقائد مستنبط کر سکتے ہیں :-

- ۱۔ خلافت و امامت صرف قریش کے قبیلہ کے لیے مخصوص ہے۔
- ۲۔ خلیفہ یا امام کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کے لیے بھی قریش ہی کا کوئی آدمی ڈھونڈا جائے گا۔
- ۳۔ اگر دسے زمین کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تب بھی ان میں سے کوئی خلافت کی سند کا مستحق قرار نہیں پاسکتا۔
- ۴۔ دنیا کے تمام مسلمان قبیلہ قریش کی دائمی اور دائمی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں۔

۵۔ اگر دنیا کا کوئی مسلمان سب سے زیادہ متورع، متقی، باہنہ، مدبر، عالی دماغ اور بیدار مغز ہو تب بھی جانشینی کے وقت اس کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ بلکہ قبیلہ قریش میں سے کسی شخص کو مسندِ خلافت و امامت پر ممکن کر دیا جائے گا۔ اب دیکھیے کہ یہ عقائد عقلِ عمومی کے بنیادی اور اصولی مسلمات کے مخالف ہیں یا نہیں۔ اور اس سے دنیا کے کسی گروہ یا جماعت یا قوم کے کسی صحیح اور جائز مطالبہ و خواہش پر ضرب پہنچتی ہے یا نہیں۔ اور یہ عقیدہ دنیا کے بسنے والوں کو ان کے کسی حق سے محروم کرنے کا موجب تو نہیں ہے۔ ان عقائد کا منشاء یہ ہے کہ بنائے اسلام کی خواہش یہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد مسلمانانِ عالم پر ان کا قبیلہ تا قیامِ قیامت سلطانِ وقت کی حیثیت سے حکمرانی کرے اور ان کے قبیلہ کے افراد کے ہوتے ہوئے روئے زمین کا کوئی مسلمان مسندِ خلافت کا امیدوار نہ ہو سکے۔

اب بڑی صاحب کے غور کر لے کی چیز ہے کہ مذکورہ بالا استحقاق کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسلام دنیا میں غیر مستقل مطلق العنانی اور ناجائز نسلی امتیاز کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ دیکھنا ہو گا جیسے آج ہر ہٹلریہ طے کر دے کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ میں اور میرے بعد میرا قبیلہ ابد الابد تک ہر جن قوم پر فرمانروائی کرے۔

بڑی صاحب کا خیال ہے کہ اگر کوئی ڈکٹیٹر اس طرح کا اعلان کرے تو اجماعی "نگار" کا دوسرا پرچہ شائع بھی نہ ہونے پائے گا کہ اخبارات میں موٹے موٹے سرورٹ سے لکھی ہوئی یہ سُرخ پڑھ لیں گے۔ "یورپ کے ایک مخبر و اطوار ڈکٹیٹر کی لاش دریا کے رُسن کے سپرد کر دی گئی۔" اب بڑی صاحب کو اقرار کرنا چاہیے کہ اہل سنت بھی خلافت کے عقیدہ کو جس نوع سے مانتے ہیں وہ نہ صرف انسانیت کے نقطہ نظر سے ناقابلِ قبول ہے بلکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو انسان کے قوائے عمل کی صحیح نشو و نما ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

کر دارا اور گرفتار کی آزادی ابد الابد تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ انسانوں کے مابین امتیاز
افتراق کی ابدی علیحدگیوں میں شامل ہو جائیں۔ ذہنی استعداد اور معاشرتی تفوق و برتری کی وہ
مکررہ نقص پیدا ہو جائے جو انسانیت کو رفتہ رفتہ ہندوؤں جیسی ذات پات کے تصور
سے قریب تر کر دے۔ انسانی عقل و فکر پر پہرے بیٹھ جائیں اور دنیا کے بسنے والے
خدا کے واحد کے علاوہ بہت سے ایسے بتوں کی پرستش کرنے لگیں جن کو پاش پاش
کرنے کی کوشش آج دنیا کے ہر گوشہ میں کی جا رہی ہے۔ چونکہ ترمی صاحب کا بانگ
دہل یہ اعلان ہے کہ میں ایمان و ضمیر کی پوری صداقت و پاکبازی کے ساتھ رب علیل
کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ان نتائج تک پہنچنے میں
فرقہ دارانہ عصبیت و تنگ نظری سے کنارہ کش ہو کر غور کرنے کی کوشش کی ہے جتنی کہ
مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی شیعہ کے گمراہی میں پیدا ہوتا تب بھی غور کرنے کے
بعد میرا عقیدہ یہی ہوتا جو پیش کیا گیا۔ ”خیر سے موصوف کسی شیعہ کے گھر میں پیدا نہیں
ہوئے لیکن اہل تسنن کے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں اہل سنت کے عقیدہ
خلافت کی اس بیباک تصویر سے جو انہی کے الفاظ کے آئینہ میں دکھلائی گئی ہے
اس کا کافی موقع حاصل ہے کہ وہ مذہب اہل سنت سے کن رہ کشی اختیار کریں اور
کسی ایسے مذہب کو اختیار کریں جو اس طرح کی باتوں سے پاک و صاف ہو۔

ممکن ہے آج کل کے روشن خیال اصحاب جو طبقہ علماء سے کافی بدظن ہیں یہ
خیال کریں کہ یہ بعد کے علماء کی کارستانی تھی کہ اصول نے مذہب اہل سنت میں اس رس
کی چیز داخل کر دی، لیکن شروع شروع جب اہل سنت کی معتقدہ خلافت کی بنیاد پڑی تو
وہ بالکل جمہوریت کے اصول کے مطابق تھی۔ اس لیے ذرا چلیے تاریخ کے اوراق الٹ کر
دفات نبوی کے بعد کا دور سامنے لائیں۔ اور سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کی داغ بیل
ڈالے جانے کے منظر کی سیر کریں۔ شیخ المہاجرین حضرت ابو بکر و جناب عمر بن الخطاب کی

پُر زور تقریروں کا مطالعہ کریں۔ دیکھیں کہ ان دونوں بزرگواروں نے جو اس خلافت کا سنگ بنیاد رکھنے والے تھے۔ خلافت کو کن اصولوں پر مبنی کیا تھا۔ میرے سامنے ہے تاریخ طبری ج ۳

صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰

رسول اللہ کی وفات ہوتی ہے، انصارِ ستیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوتے ہیں یہ قرار دیا ہوتا ہے کہ سعد بن عبادہ خلافت کے لیے مقرر کیے جائیں، حضرت عمر کو خبر پہنچتی ہے جو ابھی وفاتِ نبیؐ کے غم میں اتنے بدحواس اور از خود رفتہ تھے کہ مسجد میں تلاوت کھیچے ہوئے سہل رہے تھے کہ جو شخص کہے گا رسول اللہؐ نے انتقال کیا اس کا سر اڑا دوں گا۔ وہ اس خبر کو سنتے ہی آتے ہیں کاشانہ رسالت کی جانب جہاں رسول اللہؐ کی تجنیز و تکفین کا سامان ہو رہا ہے حضرت ابوبکرؓ کو بلوا بھیجتے ہیں۔ وہ عذر کرتے ہیں کہ میں یہاں مصروف ہوں تو کھلوایا جاتا ہے کہ یہاں ایک بڑا غضب ہو گیا آپؐ کا انا ضروری ہے حضرت ابوبکرؓ باہر آتے ہیں۔ جناب عمرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کو نہیں خبر انصارِ ستیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنادیں حضرت ابوبکرؓ اس خبر کو سن کر اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ اندرجار علی بن ابی طالبؓ کے اطلاع تو کر دیں جیسا دنیا کا قاعدہ ہے کہ کسی میت کی تجنیز و تکفین سے بغیر ورت کوئی شخص علیحدہ ہونا چاہے تو اس کے دشمن سے جا کر اپنا عذر بیان کرتا ہے اور رخصت ہوتا ہے لیکن تھا کہ جناب علیؓ بن ابی طالبؓ سے اس کا تذکرہ کیا جاتا تو وہ بھی اپنی کوئی رائے اس اہم مسئلہ کے متعلق ظاہر کر دیتے۔ جبکہ ان حضرات کو آپؐ کی اصابتِ رائے پر اعتماد تھا کہ اپنی خلافت کے دور میں بڑے بڑے اہم معاملات میں آپؐ سے مشورہ لیتے تھے اور آپؐ کے ہدایات پر کاربند ہوتے تھے۔ مگر اس وقت اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی یا کسی حیثیت سے مصرف خیال کیا گیا۔ بہر حال حضرت ابوبکرؓ می سیدھے حضرت عمرؓ کے ساتھ ہو لیے راستہ میں ابو عبیدہ جراحؓ مل گئے انھیں بھی اپنے ہمراہ لیا اور تینوں بزرگوار

سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے دل ہی دل میں ایک تقریر مرتب کر لی تھی۔ اور کچھ پوائنٹس سوچ لیے تھے مگر حضرت ابوبکر نے مجھے تقریر سے روک دیا اور کہا کہ مجھے تقریر کر لینے دو۔ پھر تم بولنا۔ آپ نے جو تقریر فرمائی تو جتنے پوائنٹس میرے دل میں تھے وہ سب اور کچھ اضافہ کے ساتھ آپ نے پیش فرمائے۔ صورتِ حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے لیے پہلے سے نہ کوئی اصول مقرر تھا نہ خاص اسکیم سوچی گئی تھی پس جو کچھ تقریر دل سے ظاہر ہوا اور جس بات پر اس جلسہ کی کاروائی کا اختتام ہوا وہی خلافت کا دستور العمل ہے اور وہی نظام۔

دل تو چاہتا ہے کہ اس تقریر میں کچھ اسلام کی جمہوریت پسندی کا بیان ہو اس کے اصول مساوات کو رد کر دینا اور یہ کہا جائے کہ یہ مسئلہ تمام مسلمانوں کے مفاد سے متعلق ہے کسی جماعتی استبداد سے کام نہ لیا اور امتی جلد بازی نہ کرو بلکہ اس کا انتظار کرو کہ رسول اللہ کی تجہیز و تکفین ہو جائے پھر تمام مسلمانوں کو اطلاع دو۔ اس کے بعد ہم تم مل کر متنقہ مشورہ سے کوئی متحدہ فیصلہ کر لیں گے۔ اور کسی خاص شخص کو جو اس منصب کا اہل ہے معین کریں گے۔ اور اچھی ذہنی ماشم جو خاص رسول اللہ کے دل و جگر میں وہ رسول کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہیں۔ کتنا ظلم ہے کہ ان کو شریک مشورہ بھی نہ کیا جائے اور ہم لوگ خود غرضی سے کام لے کر بطور خود اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیں۔

یقیناً اس طرح کی تقریر ایسی نہ ہوتی جو اس مجمع پر اثر انداز نہ ہو جبکہ خود ان میں کسی حد تک قبائلی اختلاف دلوں میں کارفرما تھا یعنی قبیلہ اوس کے لوگوں کو یہ ناگوار تھا کہ سعد بن عبادہ جو رئیس قبیلہ خزرج ہیں وہ خلافت کے لیے مقرر ہو جائیں۔ یہی وہ چیز تھی جو بالآخر انصار کے خلاف کامیابی کا باعث ہوئی۔ اور یہی اس وقت بھی رہنا ہوتی۔ یعنی قبیلہ اوس کے افراد اس کی تائید کرتے خصوصاً جبکہ وہ ایک بات بالکل "عقار عمر" اور "سائر اجتماع" کے مخالف تھے۔

لیکن حضرت ابوبکر نے جو اس موقع پر تقریر فرمائی وہ ملاحظہ ہو۔ آپ نے بعد حمد و سلاۃ کے کہا :-

ان الله بعث محمد رسولاً
الى خلقه وشهيداً على امتهم
ليعبدوا الله وليوحدهم
ليعيدون من دون الهة شتى
ويسزعون انما لهم عنده شافعة
ولهم نافعة وانساها من حجر
منحوت ونخشب منجور ثم قرأ
او يعبدون من دون الله ما
لا يضرهم ولا ينفعهم ويقولون
هؤلاء شفعاؤنا عند الله وقالوا
ما نعبدهم الا يتصرفونا الى
الله زلفى ، فعظم على العرب
ان يتركوا دين اباؤهم فخص الله
المهاجرين الاولين من
قومه بتصديقهم والايمان
بِهِ والمؤاماة لَهُ والصبر
معه على شدة اذى قومهم
لهم وتكذيبهم اياهم و
حل الناس لهم مخالف

اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا حضرت محمد
مصطفیٰ کو رسول بنا کر اپنے خلق کی طرف
اور گواہ بنا کر اپنی امت پر تاکہ وہ خدا کی
عبادت کریں اور اس کی توحید اختیار
کریں اور یہ لوگ اس کے پہلے مختلف خداؤں
کی عبادت کرتے تھے اور خیال کرتے تھے
کہ وہ اصنام ان کی شفاعت کریں گے اور
ان کو فائدہ پہنچائیں گے۔ حالانکہ وہ ترشے
ہوئے پتھروں اور لکڑیوں کے بنے ہوئے
تھے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اور لوگ
عبادت کرتے ہیں خدا کو چھوڑ کر ان چیزوں
کی جو انھیں نہ نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ
فائدہ ، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفاعت
کرنے والے ہیں اللہ کے یہاں اور کہتے
ہیں کہ ہم ان کی طرف اس لیے عبادت
کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے یہاں تقرب
کا باعث ہوں ، رسول کی بعثت کے بعد
عرب پر بہت گراں گزرا کہ وہ اپنے
آباؤ اجداد کے دین کو ترک کریں تو خدا نے

نزار علیہم فلم یستوحشوا
 لقلۃ عدد دم و شنف الناس
 لهم واجماع قومهم علیہم
 فہم اول من عبد اللہ فی الارض
 وامن باللہ وبالرسل و ہم
 اولیاءوہ وعشیرتہ و احق
 الناس بھذا الامر من بعدہ
 ولا ینازعہم ذلک الا ظالم و
 انتم یا معاشرا الانصار من
 لای نکر فضلہم فی الدین ولا سألکم
 العظیمۃ فی الاسلام رضیکم
 اللہ انصار الدینہ ورسولہ
 وجعل الیکم ہجرتہ و فیکم
 جلتہ از واجہ واصحابہ فلیس
 بعد المہاجرین الاولین عندنا
 بمنزلتکم فنحن الامراء و انتم
 الوزراء لانفتاؤن بمشورۃ ولا نقضی
 دونکم الامور

مخصوص کیا مہاجرین اولین کو جو رسول کی
 قوم سے تھے، آپ کی تصدیق اور ایمان
 اور بخواری اور مبر کے ساتھ ان تکلیفوں پر
 جو خود ان کی قوم والے ان کو پہنچاتے تھے
 اور تمام لوگ ان کے مخالفت تھے اور ان کی
 ذات کے درپے تھے، لیکن یہ لوگ
 گہرائے تہیں اپنی تعداد کے کم ہونے سے
 اور لوگوں کی مخالفت سے اور شفق ہو جانے
 سے ان کے خلاف، یہی لوگ سب سے
 پہلے عبادت کرنے والے ہیں خدا کی زمین
 پر اور سب سے پہلے ایمان لانے والے
 ہیں خدا اور رسول پر اور یہ رسول کے
 عزیز ہیں اور ان کے قبیلہ کے ہیں اور
 تمام لوگوں سے زیادہ ان کے بعد اس
 منصب کے اہل ہیں۔ جو ان سے اس
 بارے میں نزاع کرے گا وہ ظالم ہوگا اور
 تم لوگ اسے جماعت انصار وہ ہر کہتماری
 دینی فضیلت اور اسلام میں تمہارے
 بہترین خدمات کا انکار نہیں ہو سکتا۔ تم
 کو خدا نے منتخب کیا اپنے دین میں اور
 رسوا کی نصرت کے لیے اور تمہاری

وطن ان کی ہجرت قرار دی اور تم میں سے اکثر ان کے ازدواج اور اصحاب ہیں۔ لہذا ہمارے
اولین کے بعد ہمارے نزدیک کوئی تمہارے مرتبہ کا نہیں ہے۔ لہذا ہم لوگ حاکم ہوں اور تم
لوگ وزیر بغیر تمہارے مشورہ کے کوئی کام نہ ہوگا اور ہم معاملات کو بغیر تمہارے طے نہیں کریں گے۔
تقریر ختم ہوئی حضرت ابو بکر بیٹھ گئے۔ خیاب بن منذر انصاری نے کھڑے ہو کر کہا:-

یا معشر الانصار املکو علیکم
امرکم فان الناس فیہکم
وظلکم ولن یجزي حجرتی
علی خلافکم ولن یصدر الناس
الا عن رائیکم انتم اهل العزة
والثروة وادوا لعدد المنعة
والتجربة ذدوا لباس والنجدة
وانما ینظر الناس الی ما تصنعون
ولا تختلفوا فیفسد علیکم رائیکم
وینتقض علیکم امرکم ابی ہولاء
الاما سمعتم فمنا اسیر ومنہم
امیر۔

اے گروہ انصاری تم اپنی حکومت کو اپنے
قبضہ میں لاؤ۔ کیونکہ یہ لوگ تو تمہارے زیر سایہ
ہیں۔ تمہاری مخالفت کی کسی کو جرأت نہیں
ہو سکتی اور بغیر تمہاری رائے کے کوئی بات
طے نہیں پاسکتی۔ تم لوگ اہل عزت و ثروت
ہو، تم کثرت تعداد اور شان و شوکت کے
مالک اور آزمودہ کار ہو۔ تم شجاعت و
جرات کا جوہر رکھتے ہو۔ لوگ سب تمہارے
طرز عمل کے نگران ہوں گے۔ بیشک تم میں
آپس میں اختلافات نہ ہونے پائے ورنہ تمہارا
کام بگڑ جائے گا۔ ایسا بات خراب ہو جائیگی
یہ لوگ اس بات پر رہیں جسے تم نے سن
لیا۔ لہذا ایک حلیفہ ہم میں سے ہو اور
ایک ان میں سے۔

حضرت عمر نے اس تقریر کو سن کر فرمایا:-

ہیحات لا یجتمع اثنان فی
قرن واللہ لا ترضی العرب ان
افہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت
میں دو خلیفہ ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس

يُؤْمَرُكُمْ وَنَبِيَّهَا مِنْ غَيْرِكُمْ
وَلَكِنْ الْعَرَبُ لَا تَمْتَنِعُ أَنْ
تَوَلَّى أَمْرَهَا مَنْ كَانَتْ النَّبِيُّ
فِيهِمْ دَوْلَى أُمُورِهِمْ مِنْهُمْ وَلَنَا
بِذَلِكَ عَلَى مَنْ ابْنِي مِنَ الْعَرَبِ
الْحُجَّةُ الظَّاهِرَةُ وَالسُّلْطَانُ
الْمُبِينُ مِنْ ذَايَا رَعْنَا سُلْطَانُ
مُحَمَّدٍ وَأَمِيرُهُ وَخُنَّ أَوْلِيَاؤُهُ
وَعَشِيرَةُ الْأَمَدَلِ بَيَاطِلُ
أَوْ مُتَجَانِفٌ لَأَثْمٍ أَوْ مُتَوَرِّطٌ
فِي هَلَكَةٍ -

اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ وہ تمہیں
اپنا حاکم تسلیم کریں جبکہ پیغمبر ان کا دوسری قوم
قبیلہ سے ہو۔ لیکن عرب اس بات
سے انکار نہیں کریں گے کہ اس قوم و قبیلہ
کی امارت تسلیم کریں جس میں کہ نبوت رہ
چکی ہے۔ کون شخص ہے ہم سے محمد کی
سلطنت اور ان کی امارت میں نزاع کر
سکتا ہے۔ درحالیکہ ہم ان کے عزیز ہیں اور
ان کے قوم و قبیلہ کے ہیں۔ مگر یہ کہ
کوئی ناحق کوشش ہو یا گناہ کا مرتکب یا
ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والا۔

حجاب المنذر کو غصہ آیا اور سخت لہجہ میں تقریر شروع کی :-

يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ امْكُوا عَلَى
أَيْدِيكُمْ وَلَا تَسْعَوْا مَقَالَةَ هَذَا
وَأَصْحَابِهِ فَيَذْهَبُوا بِنَصِيْبِكُمْ مِنْ
هَذَا الْأَمْرِ فَإِنْ ابْوَا عَلَيْكُمْ
مَا سَأَلْتُمُوهُ فَتَا حُلُوهُمْ عَنْ
هَذِهِ الْبِلَادِ وَتَوَلَّوْا عَلَيْهِمْ
هَذِهِ الْأُمُورَ فَإِنَّكُمْ وَاللَّهِ أَحَقُّ
بِهَذِهِ الْأُمُورِ مِنْهُمْ فَإِنَّهُ بِأَسْيَانِكُمْ
دَاوُدَ لَعْنَةُ الدِّينِ مِنْ أَم

اے گروہ انصار اپنی طاقتوں کو اپنے
ہاتھ میں لاؤ اور اس کے سامتیوں کی
بات نہ سنو جس سے تمہارے حقوق اس
منصب میں تلف ہوں۔ اگر یہ لوگ نہ
مائن تو انہیں اس ملک سے باہر نکال
دو اور خود اطمینان سے حکومت کرو۔
کیونکہ تم بخدا اس امر کے ان سے
زیادہ مستحق ہو۔ کیونکہ تمہاری تلواروں سے
لوگوں نے اس کو سخت اکتاہٹ

یٰٰکَیْدِیْنَ اِنْ جَذٰیْلُهَا الْمَحْلُکُ
عَذِیْقُهَا الْمَرْجِبُ اِمَّا وَاللّٰهُ لَمُنَّ
اَسْکَرُ مَا مَرَّ مِیْدَانٍ اَوْ تَمَّ کَمُوْا اِیْحٰی
اَبْحٰی "ہیں گود ہمیں میدان"
شَتْمٌ سَعِیْدٌ بِهَا جَدْعَةٌ

یہیے سلم لیگ کے موجودہ زمانہ کے جلسوں کا منظر سامنے آ گیا حضرت عمر
نے کہا۔ "اس صورت میں خدا تجھے غارت کرے گا۔" حباب نے بڑھ کر کہا۔ تجھے
کیوں تجھے غارت کرے گا۔ ابو عبیدہ نے بیچ بچاؤ کی۔ "ہاں ہاں اے انصاری تم نے
سب سے پہلے نصرت کی۔ اب تمہیں سب سے پہلے رسول کی تعلیم سے محروم نہ ہو۔"
بشیر بن سعد جو قبیلہ اوس سے تھے اور سعد بن عبادہ کی خلافت کے منصوبہ سے دل میں
مخالفت وہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:-

یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّا وَاللّٰهُ لَمُنَّ
کُنَا اَوَّلٰی فَضِیْلَةٍ فِیْ جِهَادِ الْمُشْرِکِیْنَ
اَسَاقِبَةُ فِیْ هٰذَا الدِّیْنِ مَا
اَرَادْنَا بِهٖ اِلَّا مَرْضٰی رَبِّنَا وَطَاعَةَ
نَبِیِّنَا وَالْکَدْحَ لَا نَفْسًا فَمَا
یَنْبَغِیْ لَنَا اَنْ نُسْتَطِیْلَ عَلٰی النَّاسِ
بِذٰلِکَ وَلَا نَتَّبِعِیْ بِهٖ مِنْ
الدُّنْیَا عَرْضًا فَاِنَّ اللّٰهَ وَلِیُّ
الْمُنَّةِ عَلَيْنَا بِذٰلِکَ اِلَّا اَنْ
مُحَمَّدًا صَلٰی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَامُ
مِنْ قُرَیْشٍ وَقَوْمِهٖ اَحَقُّ بِهٖ وَاَوَّلٰی
وَاَمَّ اللّٰهُ لَا اِبرٰہِیْمَ اِنَّ اللّٰهَ اَنَا نَحْمُہُمْ

اے گروہ انصار خدا کی قسم اگرچہ ہمیں
فضیلت حاصل ہے مشرکین سے جہاد اور
دینی خدمات کی مگر ہمارا مقصد اس سے صرف
خدا کی خوشنودی اور رسول کی اطاعت اور
اپنے نفس کی اصلاح تھی۔ اب ہمارے لیے
ہرگز مناسب نہیں ہے کہ اس کے سبب سے
لوگوں پر تفوق کی کوشش کریں اور اپنے خدمات
کا دنیاوی فائدہ حاصل کریں۔ اگاہ ہو کہ
حضرت محمد مصطفیٰ قریش سے تھے اور ان ہی
کی قوم قبیلہ کے افراد ان کی خلافت کے
زیادہ حقدار ہیں۔ خدا کی قسم میں تو اس امر میں
ان سے نزاع ہرگز نہیں کروں گا۔ تم لوگ

هذا الامر ابدانا فتوالله ولا تخافوهم
خدا کا خوف کرو اور ان کی مخالفت اور
منازعت سے باز آؤ۔

یہی معاملہ درست ہو گیا۔ حضرت ابو بکر نے غرار ابو عبیدہ کا نام پیش کیا کہ
ان میں سے کسی ایک کی بیعت کر لی جائے، ان دونوں بزرگوں نے حضرت ابو بکر کی
سفارش کی۔ بشیر بن سعد نے بڑھ کر آپ کی بیعت کی اور عمرو ابو عبیدہ نے بھی فوراً
بیعت کر لی۔ جلسہ میں برہمی پیدا ہو گئی (رحمہم اللہ) کا معکوس منظر سامنے آ گیا۔ بعض انصار
بشیر بن سعد کو گالیاں دینے لگے، ادھر کے لوگ غصہ میں ادھر بڑھے۔ سعد بن عبادہ
نہت روندن میں آگئے۔ کسی نے کہا سعد کا خیال کرو پا مال نہ کرو۔ حضرت عمر نے کہا اسے
قتل کرو خدا اسے قتل کرے اور سرانے کھڑے ہو کر کہا کہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تجھ کو اپنے
پیر سے اس طرح کچھول کر تیری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ سعد حضرت عمر کی دائرہ پکڑ لیتے ہیں
حضرت ابو بکر بڑھ کر چہرہ دیتے ہیں اور حضرت عمر کو سمجھا کر الگ لے جاتے ہیں۔ رسول اللہ
کی خلافت پانچ تھیل پر پہنچتی ہے اور دو پوری اسکیم اس ننگا می صورت سے مرتب ہو
جاتی ہے جو آج تک شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد ہے۔

ابھی حضرت عمر کو پورے طور سے اطمینان حاصل نہیں تھا کہ جو کاروائی ہم نے کی ہے
اس میں ہم آخر تک کامیاب بھی رہیں گے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ عام خلقت بھڑیا دھسان
ہوتی ہے قبیلہ اسلم کے اعراب کو جو اطراف مدینہ میں مقیم تھے یہ خبر پہنچتی ہے کہ رسول
اللہ کی وفات ہو گئی اور ہزاروں آدمیوں کی تعدادیں مدینہ آ جلتے ہیں۔ اس طرح کہ
ان سے گلی راستے مدینہ کے پُر ہو جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ خلیفہ رسول اکون ہے
اور کوئی کہہ دیتا ہے کہ حضرت ابو بکر خلیفہ منتخب ہو گئے اور وہ ایک دم سے حضرت
ابو بکر کی بیعت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عمر کی مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔ خود
ابو بکر فرماتے ہیں: "ما اصابنا من الخوف الا اننا قد اقمنا ما امرنا به"

کو میرا دیکھنا تھا کہ میں سمجھا کہ فتح و ظفر میں حاصل ہو گئی۔

آپ کا یہ سمجھنا بالکل باطل تھا۔ کیونکہ ان ہزاروں آدمیوں کی بیعت کرنے کے بعد اب کتنی ہی معقول دلائل کے ساتھ کوئی مخالفت کرتا لیکن اسے باغی کہہ کر مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو عرب کے ان قبائل کا جنہوں نے حاکم موجودہ کی اطاعت سے انکار کیا اور ”مرتدین“ کے نام سے ان کے ساتھ جہاد ایک اسلامی فریضہ بنا کر ضروری سمجھا گیا۔



بہر حال گذشتہ تقریروں اور ان کے نتیجے سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت کو کس اصول پر مبنی قرار دے کر کامیابی حاصل کر لی گئی۔ انصار کے منہ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ رسول جس قبیلہ سے تھے اسی قبیلہ میں خلافت بھی ہونی چاہیے۔ اور اس کے اوپر اصرار کے سلسلہ میں کالم طوچ اور ہاتھ پائی سب کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور اس دور زدوری اور وقتی دھاندلی سے جو خلافت حاصل ہوئی اس کے ماننے والے آج کہہ رہے ہیں کہ نسلی امتیاز کو معیار خلافت قرار دینا عقل عمومی اور حاسنہ اجتماعیہ کے خلاف ہے۔ اور وہ اسلام کی روح جمہوریت و مساوات کے منافی ہے۔ انصار کے مقابلہ میں جو دلائل پیش کیے گئے ان کی کامیابی کے لیے ضرورت اسی بات کی تھی کہ بنی ہاشم کا کوئی نمائندہ اور خصوصاً حضرت علی بن ابی طالب اس مجمع میں نہ ہوں۔ ورنہ جتنے دلائل استحقاق خلافت میں پیش کیے گئے سب کا نتیجہ معکوس ہو جاتا۔ پہلی دلیل ہے سبقت الی الاسلام والعبادۃ (فہم اول من عبد اللہ فی الارض وامن باللہ ویا الرسول) حالانکہ اب کہا جاتا ہے کہ دیکھیے نیاز صاحب کا محاکمہ، اور جلیل الرحمن صاحب اعظمی کا مضمون اور اس کا تبصرہ کہ سبقت الی الاسلام کو خلافت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہر حال اگر علی بن ابی طالب موجود ہوتے تو

وہ اے شخصی حیثیت سے اپنے اوپر منطبق کرتے۔ جیسا کہ بعد میں انھوں نے کہا (اصنت قبل ان یومن ابو بکر واسلمت قبل ان یسلم ابو بکر) یعنی میں ایمان لایا قبل اس کے کہ ابوبکر ایمان لائیں اور اسلام آیا قبل اس کے کہ وہ مسلمان ہوں۔“ دوسری دلیل قرابت اور ہم قومی۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ جس طرح قریش کو انصار کے مقابلہ میں ترجیح حاصل تھی اسی طرح بنی ہاشم کو تمام قبائل قریش کے مقابلہ میں۔ اور ذریت رسول کو تمام بنی ہاشم سے۔ اسی لیے جب حضرت علیؑ کو سفینہ کے حالات معلوم ہوئے اور یہ سنا کہ قریش نے یہ استدلال پیش کیا کہ ہم شجرۃ الرسولؐ ہیں اس لیے خلافت کا حق ہم کو حاصل ہے تو آپؐ نے فرمایا ”تعلقوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ“ ”دشت کا تو خیال کیا اور میوہ کو ضائع کر دیا۔“

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی روح جمہوریت و مساوات کا خیال مد نظر تھا تو خلافت کے لیے انصار کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی جاتی۔ بلکہ سب سے پہلے یہ مثال قائم ہوتی کہ رسولؐ سے بالکل اجنبیت رکھنے والے غیر قوم و قبیلہ کے شخص کو خلافت کے لیے منتخب کیا جاتا اور خود مہاجرین اپنی پوری طاقت اس کی تائید و حمایت و اتباع و اطاعت میں مبذول کر کے اقوام عالم کو دکھلا دیتے کہ اسلامی خلافت کس جمہوریت و مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ مگر انیسویں صدی کے ایسا نہیں ہوا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خلافت اگر کسی نص پر مبنی تھیں ہے اور شیعوں کا نقطہ نظر خلافت کے بارے میں صرف قرابت کے اصول پر مبنی ہے تو اس کا سنگ بنیاد حقیقتہً سفینہ میں پڑا ہے۔ اور حضرت ابوبکر و عمر اس نظریہ کے سب سے پہلے قائم کرنے والے ہیں۔ جسے آج تمام مسلمانوں کے حقوق پر ضرب کاری کہا جا رہا ہے۔ اسلامی خلافت جمہوری اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ مگر ذرا دیکھیے تو کہ رسول اللہؐ کی زندگی میں اسلامی حلقہ کتنے وسیع ہو چکا تھا۔ لیکن اس تمام حلقہ کی کسی طرح کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔ خاص مدینہ میں اور وہ ہمہ جہت آدمیوں کی جانب سے اس مسئلہ کو

طے کیا گیا جس کی بنیاد پر یہ اصول قائم ہو گیا کہ اگر دو چار آدمی اہل حل و عقد سے جمع ہو کر کسی کو خلافت کے لیے نامزد کریں تو وہ خلیفہ رسول مقرر ہو جائے گا جس کے بعد کسی کو اختلاف، حق نہ ہوگا۔ اور کوئی اختلاف کرے تو قابلِ گردن زدنی ہوگا۔
 ملاحظہ ہو شرح مواقف (مطبوعہ نول کشور ۱۳۳۳ھ)

اذ ثبت حصول الامامة بالاختيار
 والبيعة فاعلم ان ذلك الحصول
 لا يقتصر الى الاجماع من جميع اهل
 الحل والعقد اذ لم يقم عليه اى
 على هذا الافتقار دليل من العقل
 والسمع بل الواحد والاثنيان من
 اهل الحل والعقد كاف في ثبوت
 الامامة ووجوب الاتباع
 على اهل الاسلام وذلك لعلنا
 ان الصحابة مع صلاحيتهم
 في الدين وشدة محافظتهم
 على امور الشريعة كما هو حتما
 اکتفوا في عقد الامامة
 بذلك من الواحد والاثنيان
 كعقد عمر لابي بكر وعقد
 عبد الرحمن بن عوف لعثمان
 رضي الله عنهم لانهما اقرقاها

جبکہ ثابت ہو چکا کہ امامت عامۃ الناس
 کے انتخاب اور بیعت سے ثابت ہوتی ہے
 تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے لیے
 اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تمام ارباب
 بست و کشاد متفق ہوں۔ کیونکہ اس پر
 کوئی عقلی و نقلی دلیل نہیں ہے۔ ایک
 یا دو اہل حل و عقد کا بیعت کرنا کافی ہے
 اس امر کے لیے کہ امامت ثابت ہو جائے
 اور اس امام کا اتباع تمام اہل اسلام پر
 واجب ہو جائے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے
 کہ صحابہ نے باوجود مذہبی امور میں سخت
 ہونے کے اور شرعی احکام کے
 پورے طور پر پابند ہونے کے امامت
 کے منعقد ہونے میں اسی ایک یا دو کی قرارداد
 کو کافی سمجھا۔ جیسے حضرت عمر کا رائے دینے
 حضرت ابو بکر کے لیے اور عبد الرحمن بن عوف
 نے عثمان کے لیے۔

اجتماع من فی المدینہ من
 اہل الحل والعقد فضلا من
 اجماع الامۃ من علماء امصار
 الاسلام ومجتہدی جمیع اقطارہا
 ہذا کما مضی ولم ینکر علیہ احد
 وحلیہ اى علی الاکتفاء بلو معدوا
 لآئینین فی عقد الامامۃ افتوت
 الاعصار لبعیدہم الی وقتنا ہذا۔

شرط ضروری نہیں تھی کہ خاص مدینہ کے
 تمام حل و عقد ہوں چہ جائیکہ تمام ممالک
 اسلامیہ کے مسلمانوں کا اجماع اطراف دنیا
 کے مجتہدین کا اجماع و اتفاق۔ جیسا کہ
 سابق میں گزرا اسی طریقہ پر ایک یا دو
 کا مقرر کرنا امامت کیلئے کافی سمجھا جانے
 پر زمانہ کے درق لٹتے رہے ان کے بعد سے
 برابر آج کے دن تک۔

یہی ہے وہ جمہوری اصول خلافت جس کو تمام افراد اسلام کے حقوق کی مراعات
 کا ذریعہ بتایا جا رہا ہے اور اسے "عقل عمومی" اور "حساسۂ اجتماعہ" کے مطابقت کی سند
 عطا کی جا رہی ہے۔ اچھا حضرت ابوبکر خلیفہ ہو گئے اور ماننے کے اجماع امت سے
 ہوئے۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمران کی خلافت استخلاف کے ذریعہ سے ثابت
 ہوتی ہے۔ یعنی حضرت ابوبکر اپنے بعد کے لیے ان کو خلیفہ بنا جاتے ہیں۔ اور ایک
 عجیب انوکھے طریقہ سے لوگوں سے اس کا اقرار لیا جاتا ہے جس کی مثال شاید دنیا نے
 تاریخ میں اس کے سوا نہ مل سکے۔ ملاحظہ ہو شرح عقائد انسانی۔

ان ابا بکر لما الیس من حیاتہ دعاً
 عثمان رضی اللہ عنہ واملاً علیہ
 کتاب عہدہ لعمران فلما کتب
 ختم الصحیفۃ واخرجہا الی
 الناس امرہم ان یألوا
 لمن فی الصحیفۃ فآلوا

حضرت ابوبکر جب اپنی زندگی سے یالوں
 ہوئے تو حضرت عثمان کو بلوایا اور انکو لکھائی حضرت
 عمر کی خلافت کی دستاویز جب یہ لکھی جا چکی
 تو اس کاغذ کو سر مہر کیا اور بند کاغذ کو لوگوں کے
 سامنے باہر نکالا اور حکم دیا کہ وہ بیعت کریں
 اس شخص کی جس کا نام کاغذ کے اندر تحریر ہے۔

حتی مرت بعلمی دن فقال سب سے اسی طرح بیعت کی جب حضرت علیؑ کے پاس
 با یعنا لمن کان فیہا یہ کاغذ آیا تو آپ نے کہا ہم نے بیعت کی اس شخص کی
 وان کان فیہا عمر۔ جس کا نام اس میں ہے۔ اگرچہ وہ عمر ہوں۔

یہ خلیفہ کے انتخاب کی لائری مٹی جس پر ادارہ خلافت کی جانب سے لوگوں سے
 بیعت لی گئی۔ تاریخ طبری سے صحت ظاہر ہے کہ صحابہ حضرت عمرؓ کی ولیعہدی پر رفاہی
 نہ تھے۔ (ملاحظہ ہو ص ۵۲ جلد ۱) عبدالرحمن بن عوفؓ بیماری کی حالت میں حضرت ابوبکر
 کے پاس آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "انی ولیت امرکم خیرکم
 فی نفسی فطاکم ورم الفہ ذلک یرید ان یکون الامر لدوخلہ" میں نے
 اس شخص کو مقرر کیا جو میرے نزدیک تم سب میں بہتر ہے۔ تو تم میں سے ہر ایک کی ناک
 پھول گئی اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ خلافت کا منصب اس کے لیے ہوتا اور عمر کو نہ ملتا۔
 اب آپ دیکھیے کہ رسول اللہؐ کا کسی کو مقرر کر جانا اصول جمہوریت کے خلاف
 قرار دیا جائے اور اسے مسلمانوں کے حقوق پر ضرب کاوی سمجھا جائے لیکن حضرت ابوبکر
 کی مستبدانہ کاروائی بالکل درست اصول جمہوریت کے مطابق اور عقل عمومی و عامہ
 اجتماعہ کے موافق ہو۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت کا مسئلہ کس طرح
 مقرر ہوا؟ کہ حضرت عمرؓ نے ایک چھ آدمیوں کی کمیٹی بنادی کہ یہ لوگ اپنے میں سے
 کسی ایک کو منتخب کر لیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام مشرق و مغرب کے
 مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ان چھ آدمیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور کسی دوسرے شخص
 کو رائے زنی کا حق باقی نہیں رہا۔ پھر چونکہ یہ چھ آدمی بھی جمہور قوم کے منتخب کیے ہوئے
 نہیں ہیں بلکہ پیشرو خلیفہ نے انھیں منتخب کر دیا اس لیے حقیقتاً اس میں تمام ذمہ داری
 انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ اب اسے جانے دیجیے کہ ان افراد کے انتخاب میں کیا صوتیں
 ملحوظ رکھی گئی ہیں اور عبدالرحمن بن عوفؓ کو اس کمیٹی کا صدر کس لیے قرار دیا گیا تھا اور

کمپنی کی کاروائی میں کیا چابک دستیائیں عمل میں آئیں۔ اس سب کو جاننے دیجیے کمپنی نے انتہائی دیانتداری کے ساتھ بھی فیصلہ کیا ہو لیکن آخر اس فیصلہ میں جمہور قوم کے کسی فرد کو حق رائے دہندگی کا حاصل نہ ہونا کیا ان کے حقوق پر ضرب نہیں ہے۔ اور کیا اس سے ان کی آزادی و حریتِ ضمیر کو صدمہ نہیں پہنچتا اور کیا اس کو استبداد کے علاوہ کچھ اور بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہے اس پوری خلافت کی تشکیل کی سرگزشت جس سے اصولی حیثیت سے اختلاف رکھنے کی بنیاد پر آج شیعہ اسلام اور انسانیت کے وسیع احاطہ سے خارج کیے جا رہے ہیں۔ اور انھیں ”عقل عمومی“ اور ”عامۃ اجتماعیه“ کا مخالفت بتایا جا رہا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ حق و حقیقت کی قسم شرفِ انسانیت کی قسم، راستی و حقانیت کی قسم کہ مذہبی تعصبات کو بالکل ہٹاتے ہوئے ایک غیر جانبدار انسان کی حیثیت سے جہاں تک غور کرتا ہوں میری تو یہی سمجھ میں آیا ہے کہ اگر خلافت کوئی چیز ہے تو جو شیعہ کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے وحی الہی کی بنا پر اپنے بعد کے لیے خلیفہ کو نامزد کر دیا۔ اور اس کا اظہار فرمادیا جس کے بعد پھر مسلمانوں کو اپنی طرف سے انتخاب و اختیار کا حق باقی نہیں رہا۔ تو یہی ٹھیک ہے اور خلافت اس صورت پر واقعیت رکھتی ہے۔ اور یا پھر یہ ”دفتر بے معنی غرقِ مے نابِ ادلیٰ“ یہ خلافت کا ڈھونگ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ بلکہ خوارج کا مسلک ٹھیک ہے کہ جب ضرورت ہو جہاد کا موقع پیش آئے تو وقتی حیثیت سے اپنے میں سے ایک حاکم مقرر کر لیں اور اس کے آگے نہ خلافت کوئی چیز ہے اور نہ خلیفہ کو کوئی مذہبی حیثیت حاصل ہے۔

شیعی مذہب کی کتنی غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ ان الفاظ میں کہ:-
 ”نہی امتنا من جہاد کے ماتحت اولاد رسول ﷺ کے تمام انسانوں

پر ابوالاباذ تک حکمران ہونے کی حقدار ہے اور آل علی کا ہر بچہ ماں کے پیٹ سے یہ استحقاق لے کر پیدا ہوا کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی گردنیں اس کے سامنے عقیدت و احترام کے ساتھ خم ہو جائیں محض اس لیے کہ وہ ”یکے از آل علی“ ہے۔

یہ صورت گری اس وقت درست ہو سکتی تھی جب شیعہ انتخاب و اختیار کو عام خلق کے سپرد قرار دے کر پھر آل علی میں سے ہونا اس کی شرط قرار دیتے لیکن جبکہ وہ نص پر مبنی ہے اور اس لیے جس کے واسطے نص ثابت ہو وہ مخصوص ذات ہی خلافت کی مستحق ہے تو اب کسی کو بھی آل علی میں سے صرف آل علی ہونے کی بنا پر یہ استحقاق نہیں پہنچتا کہ وہ دنیا پر حکمرانی کرے۔ شیعوں کے مذہب کی یہ خصوصیت بالکل نمایاں ہے کہ وہ دنیا کے ان بادشاہوں کو جو فاطمی النسل ہوں اور غلوی نژاد بالکل ہامی نظر سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کو۔ اور ہرگز کسی مذہبی حیثیت سے ان کے قائل نہیں ہیں۔

استملائی بے مانگی کا کتنا حسرتناک مظاہرہ ہے ”خلافتِ ائیمہ“ کے عقیدہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے سرآغا خاں اور طاہر سیف الدین کی اور ان کے اتباع کی مثال پیش کرنا اور اس پر یہ دعویٰ کرنا کہ اگر تمام مسلمان ”الوہی خلافت“ کے مسئلہ پر ایمان لے آتے تو تمام چالیس کروڑ فرزندِ ان توحید کا یہی عالم ہوتا۔ دنیا کو معلوم ہے کہ ”خلافتِ ائیمہ“ کا عقیدہ شیعہ جماعت کا طرہ امتیاز ہے۔ اور شیعوں کا وہ فرقہ جو دنیا کے ہر حصہ میں پوری کثرت تعداد کے ساتھ موجود ہے اور کم از کم دو کروڑ افراد اس کے تو خود ہندوستان میں موجود ہیں وہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ ہے۔ اگر ”خلافتِ ائیمہ“ کے عقیدہ کو اختیار کرنے کے لوازم میں سے ہوتا، وہی تاریک منظر جو جناب ترمذی صاحب کے اظہار کے مطابق آسمان خانی یا داؤدی جماعت میں ہے

تو مومن کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جا کر ان دونوں مخصوص محدود فرقوں کی مثال تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیا یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ "ابوہی خلافت" کے نتائج کے دکھلانے میں سرآغا خان اور طاہر سعید الدین کی مثال پیش کی جائے۔ جہنیں شیعوں کا قابل لحاظ طبقہ امام "منعروض الطاعہ" نہیں مانتا ہے اور اپنی "جمہوری خلافت" کے نتائج کے لیے جو براہ راست "عقل عمومی" اور "حساسہ اجتماعیہ" کے مطابق ہے؟ "دشمن" اور "لفظ" کے سراپا رنگین اور حسن پرور "خلافت کد" کا جائزہ نہ لیا جائے جہاں "آفتاب و مہتاب" کے جلوے اور "ذہرہ و مشتری" کے نئے "خلافت رسول" کی "مقدس سند" کی رمزیت کو ہر وقت دہرایا کیے ہوئے تھے اور بے گن ہوں کے خون کی تحریروں "دیہیم خلافت" کے دل افروز نقش و نگار تھے۔ مضمون اب نگار کے وسعت و اماں کے حدود سے بہت بڑھ رہا ہے۔ ورنہ یہاں بہت کچھ لکھا جاتا۔ اور وہ رنگیں مرتعے کا قندپہ کھینچ کر پیش کر لیے جاتے۔ جہاں ہر قدم پر گر شمرہ دامن دل سیکند کہ جائی نجاست "اوسیت" کے عقیدہ کا نتیجہ "اصنام باطل" کی پرستش اور نمرودیت و فرعونیت کی نشوونما اگر قرار دی جا سکے۔ "رسالت الہیہ" کے عقیدہ کا نتیجہ "مسلمہ" "سماج" "مذہب" "غیبی" وغیرہ کے طرز عمل کو ٹھہرایا جا سکے تو بے شک "خلافت الہیہ" کے نتائج میں اس قسم کا بہت سی مثالوں کا شمار کرنا بالکل درست ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور کوئی غریہ اپنے غلط محل الطباق کی وجہ سے مورد الزام نہیں ہو سکتا۔ تو اس قسم کی کوئی مثال بھی شیعہ فرقہ کے نظریہ "خلافت الہیہ" کو بحیثیت نظریہ غلط ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ شیعوں نے امت میں عصمت کی شرط اس سے لگائی ہے کہ ان تمام مفاسد کا سد باب ہو سکے جو خطا کار ہستیوں کے حاکم بن اور پیشوائے مذہب بن جانے سے نمودار ہو سکتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ فرقہ کے حقیقی ائمہ اپنے معیار زندگی کے لحاظ سے ہمیشہ ایسے اوصاف

۵۷۲

کے حامل رہے جن کی بنا پر باوجود حکومتِ وقت کی مخالفت اور معاندین کی کثرت کے ان کی زندگی کا تقدس اور اخلاق کی بلندی آج بھی موافق و مخالفت میں ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اسے بھی زیرِ نظر مقالہ کا ایک باب سمجھیے جسے اختصار کی غرض سے یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔



jabir.abbas@yahoo.com

۵۴۳

مسئلہ خلافت و امامت

jabir.abbas@yahoo.com

ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے

jabir.abbas@yahoo.com

مسئلہ خلافت و امامت

استحقاق خلافت کے کیا شرائط ہیں؟

اور کیا وہ خلفائے ثلاثہ میں موجود تھے اور حضرت علیؓ میں مفقود؟

اس بحث کے سلسلہ میں پہلے خلافت کے مفہوم پر بحث کی جائے گی۔ اور پھر اس کے شرائط پر روشنی ڈالی جائے گی۔

خلافت کا مفہوم "خلافت" کے معنی شیعہ نقطہ نظر سے یہ ہیں کہ کسی شخص کا رسول کے بعد بحیثیت جانشین، امام یعنی پیشوائے خلق ہونا؟ امامت کے معنی لغت میں بھی پیشوائی ہی کے ہیں۔ شیعہ بھی اس لفظ کا اطلاق اسی معنی میں کرتے ہیں بیشک وہ پیشوائی مطلق کا درجہ کسی کو بغیر انتخاب الٰہی کے دینے میں صحیح نہیں سمجھتے اور اسی لیے امامت ان کے نزدیک "رسالت" و "نبوت" کی طرح کا ایک منصب ہے جو خدا کی طرف سے کسی بہتی کو عطا ہوتا ہے۔ وہ بہتی کبھی اس کے ساتھ نبی و رسول بھی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ (اتّٰی جاً علّٰی للنّاس اماماً) اور کبھی بحیثیت خلیفہ رسول اس منصب پر فائز ہوتی ہے۔

امامت کے لیے "م۔ ح" صاحب نے مذہب شیعہ کی طرف جو خصوصیات منسوب کیے ہیں کہ امامت ساری دنیا میں صرف قریش کے لیے مخصوص ہے اور پھر قریش میں سے بھی صرف بنی ہاشم کے لیے اور بنی ہاشم میں سے بھی صرف علیؓ اور اولاد علیؓ کے لیے الخ

اللہ کو رضا مند کرنا لازم۔ رسول کو بھی رضا مند کرنا ضروری۔

(واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مؤمنین)

اللہ اعمال کا نگران ہے، رسول بھی اسی طرح اعمال کے نگران ہیں۔

(وسبوی اللہ عمدکھ ورسولہ)

اللہ کے لیے عزت ہے اور رسول کے لیے بھی اسی طرح عزت حاصل ہے۔

(لذہ العزۃ ورسولہ)

ترازو کے ایک پلہ میں نبوت ہے اور دوسرے میں الوہیت۔ مذہب اسلام

قول رہا ہے اور دونوں پلے برابر ہوتے ہیں۔

پھر اگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ رسول پر ایمان، رسول کی اطاعت

رسول کی ولایت، رسول کی محبت، رسول کی عزت جو کچھ بھی ثابت ہے وہ اللہ کے

رسول ہی ہونے کی حیثیت سے ہے اس لیے وہ اللہ کے ہم پلہ نہیں قرار پاسکتے تو اسی

طرح امام کی اطاعت، پیروی جو کچھ بھی لازم ہے وہ خلیفہ رسول ہونے کی حیثیت سے

اس لیے امام اپنے پیشور رسول سے بالکل مساوی کسی طرح قرار نہیں پاسکتے۔ معصوم اور

مفترض الطاعت ہونے سے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ائمہ رسول کے برابر ہو جائیں کیونکہ

انبیائے سابقین سب معصوم تھے۔ اور اس میں بھی کیا شبہ کہ ہر ایک اپنے زمانہ

میں مفترض الطاعت بھی تھا۔ لیکن پھر بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ تلت الرسل فضلنا

بعضہم علی بعض (ان پیغمبروں میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے) اور

مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر تمام دوسرے انبیاء سے افضل تھے۔

اسی طرح رسول کے درجہ نبوت کے خصوصیات وہ رسول کے ساتھ مخصوص ہیں

ہرگز ائمہ کے لیے حاصل نہیں ہیں۔ پھر بھی ہر امام کی اطاعت اس کے زمانہ میں خلق

خدا پر اس طرح واجب ہے جس طرح رسول کی اطاعت، اور چونکہ حکام برائے

حقیقی علم کا ذریعہ ہر زمانہ میں وہ امام ہی ہے۔ اس لیے ما اتکم الرسول فخذوه و ما نہاکم عنہ فانتہوا پر عمل کی ہر زمانہ میں یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ما اتاکم الامام فخذوه و ما نہاکم عنہ فانتہوا اور یہ قانون برابر پر امام کیلئے ثابت ہے (و کذا اللہ عجری لائمة الہدی واحد بعد واحد)

امام کے لیے تشریع احکام کا اپنی جانب سے ہرگز حق نہیں ہے لیکن بہت بار مصلح جزئیہ و ضروریات و فقیہ قوانین کلیہ کے تحت میں بہت سی حلال باتیں عارضی طور پر حرام اور بہت سی حرام چیزیں بطور کلیہ عارضی طور پر حلال ہو سکتی ہیں۔ اس کا نگران اپنے وقت میں امام ہی ہے۔ اس سے ہرگز امام کی مساوات یا افضلیت رسول سے ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ درجہ تو ایک ناقص حد تک عام مجتہدین کے لیے بھی حاصل ہے چہ جائیکہ امام۔

چونکہ ائمہ زجوان رسول ہیں اور رسول ترجمانِ حق اس لیے کیا شبہ کہ "امام پر اعتراض کرنے والا اُن کے کسی حکم کی بابت مثل اس کے ہے جو حق را اور رسول پر اعتراض کرنے والا ہے۔ اور امام کی رد کرنے والا ویسا ہی ہے جیسے اُس نے خدا کی بات کو رد کیا۔"

شیعہ چونکہ امامت کے مسئلہ کو خدا و رسول کی جانب سے سمجھتے ہیں اس لیے کوئی قابلِ تعجب امر نہیں کہ وہ اس کے اقرار کو جزو ایمان قرار دیں۔ یا لیکن مذہبِ محمدیہ کیونکہ وہ (وما اُخذ الی السبی) میں داخل ہے جس پر ایمان ہر مسلمان کا فرضیہ ہے مگر حیرت کے لائق ہے یہ کہ خلافت کے مسئلہ کو خدا و رسول سے باطل غیر متعلق قرار دے کر بھی اس کو مذہبی حیثیت سے انتہائی اہمیت دی جائے اور مدارِ نجات قرار دیا جائے۔

ما حظہ ہو، علامہ ابن حزم کی کتاب "المحتل" مطبوعہ مصر، جلد ۱ صفحہ ۱۴۵۔

لايجوز ان يكون في الدنيا الا امام واحد فقط ومن
بات ليلة وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية
”دنیا میں بس ایک ہی امام ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک رات بھی گرائے
اس حالت میں کہ اس کی گردن میں کسی امام کی بیعت نہیں ہے، تو وہ
جاہلیت (کفر) کی موت مرے گا“

اب اس خلافت کا باہ و جلال دیکھنے کے قابل ہے جو اپنے ہی ماعتول کی تراشی
ہوئی ہے، مگر اس کی عمارت کا کارخ بند نبوت و رسالت سے ٹکرا رہا ہے۔
اور احکام خدا میں تغیر کا اختیار بھی بعض علمائے اہل سنت نے خلفاء کو دے
دی ڈالا۔ چنانچہ علامہ ابن قیم زاد المعاد فی ہدی خیر العباد (مطبوعہ مصر ج ۳۳) میں
مسئلہ متعبد پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

فان قيل فبا التصنعون بما رواه مسلم في صحيحه عن جابر
بن عبد الله قال كنا نستمتع بالقبضة من التمر والدين
الايم على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وابي بكر
حتى نهى عنها عمر في شان عمر و بن حريث وفيما ثبت عن
عمر انه قال متعتان كانتا على عهد رسول الله صلى الله
عليه وسلم انا انهى عنهما متعة النساء ومتعة الحج
قيل الناس في هذا اذ ائفتان طائفة تقول ان عمر هو الذي
حرما ونهى عنها وقد امر رسول الله صلى الله عليه
وسلم بايتاع ما ستم الخافاء الراشدون -

”اگر کوئی دریافت کرے کہ کیا صورت کرو گے اس روایت کے متعلق جو
مسلم نے اپنی صحیح میں جابر بن عبد اللہ سے نقل کی ہے کہ ہم ایک مٹھی

ختمے اور آٹے کے عوض میں برابر متعہ کرتے رہے۔ جناب رسالتاً بے اور پھر ابو بکرؓ کے زمانے میں 'یہاں تک کہ عمر نے اس سے مانعت کی عمر بن حویش کے معاملہ میں اور اس روایت میں جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ دو متعہ عبد رسولؐ میں تھے اور میں ان سے مانعت کرتا ہوں۔ ایک متعہ نسا اور دوسرے متعہ الحج؟ تو جواب میں کہا جاتا تھا کہ لوگ اس کے متعلق دو گروہوں پر منقسم ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ ہی وہ ہیں جنھوں نے متعہ حرام کیا اور اس سے مانعت کی اور جناب رسالتاً بے نے حکم دیا تھا، خلفائے راشدین کے احکام پر عمل کرنا اور انکی سنتوں کے اتباع کا۔“

حضرت اہل سنت نے خلافت کی تعریف اپنے مذاق پر کی ہے (شرح موعظ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ص ۷۹)

قال قوم من اصحابنا الامامة رياسة عامة في امور الدين والدنيا لشخص من الاشخاص - ونقص هذا التعريف بالنبوة والاولى ان يقال هي خلافة الرسول في اقامة الدين وحفظ حوزة الملة بحيث يجب اتباعه على كافة الاممة -

”ہمارے بعض علمائے ماہرے کہ ”امامت“ ہمہ گیر حکومت ہے، دین و دنیا کے تمام امور میں کسی خاص شخص کے لیے اشخاص میں سے۔ اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں نبوت داخل ہو جاتی ہے۔ اور بہتر یہ تعریف ہے کہ وہ رسولؐ کی نیابت ہے دین کے قائم کرنے میں اور ملت کی اجتماعی مرکزیت کو محفوظ رکھنے میں اس طرح کہ اس کا اتباع تمام امت پر واجب ہو۔“

میرے گذشتہ مضمون کو پورا پڑھیے۔ معلوم ہوگا کہ میں نے خلافت کے مفہوم پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ اور نہ کوئی اس کی تعریف از روئے اصطلاح شرعی بیان کی ہے۔ لیکن ”ہزنام“ صاحب نے اپنے آخری مضمون میں جو نیا نہ صاحب کے محاکمہ کے بعد لکھا ہے اس سلسلہ میں کہ خلافت کا تعلق مذہب کے ساتھ ہے یا نہیں یہ لکھا تھا کہ ”خلافت کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ ”النیابة فی امور الدین والدنیا“، تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔“

میں نے اپنے مضمون میں ہزنام صاحب کے اس استدلال کا صرف حوالہ دیا تھا لیکن ”م۔ ح“ صاحب نے بہت اطمینان کے ساتھ میری جانب نسبت دی ہے کہ ”صاحب تبصرہ نے خلافت کی از روئے اصطلاح شرعی تعریف یوں بیان کی ہے کہ ”ھی النیابة فی الدین والدنیا“، خلیفہ اور دینی (مذہب) وغیر دینی (دنیوی) میں نبی کا نائب ہوتا ہے۔“

اس پر آپ نے دو ایراد فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ خلیفہ نبی کا نائب دین کے ایک شعبہ میں ہوتا ہے۔ یعنی نشر و نفاذ احکام النبیین لیکن پہلا شعبہ یعنی اخذ احکام الکیہ اس میں نائب نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ نبی کا امور دنیوی یعنی وظائف بشریہ میں نائب نہیں ہوتا۔

دیکھا جائے تو ہزنام صاحب کی تعریف شرح مواقف کی تعریف اور اس کے ایراد سے خلاصہ کے طور پر مستنبط تھی۔ میری رائے میں ”ہزنام“ صاحب کو بہت خوشی کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ”نبیایۃ عن النبی“ کے پہلے ”رہبایستہ عامۃ“ کا جزو نظر انداز ہو گیا ہے۔ تاکہ نیابت کا تعلق صرف اس حیثیت کے ساتھ ہو جلدے جو رسول کو خلق کے ساتھ حاصل ہے اور اس حیثیت کے ساتھ نہ ہو جو رسول کو خالق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ وہ گیارہ دوسرا ایراد، وہ بالکل بے محل ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نیابت کا تعلق انہیں امور میں ہے

عربی کے لیے بحیثیت نبوت ثابت نہیں۔ نہ وہ کہ جو ان کی ذاتی حیثیت سے شخصی طور پر ثابت ہیں۔
بہر حال ہزنام صاحب کا استدلال اپنے مقام پر برقرار ہے کہ جب خلافت صرف دنیوی
باتوں میں نہیں ہے بلکہ دین کا جزو اس کے ساتھ شریک ہے تو وہ مذہب کے
شیعہ سے بے تعلق چیز نہیں سمجھی جاسکتی۔



اب سنیوں کے ”م۔ ح“ صاحب نے خلافت کی کیا تعریف فرمائی ہے :-

”آپ فرماتے ہیں کہ ”خلافت و امامت بادشاہت کو کہتے ہیں لیکن ایسی بادشاہت
جو قیام و استحکام دین کے لیے بنیاست میں غیر ہو۔ ورنہ وہ خلافت نہ ہونی صرف لوگوں کی
یا قیصریت ہوگی۔“ لیکن اگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ :-

”عہد خلافت کی حیثیت ایک وقت پولیس اور فوج کی سی ہے کہ پولیس کا منصب
صرف نفاذ احکام ہے اور فوج کا نام ہے ان ہی احکام و قوانین کی حفاظت
کا۔ لیکن پولیس اور فوج کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اسمبلی اور کونسل کے پاس
قوانین میں دست اندازی کریں۔ عہد خلافت کی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے
ہم کہتے ہیں کہ آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا
کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان ہی کے افراد برسر کار ہوں، کسی
دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس شیعہ میں اپنی خدمات سے حکومت کو فائدہ پہنچائے۔“

اب اس ٹولیدہ بیانی کی بنا پر دیکھنے والا کیا سمجھے کہ خلافت بادشاہت کا ایسا اعلیٰ
عہدہ ہے یا پولیس اور فوج کا معمولی درجہ ہے۔ بہر حال ماننے کے خلافت بادشاہت
ہے لیکن اس کے ساتھ یہ جزو دیکھنے کے قابل ہے کہ قیام و استحکام دین کے لیے بنیاست
”غیر ہو۔“ ظاہر ہے کہ نیابت کا تعلق انہی حیثیتوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو ”منوب عنہ“
کے لیے حاصل ہیں۔ بادشاہت کو اگر ظاہری شان و شوکت، وجہت و حشمت، عظمت و

طریق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کا انبیاء میں پتہ بھی نہیں ملے گا۔ اور اس لیے آپ دیکھیں گے کہ انبیاء کے زمانہ میں مختلف لوگ و سلاطین تحت سلطنت پر تہکن ہوتے تھے اور انبیاء ان کے ساتھ کوئی تعرض نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنے فرائض منصبی میں بطور خود مشغول رہتے تھے۔ انبیاء کی بادشاہت کا کوئی مفہوم اگر ہو سکتا ہے تو وہ مذہبی حیثیت سے مفروض الطاعہ ہونا، لیکن اگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مضمون نگار اس حیثیت کی خلیفہ سے نفی کر دیں گے۔ فرماتے ہیں کہ:-

”نبی کا خلیفہ دینی بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ نبی کی طرح مفروض الطاعہ، بائیں ہاں امور میں نائب نہیں ہوتا ہے۔“

اب دیکھیے کہ مفروض الطاعہ نہ ہونے کے بعد اس کی بادشاہت کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ بادشاہت طاعت کا حیثیت بادشاہ، نبی کی موجودگی میں مبعوث ہونا صحت اس امر کی دلیل ہے کہ نبی کی حیثیت بادشاہ کی حیثیت سے مختلف ہے۔ پھر آخر نیابت رسول کو بادشاہت کا مراد سمجھ لینا کب صحیح ہو سکتا ہے؟

یہ بھی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بادشاہ دینی کا انتخاب بھی خدا کی جانب سے ہوتا عام افراد کو کوئی حق انتخاب کا باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کا اختلاف کہ ”انّی یكون له الملك علیّنا و نحن احق بالملك منه و لیس یؤت معة من المال“ (یعنی اس کو کہاں سے بادشاہت کا حق ہم پر ہو سکتا ہے و مقرر ہے کہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں اور یہ کوئی مالدار شخص نہیں ہے) مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ ”ان الله اصطفیٰ علیّکم“ (خدا نے ان کو تمہارے اوپر برگزیدہ کیا ہے)

لیکن رسول اللہ کی خلافت کے لیے مسلمان اس حق کو اللہ و رسول سے سلب کر کے اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا و رسول کی طرف سے اس امر میں مداخلت ہونا ”عقل عمومی“ اور ”حادثہ اجتماعیہ“ کے خلاف اور اصول جمہوریت کے منافی ہے۔

علم خلافت کی حیثیت پولیس اور فوج کی ہے، لیکن آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج کے تقرر کا اختیار حکومت کو نہ ہو بلکہ عام پبلک اپنے اعتبارات سے پولیس اور فوج کو مقرر کرے جو ظاہر ہے ایسے ہی انسداد کو فتح کرے گی جو اس کے ڈمب کے ہوں اور نہ اس پولیس اور فوج کی بہت ہو سکتی ہے کہ وہ فرائض کی انجام دہی میں کسی سخت گیری کی جرأت کرے کیونکہ وہ سمجھے گی کہ ہمارا عز و نصب اسی عام خلقت کی رضامندی سے وابستہ ہے۔

یہ کہنا کہ کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان کے افراد برسر کار ہوں۔ یہ صحابہ کبار اور بالخصوص حضرت ابو بکر و حضرت عمر کے فہم و دانش پر حملہ ہے اس لیے کہ سب سے گزشتہ متعجب کے ذیل میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ خیال سب سے پہلے ان ہی حضرات کا ظاہر کیا ہوا ہے۔ اور اس کی نسبت حدیث حضرت رسول کی طرف دی گئی ہے۔

چلتے چلاتے ایک سند اس کی اور سن لیجیے :-

(محلّی ان حرم جلد مطبوعہ مصر ص ۲۴)

ولا تجوز خلافة الا في قرين و هم ولد فھر بن مالك بن نصر
بن كنانة الذين يرجعون بانسابهم اليه حدثنا عبد الله
بن يوسف ثنا احمد بن فتح ثنا عبد الوهاب بن عيسى ثنا
احمد بن محمد ثنا احمد بن علي ثنا مسلم بن حجاج ثنا احمد
بن عبد الله ثنا يونس ثنا عاصم بن محمد بن زيد بن عبد الله
بن عمر بن الخطاب عن ابيه قال قال عبد الله بن عمر
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يزال هذا الامر
في قرين ما بقى من الناس اثنان

”یعنی خلافت جائز نہیں ہے مگر قریش میں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا سلسلہ نسب نضر بن مالک بن نضر بن کنانہ تک پہنچتا ہے۔۔۔ (بند متصل)
عبداللہ بن عمر سے روایت ہے حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ ہمیشہ یہ امر (خلافت) قریش میں رہے گا جب تک کہ دنیا میں دو شخص بھی موجود ہوں۔“
علامہ ابن حجر کی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر ۱۸۷۱ء) میں لکھا ہے۔
فی روایۃ ان ابابکر احتج علی الانصار بخبر الاثمۃ من قریش
وہو حدیث صحیح درہم طرق عن غواریعین صحابیہ۔

(یعنی) ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار کے مقابل میں استدلال کیا اس روایت سے کہ ائمہ قریش سے ہوں گے اور یہ حدیث صحیح ہے جو تقریباً چالیس صحابیوں کے طریق سے وارد ہوئی ہے۔“

اب”م۔ح“ صاحب کو اختیار ہے کہ اس شرط کو مہل قرار دیں یا خود ساختہ اور عقل والے انسانوں کے باور کرنے کے قابل سمجھیں یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حبشیا ہزام صاحب نے اپنے آخری مضمون میں لکھا ہے، اگر خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو کوئی مذہبی حیثیت عطا نہ کی جائے اور انھیں صرف ایک مسلمان بادشاہ سمجھا جائے تو شیعی اور سنی اختلاف باقی ہی نہیں رہ سکتا۔

میں ہزام صاحب کی نکتہ رسی کی قدر کرتے ہوئے ان کی تحریک یا یہ جزاں موقع پر ضرور نقل کروں گا۔ وہ لکھتے ہیں:-

”اس وقت مسلمانوں کے لیے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس قدر ہے کہ

وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا رہنما قرار دیں اور ان کے تعلیمات پر عمل کریں؟

اگر یہ مسئلہ اس وقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت سے

عزتِ رسولؐ کی مذہبی پیشوائی کو قبول کر لیں اور احکام و تعلیماتِ مذہبی میں ان ہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ خلافتِ معنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے جس کے احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آئندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر حضراتِ خلفاء کی حکومت کو اس حیثیت سے ان کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس لیے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا۔“

یہ اضطرابِ بیان کیا حقیقت سی کا پتہ دیتا ہے کہ شروع میں خلیفہ کو امورِ دینیہ میں نبیؐ کا نائب، بتلایا جاتا ہے اور یہ کہ اس کا کام ہے انشرو نفاذِ احکامِ الہیہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسولؐ کی نیابت میں احکامِ شرعیہ سے امت کو آگاہ کرنے والا ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی ضرورت ہے احکامِ شرعیہ کے علم کی۔

آگے بڑھ کر اس کی حیثیت قرار دی جاتی ہے ”بادشاہ“ کی اور بتایا جاتا ہے کہ ”اس کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامِ بقائے دین کے لیے فرائضِ جہاد کو انجام دے۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھنا چاہیے کہ تحفظِ اسلام کے لیے جو کوششیں ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے کی جاسکتی ہیں ان ہی کا نام اسلام کے اندر اسلامی سیاست ہے۔ خلیفہ اسی اسلامی سیاست کا نگران ہوتا ہے اور بس۔“

اسی بنا پر خلیفہ میں صرف ان ہی امور کے موجود ہونے کی ضرورت ہے جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں اور وہ طاقت و قوت ہے اور علم، مگر علمِ شریعت نہیں بلکہ علمِ سیاست۔ تیسری گزشتہ بن خلیفہ کی حیثیت قرار دی گئی ہے۔ پونیس اور فوج کی ساس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیاست میں الا قوامی کانگریس نہیں بلکہ صرف انتظام و داخلی کا محافظ اور

کرا گئے۔

بہر حال اب وقت ہے اس کا کہ شرائط خلافت پر تبصرہ کیا جائے۔

شرح موافقت (مطبوعہ نولکشور ماہ ۶۲) میں ہے :-

المقصد الثاني في تشييد الامامة الجمهور على ان اهل الامامة
ومستحقها من هو مجتهد في الاصول والفروع ليقوم
بامور الدين متمكنا من اقامة الحج وحل الشبهة في العقائد
الدينية مستقلا بالفتوى في النوازل والاحكام والوقائع لها
واستنباط لان اهم مقاصد الامامة حفظ العقائد وفصل
الحكومات ورفع المحاكمات ولتمديد من هذا الشرط ذراي
ولصاوة بدو الخروب والسلم وترتيب الجيوش وحفظ الثغور
ليقوم بامر الملك نجيحا فوي قلب ليقوى على الذب عن الحوزة
والحفظ لينصبه الاسلام بالثبات في المعارك كما روى انه
عليه الصلوة والسلام وقف بعد انقزام المسلمين في الصف
قائلا انا النبي لا كذب انا ابن عبد المطلب ولا سهولة
ايضا في اقامة الحدود وضرب الرقاب۔

يجب ان يكون عدلا في الظاهر لئلا يجوز فان الفاسق
ربما يصرف الاموال في اغراض نفسه فيضيع الحقوق عاقلا
ليصلح للتصرفات الشرعية والملكية بالغالقصور عقل
العصبى ذكرنا اذ النساء ناقصات العقل والدين حر المشلا
ليشغل خدمته السيد عن وظائف الامامة ولئلا يحتقر
في بعضى فان الاحرار يستحقرون العبيد وليست تكفون عن

طاعتھا فہذہ الصفات معتبرۃ فی الامامة بلا جاح۔

ترجمہ۔ دوسرا مقصد بحثِ امامت کا شرائطِ امامت کے بیان میں ہے۔
 جھوٹا اس بات کے قائل ہیں کہ امامت کا مستحق وہ شخص ہے جو اصول عقائد
 اور فروع احکام دونوں میں مجتہد ہو تاکہ امورِ دینیہ کا انصرام کر سکے، اور
 عقائدِ مذہبی میں دلائل قائم کرے اور شبہات کو حل کرے۔ مسائل اور
 احکام اور ردِ منہا ہونے والے واقعات میں نص صریح اور استنباط کی بنا
 پر بذاتِ خود فتویٰ دے سکے۔ اس لیے کہ امامت کے مقاصد میں سب سے
 اہم بات عقائد کی حفاظت ہے اور مقدموں کا فیصلہ کرنا اور اختلافات
 کا دور کرنا ہے اور یہ بغیر اس شرط کے نہیں ہو سکتا۔ جنگ و صلح کے تدابیر
 اور لشکروں کی ترتیب اور سرحدوں کی حفاظت میں ملے اور نظر صائب رکھتا
 ہو تاکہ ملکی امور کو انجام دے سکے۔ بہادر قوی دل ہو تاکہ اسلام پر کوئی مصیبت
 آئے تو وہ اس کے دفع کرنے پر قادر ہو۔ اور مرکزِ اسلامی کی حفاظت کی
 طاقت رکھتا ہو۔ تاکہ اسلام اس کو جنگ کے معرکوں میں پامردی کی بنا
 پر کھڑا کر سکے جیسا کہ روایت میں وارد ہوتا ہے کہ حضرت بول تمام مسلمانوں
 کے شکست کھانے کے بعد بھی صعبِ جنگ میں کھڑے رہے اور آپ
 نے فرمایا:-

”میں نبی ہوں، کوئی جھوٹا شخص نہیں ہوں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔“
 اس کے علاوہ حدود کا قائم کرنا اور گردنوں کا ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے
 یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بظاہر عادل ہو، تاکہ بے انصافی نہ کرے، کیونکہ ناسق
 شخص اکثر اموال کو اپنے ذاتی اغراض میں صرف کر دے گا تو حقوق ضائع
 ہوں گے۔ عاقل ہو (یعنی دیوانہ نہ ہو) تاکہ تصرفاتِ شرعیہ اور امورِ سلطنت کے

قابل ہو سکے۔ بالغ ہو، اس لیے کہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہوا اس لیے کہ عورتیں عقل اور مذہب دونوں حیثیتوں سے ناقص ہیں۔ آزاد ہوتا کہ اپنے مالک کی خدمت گزاری اس کو فرائض امامت سے مانع نہ ہو نیز اس لیے کہ اس کو حقیر سمجھ کر اس کی نافرمانی نہ کی جائے کیونکہ آزاد کو غلاموں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کی اطاعت اپنے لیے ننگ خیال کرتے ہیں۔ یہ صفتیں وہ ہیں جو امامت میں باجماع معتبر ہیں۔“

غفا نذسفی میں لکھا ہے۔

يشترط ان يكون من اهل الولاية المطلقة الكاملة سائسا
قادر العاقل وعدله على تنفيذ الاحكام وحفظ حدود
دار الاسلام والصلوات المظلوم من الظالم۔
(ترجمہ) حلیقہ کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ کامل ولایت کے تمام خصوصیات رکھتا ہو یعنی مسلمان، آزاد، مرد، عاقل، اور بالغ ہو۔ اور انتظام کی قابلیت رکھتا ہو۔ اور اپنے علم اور عدالت کی بنا پر احکام شرعیہ کا اجرا اور دار الاسلام کے حدود کی حفاظت اور ظالم سے مظلوم کے انصاف پر قدرت رکھتا ہو۔“

علامہ ابن روز بہان کی عبارت اس کے پہلے درج ہو چکی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔ ”امام کہ جو اس منصب کا اہل اور مستحق ہے اس کے شرائط یہ ہیں کہ وہ اصول و فروع میں مجتہد ہو تاکہ امور دین کو انجام دے سکے، جنگ کے تدابیر میں رائے اور نظر صائب رکھتا ہو، بہادر قوی دل ہو تاکہ مرکز اجتماعی سے مدافعت کر سکے، عادل ہو تاکہ ظلم و جور نہ کرے، اس لیے کہ فاسق اکثر اموال کو اپنے ذاتی اغراض میں صرف کر دیتا ہے اور عادل ہمارے نزدیک وہ ہے جو کبار کا ارتکاب نہ کرتا ہو اور صغائر

پر اصرار نہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ عادل ہونا کہ تصرفات شرعیہ اس کے جائز ہوں۔ باغ ہو، کیونکہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو، اس لیے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں، آزاد ہو اور قبیلہ قریش میں سے ہو۔ جس میں یہ سب صفتیں موجود ہوں۔ وہ خلافت کے منصب کا مستحق ہوگا۔“

ان کلمات سے ظاہر ہے کہ خلافت میں سب سے زیادہ اہمیت علم شریعت اور مذہبی اصول و فروع میں قوت اجتہاد کو دی گئی ہے اور شارح موافقت نے تصریح کی ہے کہ ”امامت کے مقاصد میں سب سے اہم بات عقائد کی حفاظت اور عقیدوں کا فیصلہ کرنا اور اختلافات کا دور کرنا ہے“

شرح عقائد نسفی میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔
 فان قيل فليكتف بذی شوكة يملك العامة سوائه فان
 اما او غير امام فان انتظام الامور يحصل بذلك كما في
 عهد الاقوال قلنا نعم يحصل لبعض النظام في الدنيا
 لكن يختل امر الدين وهو المقصود الاهم والعهد العظمى
 (ترجمہ) اگر کہا جائے کہ کوئی شخص ایسا ہو جو جاہ و شمت رکھتا ہو اور عام
 افراد پر سلطنت کرے وہ کافی سمجھا جانا چاہیے۔ خواہ امام ہو یا غیر امام۔
 کیونکہ انتظام کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے گا۔ جیسا کہ ترکوں کے
 زمانہ میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں اس سے دنیاوی معاملات
 کا تو کچھ انتظام ہو جائے گا۔ لیکن دینی امور درہم برہم ہو جائیں گے
 اور اہم ترین مقصد اور سب سے بڑا رکن یہی ہے۔
 علامہ قوشچی نے شرح بقرہ میں لکھا ہے:۔

انتظام امر عموم الناس علی وجه یؤدی الی صلاح الدین

والدنيا ليفتقر الى رياسة عامة فيهما اذ لو تعدد الرؤساء
في الاصطناع والبتاع لادى الى منازعات ومخاصمات مرجبة
لاختلال امر النظام ولو اقتضت رياسة على امر الدنيا
لفات انتظام امر الدين الذى هو المقصود الا هم والعمدة
العظمى -

(ترجمہ) تمام لوگوں کے امور کے انتظام کے لیے اس صورت پر کہ دین و
دنیا دونوں کی بہتری ہو، ضرورت ہے کہ دین و دنیا دونوں میں ریاست
عامہ حاصل ہو۔ اس لیے کہ اگر متعدد حاکم ہوں اور مختلف ممالک میں
تو آپس میں لڑائیاں ہوں گی جس سے انتظامات میں خرابی واقع ہوگی
اور اگر اس کی ریاست دنیاوی امور سے مخصوص ہو تو دین کا انتظام رہ
جلنے کا جو اہم مقصد اور سب سے بڑا رکن ہے۔

ملاحظہ کیا آپ نے کہ یہ علمائے اسلام خلافت کے بارے میں بہت زیادہ زور
علم دین و شریعت پر دے رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک ملکیت اور خلافت
میں حد فاصل یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف امور دنیا سے ہوتا ہے لیکن اس میں
”مقصود اہم اور رکن اعظم“ دین ہوتا ہے۔

خلفاء کے صفات کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جزو ہونا چاہیے تھا
لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر ہم اور واضح ہے۔ اس لیے
”م۔ ح“ صاحب نے اس میدان میں اپنی جماعت کی شکست کی یقینی سمجھتے ہوئے
اپنی زرنگاد کا دوسرا میدان تلاش کیا ہے۔ انھیں علم دین و شریعت کے مسئلہ
میں اتنی یالوسی ہوئی ہے کہ وہ طاوت کی بادشاہت کے بارے میں قرآن مجید
کی آیت ”و علم“ و ”جسم“ کا لفظ ہے اس سے بھی فوراً خطرہ کا احساس کرتے ہوئے

”علم“ کے ساتھ اپنے ترجمہ میں برکیٹ کے اندر (سیاست) کا لفظ لکھ دیتے ہیں تاکہ علم شریعت کی ضرورت خلافت کے لیے ضروری نہ قرار پائے۔

اب دیکھیے کہ اُنھوں نے ”امور استحقاق خلافت“ کے ذیل میں کیا چیزیں پیش کی ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔ دہی امور جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں ان کی ایک شخص میں موجودگی اس کو مستحق خلافت قرار دے گی“

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جو بادشاہت کے لیے ضروری ہیں کہ بغیر اُن کے کوئی شخص بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ہم کو یہ نظر آتی ہے کہ سلطنت و حکومت کے لیے جابرانہ قوت اور قاہرانہ طاقت کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں قوت نہ ہوگی وہ کیا حکومت کر سکے گا۔ اس طاقت کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ وہ جسمانی طور سے جسمانی قوت کا فی رکھتا ہو۔ فنون جنگ و سپہ گری میں اس کو مہارت نامہ ہو اور عزم و ارادہ کی بھی اس کے پاس غیر معمولی طاقت ہو۔ اور طاقت کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے عزم کا مضبوط ارادہ کا پکا انسان ہو اور علم و تدبیر سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہو تاکہ امور سیاست کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے۔ اور ملکی نظم و نسق کو عمدہ اسلوب پر قائم کر سکے۔ اگر کسی میں یہ دو صفات موجود ہیں تو وہ بادشاہت کر سکتا ہے ورنہ ناممکن ہے۔

خلافت کا مستحق بھی وہی شخص ہو گا جس میں مذکورہ بالا دو شرطیں موجود ہوں، کیونکہ اس کا شن صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا نفاذ کرے، حدود اللہ کو قائم کرے اور غفلت، بقا و دین کے لیے اگر ضرورت پیش آجائے تو مردانہ وار جنگ سے بھی دریغ نہ کرے۔ ان امور کی انجام دہی کے لیے ضرورت ہے کہ وہ پختہ کار انسان ہو۔ اس کے عزائم میں اس قدر استقلال ہو کہ دوسری طاقتیں اسے متزلزل نہ کر سکتی ہوں۔ پُرخطر مواقع میں اس کے پاؤں نہ ڈل سکتے ہوں۔ وہ ایسی کمزور ذہنیت کا مالک

نہ ہو۔ کہ مختلف آراء اُسے ہر موقع پر شکست دے سکیں، بلکہ سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والا انسان ہو۔ فہم و تدبیر اور فراست و دانائی سے کافی حصہ پایا ہو۔ نڈر ہو اور بیباک پختہ خیال ہو اور راسخ العزم مشکلات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بہت وجہات رکھتا ہو۔ لوگوں پر اس کی غیر معمولی طاقت کا اثر قائم ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے احکام و مرسوم سے منوا سکتا ہو۔ ایسا شخص خلیفہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خلافت کا مستحق ہے۔“

صاحبِ تبصرہ نے بہت سمجھ بوجھ کر خلافت کے لیے بس دو شرطیں قرار دی ہیں ایک یہ کہ وہ جمہانی قوت رکھتا ہو اور فنونِ جنگ و سپہ گری میں اس کو مہارت ہو اور دوسرے اپنے عزم و ارادہ کا پختہ ہو۔ حالانکہ جنابِ برجمی صاحب بھی جو اپنے پہلے مضمون میں سیاست کے پہلو پر بہت کچھ زور دے چکے ہیں، خلیفہٴ اسلام کے لیے صرف اسی کو کافی نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ انھوں نے شرائطِ خلافت کو بہت ایجاز کے ساتھ حسبِ ذیل الفاظ میں مختصر قرار دیا ہے :-

”خلافت و امامت کے سلسلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی کریم کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد میں دنیا کا مہذب ترین فرمانروا۔“

امور استحقاقِ خلافت

اب گذشتہ تمام اقوال کو پیش نظر رکھ کر اگر خلافت کے شرائط پر نظر ڈالی جائے

تو وہ حسب ذیل قرار پاتے ہیں:-

۱۔ دین و شریعت کا کامل علم رکھنا، یعنی اصول دین اور احکام شرعیہ میں استنباط کی قدرت رکھنا ہو تاکہ عقائد دینیہ میں جو شبہات واقع ہوں اور جو شرعی مسائل درپیش ہوں ان سب کو حل کر سکے۔

۲۔ تدابیر جنگ سے خوب واقف ہو اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔

۳۔ شجاع قوی دل چوس کا جنگ میں نیاات مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہو اور نیز اجرائے حدود اور قصاص کے معاملہ میں اس سے کمزوری کا اندیشہ نہ ہو۔

۴۔ عادل ہو تاکہ اموال مسلمین میں تغلب و تصرف نہ ہونے پائے۔

۵۔ بشرائط مستند علمائے اہل سنت کے بیان کردہ ہیں اور اسی کے ساتھ ”م - ح“ صاحب کی خاطر سے بڑھا لیجیے کہ:-

۵۔ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکا انسان ہو۔

۶۔ اہل بزمی صاحب کے نقطہ نظر سے:-

۶۔ اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو۔

کیا حضرات خلفائے ثلاثہ مستحق خلافت تھے؟

یہ گذشتہ بحث کا لازمی نتیجہ ہے بشرائط خلافت جو اہل سنت کے نقطہ نظر سے درج کیے گئے ہیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان امور کے لحاظ سے فہم و روایت کی روشنی میں دیکھئے کہ حضرات خلفائے ثلاثہ میں کہاں تک خلافت کی استعداد و صلاحیت تھی۔

حضرت بزمی صاحب نے اپنے ابتدائی مضمون میں اس بحث کو اس طرح ختم کرنا چاہا ہے کہ:-

”دنیا کا عام اصول یہ ہے کہ جو شخص کسی عمدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام

دے سکے اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لیے حضرت ابو بکر
اور حضرت عمر کی اہمیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہیں چاہیئے۔
اس پر مجھے اُس ایرانی کی نقل یاد آ جاتی ہے جس نے کہا تھا۔
”میں گویا نماز بے وضو یعنی شہدائے من نماز بے وضو کروم و شد“

بندہ پرور، اصل محل بحث وہ حکومت ہے جو رسولؐ کی جانشینی کے لحاظ سے
مذہبی طور پر صحیح بھی ہو۔ اس کے لیے اگر وہ شرائط موجود نہیں ہیں جو ضروری قرار دیے
گئے ہیں تو یہ تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عہدہ بغیر کسی قباحت کے انجام پا گیا ورنہ کرم و شد
کی صورت پر تو یزید و ولید ایسے فاسق و فاجر بھی ”امیر المؤمنین“ بنے اور ہو گئے ادالیک
غیر مسلم میں اس عہدہ کو انجام دے سکتا ہے اور ہو جائے گا۔

پہلی شرط:- دین و شریعت کا کامل علم

انفوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہی شرط جو مقصود اہم اور رکن اعظم ہے ان حضرات
کے کمالات کا سب سے زیادہ کمزور پہلو ہے۔ اُن کی واقفیت مسائل شرعیہ میں اتنی بھی
نہ تھی جتنی بہت سے عام صحابہ کی تھی۔ اور اس کمزوری کا احساس خود آپ حضرات
کو بھی تھا۔ اس لیے برابر ایسے صحابہ کو مددگار رکھا جاتا تھا جو ان مہموں میں دستگیری کر سکیں
ایسے اتفاقات بھی ہوئے ہیں کہ فیصلہ غلط کیا اور کسی صحابی نے اعتراض کر دیا۔
فوراً فیصلہ بدل دیا، اور اس صحابی کے قول کے مطابق حکم دے دیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت
کی مدت ہی کتنی تھی، اور وہ بھی ”فتنۃ ارتداد“ اور ”انظمام مملکت“ کے جھگڑوں میں صرف
ہوئی۔ لیکن اس میں بھی بعض واقعات ایسے پیش آ گئے جن میں آپؓ کو رجحت سے
دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں میراثِ حبۃ کا مسئلہ بہت مشہور و معروف ہے۔ علامہ

ابن تیمیہ نے ”رفع الملام عن الائمة الاعلام“ میں لکھا ہے کہ جب آپ سے میراثِ حبہ کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس مسئلہ کا بالکل علم نہیں۔ ہاں میں لوگوں سے دریافت کر دوں گا۔ چنانچہ آپ نے دریافت کیا: مغیرہ بن شعبہ و یحییٰ بن مسلم نے بتایا کہ رسول اللہ نے اس کو سدس عطا کیا ہے۔

قرآن مجید کی آیت ”وفاکھتہ واجبا“ کے معنی میں آپ ہمیشہ متحیر رہے اور کبھی سمجھ میں نہ آئے۔

چور کا باباں ہاتھ کٹوا دیا، فجاہ سلمیٰ کو آگ میں جلوا دیا، جس کے لیے علامہ نوشہی کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہ آپ کی غلطی تھی۔ یہ آپ کے مختصر دورِ خلافت کے چند واقعات ہیں جو تاریخ نے اب تک پہنچائے ہیں۔ حضرت عمر بن کا دور اپنے ”جبروت“ کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کا زمانہ بھی نسبتاً طولانی ہے۔ اس میں ان واقعات کی بہت کثرت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ حراتی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر حسب ذیل مسائل کو نہ جانتے تھے۔ سنت استئذان، میراثِ دیت، حکمِ محسوس باعتبار جزیرہ انگلیوں کی دیت کے بارے میں آپ نے غلط فیصلہ کیا جسے معاویہ کو اپنے دور میں منسوخ کرنا پڑا اور مسلمانوں کو کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہ ہوا کہ وہ معاویہ کے فیصلہ پر عمل کریں۔ کلام کے معنی کبھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے حالانکہ آپ نے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ بلکہ جو مسئلے آپ کو معلوم تھے وہ بھی آپ کو وقت پر یاد نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے دیانت کیا کہ مجھے ضرورتِ غسل متقی اور پانی موجود نہ تھا، فرمایا اس صورت میں نماز نہ پڑھو۔ عمار نے کہا، کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم اور آپ ایک غزوہ میں گئے اور ہم کو غسل کی ضرورت

۱۔ مطبوعہ مصر ۱۲۰۲ھ۔ ۲۔ آفتاب سیوطی مطبوعہ دہلی ۱۶۲۳ھ۔ ۳۔ رفع الملام عن الائمة الاعلام ص ۲۴

۴۔ آفتاب مطبوعہ دہلی ۱۶۲۳ھ

پیش آئی تو آپ نے تو نمازی نہیں پڑھی اور میں سٹی میں لوٹا اور نماز پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس صورت میں خاک پر ہاتھوں کو مار کر چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لینا چاہیے۔ اس قسم کے مسلسل واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ مسابلی شرعیہ میں آپ کے کسی حکم یا فیصلہ کا کوئی وزن عام نظر دل میں باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے اعلان کیا کہ عورتوں کے مہر میں کوئی زیادتی نہ کی جائے، اگر ایسا ہو گا تو زیادتی کی رقم بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ ایک عورت نے کہا کہ یہ حکم خدا کے خلاف ہے۔ اور قرآن کی آیت پڑھ دی تب آپ کو اعتراف کرنا پڑا۔ ابی بن کعب پر آپ نے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں اعتراض کیا۔ انھوں نے فوراً کہہ دیا۔ ”کان یلھینی القرآن ویلھمیت الصفق بالاسواق“۔ میں رسول اللہ سے قرآن کا علم حاصل کرتا تھا اور آپ کے بازاروں میں خرید و فروخت سے فرصت نہ تھی۔

وہ صاحبِ جاہ و بجلال انسان جو سعد بن ابی وقاص ایسے بڑے جرنیل کو اتنی سی بات پر کوڑا مار دے کہ وہ تعظیم کے لیے کمرے نہ ہوتے تھے اور یہ کہے کہ ”لہ تھباً لخلافۃ فآہدت ان تعرف ان الخلافة لا تھابلاً“ تم خلافت کی ہیبت سے متاثر نہیں ہوئے۔ میں نے چاہا تم کو بتاؤں کہ خلافت بھی تم سے مرجع نہیں ہوتی۔ ایسا پُر ہیبت انسان علمی مسائل میں اس طرح کی باتیں سنتا ہے اور شہوت کے گھوٹ کی طرح پی جاتا ہے۔ یہ اسی لیے کہ اس معاملہ میں خود آپ کا نفس اپنی عظمت کا قائل نہیں تھا اسی لیے آپ مختلف صحابہ سے اس مرحلہ میں مدد حاصل کرتے رہتے تھے۔ جن میں سے ایک یہی ابی بن کعب ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:-

روی عند من الصحابة عمر و کان لیسئلہ عن التوازل و تنجأ لہ الیہ

۱۔ محلی جلد ۲ ص ۱۵۵۔ ۲۔ اتحات السائق المتقین فی شرح احیاء علوم الدین ج ۱ مطبوعہ مصر ۱۲۸۹ھ

رفع اللام عن الآلة الاعلام ص ۲۹۔ ۳۔ صواعق محرقة مطبوعہ مصر ص ۷

فی المعضلات“ ان سے صحابہ میں سے حضرت عمرؓ نے احادیث کی روایت کی ہے اور وہ ان سے پیش آمدہ مواقع میں مسائل دریافت کیا کرتے تھے اور شکل مقدمات کا ان سے فیصلہ کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ابن عباسؓ جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں کسں تھے اور انہوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا حضرت عمرؓ کے لمبا و ماویٰ تھے۔

ابن خیر جزری لکھتے ہیں:- ان عمرؓ کا ان اذا جاء قتله الا قضية المعضلة قال ابن عباسؓ انها قد طرت علينا قضية وعضل فانت لها ولا مثالا ثم يأخذ بقوله۔

جب حضرت عمرؓ کے پاس مشکل مسائل پیش ہو جاتے تھے تو ابن عباسؓ سے فرماتے تھے ہمارے پاس کچھ مقدمات اور دشوار مسائل آگئے ہیں ان کا فیصلہ نہیں کر سکتے ہو پھر جو کچھ ابن عباسؓ کی رائے ہوتی تھی اس پر عمل کرتے تھے۔

یہ ابن عباسؓ وہ تھے جو حضرت علیؓ کے شاگرد تھے اور ان کا قول تھا کہ اذا جاءنا الثبت عن عليؓ لم نعدل عنه۔ جب کوئی حکم شرعی ہم کو علیؓ کی جانب سے ثابت ہو جاتا تھا تو پھر ہم اس سے عدول نہیں کرتے تھے۔

پھر کیا تعجب ہے اگر حضرت عمرؓ مسائل شرعیہ میں خود حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کی طرف رجوع کریں اور ان کے احکام پر کار بند ہوں۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں۔ اور ایسے ہی مواقع پر آپؐ کی زبان سے یہ فقرہ نکلا تھا جو زبان زد خلاق ہے۔ لولا علیؓ لهلك عمر۔ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔ اور اعود بالله من معضلة ليس لها ابو الحسن۔ خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس مشکل سے جس کے لیے ابو الحسنؓ علیؓ بن ابی طالبؓ نہ ہوں۔

تصدیق کے لیے ملاحظہ ہو امام ابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۵۶ھ کی کتاب

تداول مختلف الحديث في الرد على اعداء اهل الحديث ۶ مطبوعه مصر ۳۲۶ھ ۲۰۔ استيعاب
 في معرفة الاصحاب ۱ ابن عبد البر قطبي مالكي متوفى ۴۶۲ھ (مطبوعه حيدرآباد جلد ۲ ۴۴۴ھ)
 اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزوی متوفی ۶۳۰ھ مطبوعه مصر ج ۴ ص ۲۷۲۔ تہذیب التہذیب
 حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۷۵۲ھ مطبوعه حيدرآباد ج ۷ ص ۳۳۷۔ اصحابہ حافظ ابن حجر
 ج ۲ ص ۵۰۹۔ شرح نفع البلاغہ ابن ابی الحدید مصر ج ۱ ص ۷۔ ذخیرۃ المال شہاب الدین
 عبد القادر عجمی۔ مطالب السؤل کمال الدین ابن طلحہ شافعی (مطبوعه ایران) ص ۱۷۱۔ مناقب
 الخطیب خوارزم ص ۴۰۔ ملفوظات سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء توضیح الدلائل شہاب الدین احمد
 شرح قصیدہ تائیہ ابن فارض مؤلفہ سعید الدین محمد بن احمد فرغانی۔ مطول سعد الدین تفتازانی
 مطبوعه تبریز ص ۱۳۶۔ فصول محمد ابن صباغ مالکی ص ۱۰۷۔ کفایۃ الطالب حافظ بن محمد یوسف
 کنجی شافعی باب ۵۷۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسة الشرعیۃ شمس الدین ابن قیم جوزی حنبلی
 مطبوعه مصر ۳۱۴ھ ص ۴۷۔ موافقت عضد الدین الایچی۔ شرح موافقت ابو العلی بن محمد رضا
 بخاری مطبوعه لکھنؤ ۳۱۴ھ ص ۴۳۳۔ البطل الباطل فضل الثدین روز بہان شیرازی
 شرح تجرید توشیحی۔ جواہر العقیدین نور الدین محمودی۔ صواعق محرقة ابن حجر مکی مطبوعه مصر ص ۷
 اسعاف الراغبین محمد بن علی بن صہبان مصری برعاشیہ مشارق الانوار شیخ حسن حمزادی
 مطبوعه مصر ۱۵۲ھ۔ تاریخ الخلفاء حافظ جلال الدین السیوطی مطبوعه مصر ۶۶۷ھ۔ نور الالبصار
 سید مومن شبلنجی مطبوعه مصر ۳۳۷ھ۔ ہدایۃ المطرب حلج احمد آفندی مطبوعه مصر ۱۲۷۶ھ وغیرہ
 مثل مشہور ہے "المناس اعداء لما جہلوا"۔ بادشاہ دقت میں جتنا علمی ذوق
 اعلیٰ پایہ کا ہوگا اتنا وہ علوم و فنون کی ترویج کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا۔ لیکن دوسری
 صورت میں اس کے برعکس صورت پیدا ہونا یقینی ہے۔

یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمر کے دور میں مسلمانوں کی علمی ترقی میں
 بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ خود آپ کے احادیث بہت کم تھے۔ اس لیے کہ

آپ کو اپنی قوتِ حافظہ پر اعتماد ہمیں تھا۔ چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا بات ہے آپ رسول اللہ کے کچھ احادیث بیان میں فرماتے تو ارشاد کیا۔ انما اخشئ ان ازید الغص۔ مجھ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ زیادتی کمی نہ کر دوں۔

اس کے باوجود آپ نے جرات سے کام لے کر کبھی دو ایک حدیثیں ارشاد فرمائیں تو ان میں بھی اشتباہ واقع ہو گیا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری۔ باب ان المیت لیعذب بکاء اہلہ۔ حضرت عائشہ کے سامنے یہ حدیث جناب عمر کے انتقال کے بعد آپ کی زبانی بیان ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ عمر کو دھوکا ہوا۔ یہ حدیث اس طرح نہیں تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانہ میں احادیث کی روایت سے ممانعت کر دی تھی۔ اور بہت سختی کرتے تھے۔ چنانچہ اس مصیبت سے جناب ابو ہریرہ کو بھی دوچار ہونا پڑا۔

اگر کتب خانہ اسکندریہ کے جلالہ کا واقعہ غلط بھی ہو تب بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ تصنیف و تالیف کے مخالف تھے۔ اور مسلمانوں میں کتابت کے رواج ہی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چھوڑ سلین تصنیف کے معاملہ میں پیچھے ہو گئے تھے۔

مولانا غنائت اللہ فرنگی محلی انسر مدرس مدرسہ نظامیہ فرنگی محل نے "تدوین حدیث" ایک مضمون مسلم ایگاڈمی لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ جو کتابی صورت سے شائع ہوا ہے۔ اس میں آپ نے حدیث کی جمع و تالیف کے متعلق صحابہ میں جو اختلاف رائے تھا اسے تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"صحابہ مذہب میں بدعت سے اس قدر بچتے تھے کہ ادنیٰ باتوں میں

لہ حیوۃ الخیران دیری ج ۲۸۲ ۲۸۲ شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ جزو ۱ ص ۱۱۱۔

بدعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ قرآن کی تدوین پر ایک گروہ صحابہ کو سخت اعتراض تھا۔ روایت حدیث پر سزا تک کی نوبت آئی۔ تدوین احادیث میں تو ایک یہی خرابی کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن جو اس وقت تک موجودہ طور پر مکتوب نہیں تھا اور کلام حضرت رسالت پنا ہی مخطوط نہ ہو جائیں حضرت ابو ہریرہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشہور ہے کہ انکار حدیث پر سزا دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کو طلی مقرر فرماتے تو منجملہ دوسرے نصائح کے یہ بھی اس کو نصیحت فرماتے کہ دیکھو جن لوگوں کے پاس جا رہے ہو وہ قرآن پڑھنے میں مصروف ہیں اور شب و روز اپنا وقت تلاوت قرآن میں صرف کرتے ہیں، ان سے زیادہ حدیثیں بیان کر کے ان کے ذہنوں کو تشویش میں نہ ڈالنا۔ غرض کہ جب روایت حدیث کی یہ صورت ہو تو تدوین و کتابت حدیث کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ پھر تحریر فرماتے ہیں :-

"حضرت عمر ہی کے زمانہ میں جمع حدیث کی ضرورت محسوس ہونے لگی مثنیٰ اور تمام صحابہ اس کو جمع کر دینے کی رائے ظاہر کر چکے تھے۔ مگر قرآن کے سامنے بے خوفی تو جہی کے خوف نے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبوراً باز رکھا تھا اور اس کے بعد ہم کو باوجود تلاش پھر کبھی صحابہ کا جمع کی جانب توجہ کرنا نظر نہیں پڑا۔ اگر کہیں احادیث کو بھی قرآن کی طرح خلفائے راشدین نے مدون کر دیا ہوتا تو یقین کیجیے کہ بہت کچھ کیلئے قرآن کی طرح وہ بھی دست تصرف سے محفوظ ہو جاتے اور باقی مسلمانوں میں کثیر فرقہ بندیوں کی نائند روک تمام ہو جاتی۔ کج احادیث میں جو جو مبہمات اور شکوک اسناد و الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے پیش

کئے ہیں وہ ان کی تدوین و جمع کے بعد پیش نہیں آ سکتے تھے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔“

امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے۔ اختلافوا فی کتابنا الحدیث فکروا طاعتنا منهم عمر بن الخطاب۔ احادیث کے قلمبند کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا۔ ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا۔ جن میں سے حضرت عمر ہیں۔“

عقائد کے معاملہ میں جو شبہات پیدا ہوتے تھے ان کا حل علمی دلائل کے بجائے آپ کی جانب سے بزورِ تازیانہ کیا جاتا تھا۔ امام غزالی کی کتاب ایضاً العلوم میں اس کی کافی تفصیل موجود ہے۔

رسالہ حقائق لکھنؤ میں شعبان ۱۳۵۳ھ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں اس صورتِ حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے :-

”وہ دور کس حد تک روشن کئے جانے کے قابل ہے جس میں معارف و حقائق کا پرچہ نہ رہے فلسفہ الہیات اور علم کلام کے مسائل گوشہ نگاہی میں پڑ جائیں۔ تصنیف و تالیف کا دروازہ بند ہوا اور روایت و احادیث پر سخت پابندیاں عائد ہوں۔ کتبِ علمیہ کی چھان بین میں اور جستجو تو کجا علمی تحقیقات کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں۔“

تفسیر قرآن کے متعلق ایک سوال پر سمرائے تازیانہ دیے جانے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :-

”حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہبی سوال پر سختی و تشدد کسی طرح مناسب نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس سختی و تشدد کے بعد معترض کا یہ کہہ دینا کہ اس کی تسکین ہو گئی اس کے تسکین قلب کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے

طرز عمل سے عام افراد کو یہ خیال قائم کر لینے کا موقع مل سکتا ہے۔ کہ سوال
 کا جواب تھا، اور سوائے مظاہرہ جبر و تشدد کے اس کا کوئی حل موجود نہ تھا۔
 اکثر ایسے موقعوں پر بھی آپ کا تازیانہ اٹھ گیا جہاں کہنے والے نے ایک صحیح علمی
 بات اپنی زبان سے نکالی تھی۔ ملاحظہ ہو آلقان علامہ سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۱۶۷۔
 ”ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں جانتا ہوں ایک آیت جو کتاب
 خدا میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ آپ نے اس کو درہ لگایا اور کہا
 کہ تجھے بھلا اس کا علم کیسے حاصل ہوا۔ اچھا بتا دو کیسے؟ اس نے کہا
 ”من یعمل سوء یحیض بہ“ جو کوئی بھی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا
 جائے گا۔ لہذا کسی کو ہم میں سے مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ جو کوئی گناہ ہم
 سے صادر ہو گا اس کی پاداش ملے گی۔“ دیکھا آپ نے یہ درہ کس قصور
 پر اٹھایا گیا۔ کاش دریا فت کرنے کے بعد یہ تازیانہ اٹھایا جاتا،
 جب وہ کوئی بے جا بات کہتا۔

اس صورت حال میں کیا کسی مسلمان کو جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ کسی علمی بات کا
 تذکرہ زبان پر لائے یا کوئی استفسار و سوال کرے۔ کیا اس طرح عقول و افکار
 مسلمانوں کے زنگ آلود نہیں بنائے گئے اور کیا یہی وہ علمی فریضہ ہے جو ایک
 خلیفہ رسول کو انجام دینا چاہیے؟

حضرت عثمانؓ کو تو صحابہ کی عام مخالفت اور بغاوت کی وجہ سے اس طرح کے
 مواقع ہی حاصل نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا پھر بھی معلوم ہو سکا کہ آپ کو اس مسئلہ کا علم
 نہیں تھا کہ زوجہ کو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اسی مکان میں رہنا چاہیے جہاں کہ
 اس نے چھوڑا تھا۔ یہاں تک کہ فریضہ نیت مالک ابو سعید خدری کی بہن نے
 آپ کو اس مسئلہ سے آگاہ کیا۔

یہ ہے حالت اس شرط کی جو ایک "خلیفہ دینی" کے لیے مقصود اہم اور کن اعظم کی حیثیت سے قرار دی گئی ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر کہنے دیجئے کہ اس پہلو سے یہ حضرات نہ صرف امیر المومنین حضرت علیؑ سے بلکہ دوسرے بہت سے ان صحابہ کے عقیب میں تھے جو مسائل شرعیہ میں فقیہہ کا درجہ رکھتے تھے۔ اور رسالت مآبؐ کے فیض علم سے مستفید ہوئے تھے۔

دوسری شرط: تدابیر جنگ و اقیبیت اور سیاسی بصیرت

اس شرط کے پہلے جزو کے متعلق کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اس لیے کہ اس قسم کا سوال اسی وقت پیدا ہو سکتا تھا جب آپؐ حضرات کو کبھی بحیثیت جرنیل فوج کی تنظیم و ترتیب اور اس کو دشمن سے صفت آرا بنانے کا موقع ہوا ہوتا۔ لیکن یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرات کو کبھی کوئی ذمہ و ارادہ منصب سپرد نہیں کیا۔ اور ہمیشہ دوسروں کا ماتحت رکھا۔ یہاں تک کہ سب سے آخر عمر میں تو اسامہ بن زید کو جو عام طور سے ایک غلام کے فرزند سمجھے جاتے تھے جنگ روم کے لیے ان پر امن مقرر کر دیا۔ جس پر بڑی سرکہ جینی "اور سرگرائی" پیدا ہوئی۔ بلکہ حکم رسولؐ سے "سرتابی" نے عملی شکل اختیار کر لی اور رسول اللہؐ کو تاکیدی حکم دینا پڑا اور اتنے سخت الفاظ استعمال فرمانا پڑے کہ جھڑا جیش اسامہ لعن اللہ من تخلفت عنہا۔

لیکن یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ لشکر رسول اللہؐ کی موجودگی میں روانہ ہونا تھا نہ روانہ ہوا۔ اور وہی لوگ جو آج بڑے درجوں پر فائز سمجھے جاتے ہیں ان الفاظ کی زد میں آئے۔ اور ہمیشہ کے لیے رہ گئے۔ کس لیے کہ اس کے بعد پھر رسولؐ کی طرف سے کسی رحمت کی دعا کا ثبوت نہیں ہے۔

رہ گیا دوسرا جزو، اس پر بڑا زور صرف کیا جا رہا ہے اور ہر پھر کے یہی ایک چیز رہ جاتی ہے جسے خلفاء کے لیے بڑے شد و مد سے ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں نمائشی الفاظ کی ردائی، تقریر کی صفائی، آواز کی بلندی اور اظہار کی طاقت سب ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر کی ذات پر مگر حضرت عثمان کی تاسخ کا ارتق سامنے آیا اور طاقت گفتار نے جواب دیا۔

آپ کا پورا دور خلافت مجموعہ ہے سیاسی غلطیوں کا جنہوں نے آخر میں آپ کی کشتی حیات کو غرق کیا۔ اور کہنے دیجیے کہ بالکل اسی طرح کا اجماع جیسا ان حضرت کی خلافت پر ہوا تھا ویسا ہی بلکہ اس سے زیادہ پُر شکوہ اجماع آپ کے قتل پر ہوا اور اسلام میں وہ شرمناک مثال قائم ہوئی جو انتہائی قابل افسوس ہے۔ حقیقتاً حضرت علی بن ابی طالب کے دور کا تمام اضطراب و انتشار نتیجہ ہے اس حد سے گزری ہوئی صورت حال کا جو حضرت عثمان کے دور میں موجود تھی۔ حضرت عمر کا مخصوص تدابیر کے ماتحت جناب عثمان تک خلافت کا پہنچانا اسے اگر اسلام کی خیر خواہی کے نقطہ نظر سے بغیر نیت پر حملہ کیے ہوئے تعبیر کیا جائے تو وہ ایک بڑی سیاسی غلطی ہی ہو سکتی ہے۔ جس کے نتائج بہت خراب صورت میں نمودار ہوئے۔

شام پر امیر معاویہ کا تسلط حمی جس نے "لوکیت" کی شکل اختیار کی اسی دور میں انجام پایا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ "نوجوان" "پُر حوصلہ" معاویہ نے حضرت عمر کے سیاسی جبروت کو تھوڑی ہی مدت میں "مرعوبیت" کی حد تک مغلوب کر لیا تھا جس کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب آپ شام تشریف لے گئے اور معاویہ کی شان و شوکت کو دیکھ کر آپ نے ٹوکنے کی ضرورت محسوس کی اور ادھر سے دوفقروں میں آپ کو اس طرح قائل کر دیا گیا جس کا اقرار آپ کو خود کرنا پڑا۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی تدبیر کی حیثیت سے اگر کچھ درجہ قرار دیا بھی جاسکتا ہے، تو حضرت عمرؓ کا۔ لیکن وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں ہے۔ اور وہ غلطیاں اتنی اہم اور غیر معمولی تھیں جن کے نتائج انتہائی خراب صورتوں میں نمودار ہوئے۔

تیسری شرط شجاعت قوت اور ثبات قدم و استقلال

یہ انتہائی مایوسی کی جگہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے دل کو رسول اللہؐ کی موجودگی میں اور حضرت کے ساتھ جو قوت و طاقت حاصل ہو سکتی ہے وہ رسول اللہؐ کے بعد کبھی حاصل نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ وہ رسولؐ خود ثبات و استقلال میں ایک ایسا نمونہ تھا جس کی مثال غیر ممکن ہے۔

پھر اگر رسول اللہؐ کے ساتھ کیڑائیوں میں کمزوری کا مظاہرہ ہو اور ثبات و استقلال رغبت نظر آئے تو اس کے بعد کیا امید باقی رہ سکتی ہے۔ ”ہر نام صاحب نے اپنے ابتدائی مضمون میں جو تمام اس بحث کا سنگ بنیاد ہے اس قسم کے واقعات پوری امانت و دیانت کے ساتھ نقل کر دیے ہیں جو ناقابلِ انکار حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب جلیل الرحمن صاحب اعظمی بھی اپنے مضمون مندرجہ نگاریں تحریر فرماتے ہیں:-

”حضرت علیؓ نوجوان تھے۔ بہادر اور شیر دل تھے، اس لیے میدانِ کارزار

ہمیشہ ان کے ہاتھ رہا۔ حضرت ابو بکرؓ بڑے اور کمزور تھے، اس لیے انھیں معرکہ بے جنگ میں کوئی طرہ امتیاز حاصل نہ تھا۔“

حالانکہ حضرت ابو بکرؓ کے بڑھاپے کا جن وقت انگیز الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے، وہ چندال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آپؓ رسول اللہؐ کے بالکل ہمسن تھے۔ اس لیے اگر اپنے زمانہ خلافت میں ضعیف العمر رہے بھی ہوں تو اسلام کی ریڈائیوں میں اس حد تک بوڑھے نہ تھے۔

اسلامی مجاہدین میں بہت سے افراد ان سے زیادہ کبیرا سن تھے۔ علی بن ابی طالب نے آخر عمر میں اپنی محل، صیفین اور نردوان کی لڑائیوں میں دکھلادیا کہ شجاعت و قوت یا ثبات قدم و استقلال کا تعلق کسی خاص عمر کے ساتھ نہیں ہے جس کے قدموں کو بھلگنے کی عادت نہ ہو وہ بڑھاپے میں بھی اسی طرح ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے پھر اگر حضرت ابوبکرؓ بڑھے اور کمزور تھے تو حضرت عمرؓ اور عثمانؓ تو اس طرح نہ تھے حالانکہ میدان جنگ کے ناگوار واقعات میں یہ بزرگوار ان حضرات ابوبکرؓ سے قدم رکھتے ہیں۔ اپنی خلافت کے زمانہ میں ان حضرات نے کبھی اس طرح کا موقع آنے ہی نہ دیا کیونکہ ہمیشہ دوسرے سپہ سالاروں کو لڑنے کے لیے بھیجا اور خود مرکز خلافت سے قدم نہیں ہٹایا۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت عمرؓ نے خود یا لوگوں کے کہنے سے خیال ظاہر کیا جنگ میں تشریف لے جانے کا۔ مگر اس موقع پر کچھ سوچ کر علیؓ بن ابی طالب سے مشورہ کیا جن کی اصابت رائے اور سیاسی تدبیر کو آج معرض بحث میں لایا جا رہا ہے اور خود اعتمادی کی سپرٹ رکھنے والے، "اپنی رائے پر قائم رہتے والے" خلیفہ وقت نے علیؓ بن ابی طالب کے منع کرنے سے ہی جنگ میں جانے کا خیال ترک کر دیا۔

یہ دونوں مشورے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو خود اپنی شجاعت پر اور دوسرے حقیقت سے واقف افراد کو بھی کتنا اعتماد حاصل تھا۔ پہلا مشورہ غزوہ روم کے متعلق ہے۔ جب حضرت عمرؓ نے خود جانے کا حضرت علیؓ سے مشورہ کیا تو آپؓ نے فرمایا:-

قد توکل الله لاهل هذا الدين باعزاز الحوزة وستر
العورة والذى نصرهم وهم قليل لا ينتصرون ومنعهم
وهم قليل لا يمتنعون حتى لا يموت انك متى تشر الى
هذا العدو ينفسك فتلقهم فتك لا تكن المسلمين

كَانَفَةً دُونَ اَقْصٰى بِلَادِهِمْ فَلَيْسَ لِعَدْلِكَ مَرْجِعٌ يَرْجِعُونَ
اِلَيْهِ فَاَبْعَثْ اِلَيْهِمْ رَجُلًا مَّجْرِبًا وَلِحَفِزٍ مَعَهُ اَهْلَ الْبَلَاءِ وَ
النَّصِيحَةِ فَاِنَ اَظْهَرَ اَللّٰهُ فِذٰلِكَ مَا تُحِبُّ وَاِنَ تَكُنِ الْاٰخِرَةُ
كُنْتَ بِرَدِّ النَّاسِ وَمِثَابَةِ الْمُسْلِمِيْنَ -

(ترجمہ) ”خداوندِ عالم نے اس دین کے متعلق یہ ذمہ داری لی ہے کہ اس کے مرکز کی تقویت ہو اور کمزوریوں کی پردہ پوشی ہو اور اس نے ان کی حفاظت کی جب وہ کم تھے، خود اپنی حفاظت پر قادر نہ تھے، وہ اب بھی موجود ہے، زندہ ہے اور مرنے والا نہیں۔ اگر آپ خود دشمنوں کے مقابلہ کو گئے اور جنگ ہوئی اور آپ نے شکست کھائی تو مسلمانوں کے لیے کوئی جلے پناہ ان دشمنوں کی سرحد کے قریب نہ ہوگی۔ اور آپ کے شکست کھانے کے بعد کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں۔ لہذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایک تجربہ کار شخص کو روانہ کیجیے اور اس کے ساتھ ان اشخاص کو بھیجیے جو سختیاں جنگ کی اٹھانے کی طاقت اور اخلاص و خیر خواہی رکھتے ہوں۔ اس صورت میں اگر خداوندِ عالم نے غلبہ عطا کیا تو یہی آپ کا مقصد ہے اور اگر معاملہ نوح و دگر ہوا تو آپ تو یہاں موجود ہیں۔ آپ کے پاس مسلمان واپس آئیں گے اور پناہ لیں گے۔“

(جناب سید العلماء دام ظلہ نے اس مشورہ پر بہت مبسوط بحث کی ہے جو امامیہ مشن لکھنؤ کے شائع کردہ رسالہ ”الہدایہ کے تعلیمات میں موجود ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مشورے دے کر حضرت علیؑ بن ابی طالب نے اسلام کی عزت رکھ لی، ورنہ کج تاریخ اسلام کسی اور صورت پر مرتب ہوتی۔

چوتھی شرط - عدالت اور اموالِ مسلمین کی حفاظت

اس سلسلہ میں کچھ کتنا جمہور مسلمین کے نقطہ نظر سے بالکل بے عمل ہے۔ اس لیے کہ وہاں تمام رسول اللہ کی صورت دیکھتے والے مسلمانوں کے لیے (الصحابۃ کلہم عدول) کا کلیہ قرار دے لیا گیا ہے۔ اس لیے ”ترد امینی“ آنکھوں کے سامنے نظر آئے تب بھی عدالت کا حصار ”حرف گیری“ سے مانع ہے۔

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے کبھی راہ چلتے دم زدن کے لیے بھی بجات اسلام رسول اللہ کی زیارت کر لی ہے۔ پھر چہ جائیکہ وہ صحابہ کبار جن کو اکثر رسول اللہ کی صحبت کا شرف حاصل رہا ہو، ان میں تو اس کے خلاف شبہ کرنا بھی کفر کے درجہ سے قریب ہے۔ مگر اس کو کیا جائے کہ ”آزاد بحث“ اس طرح کے ایک طرفہ ستمات کی پابند نہیں ہو سکتی۔

اگر عدالت کو عام معنی میں لیا جائے جسے کہتے ہیں کبار سے اجتناب اور صغائر پر عدم اصرار، تو قرآن و حدیث اور تاریخ ”فرار عن الزحف“ ہی کا وہ مرقع پیش کر دے گی جس کے سامنے دعوائے عدالت صریحاً بیان ہو جائے اور رسول اللہ کی زندگی کے بالکل آخری حصہ میں عبس اسامہ سے تھکت کا قصہ سامنے آئے گا جس کی معافی کی سند بھی ڈھونڈنے سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن جبکہ عدالت کو محدود معنی میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور اموالِ مسلمین کی منصفانہ رعایت کے ساتھ حفاظت کے اعتبار سے دیکھا جائے جو اس شرط کے اعتبار کا منشاء قرار دیا گیا ہے، تو

”فدک“ کا معاملہ سامنے آ جاتا ہے جس میں شیعہ تو شیعہ بہت سے تحقیق شیوہ

علمائے اہل سنت بھی ”انگشت بندناں“ نظر آتے ہیں اور بہر حال وہ مسئلہ اب تک ”عقلمند لایخل“ بنا ہوا ہے۔

پھر حضرت عثمان کے زمانہ میں تو تقسیم اموال کی جو صورت ہوئی وہ ایسی ہے کہ تمام صحابہ فریادی نظر آنے لگے۔ اور انجام کار یہ بھی ایک سبب ہوا اس منہگامہ کا جو آپ کی شہادت پر ختم ہوا۔ یہ واقعات تاریخ اسلام میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں ان کا تذکرہ اس موقع پر طول کے اندیشہ سے ترک کیا جاتا ہے۔

پانچویں شرط غزم کی مضبوطی اور ارادہ کی پختگی

یہ شرط جناب م۔ ح صاحب کی قرار دی ہوئی ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں ”خود اعتمادی“ اور مستقل مزاجی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی میں اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ ہونا اور مخالف رائے سے متاثر نہ ہونا۔ یہ بحث بعد کو آئے گی کہ یہ شرط کہاں تک قابل قبول ہے۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ یہ شرط حضرات خلفائے ثلاثہ پر کہاں تک منطبق ہوتی ہے۔

خطامعات۔ حضرت ابو بکر کی ”خود اعتمادی“ کی صفت یا اپنی صحیح رائے پر بھروسہ ہونے کا خیال اس خطبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے جو آپ نے سب سے پہلے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی ارشاد فرمایا تھا:-

ملاحظہ ہو صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۳

تکلم ابو بکر خمد اللہ راشنی علیہ نم قال اما بعد
ایہا الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت
فاعمیونی وان اسأت فقتو موئی۔

(ترجمہ) ”حضرت ابو بکر نے تقریر کی۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ ایہا الناس

میں تمھارا حاکم ہوا ہوں۔ مگر میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک طریقہ اختیار کروں تو میری امداد کرنا اور اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کر دینا۔
دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:-

اما بعد فانى قد وليت هذا الامر وانا لله كاره ووالله
لو ددت ان بعضكم كفانيه الا وانكم ان كلفتمونى ان
اعمل فيكم بمثل عمل رسول الله صلى الله عليه وسلم لم اقم
كان رسول الله صلى الله عليه وسلم عبداً اكرم الله بالوحى
وعصمه به الا وانا انا بشىء ولست بخير من احدكم فراعونى
فاذا راعيتونى استقمتم فاتبعونى واذا راعايتونى نهغت قومونى
(ترجمہ) میں اس منصب پر مقرر ہوا ہوں در صورتیکہ میں اسے ناپسند کرتا تھا
اور خدا کی قسم مجھے آرزو تھی کہ کوئی تم میں سے اس بار کو مجھ سے لیتا۔ اب
اگر تم مجھ سے یہ چاہو کہ میں تم میں ایسا طریقہ عمل اختیار کروں جو رسول اللہ
کا تھا تو میں اسے پورا نہیں کر سکوں گا۔ رسول اللہ ایک مخصوص بندے تھے
جن کو خدا نے وحی کے ساتھ معزز کیا تھا۔ اور اس طرح غلطی سے انھیں محفوظ
رکھا تھا۔ مگر میں ایک معمولی انسان ہوں اور تم میں سے کسی ایک سے
بہتر نہیں ہوں۔ لہذا تم میری نگرانی کرتے رہو۔ اگر دیکھو کہ میں سیدھی راہ پر ہوں
تو میری پیروی کرو۔ اور اگر دیکھو کہ میں کج ہو رہا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

یہ ہیں وہ الفاظ جن سے ضمیر کا غیر مطمئن اور دل کا ڈانواں ڈول ہونا صاف ظاہر ہے۔
ذرا موازنہ کیجیے ان بے امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے قول کا جو آپ اپنے خطبہ

میں فرماتے ہیں

لے شیخ البلاغہ جلد ۱ مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ

اقتلکم علی سنان الحق فی جواد المضلة حیث تلتقون
ولا دلیل دختفرون ولا تیهون - عزب رأی امرئی
تختلف عنی ما شککت فی الحق مذاریتما -

”کھڑا ہوں میں تمہارے واسطے حق کے راستے پر مگر اہی کے چوراہے کے
اندر جس جگہ تم سب بہم ہوتے ہو اور کوئی رہنا نہیں ملتا اور کوشش کرتے
ہو اور کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ غلط ہے رائے اس کی جو مجھ سے مخالفت
کے، شک نہیں ہوا مجھے حق میں کہیں جیب سے میرے سامنے دھپش کیا گیا۔“
معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان ہے جس کا ضمیر مطمئن ہے، جسے اپنی حقیقت پر
اعتماد ہے اور اپنی راست روی پر پورا ہمدردی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں یہ

ذات معی البصیرتی ما لبست علی نفسی ولا لبس علی۔ ”میرے ساتھ
ہے میری حق بینی، نہ کبھی میں نے اپنے نفس میں مغالطہ میں مبتلا کیا اور نہ کبھی مجھے شبہ
واقع ہوا۔“

بھلا وہ شخص دوسروں کی اصلاح کیا کر سکتا ہے جو خود طالب اصلاح ہو۔
دام من یهدی الی الحق احق ان یشیع ام من لا یهدی الا ان یهدی)
ایک رہنمائے حقیقی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے اپنی ذات کو بطور نمونہ
پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ

مرکزت فیکم رأیة الایمان ووقفتم علی حدود الحلال والحرام
والبتمک العافیة من عدلی وفرشتکم المعروف من قولی وفعلی
وارہیتکم کرائم الاخلاق من نفسی۔

”میں نے تم میں ایمان کا جھنڈا اکاڑ دیا۔ اور تم کو حلال و حرام کی حدود

سے نبی البلاغہ ص ۱۶

سے باخبر کیا اور تمہیں اپنی عدالت سے امن و امان کا لباس پہنا دیا اور اپنے قول و فعل سے حسن سلوک کا اور صفا بچھڑاتا تمہارے لیے کر دیا۔ اور تمہارے سامنے اپنی ذات کی جانب سے بزرگ ترین اخلاق کا نمونہ پیش کیا۔ وہ یہ کہ کہ جہاں نہیں چھڑاتا کہ مجھ پر وحی نہیں اترتی اس لیے مجھ سے سنتِ رسول پر چلنے کا مطالبہ نہ کرو بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ مَا اسْمَعُهُمْ اَنْ رَسُولَ شَيْئًا اِلَا وَّهَا اَنَا ذَا الْيَوْمِ مَسْمُوعُوهُ
وَمَا اسْمَعَكُمْ الْيَوْمَ بَدْوَنَ اسْمَاعِهِمْ بِالْاَمْسِ وَلَا شَقَتْ
لَهُمُ الْاَبْصَارُ وَلَا جَعَلَتْ لَهُمُ الْاَفْئِدَةُ فِي ذَلِكَ الْاَوَانِ
اِلَّا وَقَدْ اَعْطِيَتْهُمْ مَثَلَهَا فِي هَذَا الزَّمَانِ۔

”خدا کی قسم رسول اللہؐ نے اپنے زمانہ والوں کو جتنے تعلیمات پہنچائے تھے وہ آج میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ اور تمہیں کوئی ایسی نئی بات نہیں سنائی جاتی جو انہیں سنائی نہ گئی ہو۔ اور نہ ان کے لیے تم انہیں کھولی گئیں اور دلوں میں احساس پیدا کیا گیا مگر یہ کہ آج تمہارے لیے وہی بات باعمل ہے۔“ وہ دوسروں سے چاہتا بھی ہے تو یہ نہیں کہ وہ اسکی خود اصلاح کریں۔ بلکہ یہ کہ وہ اپنے نفوس کی اصلاح میں اس کے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں۔

اِيْهَا النَّاسُ اَعْدِيْنِيْ عَلٰى الْفُسْكَرِ وَاِيْمُ اللّٰهِ لَا نَصْقُكَ الْمَظْلُوْمُ
مِنْ ظَالِمِهِ وَلَا فُودُتِ الظّٰلِمُ نَجْزَامَةً حَتّٰى اُوْرِدَهُ
مِنْهُلِ الْحَقِّ وَاِنْ كَانَ كَاْمَرَهَا۔

”میری امداد کرو خود اپنے فُصول کے خلاف اور خدا کی قسم میں مظلوم کی ظلم سے داد ضرور دلاؤں گا۔ اور ظالم کو اس کی مہار پکڑ کر کھینچوں گا یہاں تک

کہ اسے حق کے حشر پر پہنچا دوں۔ اگرچہ وہ اسے ناپسند کرتا ہو۔“

نظم و نسق اور ملکی انتظامات میں حضرت ابوبکر کے تختی، عزم، قوت فکر اور مستقل مزاجی اپنی صحیح رائے پر اعمتاد اور مخالفت طاقتوں سے مرعوب نہ ہونے کا اندازہ اس روایت سے کیجیے، جسے شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصحابہ جلد ۲ صفحہ ۵۵ میں لکھا ہے اور ابن الجوزی نے شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۱ میں بھی اس کو درج کیا ہے۔ کہ ۱۔

”عین بن حصین اور اقرع بن عابس حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے پاس ایک شہرہ ناز زمین ہے جس میں نہ

آب دیکھا ہے اور نہ کوئی فائدہ ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں، تو وہ

زمین ہمیں بطور جاگہ دے دیجیے۔ شاید خدا اس کے ذریعہ سے ہم کو فائدہ

پہنچائے۔ حضرت ابوبکر نے ان لوگوں سے جو آپ کے گرد و پیش بیٹھے تھے

پوچھا، کہ کیوں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی

حرج نہیں ہے۔ آپ نے اُن کے لیے نوشتہ تحریر فرما دیا۔ وہ اس کیلئے

ہوئے حضرت عمر کے پاس گئے کہ وہ اس میں اپنی گواہی تحریر فرمادیں۔ آپ

نے اس کو لے کر اس میں تھوک دیا اور مٹا دیا۔ وہ بڑے برا فروختہ ہوئے

اور بدزبانی کرنے لگے۔ پھر ابوبکر نے اسے جبراً ہوتے ہوئے گئے اور کہنے

لگے خدا کی قسم کچھ سمجھ میں نہیں آتا، خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابوبکر نے

فرمایا، انہیں بھی خلیفہ ان ہی کو سمجھو۔ اتنی دیر میں عمر آگئے اور بڑے غصہ

میں حضرت ابوبکر کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے مجھے بتاؤ یہ زمین

جو تم نے ان دونوں کو دے دی یہ تمہاری ملکیت تھی یا مسلمانوں کی تھی؟

انھوں نے کہا۔ مسلمانوں کی تھی آپ نے کہا پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا جو

تم نے اسے ان دونوں سے مخصوص کر دیا؟ آپ نے فرمایا میں نے اپنے

گرد و پیش کے لوگوں سے رائے لے لی تھی حضرت عمرؓ نے کہا: کیا تمام مسلمانوں سے آپؐ نے مشورہ لیا تھا اور رضامندی حاصل کی تھی؟ حضرت ابو بکرؓ نے (بڑی بے بسی سے کہا) فقد كنت قلت لا، انك اقوى على هذا الامر مني كنت غلبتني۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم میں امر خلافت کے انجام دینے کی مجھ سے زیادہ طاقت ہے۔ لیکن تم ہی نے مجھے مجبور کیا؟ فقہ حنفی کی مشہور کتاب تدمری کی شرح "جوہرۃ نیرہ" میں جو مصر میں شائع ہوئی ہے جلد ۱ ص ۱۶۴ میں اسی طرح کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ:-

"مؤلفۃ القلوب جنیں رسول اللہؐ کی زندگی میں عطایا دیے جاتے تھے وہ بعد رسول اللہؐ کے ابو بکرؓ کے پاس آئے تاکہ آپ ان کے لیے حسب معمول عطیہ کا فرمان صادر کریں۔ آپؐ نے لکھ دیا۔ وہ اس نوشتہ کو لیے ہوئے حضرت عمرؓ کے پاس گئے کہ آپؐ کی تحریر بھی حاصل کریں۔ آپؐ نے اس کاغذ کو پھاڑ ڈالا اور فرمایا۔ کہ اب ہم کو تمہاری ضرورت نہیں ہے خدا نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے۔ اور تم سے استغنیٰ کر دیا۔ اب اگر تم مطیع فرمان رہے تو تیرے نہیں تو تلوار سے تمہیں ٹھیک کیا جائے گا۔ وہ لوگ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا۔ خلیفہ آپؐ میں یا عمرؓ؟ فرمایا نہیں خلیفہ وہی میں انشاء اللہ اور آپؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو برقرار رکھا۔"

اس کے بعد سے اہل سنت کے مذہب میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہو گیا۔ یہاں تک کہ اگر انھیں خمس سے حصہ دیا جائے تو برأت ذمہ حاصل نہیں ہوگی۔ یہ ہے حضرت ابو بکرؓ کی بلند حوصلگی کی صفت جس کے لحاظ سے "م۔ ح" صاحب آپؐ کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہیں کہ "وہ ابو بکرؓ تھے۔ ایک

کوہ عزم و ثبات، ایک اسماعی عظمت و جمال، انھیں اپنی اصابت رائے پر کامل اعتماد و اطمینان تھا
حضرت عمر جیسا دبنگ انسان ان کو اپنی رائے سے بائزر کھنے گیا لیکن ایسی ڈانٹ بتائی کہ ان
کو خاموش ہی رہنا پڑا۔

یقیناً اس طرح کا ایک ایک حرف گزشتہ واقعہ سے بالکل ثابت ہے۔ "یہ نشان
خلافت حق ہے۔"

حضرت عمر کے بقول "م۔ ح صاحب" دبنگ ہونے میں بیشک کوئی شبہ نہیں اور
اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابو بکر کے زمانے میں بھی خلافت و حقیقت آپ ہی کر رہے تھے جیسا
کہ مذکورہ بالا واقعہ سے آپ نے دیکھ لیا لیکن دو موقعوں پر آپ کے عزم و استقلال ثبات
رائے اور خود اعتمادی کو شکست اٹھانا پڑتی تھی۔ ایک وہ جب کوئی مسئلہ ایسا پیش ہو جائے
جس کا فیصلہ حکم شرع کے مطابق ہونا چاہیے تو آپ کے قلبی نزاع کا یہ عالم ہوتا تھا
کہ ایک کسی بڑے آدمی کا کیا ذکر ہر معمولی صحابی بلکہ ادنیٰ عورت کے کہنے سے بھی فوراً
فیصلہ پلٹ دیتے تھے۔ اس کی مثالیں سابق میں پیش ہو چکی ہیں اور دوسرے وہ جب
جان جو حکم کا مرحلہ سامنے آجائے جیسے فارس اور روم کی جنگ میں بذات خود جہانے کا
ارادہ اور حضرت علیؓ کا اس کے خوفناک پہلو کو دکھلانا اور اس آپ کا اس ارادہ کو ترک کر
دینا۔ اس کی تفصیل بھی پہلے درج ہو چکی ہے۔

خالد بن الولید سے مالک بن نویرہ کے قتل کا قصاص لینے پر آپ کا حضرت ابو بکر
کے زمانے میں اصرار اور کسی اندیشہ سے حضرت ابو بکر کا اس پر عمل نہ کرنا، اس کا تقاضا تھا کہ
جب حضرت عمر خلیفہ ہوں تو خالد بن الولید سے قصاص لے لیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔
کیوں؟ صرف خالد کی ہدیت جو حضرت ابو بکر کو اس معاملہ میں حضرت عمر کے اصرار
کے باوجود مانع رہی۔ اسی وجہ سے خود آپ اس فرض کے انجام دینے سے
قاصر رہے۔

جب ان دلوں مہم بالشان خلافتوں کا یہ عالم تھا تو اب میں حضرت عثمان کی خلافت کا جائزہ کیا لوں۔ بہر حال اس داستان کو بھی دیکھ لیجیے، میرے قلم سے نہیں بلکہ خواجہ حسن نظامی کے دلچسپ انداز تحریر میں۔ اس لیے نہیں کہ میں ان کی روایت کو تمام اہل سنت کے سامنے بطور سند پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ واقعات تو تمام مسلمہ تاریخوں میں موجود ہیں۔ لیکن صرف اس لیے کہ ان ہی واقعات کو انھوں نے اپنے انداز میں درج کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب "محرم نامہ" میں جو بار دہم ۳۴۸ھ میں دہلی میں شائع ہوئی ہے اور ممکن ہے اس کے بعد بھی چھپی ہو، لیکن میرے سامنے یہی ایڈیشن ہے۔ تحریر فرماتے ہیں: ۱۔

"تاریخوں اور معتبر کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بہت نرم دل آدمی تھے۔ حدیث میں آیا ہے۔ "اہل الجنة بلبہ" جنتی بھولے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی بھولپن بہت تھا۔

حضرت عمرؓ نے تاکید کر دی تھی کہ خلافت حاصل ہونے کے بعد اپنے خاندان اور قبیلہ کی رعایت نہ کرنا۔ مگر حضرت عثمانؓ اس پر عمل نہ کر سکے۔ الخ۔ اس کی پوری تفصیل محرم نامہ میں ملاحظہ کیجیے۔

اطمینان کے لیے صواعق محرقة علامہ ابن حجر مطبوعہ مصرؒ میں بھی یہی واقعات پڑھ لو۔ کیا اسی کا نام ہے عزم و استقلال، قوت نفس اور اطمینان۔ جس کا گذشتہ واقعات میں مظاہر ہو ہے۔ اگر پھر ضرورت ہوئی تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اس وقت اتنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو
چھٹی شرط

یہ برقی صاحب نے اپنے سابق مضمون میں شرط لکھی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں

کہ یہ انھوں نے بالکل بلا قصد و ارادہ لکھی ہے اور ہرگز اس کا مفہوم ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ کیونکہ اگر دنیا کے مختلف افراد کے اخلاقی حدود کے اعتبار سے دیکھا جائے اور اخلاق کے معنی پر نظر کر لی جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان "سوائے" معصوم" کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن عصمت کی شرط کی نفی بڑی صاحبِ ادران کے تمام ہم خیال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پھر یہ شرط قلم سے کیونکر نکلی؟ مرنے عقل عمومی، اوچھائے اجتماعیہ کی فطری تحریک سے بغیر جانے دیجیے۔ "اخلاق" کا یہ مفہوم بلکہ اس کو بے لیجیے اس عام معنی میں جو محض معاشرت کی مراد صورت سے ہماری زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ اخلاقی فضیلت میں خلفائے ثلاثہ دنیا کے "مکمل ترین" نہ سہی بجائے خود "مکمل" انسان تھے؟ انہوں نے کہ ایسا نہیں ہے

حضرت ابو بکر کو خود اس کا احساس تھا۔ چنانچہ سب سے پہلا تاریخی خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا جس کے بعض اقتباسات اس کے پہلے آچکے ہیں اس میں آپ نے فرمایا: "واعلموا ان لی شیطاناً یعتری سبی فاذا سراہتمونی غضبت فاجتنبونی" تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ پر شیطان کا غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے جب تم دیکھو کہ مجھے غصہ آیا ہے تو مجھ سے بچا کر دینا۔

یہ حقیقت ہے کہ قدیم عادیں مشکل سے چھوٹی ہیں۔ سجاہلیت کے لوگوں کی زبان پر گالیاں اکثر اُترتی تھیں۔ اسلام نے اس عادت کی بہت اصلاح کی مگر وہ پھر بھی باقی رہی۔ مؤرخ ابن عساکر دمشقی نے لکھا ہے: "استب عقیل بن ابی طالب والی بکر قال دکان ابوبکر سبلاً اونساکب عقیل بن ابی طالب اذ ابوبکر میں گام گلوچ ہوئی اذ ابوبکر بڑے گالیاں جلتے والے تھے یا نب سے بہت واقف تھے بلکہ

لے صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ لے صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷

سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ نسباً کا لفظ بھی ہو جب بھی اس کا مطلب یہی ہے کہ گالیوں کے لیے ماں بہن کے بکمال خوب کرتے تھے۔

اور حضرت عمرؓ ان کی تو سخت مزاجی اور درشت خوئی شہرہ آفاق ہے۔ جس کا مظاہرہ رسول اللہؐ تک کے ساتھ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب رسول اللہؐ عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے تو تاریخ میں ہے کہ جذبہ عمر قال ایس قد نفی اللہ ان تصلی علی المنا فقین۔ حضرت عمرؓ نے پکڑ کر کھینچا اور کہا، کیا خدا نے آپ کو مانعت نہیں کی ہے منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے۔

آپ کی اس درشت خوئی کا اتنا شہرہ تھا کہ ہر شخص واقف تھا اور آپ سے دُرتا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے ام کلثوم دختر ابوبکر کے ساتھ شادی کی درخواست حضرت عائشہ سے کی اور ام المومنین نے مصلحتاً آپ سے اس کا وعدہ کیا اور آپ اٹھ کر تشریف لے گئے تو لڑکی نے اپنی بڑی بہن سے کہا۔ تزوج جیتی وقد عرفت غیوتہ وحشونہ عیش۔ واللہ لئن فعلت لا اخرجن الی قبر رسول اللہ ولا صیحن بہ۔

آپ میری شادی ان کے ساتھ کر دیں گی مہالانکہ آپ کو ان کا غصہ اور طرہ معاشرت کی دشمنی معلوم ہے۔ بخدا اگر آپ نے ایسا کیا تو میں رسول اللہؐ کی قبر پر ہمارا فرادہ کر دوں گی۔ سقینہ میں جو آپ کی جانب سے اخلاقی نمونہ پیش ہوا وہ اس کے پہلے آچکا ہے دوسرے موقعوں پر جو بات بات پر آپ کا کوڑا اٹھ جاتا تھا اس کی بعض مثالیں پہلے آچکی ہیں۔ کوئی آپ کی تعظیم کے لیے نہ کھڑا ہوا کوڑا مار دیا۔ کسی نے قرآن کے کسی مشابہ آیت کے معنی دریافت کیے آپ نے کوڑے لگائے اتنے کہ وہ زخمی ہو گیا اور اس کے سر سے خون جاری ہو گیا۔

لہ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۱ ص ۳۷۸ لہ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۳۷۸

لہ مواہن مرقۃ مطبوعہ مصر لہ آلفان سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۲۸

کسی نے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں کچھ معلومات کا اظہار کرنا چاہا، آپ نے
کوڑا لگا دیا۔

اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ کر لیجیے۔ قبیصہ بن جابر اسدی کی روایت ہے کہ میں
احرام باندھے ہوئے تھا۔ میں نے ایک ہرن دیکھا، اس کے تیرنگا دیا، وہ مر گیا۔ اس سے
مجھے شک پیدا ہوا۔ میں حضرت عمر کے پاس آیا۔ آپ کے پہلو میں عبدالرحمن بن عوف
تھے۔ میں نے حضرت عمر سے مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے عبدالرحمن کی طرف متوجہ ہو
کر فرمایا: ”کیوں تمہارے نزدیک ایک بکری کی قربانی کافی ہوگی“ انھوں نے کہا: ”ہاں کافی
ہے۔“ تب حضرت عمر نے مجھے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر دوں۔ جب ہم لوگ وہاں سے
اٹھے تو میرے ایک ساتھی نے مجھ سے کہا کہ امیر المؤمنین لمحیح بن ان یفیتک
حق سئل الرجل: ”خليفة صاحب خود فتویٰ نہیں دے سکے جب تک اس شخص سے
پوچھ نہیں لیا۔“ حضرت عمر نے کلام اس کا کچھ سن لیا۔ فوراً کوڑا لے کر بڑھے اور اسے کوڑا
مار دیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے کہ مجھے ماریں۔ میں نے کہا حضور میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔
کہا اس نے تھا۔ تب آپ نے خنجر کو چھوڑ دیا۔

اس آپ کی مزاحیہ خصلت کا علمائے اہل سنت کو اقرا ہے۔ چنانچہ اسمعیل بن
حماد بن ابی حنیفہ کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں ایک آٹا پیسنے والا رافضی تھا۔
جس کے پاس دو خچر تھے۔ ایک کا نام اس نے رکھا تھا ابو بکر اور دوسرے کا عمر۔ ایک
نے ان میں سے اس کو لات ماری جس سے وہ مر گیا۔ میرے دادا ام ابی حنیفہ
کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا دیکھو جس نے لات ماری ہے وہ وہی ہوگا
جس کا نام عمر ہے۔ لوگوں نے دیکھا تو واقعہ یہی تھا۔

رہ گئے جناب عثمانؓ ان کے بہت سے واقعات آپ کے سامنے آچکے ہیں۔

۱۔ اتفاقاً طبعہ دہلی ۲۴۴۰ھ۔ حیوۃ الحيوان ج ۲ ص ۵۷۔ ۲۔ حیوۃ الحيوان ج ۱ ص ۱۴۲۔

جن میں آپ کو اخلاقی جوہر بھی دکھلائی دیں گے۔

حضرت ابوذر غفاری جن کے متعلق رسول اللہ کا ارشاد تھا۔ ”ما اظلت الخضرۃ ولا اقلت الغبراء علی اصدق من ابی ذر“ نہ آسمان نے سایہ ڈالا اور نہ زمین نے اٹھایا کسی ایسے شخص کو جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو۔“

حضرت عمار یا سر کے لیے رسول اللہ کا ارشاد تھا۔ عمار حلیۃ ما بین عینی ”عمار میری آنکھوں کے درمیان کی کھال ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود جن کے لیے رسول اللہ کا ارشاد تھا۔ ”من اسراہ ان یقرأ القرآن غصاً فلیقرأہ علی قراءۃ ابن ام عبد۔“ یہ شخص قرآن کو تروتازہ پڑھنا چاہتا ہو وہ ابن مسعود کی قرأت پر پڑھے۔“ ان تمام محترم صحابیوں کے ساتھ ضرب شدید کا ارتکاب کس نے کیا؟ مسلمانوں کے نمائندوں کو عمل کے بدلے پرست دھکے دے کر کس نے نکلوا دیا؟ حضرت علیؑ کے درمیان میں پڑنے پر مذاق کی علیحدگی کے وعدے کر کے پھر ان وعدوں کی مخالفت کس نے کی؟ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔

کیا ایسے ہی اشخاص کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”وہ اخلاقی فضیلت میں دنیا کے مکمل ترین انسان تھے۔“ معلوم ہوا کہ فتنہ انظر خلافت میں سے کوئی ایک فتنہ بھی ایسی نہ تھی جو ان حضرات میں موجود سمجھی جاسکے۔ پھر آخر ان کی حکومت کو خلافت رسولؐ کس طرح سمجھا جائے۔ اور ان کی امامت کو کیونکر صحیح و حق بجانب قرار دیا جائے۔

بیشک اگر صرف بادشاہت کا سوال ہے تو اس میں کیا شبہ کہ یہ لوگ حکمران تھے۔ پھر یہ جھگڑے کی کون سی بات ہے اور اس میں اختلاف کی کیا گنجائش ہے۔

حضرت علی بن ابیطالبؓ شرائط خلافت کا انطباق

اب آئیے دیکھیں، گزشتہ شرائط کے لحاظ سے حضرت علی بن ابی طالب کا کیا درجہ نظر آتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پہلی، تیسری، چوتھی اور چھٹی شرط کے لحاظ سے آپ کی بلندی اتنی واضح ہے کہ کسی کو اس میں گنجائش کلام ملتی ہی نہیں۔

علی کا علم، علی کی شجاعت، علی کی عدالت، اور علی کی اخلاقی فضیلت اتنی روشن حقیقتیں ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکنا بھی بیکار ہے۔

بہت کمائش و کاوش کے ساتھ اگر گنجائش بحث نکالی جاتی ہے تو وہ صرف دو باتوں میں۔ ایک سیاسی قابلیت اور دوسرے عزم و ارادہ کی پختگی۔ ”م۔ ح“ صاحب نے جہانفشانی اور عرق ریزی سے یہ ثبات کرنے کی کوشش کی ہے کہ جناب امیرؓ میں یہ دونوں صفتیں مغفود تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”ان کو دوسروں سے اختلاف رائے کی ہمت کم ہوتی تھی۔ وہ اپنے عزائم میں غیر معمولی طریقہ سے ثبات و استقلال نہیں رکھتے تھے۔ ان کو خود اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ نہ ہوتا۔ وہ مخالفت طاقتوں سے مرعوب ہو جاتے۔ ان میں وہ قاہرانہ سلطوت اور آمرانہ دبدبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتیں مان لیتے یا ان کے احکام پر عمل پیرا ہوتے۔“

میں اس نکتہ سی پر ”م۔ ح“ صاحب کو قابل الزام نہیں سمجھتا۔ کیونکہ حضرت علیؓ بن ابی طالب کی حکومت کا دور جن متواتر مثالوں کے بعد آیا ان کے تناسب سے جب حضرت علیؓ کے طرز حکومت کو دیکھا جائے گا تو وہ بالکل مختلف ضرور نظر آئے گا۔ اور اسی لیے اس موقع پر آپ خلافت کے قبول کرنے سے انکار بھی فرما رہے تھے اور کہتے تھے۔ ”دعونی والتمسوا غیری۔“ مجھ کو معاف کرو کسی اور سے کہو۔“

اور اسی لیے حضرت عثمان کی خلافت پر آپ نے صاف انکار کر دیا کہ سنت

شیعین کی پابندی میں نہیں کر سکتا۔ اس کی تفصیل بعد کو آئے گی۔
 مجھے حضرت علیؑ کی خلافت کے سمجھانے کے لیے ضرورت پڑتی ہے کہ کہیں برس
 پہلے کی تاریخ الٹ کر حضرت رسول اللہؐ کی طرز حکومت کو دیکھوں مجھے معلوم ہوتا ہے
 کہ دونوں نقض ایک دوسرے سے ملنے جلتے ہیں اور آپس میں اختلاف نہیں ہے۔
 ”م۔ ح“ صاحب کے نقطہ نظر کی عینک لگا کر حیب میں دیکھتا ہوں تو مجھے وہاں
 بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اختلاف رائے کی بناء پر وہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہے جس
 کا نتیجہ ان کے حق میں خراب بھی نکلا۔

چنانچہ جنگ احد میں حضرت رسولؐ کی خود رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں قیام فرمائیں۔
 اور وہیں رہ کر دشمنوں سے جنگ کریں۔ مگر بہت سے مسلمانوں نے یہ کہا کہ نہیں، اس
 میں کفار سمجھیں گے کہ ہم ڈر گئے اور ہم نے بزدلی سے کام لیا۔ یہ سن کر حضرت بیت الشرف
 میں تشریف لے گئے اور آپؐ لباسِ حرب سے آراستہ ہو کر باہر تشریف لائے حیب
 ان لوگوں نے دیکھا کہ حضرت آمادہ ہو گئے تو یہ لوگ پشیمان ہوئے اور آپس میں ایک
 دوسرے سے کہا کہ کتنا بُرا کیا تم لوگوں نے رسول اللہؐ کو ان کی رائے کے خلاف مشورہ
 دیا۔ حالانکہ ان پر وحی اترتی ہے۔ آخر رسول اللہؐ سے کہا کہ جو آپؐ کو مناسب معلوم ہو وہ
 کیجیے اور معذرت کی۔

آپؐ نے فرمایا۔ نہیں، اب حیب میں تیار ہو گیا تو جاؤں گا ضرور ہے
 نتیجہ دہی ہوا جس کی آپؐ نے پہلے سے خبر دی تھی کہ سخت شکست اور تباہی سے
 دوچار ہونا پڑا۔ صرف رسول اللہؐ کا اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کی مخالفت کی بناء پر بدلتا
 کیسا بلکہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ احکامِ حسد میں تبدیلی ہو گئی، لوگوں کی عملی مخالفت کی وجہ
 سے جیسے ابتدائے اسلام کا یہ حکم کہ زمانہ ماہِ صیام میں رات کے وقت بھی عورتوں کے

ساتھ مخصوص تعلقات جائز نہیں ہیں۔ جناب عمر بن الخطاب اور مالک ابن ابی انس یا کعب بن مالک نے اس حکم کی مخالفت کی۔ آخر وہ حکم منسوخ ہو گیا اور بات کو یہ لہر جائز ہو گیا۔

یا رسول اللہ کے ساتھ نجوی کے لیے صدقہ پیش کرنے کا حکم اور اس کی مخالفت پر اس آیت کا اڑنا۔ (لا شفقتم ان تقد موا بین یدی انھو یکم صدقات) ”تم لوگ ڈر گئے اتنے سے کہ رسول کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کچھ صدقہ پہلے دے دو“۔ آخر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت رسول کی رعایا آپ کا کہنا ہمیشہ نہیں مانتی تھی۔

ولوا ان کتبنا علیہم ان اقتلوا انفسکم وادخر جوا سن دیا کہ ما غلوہ الا قلیلا منهم۔ ”اگر ہم ان کو حکم دیں کہ تم اپنے خاص اشخاص کو قتل کر دیا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو بہت کم وہ لوگ ہوں گے جو ایسا کریں۔“

ان میں سے بہت لوگ وہ تھے جو جہاد کے حکم پر دہشت زدہ ہو جاتے تھے اور حیلہ حوالہ کرنے لگتے تھے۔ ”فلما کتب علیہم القتال اذا فریق منهم یخشون الناس کخشیة اللہ وراشد خشية وقالوا رہنا لکم کتبت علینا القتال“ ”جب ان پر جہاد کا فرض عائد کیا گیا تو ایک جماعت ان میں سے لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرا جاتا ہے۔ یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے پڑ گارا تو نے ہم پر جہاد کیوں واجب کیا۔“

یہ لوگ رسول کے رعب و دبدبہ سے اتنے کم متاثر تھے کہ وہ رسول سے روتے اور جھگڑا کرتے تھے۔ کہا اخرجک من بیتک بالحق وان فریقاً

۱۔ استیعاب ج ۱ مطبعہ جدیدہ بادمہ ۳۳ لغات القرآن فی مہمات القرآن ص ۱۵۱ سیوطی مطبوعہ

مصر ۱۲۸۵ سورہ جہاد ۱۲ سورہ نساء ۷۷ سورہ نساء ۷۷

من المؤمنین لکاردھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کالتما یساقون
الی الموت وهم ینظرون ۔

”پھر تم کو تمہارے رب نے سچائی کے ساتھ اپنے مکان سے نکلنے کا حکم دیا اس
حالت میں کہ ایک جماعت مسلمانوں کی اس کو ناپسند کرتی تھی۔ یہ لوگ تم سے رشتہ
حق کے معاملہ میں جبکہ وہ ظاہر ہو چکا تھا معلوم ہوتا تھا کہ یہ موت کی طرف لے جائے جا
رہے ہیں درآغالبیک وہ دیکھ رہے ہیں۔“

رسول اللہ جہاد کا حکم دے رہے ہیں اور لوگ سرگرائی سے کام لے رہے ہیں
مالکم اذا قیل لکم انفراد فی سبیل اللہ اثا قلمت الی الارض ۔

”انہو یہ کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نکلو تو تم
گراں جانی کے ساتھ زمین گیر ہو جاتے ہو۔“

ان لوگوں میں وہ لوگ بھی تھے جو رسول کو ایذا پہنچاتے تھے۔ منهم الذین
یؤذون النبی ویقولون هو اذن ۔

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو رسول کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو بس
”کان“ ہیں (یعنی ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں) و رسول اللہ کا اور ان کی باتوں کا مذاق
تک اڑاتے تھے۔ و ان سئلتم لیقولن انما کنا غرض و ندعب و نل
ابا للہ و آیاتہ و رسولہ کنتہ تستہزن و ن ۔

”اگر ان سے پوچھو تو یہ کہیں گے کہ ہم تو باتیں کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے
تھے۔ کہو کہ کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کا مذاق اڑا رہے تھے؟“
اطاعت و فرمان برداری تو بعد کی چیز ہے اور وقعت و دنیا دوسرا مرحلہ ہے یہ لوگ
آپ کی باتوں کو غمزے سننے تک نہ تھے۔ (ومنہم من لیستع الیٰہ حتی

لہ النعال پ ۱۰۰ توبہ پارہ ۱۰۔ ۱۰ توبہ پ ۱۰۰

افاخر جوامن عندك قالوا للذين اذكو العلم ما ذا قال انفا

”ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہاری باتوں کو ظاہر میں سننے آتے ہیں اور جب تمہارے پاس سے جلتے ہیں تو دوسرے لوگوں سے جو واقفیت رکھتے ہیں پوچھتے ہیں، یہ بھی انہوں نے کیا کیا تھا۔“

یہ لوگ رسول اللہ کی محفل میں بیٹھ کر آدابِ مجلس تک کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ اور آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے تھے۔ ان کو منع بھی کیا گیا۔ جب بھی کوئی سماعت نہیں کی۔

المستزالی الذین نهوا عن النجوى ثم لجودون لما نهوا عنه ویتاحون بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول۔ کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیوں سے ممانعت ہوئی تھی۔ پھر بھی انہوں نے وہی کیا جس سے منع کیا گیا اور گناہ و ظلم اور رسول کے حکم کی مخالفت کے ساتھ یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں؟ ان لوگوں کے دل پر خود رسول کی عظمت کا اتنا کم اثر تھا کہ مسجد میں آپ کی موجودگی میں اور آپ کے خطبہ پڑھنے کی حالت میں باجے کی آواز سن کر یہ دیکھنے چلے جلتے تھے اور رسول اللہ کو کھڑے کا کھڑا جھوڑ دیتے تھے۔

واذا امرأ وابتجارة اولهوا الفتوا اليها وتركوا قسما۔

”جب انہوں نے تجارت دیکھی یا ہوا و لعب دیکھا متفرق ہو گئے اس کے لیے اور تم کو کھڑا ہوا جھوڑ دیا۔“

وہ لوگ سب مخالفتیں کرتے تھے رسول کو تکلیفیں دیتے تھے۔ آپ کی درکرتے تھے اور بے اعتنائی سے کام لیتے تھے۔ مگر رسول اللہ کی جانب سے نہ ان کے خلاف قیام رکھا جاتا تھی نہ کوئی اہل بند کیا جاتا تھا، بلکہ بے بس اور کمزور لوگوں کی طرح انہیں عذابِ خدا سے ڈرنے پر کٹھا کی جاتی تھی۔ اور خدا کی قوت کا حوالہ دیا جاتا تھا۔

سہ سورۃ محمد پڑھا سورۃ جمع پڑھا

فَانْزَلْنَاهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكَ الْبَيِّنَاتُ فَاَعْلَمُوا اِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ
 اگر تم لوگ غموں کو کھاؤ بعد اس کے کہ روشن دلیلیں تمہارے سامنے آسکیں تو سمجھ لو کہ خدا
 غالب و قہر مند بڑا مصلحت میں ہے۔

اَلَا تَتَضَرَّعُونَ بَعْدَ الَّذِي نَذَرْنَا لَكُمْ عَذَابًا اَبَا الْيَمَانِ - اگر تم جہاد کو نہ گئے تو خدا تمہیں دردناک
 عذاب کرے گا۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ - جو لوگ رسول
 کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فَاَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ لِّمَنْ دَانَ يَوْمَئِذٍ لَعَنَهُمُ اللَّهُ عَذَابًا
 الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ - اگر انہوں نے توبہ کر لی تو ان کے لیے بہتر ہے اور اگر انہوں نے
 روگردانی کی تو خدا ان پر عذاب نازل کرے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔
 اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا - یہ لوگ جو خدا و رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں دنیا و
 آخرت میں ان پر لعنت ہے اور خدا نے اپنے حقارت آمیز عذاب کو ان کے
 لیے تہیہ کر رکھا ہے۔

ان کے لیے رسول اللہ کی جانب سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ رسول کا کام
 تمہیں صریح ہدایت کرنا ہے اور بس۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول فان
 تولیتہ فانتما رسولاں البکاغ المبین۔

”خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے رسول
 کا فرض صرف واضح تبلیغ کر دینا ہے۔“

۱۰ بقرہ پ ۱۰ توبہ پ ۱۰ توبہ پ ۱۰ توبہ پ ۱۰

۲۲ احزاب پ ۲۸ تغابن پ ۲۸

خداوندِ عالم کی جانب سے خود رسول اللہ کو مطلع کر دیا گیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ومن تولیٰ فمأویسنا اللہ علیہم حقیقاً۔ جو شخص رسول کا کنا مانے اس نے خدا کا کنا مانا اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے تم کو ان کا ذمہ دار قرار دے کر نہیں بھیجا ہے۔

ما علی الرسول الا البلاغ واللہ لعلہ ما یدون وما تکتمون رسولہ کا ام صرف تبلیغ کر دینا ہے۔ اور خدا ایمان داتا ہے تمہاری سب باتوں کو جنہیں تم ظاہر کرتے ہو اور جنہیں تم مخفی کرتے ہو۔

فان تولوا فانما علیہ البلاغ المبین تاکر یہ لوگ روگردانی کریں تو تمہارا فرض صرف واضح طور پر تبلیغ کر دینا ہے۔

بالکل اس طرح جیسے حضرت علیؑ اپنی رعیت کے لیے بددعا کرتے تھے۔

قاللک اللہ لقد ملأتم قلوبی قیحا و شغنتم صدری غیظاً۔

”اللہ تم لوگوں کو لاک کرے۔ تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غصہ سے۔“

اسی طرح رسولؐ کو اپنی رعیت کے لوگوں کی کاروائیوں پر بددعا ہی کرتے نبی مہدیؑ۔ قاللہم اللہ انی دیوفکون۔ ”اللہ ان لوگوں کو لاک کرے یہ کیسے بھٹکتے پھرتے ہیں۔“

کیا یہ بادشاہان دنیا کی شان ہوتی ہے، کیا اسی طرح رعب و سطوت و دبدبہ قائم ہوتا ہے

کہاں وہ شانِ جبروت و بطلان کہ کوئی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہوتا تو کوڑا مار دیا گیا۔ اور کہاں یہ

کہ رسول اللہؐ کو صرف ان کا نام لے کر لوگ پکارتے ہیں اور وہاں سے صرف زبانی ہدایت

پر القفا کر دی جاتی ہے کہ لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم لبعضا

رسول اللہؐ کے پکارنے کو اپنے اندر اس طرح نہ بناؤ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو

سے نام پکارتے ہو۔

آواز دیتے ہو؟

رسول اللہؐ سے لوگ جھج جھج کر بات کرتے تھے اس پر بھی اخلاقی حیثیت سے تعلیم دی جاتی ہے اور خلافت و ندی کی صورت میں پیروی عذابِ آخرت کا خوف۔

یا ایہا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا یجھروا لہ بالقرول کجھربعضکم لبعض ان عقیط اعمالکم وانتم لا تشعرون۔

”اے مسلمانو! رسولؐ کی آواز پر تم اپنی آواز بلند نہ کرو۔ اور ان سے بلند آواز سے باتیں نہ کرو، جیسے آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو۔ اس صورت میں تمہارے اعمال جھوٹ ہو جائیں گے اور تمہیں خبر نہ ہو گی۔“

کیا شاہانِ دنیا کا یہی انداز ہوتا ہے:

رسول اللہؐ خود یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کو دنیا کے بادشاہوں کی صورت پر سمجھ لیا جائے جب ایک شخص رسول اللہؐ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا تو اپنے فرمایا: ہوں علیؑ فانی ست بملک انما انا ابن امرأۃ من قریش کانت تاكل القديۃ ”ٹھہر جا، ٹھہر جا، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایک عورت کا فرزند ہوں جو معمولی کھانا کھاتی تھی“

ان اعلانات کے بعد کہ ”ان تولیتہ فانا“ رسولنا البلاغ المبین فان تولوا فانا علیہ البلاغ المبین“ لگایا سمجھتے کہ اگر ہم ان کا منہ نہ انیں گے تو یہ کچھ بنا سکیں گے۔

پھر جب رسول اللہؐ کا یہ عالم ہے تو خلیفہ رسولؐ کو اس سے زیادہ کیا قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ مذکورہ واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کا فرض ہے تبلیغ اور نفاذ احکام اور مسلمانوں کے لیے آپ کی اطاعت اور آپ کے احکام کا بجالانا

لہٰذا آپؐ نے حجراتؓ کے طبقات ابن سعد جلد اول مطبوعہ لیڈن سے

ایک مذہبی فرض کی بنیاد رکھتا ہے۔ جس کی مخالفت میں نہ ملے انہی سے ہے۔ دنیاوی سزا ان ہی احکام الہی کی مخالفت میں ہے کہ جس میں شریعت کی جانب سے حدود و تعزیرات مقرر ہو گئے ہیں۔ ان کی مخالفت میں بحیثیت حاکم شرع کے رسولؐ اور امامؑ حدود و تعزیرات قائم کرتا ہے۔ جس میں اس کی جانب سے کمزوری نہیں ہونا چاہیے حضرت علیؑ نے خلیفہ رسولؐ اور عام امت کی اس پوزیشن کو صاف الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے

ایما الناس سلی علیکم حقا و لکم علی حق فاما حقکم علی فالنصیحة لکم و توفیر فیئکم علیکم و تعلیمکم کیلا تجھلوا و تأدیکم کیما تعمروا و اما حق علیکم فالو فاء بالبیعة و النصیحة فی المشهد و المغیب و الاجابة حین ادعواکم و الطاعة حین امرکم۔

”ایما الناس! میرا تمہارے اوپر ایک حق ہے۔ اور تمہارا میرے اوپر ایک حق ہے۔ تمہارا حق تو میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہاری خلوص دل کے ساتھ ہدایت کر دوں تمہارے حقوق جو زکوٰۃ و خمس و غیرہ میں ہیں انہیں تم میں تقسیم کر دوں۔ اور تمہیں تعلیم دوں کہ تم جاہل نہ رہو۔ اور تمہیں آداب و قواعد سکھلا دوں تاکہ تم عمل کرو۔ اور میرا حق تم پر یہ ہے کہ تم بیعت کے ساتھ و فاکرو اور سامنے اور پس پشت ہر حال میں خیر خواہی کرو اور جب تمہیں جہاد کے لیے دعوت دوں تو تم لبیک کہو اور حسب حکم دوں تو تم اطاعت کرو۔“

دوسری جگہ فرماتے ہیں

انہ لیس علی الامام الاما حل من امر ربه الابلاغ فی الموعدة والاحتیاد فی النصیحة والاحیاء للسنن و اقامة الحد و دعی مستحقہا و اصدار الشہان علی اہلہا۔

۱۔ بیج البلاغ مطبوعہ مصر ۱۳۹۲ھ - ۲۔ بیج البلاغ مطبوعہ مصر ۱۳۹۹ھ

”امام کا فرض نہیں ہے مگر وحی جس کا وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ پس موعظہ و نصیحت کے ذریعہ سے تبلیغ کرنا۔ اور خالص خیر طلبی میں جدوجہد کرنا، اور احکام شریعت کو زندہ رکھنا اور حدود کا جاری کرنا، ان لوگوں پر جو مستحق ہوں اور زکوٰۃ و خمس کے حصول کو پہنچانا ان کے اہل تک۔“

یہ ہے وہ حکومت جو خلافت رسول اللہ کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے ظاہر میں لوگ جو خلافت رسول کی کامیابی فتوحات کی کثرت کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں۔ حضرت علی کی خلافت کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے مختصر دور خلافت میں دنیا کو دکھلادیا کہ سیاست رسالت کیا چیز ہے اور خلافت نبویؐ کے معنی کیا ہیں۔

بہر صورت ایکہ رائے پر قائم رہنا ہرگز صحیح عزم و ارادہ کی پختگی نہیں ہے کیونکہ کبھی لوگوں کی مخالفت کی صورت میں حکمت و دانش مندی کا تقاضا ہی یہی ہوتا ہے کہ اپنی رائے پر عمل نہ کیا جائے، اس صورت میں اپنی رائے پر عمل کرنے والا مذہبی اور ہٹ دم دم کہلائے گا۔ ہرگز ہرگز عزم و ارادہ کی صفت کے ساتھ قابل تعریف نہ ہوگا۔ جیسے حضرت عثمان کا تمام مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مردان بن الحکم کے سر چڑھائے رکھنے پر اصرار نہ سیاسی نڈیر کا نتیجہ ہے نہ حکمت و مصلحت بنی کا تقاضا۔

لیکن جو شخص تدبیر و حکمت کے ساتھ عزم و ارادہ کی صفت کا بھی مالک ہوتا ہے وہ جب مصلحت اس میں دیکھتا ہے کہ مخالفت کے ساتھ رائے میں تبدیلی کر دے اس وقت ایسا کرتا ہے اور جب اس کے خلاف مناسب سمجھتا ہے تو مخالفت کے باوجود اپنی رائے پر قائم رہتا ہے۔

رسول اللہ کی سیرت میں ہم کو دونوں طرح کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح

حضرت علی بن ابی طالب، ایک نقت آپ دوسرے لوگوں کی رائے پر عمل کر لیتے ہیں، یہ بتا دینے کے بعد کہ وہ غلط ہے۔ اس لیے کہ اس کے خلاف کرنے میں اپنی ہی رعیت کے اندر خونریزی کی صورت میں پیش آئے گی۔ جسے آپ موجودہ حالت میں تباہ کن سمجھتے ہیں۔

اور دوسرے مواقع پر لوگ مخالفت کرتے ہیں لیکن آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہتے ہیں۔ اس کی نفی بہت ہے۔ طلحہ و ذریعہ لغات کرتے ہیں اور لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ ان کا مقابلہ نہ کیجیے اور آپ فرماتے ہیں یہ

واللہ لا اکون کما الضعیف تنام علی طول اللدم حتی یصل الیہا طالبہا ویختلفا مرادھا ولکنی اضرب بالمقیل الی الحق المدد برعنه وبالسماع المطیع العاصی المریب ابداحتی یأتی علی یومی۔

”خدا کی قسم میں اس طرح نہیں ہو سکتا جیسے بچہ۔ جتنا اس کو کھٹکھٹایا جائے وہ سوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فکسار کرنے والا پہنچ جائے۔ اور اس پر حملہ کرنے لیکن میں ان لوگوں کو لے کر جو حق کی طرف متوجہ ہوں اور اطاعت گزار ہوں جنگ کر دوں گا ان سے جو حق سے روگردان ہیں اور نافرمان ہیں، ہمیشہ یہاں تک کہ میری عمر کا آخری دن آئے۔“

حضرت عثمان نے جو جاگیریں لوگوں کو دے دی تھیں، آپ نے سب واپس لے لیں، لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، آپ نے فرمایا:

واللہ لو وجدته قد تزوج به النساء وملک به الاماء لرد دته فان فی العدل سعة ومن صاق علیہ العدل فلجور علیہ اضیق۔

”خدا کی قسم اگر میں دیکھتا کہ اس مال سے عورتوں کے ساتھ شادی کی گئی ہے اور کینڑوں کی

لے بیج البلاغ مطبوعہ مصر ص ۱۷۱ بیج البلاغ ص ۱۷۲

ملکیت حاصل ہوئی ہے تو بھی میں مسترد کر دیتا اور جس شخص پر عدالت کا دائرہ تنگ ہو اس پر ظلم و جور اور تنگی کا باعث ہوگا۔"

جریر بن عبداللہ بجلی آپ کی جانب سے قیام بھیجے جاتے ہیں اور لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیے اور آپ اختلاف فرماتے ہیں۔
جنگ مصفین میں لوگوں کا اصرار ہے کہ جنگ شروع کیجئے اور اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور آپ جب تک مناسب نہیں سمجھنے اجازت ہما دہ نہیں دیتے۔
اطمینان قلب کا یہ عالم کہ اڑائیوں میں بغیر زرہ وغیرہ کے دشمن کی فوج پر حملہ کرتے ہیں اور لوگوں کے منع کرنے سے باز نہیں رہتے۔

تاریخ کی سلسلہ حقیقت ہے کہ آپ کے منہ خلافت پر تمکن ہونے کے بعد سب اس بات کے مخالفت تھے کہ معاویہ کو حکومت شام سے معزول کیا جائے لیکن آپ نے کسی کے مشورہ پر عمل نہ کیا، اس لیے کہ آپ ایک ظالم شخص کے افعال کی ذمہ داری تھوڑے دن کے لیے بھی خود نہیں لینا چاہتے تھے۔

اقابرہ حدود میں آپ کے عزم و ارادہ اور سطوت و قوت کی عجیب شان تھی۔ وہ سابقہ خاندان قیس بن مضر میں کمزور دل پر حد آسانی سے جاری ہو جاتی تھی۔ مگر طاقتور یا شاندار انسان یا نہ رکھتے والوں کے ساتھ مراعات ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ خالد بن ولید سے مالک بن نویرہ کا قصاص اس لیے نہ لیا گیا کہ وہ "سیف اللہ" بن چکے تھے۔

حضرت عثمان نے عبید اللہ بن عمر سے ہرمزان کے قتل کا قصاص اس لیے نہ لیا کہ وہ خلیفہ زادے تھے۔

جب حضرت علی خلیفہ ہوئے تو عبید اللہ کو اپنے متعلق اندیشہ ہوا اور اس لیے وہ بھاگ کر شام چلے گئے آخر مصفین میں قتل ہوئے۔

۱۔ نہج البلاغہ ص ۳۱۳ ۲۔ نہج البلاغہ ص ۳۱۳ ۳۔ نہج البلاغہ ص ۳۱۳ ۴۔ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۲۱۴

حضرت علیؑ کے عزم و ارادہ کی اس بارہ میں یہ شان تھی کہ فرماتے تھے:۔

الدلیل عندی عن یزحقی اخذ الحق له والقوی عندی ضعیف حتی
اخذ الحق منه ۔

”کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہے یہاں تک کہ اس کا حق میں حاصل کر دوں
اور طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ اس سے حق کو وصول کر دوں۔“

حضرت عمرؓ نے اپنے سارے قدامت بن مطعون پر شراب خوری کی حد جاری کرنے میں
جبتائال مثل اور جلیلہا نہ کیا ہے وہ ایک طویل داستان ہے۔ مگر حضرت علیؑ
اس معاملہ میں اتنے بے لوث تھے کہ اپنے عزیز چچا زاد بھائی کو مرث مال کے معاملہ
میں بے اعتمادی پر بخیر فرماتے ہیں:۔

فالتی الله واردها الى هؤلا عا القوم اموالهم فاذا ان لم
تفعل ثم ما مكنی الله مناخ لا عذر ان الى الله فيك ولا
ضمير بك بسيفي الذي ما حريت به احدا الا دخل النار
والله لو ان الحسن والحسين ضلما مثل الذي فعلت ما كانت
لها عندی هوادة ولا ظفر اصني با رادة حتى اخذ الحق
منهما وارسل الباطل عن مظلمتيهما۔

”خدا سے دُرو اور ان لوگوں کے اُن کے اموال واپس کر دو، اگر تم نے ایسا
نہ کیا اور خدا نے مجھے موقع دیا تو میں خدا کی بارگاہ میں تمہارے بارے
میں اپنی جواب دہی کا سامان کر دوں گا۔ اور تم کو اپنی اسی تلوار کی ضربت
لگاؤں گا جس سے میں نے کسی کو نہیں مارا ہے۔ مگر یہ کہ وہ آتش جہنم میں
داخل ہوا اور خدا کی قسم اگر حسنؑ و حسینؑ ایسا کرتے تو ان کے لیے بھی میرے

لہ نیج البلاغہ ص ۹۸۔ ۳۵ استیعاب جلد ۲ ص ۵۰۔ ۳۵ نیج البلاغہ مطبوعہ عمر ۲ ص ۶۷۔ ۶۹

پاس کوئی رعایت نہ ہوتی اور نہ مجھ سے وہ اپنا مطلب نکال سکتے۔ یہاں تک کہ میں حق کو اُن سے لے لیتا اور باطل کو اُن کے ظلم سے بطرت کرتا؟ یہ ہیں علی بن ابی طالبؑ اور یہ ہے ان کی خلافت کی شان۔

بالکل غلط ہے یہ کہ ان کو حضرت ابو بکرؓ کی خلافت سے اختلاف کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ انھوں نے برابر اظہار کیا، اور اگر اظہار نہ کرتے تو آج ساڑھے تیرہ صدی کے بعد وہ اس درجہ ظاہر نہ ہوتا کہ "م۔ ح" صاحب کو بادل ناخواستہ اقرار کرنا پڑے۔

"یہ ایک حقیقت ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت سے ان کو انکار و اختلاف تھا" لیکن پھر بھی جہگ کو یہ مفادِ اسلامی کے لیے معز سمجھتے تھے۔

یہ بھی ان کی قوتِ ارادی اور عزم کی شان تھی کہ باوجود عداوتِ جہانی کے پھر بھی مصلحت کو مقدم کیا اور کمزور ارادہ اور رائے کے اشخاص کی طرح درغلصہ ٹالوں اور سبز باغ دکھانے والوں سے متاثر نہیں ہوئے۔

ابوسفیانؓ ایسا صاحبِ قوم و قبیلہ شخص جس کے راضی کرنے کے لیے مالکِ تاج و تخت اور صاحبِ شان و شوکتِ آدم۔ ح" صاحب کے الفاظ میں دہنگ انسان حضرت عمرؓ کو بھی شام کا پورا علاقہ ہمیشہ کے لیے فرخت کر دینا پڑا اور تیسرے دور کے واسطے بنی امیہ کے لیے جگہ بھی دینی چڑی، وہ علی بن ابی طالبؓ کو نصرت کے پورے وعدہ کے ساتھ ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے کہ میں مدینہ کو سوار و پیادہ سے بھر دوں گا اور علیؓ اس کو یہ کہ کر ڈانٹ دیتے ہیں کہ تو ہمیشہ سے اسلام کا دشمن رہا ہے یہ

وہ علم جسے آپؐ فرمائے تھے کہ تمہیں نہیں حاصل ہے۔ یہی ہے کہ اس وقت جہگ

لے انتیاب ج ۲ صفحہ ۷۸۷ تحریر صفحہ ۷۸۷۔

صورت میں کسی دوسرے کو غلبہ مقرر کر دیا سنا تو حضرت علیؓ انتظام ملکی میں اس کے احکام پر سب سے زیادہ ہی عمل کرتے، جیسا کہ ایک با اصول انسان کا دیرہ ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خلافت حقیقہ کا سوال ہی درپیش نہیں تھا۔ بلکہ تمام لوگوں کے اعتقاد کے مطابق صورت یہی تھی کہ وہ لوگ آپ کے سامنے اسی طرح حکومت پیش کر رہے تھے جس طرح اس کے پہلے کے لوگ خلافت پر عام اشخاص کی جانب سے شکن ہوتے تھے اس لیے حضرت علیؓ کے اس ارشاد سے کہ ”جس کو تم حاکم بناؤ گے اس کی میں اطاعت کر دوں گا“ یہ نتیجہ کس طرح نکالا جاسکتا ہے کہ حقیقتہً خلافت کے لیے عام پبلک کے اختیار کا نظریہ درست ہے اور اس کا تقرر خدا کے ذمہ نہیں ہے۔ جبکہ خدا کی قرارداد کو اس مسئلہ میں تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور نظام دوسری صورت سے قرار پانچا اور اسی نظام کے مطابق انتخاب کا سوال درپیش ہے۔

یہ بھی علی بن ابی طالب کی قوت ارادی کی انتہا ہے کہ طاقت و قوت کے باوجود صرف مصالح اسلامی کے لیے رسولؐ کے بعد والے دور میں منظم بھی برداشت کیے مگر جو طریقہ کار اختیار کر لیا تھا اس میں سر مؤ فرق نہ ہوا۔

آپ کی شجاعت و قوت کے لحاظ کے ساتھ جو ابتداء میں بدو واحد و خندق و تعمیر اور پیادہ و صغین و نہروان کی صورت میں مشاہدہ میں آچکی جتنا آپ پر سختی و ظلم کے واقعات زیادہ دہرائے جائیں گے ان سے آپ کی قوت نفس قوت ارادہ اور عظیم ثبات و استقلال و تحمل ہی کی صفت پر روشنی پڑتی جائے گی۔

کیا اثر پڑ سکتا ہے حقیقت واقعہ پر اس روایت کا کہ حضرت فاطمہؓ نے آپ کے سکوت پر سخت الفاظ میں اعتراض کیا اور غیرت انجیز الفاظ کہے یا نہیں۔

جہنے دیجئے کہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں بات ہی کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دوسری صورتیں ہیں یا تو سیدہ عالم فاطمہ زہرا جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے معصومہ اور غیر جائزہ الخطا تھیں اور یا جیسا کہ عام مسلمانوں کا خیال ہے ایسا نہیں تھا۔ پہلی صورت میں شیعہ لوگ اس کی نظیریں پیش کرتے ہیں مگر کہہ سکتے ہیں کہ خدا پر اعتراض (متجمل) فیہا من لیند فیہا ویسفلح الدّٰعی ابراہیم کا خدا سے مجادلہ (بجادلنا فی قوم لوط) موسیٰ کی کاروں پر سختی (ربا ابن ام لہا تاخذ لہجیحی ولا برامی) وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ان مقامات پر حقیقتہً نزاع نہیں ہے۔ اعتراض نہیں ہے، جنگ نہیں ہے بلکہ دوسروں پر اظہار حقیقت کی ایک صورت ہے۔ اسی طرح یہاں بھی واقعی اعتراض اور جنگ نہیں ہے بلکہ دوسروں پر اس حقیقت کا احتجاج کرنا تھا کہ اتنی اظہارِ ناگواری کے باوجود کتنا عظیم ہے وہ مفادِ بزر علی بن ابی طالب کو مخالفت سے مانع ہے۔ چنانچہ اس روایت میں یہ ہے کہ اسی وقت جب سیدہ علیؑ سے مصدقہ شکوہ تھیں، مؤمنوں نے اذان دی اور جناب امیرؑ نے کہا دیکھو میں تم لو راٹھاتا ہوں مگر یہ آواز تم کو سنائی نہ دیگی یہ سن کر سیدہ خاموش ہو رہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب سیدہ کو معصومہ مانا جائے۔ اور اگر عام مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ نہ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک عورت کا دل و دماغ اُن تمام مصالح و اسرار تک نہیں پہنچ سکتا جو ایک مہتر اور بڑے عقل و فکر والے مرد کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر جناب فاطمہؑ نے اس طرح کا شکوہ کیا ہو تو اس سے علی بن ابی طالب کے طریقہ کار کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

نا قابل برداشت نصیبت کی بناء پر علی بن ابی طالب ایک جذباتی انسان قرار پاتے اگر وہ صرف ایسے غیرت انگیز الفاظ کو سن کو متاثر ہو جاتے اور اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کرتے جو بڑی حکمت و منسلحت مبنی کا نتیجہ تھا۔

اس سے تو علی بن ابی طالب کی قوتِ ارادی اور بلند می حوصلہ کا اور اندازہ

ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کے خلاف کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ کیا ان روشن حقائق کی موجودگی میں صرف خلفائے ثلاثہ سے عقیدت کی بنا پر علی بن ابی طالب کی بلندی مرتبت کا انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ خلافت کے مستحق نہیں تھے بلکہ خلفائے ثلاثہ مستحق تھے۔

اس تنقیح کو اب اس سے زیادہ کیا بڑھایا جائے۔ حالانکہ بہت باتیں پھر بھی تشنہ تفصیل رہ گئیں، لیکن اب دوسری تنقیحوں کا انتظار کیجئے۔

پہلی تنقیح

آیات استدلال کا معیار اور اخبار و احادیث کا درجہ

اس تنقیح کا سبب بنیاد یہ ہے کہ مسئلہ امامت و خلافت میں نص خدا و رسول کے ثابت کرنے میں کچھ آیات قرآنی پیش کیے گئے تھے جن کی مستند تفسیر خلافت علی بن ابی طالب کے لیے قطعی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے برہمی صاحب اور "م۔ ح" دونوں فرگوارڈز کی جانب سے شکایت کی گئی ہے کہ استدلال میں آیات کے ساتھ احادیث و اخبار کا قیہ لگا دیا ہے اور اس لیے صرف قرآن سے حضرت علی کی خلافت ثابت نہیں ہوئی ہے۔ "م۔ ح" صاحب تو اس کو "ایک گہری منظرانہ چال" اور علی فریب کاری سے تعبیر کرتے ہیں اور برہمی صاحب اسے "شیعہ حضرات کی بلکی" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ان حضرات کی یہ شکایت صحیح ہے یا نہیں۔

یہ سوجھہ زمانہ میں ایک فیشن ہو گیا ہے یا روشن خیالی کا مظاہرہ کہ قرآنی آیات سے مطالب کے استخراج کے لیے اخبار و روایات کی مدد لینے سے

انکار کیا جاتا ہے، لیکن اگر آپ غور سے دیکھئے تو بغیر خارجی روایات اور اخبار کے سہارے آپ قرآن کے معانی میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

کسی اور چیز کا کیا ذکر میں تو کہتا ہوں کہ خود قرآن سے یہ تک ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے شخص خاص پر نازل ہوا ہے۔ اس میں کیسے رسول اللہؐ سے یا محمدؐ کہہ کر بات ہی نہیں کی گئی۔ ہر جگہ اوصاف کا ذکر ہے، لیکن موصوف کی تعیین ان اوصاف کے لیے صرف قرآن اور خارجی روایات کی مرہون منت ہے۔ ہر قرآن جن سے مد لینے کی ضرورت پر آپ خلافت کے مسئلہ کو قرآن سے بگایا بنا دینا چاہ رہے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اس میں یہ آیت ہے :-

وَاَنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهٖ
”اگر تم کو کسی طرح کا شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو اس کے مثل ایک سورۃ بنا لاؤ۔“

اس میں رسول اللہؐ کو ”عبدنا“ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، لیکن یہ امر کہ ”ہم سے بندہ“ سے مراد رسول اللہؐ ہی قرآن میں تو نہیں لکھا ہے۔
رسول اللہؐ کی عصمت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :-

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحٰی
یہاں ”صاحبکم“ کے لفظ سے رسول اللہؐ کو مراد لیا گیا ہے مگر کیا اس کی صراحت قرآن میں موجود ہے۔

قرآن میں ”اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبٰیْنًا“ ہم نے تمہیں ایک کھلی ہوئی فتح عطا کی ہے!

”یہ تمہیں“ کا خطاب رسول اللہؐ سے ہے۔ فتح ان کو دی گئی اور کھلی ہوئی فتح تکب اور کس طرح؟ یہ تمام باتیں قرآن میں تو نہیں موجود ہیں۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے جس حد تک سابق امتوں کا ادنیٰ کا ذکر ہے، ایک حد تک قرآن نے تصریح و بیان سے کام بھی لیا ہے مگر جہاں تک رسول اللہ اداست کے متعلقہ واقعات کا تذکرہ ہے اس میں اسی طرح کی چیزیں ہیں جن کی تعیین بغیر قرآن خارجی کے ممکن ہی نہیں۔

قرآن مجید کو کھولے اور شروع سے پڑھتے چلے جائیے۔

الکھراے تو جانے ہی دیجئے یہ بالکل راز ہے۔ ذلک الكتاب لا ریب فیہ۔ "وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں"۔ وہ کتاب سے کیا مراد؟ قرآن اگر خود قرآن میں اس مراد کی تو تصریح نہیں ہے — والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

"وہ جو ایمان لائے ہیں اس شے پر جو تم پر نازل ہوئی اور جو تمہارے قبل کے لوگوں پر نازل ہوئی تھی" یہ کس سے کہا جا رہا ہے؟ رسول سے۔ مگر قرآن میں تو یہ درج نہیں ہے۔ طان کنترہ فی ریب ما نزلنا علی عبدنا۔ اس کے متعلق تو اس کے پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ "عبدنا" کا مفہوم بالکل مبہم ہے اور تعیین قرآن میں موجود نہیں ہے۔ سیتقول السفهاء من الناس ما ولهم عن قبلتہم التی كانوا علیہا "کم عقل لوگ کہیں گے کہ یہ لوگ اس قبہ سے کیوں پلے جس پر پہلے تھے۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے کوئی اور قبہ تھا پھر اس سے عدول کیا گیا۔ مگر وہ پہلا قبہ کون سا تھا۔ اور اب کس کی جانب عدول ہوا؟ یہ قرآن میں موجود نہیں ہے — الحج اشہر معلوماً "حج کے لیے معینہ مہینے ہیں" وہ کون سے ہیں؟ قرآن میں کچھ پتہ نہیں۔ لیستلوا قتال عن الشهر الحرام قتال فیہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مہینے میں جنگ حرام ہے مگر وہ کون مہینہ ہے کچھ ذکر نہیں۔

قرآن ایک موقع کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

واذا التصعدون ولا تلوون على احد والرسول يد عموكم في اخر يوم
 ”جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اور
 رسول تمہیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔“

بے شک معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کسی وقت یہ عالم ہوا تھا۔ مگر وہ کون موقع
 تھا اور کس روزائی میں ایسا ہوا؟ یہ قرآن میں صراحت نہیں ہے۔

ان الذين تولوا منكم يوم التقي الجمعان .

وہ لوگ جنہوں نے تم میں سے پیچھے پھرائی اس دن جب دونوں لشکروں میں ٹکڑبٹڑ ہوئی
 بے شک معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کے لیے یہ واقعہ
 پیش آیا تھا۔ لیکن وہ لوگ کون تھے اور وہ دن کیا تھا؟ اس کی تصریح نہیں ہے۔
 وما اصابكم يوم التقي الجمعان فياذن الله۔ اور وہ بات جو تمہیں پیش
 ہوئی اس دن جب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا تھا وہ خدا کی مشیت سے تھی؟
 اب وہ بات کیا ہے جو درپیش ہوئی کچھ ذکر نہیں۔

كما اخرجلت من بيتك باحق وان فريقتا من المؤمنين
 لكان رھون۔ ”جیسے نکالا تمہارے پروردگار نے تم کو تمہارے گھر سے بچائی کے ساتھ
 در صورتیکہ ایک جماعت مسلمانوں میں سے کراہت رکھتی تھی۔“

”واذ ليعدكم الله احدى الطائفتين انھا لکم وتودون ان غیر
 ذات الشوكة تكون لکم۔“

”اور اس وقت جب وعدہ کر رہا تھا تم سے خدا دونوں جماعتوں میں سے ایک
 کا کہ وہ تمہارے لیے ہوگی اور تم آرزو رکھتے تھے کہ وہ ہو شان و شوکت والی
 نہیں ہے وہ تمہارے لیے ہو۔“

”دونوں جماعتوں میں سے ایک“ کیا معنی؟ غیر ذات الشوكة سے کیا مراد؟

فَلَمَّا قَتَلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ -

”تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا اور (اے رسول!) تم نے نہیں پھینکا جبکہ پھینکا، لیکن خدا نے پھینکا۔“

رسولؐ نے کیا چیز پھینکی تھی اور کب؟ قرآن میں تو صراحت نہیں ہے۔

اِذَا مَنَّ اللَّهُ بِالْعَدُوَّةِ الدُّنْيَا دَهْمٌ بِالْعَدُوَّةِ الْعُصْرَىٰ وَالرَّكِبِ اسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خِلَافَ لَكُمْ فِي الْمُبْعَادِ وَلَكِنَّ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا -

”جبکہ تم قریب کی جگہ تھے اور وہ دور کی جگہ تھے اور سوار تمہارے ادھر تھے اور اگر تم ایک دوسرے سے وعدہ کرتے تو یقیناً وعدہ میں اختلاف پیدا ہوتا، لیکن خدا کو تو پورا کرنا تھا جو کچھ اسے منظور تھا۔“

اِذْ يَرْمِيكَ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا وَلَوْ اِسْرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشَلْتُمْ وَلَتُنَازِعْتُمْ فِي الْاَمْرِ -

”جبکہ خدا تمہارے سامنے پیش کرتا تھا انہیں تمہارے خواب میں کم اور اگر وہ تمہیں زیادہ دکھائی دیتے تو تم سست ہو جاتے اور تم میں اختلاف پیدا ہو جاتا۔“

کیا یہ اشارے نہیں ہے واقعات کی طرف جن کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔

اِنَّ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ لِيُغْلِبُوا مَا مَتَّيْنِ دَانَ يَكُنْ مِنْكُمْ مَّائَتَةٌ لِيُغْلِبُوا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا -

”اگر تم میں سے بیس آدمی ثبات قدم رکھنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کا فوج پر غالب آئیں، اس کے بعد ارشاد

ہوا ہے۔

الان خفت الله عنكم و علم ان فيكم ضعفاً۔ "اب خدا تم سے تخفیف کر دی اور سمجھ لیا کہ تم کمزور ہو۔" یہاں کہا گیا، "اب" مگر وہ اب کب تھی؟ اس کا پتہ لگانا یہاں مشکل ہے۔

اجعلتم سقاية الحاج و عمارة المسجد الحرام من امن بالله و اليوم الآخر و جاهد في سبيل الله۔

”کیا تم نے قرار دیا ہے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا مثل اس شخص کے جو مبارک و معاد پر ایمان لایا ہوا و خدا کی راہ میں جہاد کرے۔“

صاف ظاہر ہے کہ دو شخصوں میں موازنہ ہے۔ مگر وہ دونوں فریق کون کون تھے موازنہ کی کیا ضرورت پیش آتی تھی؟ یہ نہیں معلوم۔

انما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا
”مشرک لوگ نجس ہیں۔ یہ لوگ مسجد الحرام کے قریب نہ جائیں اس سال کے بعد۔“
اس سال یعنی کون سال؟ یہ تاریخ سے حل ہو گا۔

اذا خرجوا الذين كفروا من اثنين اذا هما في الغار اذ يقول
اصحابه لا تحزن ان الله معنا۔

”جب کفار نے رسول کو گھر سے نکال دیا اور وہ دو میں کے ایک تھے۔ جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔“

رسول اللہ کے ساتھ دوسرا شخص کون تھا؟ صاحب سے کیا مراد ہے؟ یہ باتیں سکوتِ عنہ ہیں۔

وعلى الثلاثة الذين خلفوا حتى اذا ضاقت عليهم الارض

بِسَارِحَبْتِ وَضَاقَتِ عَلَيْهِمُ الْفَنَسُ وَظُتُوَانِ لَا مَلْجَا مِنْ اِلَهِهِ
ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا۔

”اور خدا نے توبہ قبول کی ان تین کی جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں تک کہ جب
ان پر زمین تنگ ہو گئی اور خود ان کے نفوس تنگ کرنے لگے اور انھیں یقین ہوا
کہ خدا سے بس اسی کی طرف پناہ مل سکتی ہے تو خدا نے ان کی توبہ کو قبول کیا۔“
یہ تین کون؟ اس کا ذکر نہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدَمِينَ مِنْكُمْ وَنَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ۔ ”ہم
نے خوب جان لیا ان لوگوں کو تم میں سے جو آگے رہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی
جو پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔“
کس مقام پر آگے اور پیچھے رہنا لازم ہے یا بزم میں، ایمان میں یا عبادت میں؟ یہ
کچھ پتہ نہیں چلتا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُولُونَ اِنَّمَا عَلِمْنَا لِسَانَ الَّذِي يُلْحَدُونَ
اِلَيْهِ اَعْجَى وَهَذَا السَّانُ عَرَبِيٌّ مَبِينٌ۔

”ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں رسول کو ایک شخص تعلیم دیتا ہے۔ زبان اس
شخص کی جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں عجیب ہے اور یہ کھلی ہوئی عربی زبان ہے۔“
اب بتائیے وہ کون شخص ہے جس کی طرف نسبت دی جاتی تھی۔

سُبْحَانَ الَّذِي اَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ
الْاَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ۔ ”پاک ہے وہ خدا جس نے سیر کرانی ایسے بندہ کو
رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کے گرد و پیش بركت قرار دی
گئی ہے۔“

یہاں بھی تعبیر کا لفظ ہے جس سے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ کون

مراد ہے۔ پھر وہ مسجد اقصیٰ کون ہے جہاں تک سیر کرائی گئی تھی؟

ان الذین جاءوا بالافك عصية منكم لا تحسبه شر الکمر بل هو خیر لکم لکل امرئ منہم ما اکسب من الاثم والذی تولیٰ عکبرہ منہم لہ عذاب عظیم لولا اذا سمعتموہ ظنّ المؤمنون والمؤمنات بانفسہم خیرا وقالوا هذا افک مبین لولا جاءوا علیہ بأربعة شہداء فاذا الحریثا توأ بالشہداء فاولئک عند اللہ هم الکاذبون۔

”وہ لوگ جو تہمت لے کر آئے ہیں تمہیں میں سے کچھ لوگ ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمہارے لیے کچھ بُرا ہے بلکہ وہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ ہر ایک کے لیے ان میں سے وہ ہے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے گناہ سے اور جو شخص اس کا بڑا ذمہ دار ہے ان میں سے اس کے لیے بڑا عذاب ہے کیوں نہ جب تم لوگوں نے اس تہمت کو سنا تو مومنین اور مومنات نے اپنے دل میں اچھا خیال کیا اور یہ کہا کہ یہ کھلی ہوئی تہمت ہے۔ کیوں نہ ان لوگوں نے اس پر چار گواہ پیش کیے۔ اب جبکہ وہ گواہ نہیں پیش کر سکے تو یہ لوگ خدا کے نزدیک جھوٹے ہیں۔“

اب ملاحظہ کیجیے کہ کیا تہمت؟ کس پر تہمت؟ کون لوگ لانے والے اس کا کچھ ذکر نہیں۔

پھر بھی یہ نصوصات قرآن سے سمجھا جاتا ہے مسلمانوں سے پہچنے کے اگر کوئی تفسیر انک میں حضرت ام المومنین کو متم سبھے تو وہ مومن ہے یا کافر؟ وہ کہیں گے کافر ہے۔ اس لیے کہ نص قرآنی کے خلاف اعتقاد رکھتا ہے۔

وعدکم اللہ مغائم کثیرہ تاخذونہا فحجل لکم ہذہ وکف
بیدی الناس عنکم۔ واخیری لہم تقدروا علیہا۔

۶۴۷

”تم سے خدا نے وعدہ کیا تھا بہت سی غنیمتوں کا، پس یہ تمہارے لیے جلدی عطا کر دیں اور ان لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔ اور اس کے علاوہ دوسری ان پر تمہیں قدرت حاصل نہیں ہوئی“

فجّل لکم هذا سے کاہے کی طرف اشارہ ہے، دوسری جن پر قدرت نہیں حاصل ہوئی وہ کیا ہیں۔ یہ تمام باتیں رازِ سرستہ ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ احلَّ اللَّهُ لَكَ تَبَاغِي مَرْضَاكِ الزَّوْجِ
”اے پیغمبر تم کیوں حرام کرتے ہو اسے جو خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے
تم اپنے ازدواج کی خوشی پوری کرنا چاہتے ہو۔“

وَإِذَا مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْبَيِّنَاتِ إِلَىٰ بَعْضِ الْأَزْوَاجِ فَمَا تَبَيَّنَّاتِ بَدْوِ
اظهره الله عليه عرفت بعضه و اعرض عن بعض فلما تبيَّنَّاتِ فأكث
من ابناك هذا قال نبأني العليم الخبير۔

”جب رسولؐ نے اپنی بعض ازدواج سے ایک بات چپکے سے کہی۔ جب اس بیوی نے اسے کہہ دیا اور خدا نے رسولؐ پر اس کو ظاہر کیا تو انھوں نے کچھ بتایا اور کچھ سے چشم پوشی کی جب انھوں نے اس زوجہ سے اس کی خبر لی تو اس نے کہا کہ آپ کو کس نے بتلایا، کہا مجھ کو خبر دی ہے خدا نے عالم و دانے سے۔“

ان تنوبا الى الله فقد صغت قلوبكما وان تظاهرا عليه فان الله هو مولاه وجبريل وصالح المؤمنين۔

”اگر تم دونوں توبہ کرو خدا سے تو اچھا ہے کیونکہ تمہارے دل کج ہو گئے ہیں اور اگر تم دونوں رسولؐ کے خلاف متفق ہو جاؤ تو خدا ان کا مددگار ہے اور جبریلؑ اور مومنین میں سے جو صلح ہیں۔“

اس آیت میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ صحیح معظم و متواتر ہے کہ وہ دو

سے متعلق ہے۔ مگر وہ دونوں کون تھیں اور وہ راز کیا تھا اور کس نے اس کا کس سے انہماک کر دیا تھا اور اس میں خرابی کیا تھی؟ یہ سب باتیں بھی کیا قرآن میں موجود ہیں؟ یہ تو واقعات کا عالم ہے۔

اور احکام شرعیہ۔ ان میں بھی قرآن نے نماز کا حکم دیا۔ مگر ترکیب قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ روزہ کا حکم ہے مگر کن کن چیزوں سے روزہ میں اساک ہونا چاہیے۔ اس کا قرآن میں پتہ نہیں۔ حج کا حکم ہے مگر مناسک حج کی تعلیم نہیں ہے۔ زکوٰۃ کا حکم ہے مگر نصاب و مقدار زکوٰۃ کا پتہ نہیں۔

حقیقت اگر قرآن عقیدہ و حقائق تاریخیہ سے بالکل چشم پوشی کر لی جائے تو الفاظ گنگ ہو جائیں گے اور مفہوم بالکل گم ہو جائے گا۔

اس کے لیے! تو کہیے کہ قرآن کی مناسبت اس کی مستعمل نہیں تھی کہ اس طرح کے تفصیلات اس میں مذکور ہوں۔ نہیں تو قرآن، توریت کی کتاب پیدائش یا سفر سروج کی طرح واقعات کا ایک خشک مجموعہ ہوتا اور اس کی بلاغت باقی نہ رہتی اور یا کہنے کہ اس میں کوئی حکیمانہ مقصد مضمر تھا اور قرآن خود اپنے تئیں "کافی" قرار دینا نہیں چاہتا تھا اب معلوم نہیں کہ ان تمام آیات میں نبی صاحب کو کوئی "خلا" نظر آتا ہے یا نہیں؟ اور اس حصار کے پڑ کرنے کا ان کے نزدیک کیا طریقہ ہے۔

روایات سے بالکل کنارہ کشی تو ممکن ہی نہیں ہے، قرآن مجید کے مکی و مدنی کی تعین، نسخ و منسوخ کی تمیز، مورد و مصداق کی تشخیص اور اگر حبارت نہ سمجھی جائے تو دبی زبان سے کہہ دوں کہ الفاظ تنزیل میں قرأت کی ترجیح سب روایات ہی پر مبنی ہے۔ اور اگر روایات کو کلیتہً نظر انداز کر دیا جائے تو لفظی استدلال کی عمارت بالکل زمین دوز ہو جائے گی۔ اور آلہ شرعیہ کی اینٹ سے اینٹ بچ جائے گی۔

شانِ نزول یعنی موقع کلام بھی ایک ایسی اہم چیز ہے جس سے الفاظ کے معانی

میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کو بالکل چھوڑ کیے دیا جاسکتا ہے۔
 یہ خیال کر لیا کہ روایات ظنی ہی ہوتے ہیں کلیۃً صحیح نہیں ہے۔ قرآن اکثر وہ ہوتے ہیں
 جن میں روایت قطعی ہو جاتی ہے اور اس میں شک باقی نہیں رہتا۔ نیز اکثر روایت اور
 شان نزول کے الفاظ قرآن سے بالکل مطابقت بھی اس روایت کے قطعی طور پر صحت
 کی دلیل بنتی ہے۔ بے شک اس کے لیے عقل کے کام میں لانے کی ضرورت ہے مگر
 عقل تو احکام مذہبی میں اتنی ناگزیر چیز ہے کہ بغیر اس کے نہ خدا کی الوہیت ثابت ہے
 نہ رسول کی رسالت اور نہ قرآن کی حقانیت۔

شیعوں کا عقل سے کام لینے ہی کا وہ تصور ہے جس کی بنا پر بڑی صاحب شیعوں
 پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن میں تاویلات کا دروازہ
 کھولا۔

مکن ہے ظاہریہ اور مجسمہ کی بارگاہ میں اس الزام کو کوئی مقبولیت حاصل
 ہو۔ اس لیے کہ ان تاویلات کی بنا پر خدا کا ہماری بھر کم جسم اور لانے لائے
 انھوں کے ساتھ جسمانی تخت پر جلوہ گر ہونا ثابت نہیں ہوتا اور قیامت میں اس
 کے دیدار کی حسرت بھی پامال ہو جاتی ہے۔ مگر اہل عقل جانتے ہیں کہ جلال و جبروت
 الہی ان صحیح تاویلات کی حقانیت کا پورے طور پر متقاضی ہے اور مذہب و عقل
 کی جانب سے ان کی ضرورت ہو۔

بہر حال خلافت امیر المؤمنین کے اثبات میں جو ائمہ قرآنی پیش کیے گئے ہیں وہ
 تو بالکل اس سے مختلف ہیں۔ وہاں نہ کسی تاویل سے کام لیا گیا ہے اور نہ ظاہری
 معنی کے خلاف کوئی تصرف بلکہ قرآنی آیت کا بالکل مفہوم ہے جو پیش کیا گیا ہے
 شان نزول بھی بالکل وہ ہے جس کو خود قرآن کے الفاظ صاف بتلا رہے ہیں
 اور اس کے خلاف جتنے اقوال ہیں ان کی خود الفاظ قرآنی صاف صاف نفی

کرتے ہیں۔ اس پر سابق کے مضامین میں کافی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر مصلحتاً برقی صاحب اور ”م۔ ج“ دونوں ہی بزرگواروں نے ان استدلالات پر بحث کرنے سے بالکل ہی چشم پوشی اختیار کی ہے۔

بساط بحث کو پھیلانے کے لیے خواہ مخواہ اولیٰ خلافت میں لیس البر بان تواتر البیوت من ظہورها ولكن البر من اتقى و اتوا البیوت من ابوابها کی آیت کو اپنی جانب سے بڑھا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اثبات خلافت کے ادلہ میں مستقل طور پر اس کو کبھی ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک خطائے اجتہادی کی بحث میں ضمنتاً اس کو رسول اللہ کی حدیث رانا مدینۃ العلم و علی بابہا فمن اراد العلم خلیات الباب کا موید بتایا گیا تھا۔ لیکن آیت کا کسی حدیث کی تائید کرنا اور چیز ہے اور مستقل طور سے اس کا دلیل خلافت ہونا دوسری چیز۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي و رضيت لكم الاسلام دینا۔ **دوسری آیت**

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ قرآن کی زیر بحث آیت کے مفہوم میں کوئی ایسا خلایا نقص نہیں ہے جس کے پیش نظر اسے کسی دوسری بات سے متعلق کرنا یا کسی حدیث کے ساتھ اسے ضم کرنا قرین عقل قرار دیا جائے۔

لیکن ہر غبنی دان یہ سمجھ سکتا ہے کہ الیوم میں آلف لام عہد کا ہے۔ اور اس سے اشارہ روزِ معین کی طرف ہوتا ہے۔ الیوم کے معنی ہوئے آج اور اس کا مشار الیہ وہی دن ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی اور پھر اس دن میں کوئی خصوصیت ہونا چاہیے جس کی بناء پر کہا جائے کہ آج دین کامل ہوا اور آج نعمت تمام ہوئی اور اسلام دین پسندیدہ قرار پایا۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ وہ کسی دوسری بات سے متعلق ہے

اب اگر اُس بات کو کوئی حدیث بیان کر رہی ہے اور وہ قرآنی الفاظ کے بالکل مطابق بھی ہے تو اس حدیث کو نظر انداز کرنا کہاں تک قرینِ عقل ہوگا۔

انذر عشیرتک الا قرابین و اخفض جناحتک لمن ابتلع من المؤمنین۔

تیسری آیت

اس پر گزشتہ مضمون میں بہت سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور داخلی و خارجی قرآن سے پورے طور پر ثابت کر دیا گیا تھا کہ آیت واقعہ خاص سے متعلق ہے اور بعیتِ غیرہ کے واقعہ کے بالکل مطابق ہے۔

بڑی صاحب نے ان بیانات کی رد کیے بغیر اہل جگہ یورپ و امریکہ کے مستشرقین چین و جاپان کے آدمی، فلپائن اور آسٹریلیا کے انسان ان سب کو اکٹھا کر لیا۔ فرماتے ہیں کہ :-

”اگر کسی ایک جگہ سے بھی یہ آواز اٹھے کہ یہ آیت کسی نوع سے بھی کسی واقعہ خاص سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور بجائے خود کسی مضبوط و مکمل

صدائق کی حامل نہیں ہے تو میں سپر ڈائمنڈ کو تیار ہوں۔“

مجھے افسوس ہے کہ تقلیدِ مغرب کے ساتھ دلداد کی مجھے اس حد تک حامل نہیں ہوئی ہے کہ میں خاص مذہبی مسائل اور قرآن کی تفسیر میں بھی یورپ و امریکہ کے افراد سے فیصلہ کرانے ہی پر حقانیت کا دار و مدار قرار دوں۔ میرے نزدیک تو اسلامی مفسرین کے اقوال ایسے مسائل میں بدرجہا یورپ و امریکہ کے مستشرقین اور چین و جاپان کے افراد اور فلپائن اور آسٹریلیا کے رہنے والوں کے خیالات سے زیادہ مستند ہیں۔

”م - ح“ صاحب نے اس مقام پر آنا و خیالِ شیعہ ”کو خفض جناح“ کے محاورہ پر توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :-

”خفض جناح“ عربی کا محاورہ ہے جس کا اردو میں با محاورہ ترجمہ ”فروتنی“

کس نفی یا غاکساری کے ساتھ پیش آنے کے ہیں۔ مگر انھوں نے
 ”آزاد خیال شیعہ“ کے گذشتہ مقالہ کو غور سے نہیں ملاحظہ فرمایا۔ وہاں اس
 مجاورہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ”خفص جناح“
 کے یہ معنی قرار دینا رسولؐ کے بلند اخلاق پر حمایہ ہے۔ وہ رسولؐ ایسا تنکا لانا
 مومنین کا کیا کہ کفار تک سے حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔ پھر خاص
 اس شخص کے لیے مومنین میں سے جو آپؐ کا اتباع کرے ان معنوں سے
 وہ خفص جناح کے حکم دینے کا حاصل کیا ہوا۔ ”من اتبعك حسن
 المؤمنین کی خصوصیت بتلاتی ہے۔ کہ واخفص جناحك
 سے عزائم و غمات کی کوئی خاص صورت مراد ہے اور اس کے مطابق
 ہے بالکل وہ تفسیر جو جمعیت عشیرہ کے واقعہ کے متعلق وارد ہوئی ہے،
 اس سے معلوم ہوگا کہ اس مقام پر واخفص لهما جناح الذل
 من الرحمة کی آیت کو پیش کرنا بالکل بے محل ہے۔

یہ کون کتنا ہے کہ (واخفص جناحك) کے لفظی معنی ہیں ”علیفہ بنا دو“ تاکہ یہی
 دوسرے مقام پر بھی قرار پائیں۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ مجازی معنی قرنیہ مقام کے پابند
 ہوتے ہیں اور ان میں عمومیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔

انما وليكم الله ورسوله والذين آمنوا الذين
 يقيمون الصلوة ويطون الزكاة وهم راكعون۔

چوتھی آیت

ترجمی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے :-

”تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسولؐ اور وہ لوگ جو ایمان
 لائے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور عجز و انکاری سے
 زندگی گزارتے ہیں۔“

اس میں حقیقت پوشی کے لیے سب ذیل تصرفات کیے گئے ہیں :-

۱۔ دلی کے معنی فریق ”حالانکہ آیت کالب و لہجہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ رفاقت

کا درجہ ہر یمن کو بہ نسبت دوسرے یمن کے حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کے لیے اتنے تائید و اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ دھم براکون کو بجائے اس کے کہ وہ حال کے طور پر پہلے جملہ سے متعلق ہو۔

مستقل جملہ قرار دے کر اے متقل صفت قرار دینا یہ بھی اسلوب کلام کے نذات ہے۔ اگر ایسا یہ ہوتا تو یتیمون لصلواتہ یوتون ان کو کواۃ کی طرح اس طرف بھی دھم میر گھون کہا جاتا۔

۳۔ رکوع کے معنی غزو و محاساری سے زندگی گزارنے کے قرار دینا۔ یہ عرف لغت اور اصطلاح شرع سب کے خلاف ہے۔

ترجمہ میں عمارت اعتراض کی داغ دھڑی پورے طور پر کرنے کے بعد تبصرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ ”اس آیت میں کوئی ایسا اہتمام و خلا نہیں ہے جس سے حضرت علیؑ کی خلافت پر استدلال قائم کیا جائے۔“

اس میں کیا شبہ کہ الفاظ کے مذکورہ بالا ترجمہ کے ساتھ خلا باقی نہیں رہے گا۔ مگر آیت اپنے غلط ترجمہ کی پابند نہیں ہو سکتی۔

وہاں صاف یہ کہا گیا ہے کہ ”وہی تمہارا پس خدا ہے اور رسولؐ اور وہ مومنین جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ نہ رکوع کرتے ہیں۔“ یہ چونکہ ایک غیر معمولی بات ہے لہذا نگاہ فیصلہ صاف بتلاتی ہے کہ یہاں کسی خاص جماعت یا فرد کی طرف اشارہ ہے جس سے یہ واقعہ عالم وجود میں آیا ہے اور اس کے بعد اہتمام و خلا کا ہونا اور شان نزول کے ذریعہ سے اس کی تعیین ہونا بالکل کھلا ہوا راستہ ہے۔

”م۔ ح“ صاحب نے اس آیت کے ذیل میں اپنے معیار پر بہت مبسوط بحث کی ہے اور بڑے جوش و خروش اور غیظ و غضب کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

پہلا اعتراض قرآن کا وہی پُرانا ہے کہ آیت میں روایت کا پیوند لگایا گیا ہے لیکن یہ امر پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ آیت قرآن میں اس طرح کے پیوند ناکہ نہیں، ورنہ خلافت علی بن ابی طالب کا کیا ذکر، رسالت محمد مصطفیٰ بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔

پھر دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ ”روایت کی نقل میں — بڑی خیانت اور بددیانتی سے کام لیا گیا ہے۔“

یہ بہت بڑا الزام ہے، فوراً اس کو دیکھ کر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید حوالہ غلط دیا گیا ہو گا یا کوئی جزو روایت کا جو مخالف مقصود ہو ترک کر دیا گیا ہو گا۔ لیکن آپ کو تعجب ہو گا یہ سن کر کہ اس آیت کے ذیل میں چار صفحے لکھے جانے کے بعد بھی اس خیانت اور بددیانتی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔

لکھا ہے تو یہ کہ ”درمنثور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ درمنثور وہ کتاب ہے جس میں مصنف نے بغیر التزام تحت دنیا بھر کی صحیح و غلط، رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں کہ جس کا بیشتر حصہ صرف خرافات ہے۔

لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ درمنثور اہل سنت کے بہت بڑے عالم حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب ہے جو کوئی غیر متعصب انسان بھی نہیں سکتے۔ اس پرانے کتاب ”تاریخ الخلفاء“ گواہ ہے جس میں یزید کو خلفائے برحق میں شمار کیا گیا ہے۔ لہذا یہ خیال تو بڑی ہی نہیں سکتا کہ انہوں نے صرف خلافت حضرت علیؑ ثابت کرنے کے لیے خواہ مخواہ ایک درجن مصنفین کے نام اپنے دل سے لکھ دیے۔ اس لیے کم از کم ان مصنفین کی طرف اس کی نسبت تو درست ماننا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد ان مصنفین کو دیکھ لیجیے کہ وہ کیسے لوگ ہیں خطیب عبدالرزاق، ابن جریر

ابو شیح، ابن مردویہ، طبرانی، ابن عساکر، عتبہ بن حکیم، ابو نعیم۔

یہی لوگ وہ ہیں جن کے روایات دوسرے مسائل میں سرانکھوں پر رکے جاتے ہیں لیکن خلافت علی کے متعلق اگر یہ لوگ کچھ لکھیں تو لائق گردن زدنی۔

رہ گیا ہم پر یہ اعتراض کہ ہم دوسرے روایات کو کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ جو اس روایت کے متضاد ہیں تو اس کا جواب صاف ہے۔ اس لیے کہ کسی جماعت کے وہ بیانات جو خود ان کے موافق ہوں مخالفت پر حجت نہیں ہو سکتے لیکن وہ بیانات جو ان کے مخالفت ہوں، مخالفت کے لیے دلیل بن سکتے ہیں۔

"دلی" کے معنی صاحب اختیار اور مقصد کے نہیں ہیں تو پھر دلی مجنون اور دلی طفل کس اعتبار سے کہا جاتا ہے، کیا وہ صرف مددگار ہی ہوتا ہے۔

نوح کے بتدی طالب علم بھی جانتے ہیں کہ اضافت کے لیے کسی طرح کی ملالت ہونا کافی ہے۔ اشدھان علیا دلی اللہ میں "دلی اللہ" کے معنی کیوں نہ لیجئے کہ خدا کی طرف سے حاکم و مقصد جیسے خلیفۃ اللہ یعنی خدا کی طرف کے خلیفہ۔ اگر یہاں دلی کے معنی ناصر ہی کے ہوتے تو شیعوں کو اس پر اتنا زور دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اور وہ اس کی گواہی کو جزو ایمان کیوں قرار دیتے۔

جمع کے الفاظ سے واحد کا مراد یسنا قرآن مجید میں نایاب نہیں ہے۔ سورہ منافقون ہی میں دیکھ لیجیے ارشاد ہوتا ہے۔

یَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ۔

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو ہم میں زبردست ہوگا وہ کمزور کو نکال باہر کرے گا۔"

یہاں جمع کا صیغہ وارد ہے حالانکہ اتفاق مفسرین اس کا کہنے والا صرف ایک شخص تھا۔

بات یہ ہے کہ جب موصوف کی شخصیت نہ ذکر ہوا وصف کے ذریعہ سے اشارہ کیا گیا ہو تو واحد اور جمع کی خصوصیت قابلِ لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ اصل تو مصداق ہے وہ اگر ایک ہے تو صفات اس پر منطبق ہوں گے۔ چاہے صغیر جمع کا ہو اور اگر موصوف متعدد ہیں تو صفات ان سب پر منطبق ہوں گے چاہے صغیر واحد ہو۔ جیسے من لیحصل سوء عجز بہ ”جو شخص برا کام کرے گا اس کو بدلا دیا جائے گا“ لکن البرّ من امن باللہ والیوم الآخر ”نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لائے خدا اور روزِ قیامت پر“

اس سے بڑھ کر شدید غلطی کیا ہو گی کہ دھم راکعون کو حال تسلیم کرنے کے باوجود یہ خیال ظاہر کیا جائے کہ وہ اس کے پہلے کے تمام جملوں سے متعلق ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس قسم کے ضمیموں کے متعلق یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ وہ آخر کے جملہ ہی سے ملحق ہوتے ہیں۔ پہلے کے جملوں سے متعلق کیا جانا اکثر اہل فن کے نزدیک تو ناجائز ہے اور کم از کم مشکوک تو ضرور ہے۔

”زکوٰۃ کو صدقہ واجبہ ہی کے معنی میں قرار دینا درست نہیں ہے بخود زکوٰۃ دو قسم کی ہے واجب اور مستحب۔ مستحب زکوٰۃ کے لیے نصاب وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔

نماز میں زکوٰۃ ادا ہو جانے سے ”فعل کثیر“ کا ہونا کوئی مذوری امر نہیں ہے۔ ”زکوٰۃ“ کا دینا خود عبادت ہے۔ اس لیے اس کی طرف توجہ منافی بروج قلب نہیں ہے۔

قرآن کے آیات کی ترتیب جب بالاتفاق شان نزول کے مطابق نہیں ہے تو جو بھی ”لغویت“ اس سلسلہ میں ہو اس کی ذمہ داری خدا پر عائد نہیں ہوتی۔ قرآن میں اس وقت کمی، مدنی آیتیں مخلوط ہیں۔ ناسخ مقدم اور منسوخ مؤخر ہے۔ ایک واقعہ کی آیتوں میں

دوسری آیتیں درج ہیں۔ یہ لغو تین کیا واقعی خدا کی تسنیل میں ہو سکتی ہیں؟
یہ پہلے کئی دفعہ کہا جا چکا ہے کہ اس وقت بحث صرف خلافت حضرت علیؑ کی
ہے۔ دوسرے ائمہ کی امامت اس وقت معرض بحث میں نہیں ہے۔ بار بار اس بحث
کو نیچ میں لانا میدان بحث سے ہٹانا نہیں تو اور کیا ہے؟
پھر یہ کہ الہی خطابات کی اصل وضع تو اسی کی مقتضی ہے کہ مخاطب وہی
لوگ ہوں جو بوقت خطاب موجود ہیں۔ اس لیے انسا ولیکم کا خطاب
براہ راست اسی طبقہ کے ساتھ ہے جو اس وقت موجود تھا۔

ان کے لیے خدا کی ولایت، رسولؐ کی ولایت، اور ایسے امام کی ولایت جو
فصل رسول کے بعد امر خلق کا ذمہ دار ہونے والا ہو بتلادی گئی۔ کیونکہ اس وقت
اتنے ہی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو ائمہ ہوں گے ان کا تقرر ان ہی رسول یا
امام کی زبانی ہو جائے گا۔ پھر ائمتہ کا حصر ان ولایتوں کے خلاف اور ان سے
دوسرے مقابل ہوں۔ لیکن دوسری ولایتیں اگر خود ان اولیاء کی جانب سے ثابت ہوں
تو وہ خود انہی کے ولایت میں داخل ہوں گی۔ ان کی نفی اس سے نہیں ہوگی۔
جواب میں تفصیل و اطناب مد نظر نہیں ہے ورنہ اس سلسلہ میں بہت کچھ
کہا جاسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اس آیت سے استدلال میں جتنے نقائص بیان کیے گئے ہیں
ان میں سے کوئی ایک بھی درست نہیں ہے۔

وہ گیا بعض متعصب علمائے اہل سنت کا انکار۔ تو وہ اس دیرینہ
اصول کے ماتحت ہے کہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ کر ڈوا کر ڈوا مقو مقو" اگر
ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ سب شیعہ ہی نہ ہو جاتے اور اہل سنت کے مذہب
سے وابستہ کیوں رہتے۔

پانچویں آیت

يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

بڑی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: "اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو میرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔"

مگر کیا واقعی یہی ترجمہ صحیح ہے؟ کیا قرآن کی بلاغت اس ترجمہ کی متحمل ہے؟
"تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے۔ نہیں تو تو نے کچھ پہنچایا ہی نہیں۔"

اس کے معنی کیا ہوتے؟ سب کے ذیل میں بھی اگر کسی خاص بات پر زور دینا مقصود ہو تب تو خیر مگر وہ بڑی صاحب کے مقصد کے خلاف ہے اور اگر واقعی سب باتوں کو بحیثیت مجموعی ہی تبلیغ کا سوال ہے تو اس کے خلاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری رسالت کی تبلیغ نہیں ہوگی۔ سب نہیں پہنچایا تو کچھ نہیں پہنچایا۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر یہ آیت اگر ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہوتی تو خیر۔ لیکن جب رسول اللہ اپنی تبلیغ کی پوری عمر صرف کر چکے تو یہ کہنا کہ وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہنچا دے جو تمہارے رب کی جانب سے نازل ہوئی ہیں، یہ بھی کس وقت درست ہو سکتا جب رسول اللہ نے کسی خاص بات کی تبلیغ کو اب تک اٹھارہ گھنٹہ اور ان الفاظ کے ذریعہ سے اسی بات کی تبلیغ کی تاکید کی جائے۔

اب وہ بات کیا ہے؟ یہی وہ خلا، ایہام، ایجاز وغیرہ وغیرہ ہے

جس کے در کرنے کے لیے شانِ نزول کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو شانِ نزول درج کی گئی ہے وہ وہی ہے جو الفاظِ آیت کے بالکل مطابق ہے۔ اور اس درجہ قرین صحت ہے کہ ”م۔ ح“ صاحب کو بھی ان الفاظ میں اس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ ”یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کی تاویل اس سے بہتر نہیں کی جاسکتی۔“ مگر واضح ہونا چاہیے کہ اس شانِ نزول کے بیان میں کوئی تاویل نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کا کوئی لفظ اس کے ظاہری معنی سے ہٹایا نہیں جاسکتا بلکہ اس کی تنزیل ہے جو خلافتِ امیر المؤمنین پر منطبق ہے۔

ابن تیمیہ ایسے بعض مصنفین کا اپنی ایسی کتابوں میں جو ردِ شیعہ ہی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں اس روایت کو رد کر دینا تو ایک مناظرانہ پالیسی ہے جو کسی سنجیدہ فیصلہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے بدرجہا زیادہ ان محدثین کا قول ذہن رکھتا ہے جنہوں نے اہل سنت ہونے کے باوجود اس روایت کو درج کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔ اصولِ کافی سے جو حدیث پیش کی گئی ہے وہ معترض کے لیے اس وقت کارگر ہو سکتی تھی جب اس میں آیت کو اختلاف حضرت علیؑ سے غیر متعلق بتایا جاتا۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ کما تو اس روایت میں بھی یہی کیا ہے کہ:- ”کان کمال الدین بولایۃ علی بن ابی طالب“ دین کی تکمیل ولایت حضرت علیؑ کے ساتھ تھی۔ جو کچھ فرق ہے وہ تاریخ کا کہ اس میں غدیر کی بجائے یہ واقعہ عرفہ کے دن کا بتلایا گیا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ تاریخ کے اختلاف سے اصل واقعہ میں اختلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔

”م۔ ح“ صاحب خداوندِ عالم کے مقابلہ میں یہ ایراد وارد فرماتے ہیں کہ ”اگر اس کو یہی منظور تھا کہ علیؑ ہی خلیفہ ہوں تو کیوں نہ پہلے سے ایک بڑی جماعت میں ایسی صلاحیت یاد کر دی جو اس اعلان کے سننے کے بعد اس کے

تسلیم و اعتراض میں بیت و لعل نہ کرتی۔“

اس کا جواب خود قرآن مجید نے اس آیت کے آخر میں دے دیا ہے کہ **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ** ”خدا ظالمین کی جبریہ ہدایت نہیں کیا کرتا۔“

ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ نوحؑ کو نبی بنانا ہی تھا تو ایک بڑی جماعت ایسی کیوں نہ پیدا کر دی جو ان کی تصدیق کرتی۔ طوفان کے عذاب کی نوبت ہی نہ آتی اور اسی طرح تمام دوسرے انبیاء کے لیے جنھیں امتوں کے ہاتھوں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچیں بالکل ویسے ہی حضرت علیؑ کی خلافت کا مسئلہ ہے۔
ادھر سے صاف اعلان کر دیا گیا ہے۔ کہ:-

يَا اَكْسَرَاهُ فِي السِّبْيِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ - ”دین کے بائے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہدایت گمراہی کے طریقہ سے ممتاز ہو کر سامنے آجائے۔“ اس کے بعد جبر و تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رہ گیا یہ امر کہ اس معاملہ کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اگر یہ نہیں تو پوری رسالت کچھ نہیں۔ اس کا راز بالکل صاف ہے۔ رسول اللہؐ کی عمر محدود اور آپؐ کی علانیہ تبلیغ کی مدت صرف تیرہ برس۔ اس میں اسلام بہت پھیلنا۔ لیکن پھر بھی بجزیرۃ العرب آگے نہیں بڑھا۔ لیکن آپؐ کی رسالت کی عمر آخر قیام دنیا تک اور اس کا دائرہ تمام دنیا کے لیے ہمہ گیر۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں مسلمانوں کی ہدایت براہ راست آپؐ کی تبلیغ سے متعلق لیکن اس کے بعد کے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ یہی ہے کہ آپؐ کی جانب سے یا نشینی کا نظام قرار دیا جائے جو آپؐ کے بعد ہدایت خلق کا ذمہ وار ہو سکے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو آپؐ کے بعد ہمیشہ کے واسطے مسلمان تاریکی میں مبتلا ہو گئے اور نور سے محروم کر دیے گئے مگر ظاہر ہے

کہ آپ کے بعد کے تمام مسلمانوں کی ہدایت جو رسالت کا مفاد ہے اس کے لحاظ سے صرف اتنے مسلمانوں کی جو رسول کے زمانہ میں تھے وہ نسبت ہے جو اقلیت کے لحاظ سے کالعدم ہے اور اس لیے اگر ان تمام مسلمانوں کی ہدایت کا ہمیشہ کے واسطے کوئی انتظام نہ ہوتا تو یہ تیرہ یا زیادہ سے زیادہ بیس برس کی رسالت بھی بے کار ہے۔ اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

خدا نے مسئلہ خلافت کے متعلق سرحدی احکام کیوں نازل نہیں کیے؟ سرحدی سے مراد بظاہر یہ ہے کہ نام کی تصریح کے ساتھ اس کے متعلق پہلے کے مضمون میں کافی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

یہ ایک حکیمانہ روش تھی جس کی بنا پر دلائل خلافت علی اب تک قرآن میں موجود رہ گئے اور نہ آنا بھی نہ رہتا یا آج قرآن مسلمانوں میں متذکرہ حیثیت ہی نہ رکھتا ہوتا۔

اس کے بعد ولایت علیؑ کو اگر مانا گیا ہو تو اس سے مقصود حضرت علیؑ کی روحانی و معنوی وہ شان اور جلالت ہے جس کو دنیا کے عام افراد سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ نہ آپ کی خلافت جو قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے اور ہرگز کوئی رائے دو دوں پر وہ نہ تھی۔

پانچویں تنقیح

حضرت علیؑ کی رائے خلفائے ثلاثہ کے بارے میں

باوجودیکہ حضرت علیؑ کا خلافت ثلاثہ سے اختلاف ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا اعتراف اکثر دوسرے افراد کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ

بڑی صاحب کا یہ فقرہ پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے۔
 ”یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت سے
 ان کو انکار و اختلاف تھا۔“

لیکن پھر بھی خواہ مخواہ اس کی کوشش مزدی سمجھی جاتی ہے کہ حضرت علیؓ
 کے احوال سے خلفائے ثلاثہ کی خلافت کی تائید کی جائے۔

اس سلسلہ میں عام طور پر ”منہج البلاغہ“ کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے
 ہیں لیکن اس موضوع پر امامیہ شن لکھنؤ کی شائع کردہ کتاب ”ابوالاثرہ کے تعلیمات“
 میں اتنی مکمل بحث کر دی گئی ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس
 ہوتی۔ ناظرین کو اسی کتاب کے مطالعہ کی دعوت دینا کافی ہے۔

بڑی صاحب نے اس سلسلہ میں جو حوالے دیے ہیں وہ نہایت
 پُر لطف ہیں۔

۱۔ کتاب الفتوح ابن حاصم کوئی، اس نام کی کوئی کتاب مجھے معلوم نہیں۔
 بظاہر اس سے اعثم کوئی کی تاریخ مراد ہے۔ لیکن اعثم کوئی ایک ایسا
 خوش قسمت انسان ہے جس کے حوالے شیعوں کی کتابوں میں سنی کسک
 درج ہیں اور بڑی صاحب اس کو شیعہ کہہ کر حوالہ دے رہے ہیں حقیقت
 میں ایسے مجہول مولف کی کتاب نہ ان کے لیے سند ہو سکتی ہے نہ ان کیلئے۔
 اس کی شخصیت ہی کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ کہ وہ تھا کون؟ اور کس
 زمانہ اور کس پایہ کا شخص تھا۔

۲۔ ”شرح منہج البلاغہ مطبوعہ طہران“۔ اس کے لیے ضرورت تھی، یہ لکھا جاتا کہ
 کون سی شرح، اس لیے کہ منہج البلاغہ کی متعدد شرحیں چھپی ہیں جن میں
 سے بعض سنیوں کی ہیں اور بعض شیعوں کی ہیں۔ پھر کیا معلوم ہو سکتا ہے

کہ وہ مضمون کس شرح میں درج ہے۔

۳۔ ”اتواق الحماہیت“ از یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی۔ میں اپنے معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس نام کی کوئی کتاب شیعہ مؤلفات میں موجود نہیں ہے۔
”یحییٰ بن حمزہ“ بھی شیعہ مؤلفین میں کوئی نہیں ہیں۔

۴۔ ”فصول امامیہ“۔ اس کتاب کا بھی وجود کہیں نہیں ہے۔
”فصول مسمیہ“ ایک کتاب ہے مگر وہ ابن صباغ مالکی کی ہے جو علمائے اہلسنت میں سے تھے۔

تفسیر قمی کا ایک حوالہ درست دیا گیا ہے مگر دیکھئے تو اس میں ہے کیا؟
یہ کہ جناب ابوبکر نے حضرت رسول اللہؐ کے اخبار بالغیب پر شک کا اظہار کیا۔
جس پر حضرت نے معجزہ دکھلایا تو آپؐ نے کہا۔ یا رسول اللہؐ آپ بے شک سچے
ہیں اس سے تو حضرت ابوبکرؓ کے ایمان بالرسولؐ کی بڑی کمزوری ظاہر ہوتی ہے
نہ یہ کہ کوئی فضیلت پیدا ہوتی ہو۔

کیا ایسے ہی حوالوں کے ساتھ ان روایات کا معارضہ کیا جاسکتا ہے جو شیعوں
کی جانب سے کتب اہل سنت میں سے پیش کی جاتی ہیں۔ جن کے لکھنے والے
مسلم الثبوت حفاظ و محدثین اور ائمہ تفسیر و مورخین ہیں۔ اور جن کی شخصیت
نا قابل انکار ہے۔

چھٹی تنقیح

سنی شیعہ اختلاف میں سیاسی اغراض کی کار فرمائی

افسوس ہے کہ سنی شیعہ اختلاف کے سلسلہ میں مذہب شیعہ پر یہ ذمہ داری

عائد کی جاتی ہے کہ وہ سیاسی اغراض کے ماتحت عالمِ وجود میں آیا ہے حالانکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے شیعہ مذہب تو صرف آیات و احادیث پر مبنی ہے لیکن سنی مسلک صرف دنیاوی ڈپلومیسی سے دنیا میں قائم ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس مذہب نے اپنا سنگ بنیاد ہی خدا و رسولؐ سے الگ کر کے قائم کیا ہو، جس مذہب نے پیشوائی کا کوئی معیار ہی قرار نہ دیا ہو بلکہ جیسا رنگ زمانہ کا دیکھا ہو ویسا ہی اصول بنالیا ہو۔ اس لیے اجماع اور اس کے بعد اختلاف اور پھر شوریٰ، آخر میں قہر و غلبہ اصول اساسی میں قرار دیا گیا ہو، جس مذہب میں بادشاہانِ دنیا کو ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم“ کے ماتحت خدا و رسولؐ کا ہم پتہ قرار دے لیا جائے وہ تو سیاسی اغراض کا نتیجہ نہ ہو اور جس مذہب میں سوائے ”قال اللہ وقال الرسول“ کے کچھ اور بات ہی نہ مانی جاتی ہو، جہاں مال و دولت سے کنارہ کشی کی گئی ہو اور ظاہری شان و شوکت کو کوئی چیز نہ سمجھا گیا ہو وہ سیاسیات کا نتیجہ قرار پائے۔

”بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوا بجھی است“

بنی امیہ کے زمانہ میں کس طرح احادیث وضع کیے جاتے تھے؟ کس طرح وضع احادیث پر انعامات دیے جاتے تھے؟ کس طرح حضرت علیؑ کے فضائل و کمالات پر پورہ ڈالا جاتا تھا اور کس طرح دنیا کو اہل بیتؑ سے ناواقف بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ بہت مبسوط باب ہے جس کے لیے اب نہ وقت میں وسعت ہے، نہ قلم کو لکھنے کا حوصلہ باقی ہے۔



ساتویں تنقیح

کیا نفرت و عناد کی اسپرٹ شیعہ مذہب کی یہ خصوصیت ہے؟

جو اس کے اصلاحی یا الہامی ہونے کے خلاف ہے؟

یہ وہ اعتراض ہے جو شیعہ فرقہ پر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اسے نبی صاحب نے بھی بڑی اہمیت دے کر پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محبت و مہمردی ہر اصلاحی مذہب کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن دنیا میں یہ امتیاز صرف شیعہ مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کی بنیاد محبت و اخوت کے بجائے نفرت و عناد کے جذبات پر قائم کی گئی ہے۔

چونکہ اس بحث میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مبسوط اور پُر زور کالہ لکھا ہے جو اپنے دلائل کے لحاظ سے اس بحث میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس مقالہ کو یہاں درج کیا جاتا ہے اور یہی اس تبصرہ کا آخری جزو ہے۔



تولڈوتبرا

(از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم)

سچ یہ ہے کہ پل صراط کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور اس کے نیچے آتشیں جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں لیکن اس کا سامنا صرف قیامت پر ہی کیوں اٹھا رکھا جائے۔ الدنیا کمزرتة الاخرة آج دنیا کے سفر میں بھی پل صراط ہر شخص کے سامنے ہے۔

یہ پل صراط درحقیقت اخلاق کی دشوار گزار راہ ہے۔ جذبات و امیال انسانی کے اعتدال کا لایخل مسئلہ ہی پل صراط ہے۔ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز۔ اور اس کے نیچے ہلاکت و بربادی کا قصر آدم کی اولاد میں سے کوئی نہیں جس کو اس پر ایک بار نہ گزرنا ہو۔ وان منکم الا و مرادھا کان علی ہر بلا حتما مضیاً۔ تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر سے نہ گزرے۔ یہ ایک وعدہ اور فیصلہ ہے جس کو خدا نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔“

اخلاق کے سینکڑوں مشکل مسائل میں سے ایک مشکل تر مگر اصولی مسئلہ بغض و حسد، تولڈوتبرا، تحسین و تذلیل، اور عفو و انتقام کا بھی ہے۔ ایک طرف اخلاق ہم کو تلقین کرتا ہے کہ دل کو محبت کے لیے مخصوص کرو کہ اس گھر کے لیے یہی قانون موزوں ہے۔ انیس سو برس پہلے کا ایک اسرائیلی وعظ کرتا ہے کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو۔ کیونکہ اگر صرف چاہنے والوں کو چاہا، تو تمہارے لیے کیا اجر۔

اخلاق کے اولین اور سامنے کے سبق یہی ہیں کہ پیار کرو، خاکسار بنو، کسی سے بغض نہ رکھو۔ سب کی عزت کرو۔ انسان کی انسانیت کا بغیر تفریق ادب کرو۔ اور جس کو سامنے دیکھو سر جھکا دو۔ سوسائٹی نے بھی صدیوں سے ان تعلیموں کو اعتقاداً قبول کر لیا ہے اور اصطلاحی اخلاق، مروت، پاس و لحاظ، شرم و حیا، شرافت انسانیت تمام الفاظ ان ہی معنوں میں بولے جاتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں اسی اخلاق کا ایک دوسرا پارٹ ہے، جہاں آ کر اس کی یہ غریب و مسکین صورت ایک سخت اور جاہلانہ خشونت سے مبتلا ہو جاتی ہے اور دنیا میں اگر اس کی صدا پہلی تعلیم دیتی ہے تو خود اس کا عمل دوسری شکل میں سامنے آتا ہے۔ وہ جھوٹا قہر کرتا ہے۔ اتنی ہی بدی کو بُرا بھی کہتا ہے۔ زید کو کہتا ہے کہ وہ نیک ہے اس لیے کہ اچھا ہے۔ عمر کو کہتا ہے کہ تم بد اعمال ہو، اس لیے برے ہو۔ ظالم سے اس کے ظلم کا اور مجرم سے اس کے جرم کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلی حالت میں جس قدر عاجز رہتا تھا ہی اس حالت میں مغرور و متکبر ہو جاتا ہے۔ پہلے اگر عاجزوں کے جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر اپنے سینہ پر جگہ دیتا تھا تو اب سرکشوں کے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے پامال کرتا ہے اور پھر ساتھ ہی حالت یہ ہے کہ اس کی پہلی تعلیم سے اگر صرف معبدوں اور خانقاہوں میں رونق پیدا ہوتی تھی تو اس عمل سے پوری دنیا میں انتظام اور قانون قائم ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں اصول کے لیے ایک سخت تصادم اور کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور فیصلہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان متضاد حالات میں راہِ تطبیق کیا ہے؟ غفور و درگزر کے اصول سے کام لیجیے تو دنیا سے نیکی و بدی کی تیز تشخیص ہوتی ہے۔ انتقام و پاداش کی راہ اختیار کیجئے تو دنیا سے رحم و محبت نابود ہو جاتی ہے۔ سب کو اچھا کہیے تو صرف اچھوں کے لیے آپ کے پاس ہے، باقی کیجئے

تو اس کے حدود فیصلہ کن اصول کیا ہیں؟

آج ملک میں جو طبقہ شخصی حکومت کے جرائم سے مریض ہو رہا ہے۔ وہ گو خود جاں بلب ہے مگر اس کی نظر اپنے مرض پر نہیں بلکہ دوسروں کی شکایتوں پر ہے۔ غلامی کے حلقوں کے لیے سب کے کان چھیدے ہوئے ہیں۔ پاؤں برسوں سے بوجھل میٹروں کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان حلقوں اور میٹروں کے لیے ضرور نہیں کہ وہ تخت و تاج ہی کی طرف سے بچنے گئے ہوں۔ بلکہ ہر چاندی کا ڈھیر ہر قیمتی کپڑا ہر قیمتی موٹر، ہر ہوٹل کی اعلیٰ ترین منزل کا مقیم اور ہر مدعی جن کے گلے میں طاقت اور جیب میں سکتے ہوں ایک قانونی اور سودی حق رکھتا ہے کہ جس کو چاہے اپنے حلقہ غلامی کے انتساب کا فخر دیدے۔

رسول عربیؐ کے وقت تین سو ساٹھ بت متے جس سے بیت خلیل کی دیواریں چھب گئی تھیں لیکن آج اس کی امت میں ہر سیلی کی بستی لات و منات کی قائم مقام ہے اور ہر حاکم، ہر رئیس، ہر حکام رکن اور سب سے آخری گھر سب سے پہلے ہر خوش لباس لینڈر ایک بت کا علم رکھتا ہے۔ پوری ملت موحدان کی پوجا اور پرستش میں مشغول ہے۔ اور یقیناً اس پرستش کا وہ ہی جواب رکھتی ہے جو قریش مکہ کے پاس تھا۔ کہ ما نعبدہم الا لیقر بوجھا الی اللہ لرسولہ۔ ۳۸: ۴
و یعبدون منی دون اللہ ما لا ینفعہم شیئاً ولا یضرہم ویقولون
ہو لاء شفعاؤنا۔

اس انسان پرستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بالعموم طبیعتیں مدح و تحسین کی عادی ہو گئی ہیں۔ نکتہ چینی اور نقد و اعتراض کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ہر شخص مخاطب سے اگر کوئی قدرتی امید رکھتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ مدح و منقبت کا ترانہ سنائے اور بادۂ تحسین و اکفرین کی پے در پے بخشش سے ساقی کا جامۂ کبھی نہ تھکے۔

شرکت و بت پرستی کے اس عام سکون میں اگر کوئی صدائے توحید نکل اُٹلتا
ہوتی ہے تو ہر طرف سے اپنے ایک قدیمی پنشنر کی طرح لٹن اتھنڈت الہا
غیری لا جعلک من المسجونین۔

”اگر میرے سوائے دوسری ذات کو تو نے اپنا معبود بنایا تو میں تجھ کو قید کر
دوں گا۔“ ۶۶:۶۹۔ کاغذ ملچ بھاتا ہے۔ اور صرف یہ معبود ان باطل ہی
نہیں بلکہ ان کے پرستار بھی چاروں طرف سے لٹ پڑتے ہیں۔

یہ ایک قدیمی سنت ہے اور دنیا میں جب کبھی بھی سچائی آتی ہے تو اس کو
ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے مقابل ہونا پڑا ہے۔

فما كان جواب قوم الا ان قالوا حقوا والنصروا الهتك
ان كنته فاعلين ۱۸:۲۱

ایسے موقعوں پر عموماً اخلاقی مواعظ سے کام لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ
بڑے آدمیوں پر حملہ کرنا انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہے۔ گالیاں دینا کوئی
عادت نہیں۔ اختلاف رائے ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ مخالفت آراء رکھنے والوں کی تذلیل و تحقیر کی
جہات ہے۔ پھر اگر ایسا کرنے کے لیے آپ مجبور ہیں تو ذرا الجبر نرم کیجئے اور شکایت
بھی کیجئے تو شکر کے لمحے میں کیجئے۔ محبت و نرمی سے کام نکلے تو سختی دکھانا
شانِ شرافت نہیں۔

آج کل بھی کہ ہشپاری اور بیداری کی نہیں تو خمار و سرشاری کی ایک کوٹ
تو مسلمانوں نے ضرور بدلی ہے، نکتہ چینیوں کی زبانوں کو ایسے ہی ظاہر فریب
اور اخلاقی جملوں سے بند کیا جا رہا ہے۔

پس ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اصولاً اس مسئلہ پر غور کریں، کہ

فی الحقیقت اس بارے میں کوئی فیصلہ ہمارے پاس ہے یا نہیں۔
 کسی کو برا کہنا یقیناً اچھی بات نہیں۔ دل محبت کے لیے ہے نہ کہ عداوت
 کے لیے۔ لیکن کیا ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں یہ برائی ہی سب سے بڑی نیکی
 اور مصلحت ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے اسے اخلاق کے علم اصول کے لحاظ سے دیکھیے، جب
 بھی فیصلہ صاف ہے۔ دنیا میں جس دن اخلاق نے کہا کہ نیکی کو نیک اور
 نیک عمل کو اچھا کہو کیونکہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی، اسی
 وقت سے اس نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ نیکی کی خاطر بدی کو برا اور بد عمل کو
 قابلِ نفرین سمجھو، کیونکہ نیکی کو اس کا حق تحسین مل نہیں سکتا۔ جب تک بدی کو
 اس کی سرزنش اور نفرین نہ مل جائے۔

زیادہ غور کیجیے تو یہ ایک قدرتی اور عام معمولی بات ہے کہ گو اس کا
 آپ کو حس نہ ہو، دنیا میں اخلاقی محاسن و فضائل کا اگر کوئی وجود ہے، تو
 صرف ان کے اعداد کے تقابل ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک فضائل انسانی کو
 نمایاں نہ کیجیے گا فضائل انسانی وجود پذیر نہ ہوں گے۔

اس کے لیے روشنی اور تاریکی کی مثال شاید مقصد میں معین ہو کہ روشنی کا
 وجود صرف تاریکی کے وجود ہی کا نتیجہ ہے۔ رہا اخلاقی تلقینات اور اعمال
 کا اختلاف تو یہ تو اخلاق کے ہر مسئلہ میں درپیش ہے، مگر درحقیقت دونوں
 صورتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اخلاق دنیا میں کسی شے کو فی نفسہ اچھا یا برا کہنے
 کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی ہر تعلیم نسبت و اضافت سے وابستہ ہے
 اور اس کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ کوئی شے اس کے آگے نہ تو
 اچھی ہے اور نہ بُری۔ ایک ہی چیز کا بعض حالتوں میں نام نیکی ہوتا ہے

اور بعض حالتوں میں بدی۔ یہی حاصل اس مسئلہ کا بھی عفو، درگزر، اشتی و محبت
 نرمی و عاجزی، انسان کے لیے سب سے بڑی نیکی ہیں۔ لیکن کن کے سامنے؟
 عاجزوں اور درماندوں کے سامنے، نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے۔ ایک مسکین
 اور فلاکت زدہ سے یہ رحم کیجئے تو سب سے بڑی نیکی اور ایک ظالم پر کیجیے تو
 سب سے بڑی بدی ہے۔ گرے ہوؤں کو اٹھائیے تاکہ وہ چل سکیں لیکن اگر
 سرکشوں کو ٹھوکر نہ لگائیے تو وہ گرے ہوؤں کو اور گرا دیں گے۔ قانون کو دیکھیے تو
 وہ جرم کو روکنے کے لیے خود جرم کرتا ہے۔ خونریزی اس کے سامنے سب
 سے بڑی معصیت ہے۔ لیکن خونریزی کو روکنے کے لیے وہ قاتلوں کے خون
 بہانے ہی میں اسن دیکھتا ہے۔ قاتل کا قتل بدی تھا لیکن عدالت کا فتویٰ
 قتل نیکی ہو گیا۔

ہم نے بغیر کسی ترتیب کے چند جملے پھیلا دیے۔ کیونکہ یہ اخلاق کے ایسے
 عام اعمال ہیں جن کو یاد دلادینا ہی کافی ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان
 اخلاقاً نرمی و اشتی و محبت و عفو کا مستحق ہے اور کسی کا برائی کے ساتھ ذکر کرنا
 اخلاق کے اصول کے خلاف ہے وہ اخلاق کے نام سے ایسی سخت بد اخلاقی
 کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس پر اگر ایک لمحہ کے لیے بھی عمل کیا جائے گا تو دنیا
 شیطان کا تحت گاہ بن جائے گی۔ نیکی اور اعمال صالحہ کا نظام درہم برہم ہو جائیگا
 قانون، اخلاق، مذہب، حسن قبیح کی تمیز، اور نور و ظلمت کی تفریق کوئی بھی خدا کو
 خوش کرنے والی چیز دنیا میں باقی نہ رہے۔

یاد رکھو کہ ہر محبت کے لیے ایک بغض لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا
 جب تک کہ مستکبر و مغرور نہ ہو۔ نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اس کی خاطر بدی کو بٹا
 کٹنا ہی پڑے گا۔۔۔ خدا کا خوش رکھنا تو سب سے بڑا کام ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے فیصلہ کن حدود معین ہونے چاہئیں۔ زعمی
رحمدی اور عضو و درگزر کے مقامات کیا کیا ہیں اور سخت گیری، پاداش اور انتقام کا
حق کس موقع پر حاصل ہوتا ہے۔

عام اخلاق کے اصول بھی ان سوالوں کا جواب شاید دے سکتے ہیں مگر
ہم تو دنیا کی ہر شے کو مذہب ہی میں ڈھونڈتے ہیں پھر اس کے بعد نہیں
جانتے کہ دنیا میں اور کیا کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ایک امام مبین بتیاناً لکل شیء بیان
للناس، نور و کتاب مصبین۔ اور انسان کے ہر اختلاف و نزاع کے
لیے ایک حاکم ناطق ہے۔ اور پھر اس کا عملی نمونہ اور وجودِ قطعی اس کے حال
اور مبین کی زندگی کے اعمال ہیں کہ بقدر کائنات لکھ فی رسول اللہ اسوۃ
حسنۃ۔ پس ان سوالوں کا جواب بھی وہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔

اسلام نے اپنی تعلیم و دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقاء کے لیے
اساسِ آدین اور نظامِ بنیادی ایک اصول کو قرار دیا ہے۔ اور اس کو وہ امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - ۳ - ۲۱

”تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی دعوت دے۔ بھلائی کا حکم
کرے اور برائی سے روکے وہی فلاح یافتہ ہیں۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دعوتِ الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کا اس کو فرض
قرار دیا ہے۔ لیکن اس رکوع میں آگے چل کر دوسری آیت ہے۔

کنتم خیرامة اخراجت للناس تأمرهم بالمعروف و

تنہوں من المنکر وتؤمنون باللہ - ۱۹۶

”تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

ایک تیسری آیت میں مسلمانوں کا یہ عمل امتیاز اور قومی فرض زیادہ نمایاں طور پر بتلایا ہے :-

وکنذ اللہ جعلنا کھامة وسطا لکونوا شھداء علی الناس

ویکون الرسول علیکم شھیدا - ۲ : ۱۷۷

”اور اس طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا۔ تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور تمہارے مقابلہ میں تمہارا رسول گواہ ہو۔“

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

اسلام نے اپنی تعلیم و دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقا کے لیے اس اس اذیلین اور نظام بنیادی ایک اصول قرار دیا ہے۔ اور اس کو وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

ولکن متکمامة یدعون الی الخیر دیا امرہون بالمعروف

وینہون عن المنکر اولئک ہم المفلحون - ۳ : ۲۰

”تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو دنیا کو نیکی کی تعلیم دے۔ بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے، وہی فلاح یافتہ ہیں۔“

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے۔ اور بظاہر مسلمانوں میں سے ایک گروہ

خاص کو اس کا فرض قرار دیا ہے لیکن اس رکوع میں آگے چل کر ایک دوسری آیت ہے۔

کنتم خیرامة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف
وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللہ . ۱۹۶ : ۳

”تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیان میں اور وسط کی امت بنایا تاکہ لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور تمہارے مقابلہ میں تمہارا رسول گواہ ہو۔“

تفسیر آیات

ان تینوں آیتوں میں خدا تعالیٰ نے خاص طور پر مسلمانوں کا اصلی مشن مقصد تخلیق، قومی امتیاز اور شرف خصوصی ایسی چیز کو قرار دیا ہے کہ گودنیا میں اعلانِ حق ہر برگزیدہ ہستی اور جماعت کا فرض رہا ہو مگر مسلمانوں کا تو مریاتہ زندگی یہی فرض ہے۔ وہ دنیا میں اس لیے کھڑے کیے گئے ہیں کہ خیر کی طرف داعی ہوتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو جہاں کہیں دیکھتے ہیں اپنے تئیں اس کا ذمہ وار سمجھ کر روکتے ہیں۔ آخری آیت میں کہا کہ تم کو ایک وسطی امت بنایا گیا تاکہ تم اولین و آخرین کے لیے گواہ بن سکو اور اس امر کی کہ تم نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں تمہارا رسول امین، اللہ کے آگے گواہ ہو۔ اخلاق کے تمام دفتر کا تعین قرآن کے اسی اصل اصول پر قائم ہے۔

گو تفصیل کا موقع نہیں مگر ان آیات کے متعلق چند تفسیری اشارات کہ دینا فہم مقصد میں معین ہوگا۔

امر بالمعروف حکم عام ہے۔

دوسری آیت میں اس لیے المعروف اور المنکر پر الف لام متغلق کے لیے آیا تاکہ بقول امام رازی معروف اور منکر میں کوئی تخصیص و تحدید باقی نہ رہے اور ظاہر ہو جائے کہ وہ ہر نیک کے لیے آ مر اور ہر بدی کے نا ہی ہیں۔ عام اس سے کہ وہ کہیں پر اور کسی صورت میں ہو۔ وھذا یقتضیٰ کونھم امرین لکل معروف و ناھین عن کل منکر۔ تفسیر کبیر جلد ۲ ص ۲۲۵۔

مسلمانوں کے ملی شرف و فضیلت کی علت :-

خیرامة اخرجت للناس کے بعد امر بالمعروف کا ذکر کیا اور یہ اس لیے کہ پہلے وصف بیان کر کے پھر اس کی علت بیان کی جائے۔ یعنی مسلمانوں کا بہترین امت سے ہونا صرف ان کے وصف پر منحصر ہے کہ وہ امر بالمعروف و ناہی عن المنکر میں خیر کی دعوت دیتے ہیں اور شر سے روکتے ہیں۔

کما یقال زید کریم لطمع الناس و میکس رحم۔ اور یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ وصف امتیازی ان سے جاتا رہے تو پھر وہ بہترین امت ہونے کے شرف سے بھی محروم ہو جائیں اور ان کا وہی قومی امتیاز ان میں باقی نہ رہے۔

تیسری آیت کی تفسیر :-

تیسری آیت میں ان کو وسط کی امت قرار دیا اور پھر اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ ”تاکہ تم لوگوں کے لیے گواہ ہو۔“ افسوس ہے کہ اس صاف اور سلجھی ہوئی بات میں بھی ہمارے بعض مفسرین نے لاجاصل بحثیں پیدا کر دیں اور اس بحث میں پڑ

گئے کہ یہ شہادت دنیا میں ہوگی یا آخرت میں۔ اسلام کا اصلی کارنامہ غیر فانی دنیا ہی کی اصلاح تھا۔ مگر مفسرین اس کی طرف سے اس درجہ غافل ہیں کہ ہر شے کو آخرت ہی پر اٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر اسی شہادت کا حضرت عیسیٰؑ کی ذبانی ذکر کیا گیا ہے کہ کنت علیہم شہیداً ما دمت فیہم۔ میں اپنی امت پر شاہد تھا جب تک کہ ان میں موجود تھا۔

اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی امت میں دنیا کے اندر ہی موجود تھے، نہ کہ آخرت میں۔ بس یہاں بھی شہادت سے وہی شہادت مراد ہے۔ جو دنیا کی زندگی میں انجام دی جاسکتی ہے۔ تاہم علامہ رآزی کا ہدیشہ ممنون ہونا پڑتا ہے کہ وہ گور آیت کے متعلق طرح طرح کی توجہات جمع کر دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک نہ ایک ایسی توجہ ضرور اُن میں موجود ہوتی ہے جو اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے اور وہی خود ان کی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ اس آیت کے متعلق بھی انھوں نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہے۔ ج ۱: ۳۲۔

امت وسطا:-

اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں کا فرض منصبی قرار دیا اور فی الحقیقت ایسا کرنا دنیا میں عدل حقیقی کو قائم کرنا تھا۔ بائی اگر روک دی جلتے اور نیکی کو رائج کیا جائے تو دنیا کے نظم کے قوام کا اس کے علاوہ اور کیا اعتدال ہو سکتا ہے۔ عدل کے معنی ہیں عدم افراط و تفریط کے یعنی کسی شے کا نہ زیادہ ہونا اور نہ کم ہونا۔ اور درجہ مستام (وسط) اور درمیانی ہے۔

گناہ کی حقیقت اور اصطلاح قرآنی میں "اسراف"

دنیا کی جس قدر برائیاں ہیں، غور کیجئے تو وہ افراط یا تفریط کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ انسان کے تحفظ خود امتیازی اور حفظ حقوق کے لیے غیبت، غضب اور ہیجان کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب یہ جذبات اپنی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں تو فطرت کی بخشی ہوئی ایک شے جو یقیناً نیکی تھی یکایک بدی بن جاتی ہے۔ اور ان کا نام جرم اور گناہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی اصطلاح میں ہر جگہ معصیت اور گناہ کے لیے اسراف کا لفظ اختیار کیا۔

يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ انْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ
 "اے وہ میرے بندو کہ تم نے اپنے نفوس پر اسراف کیا ہے رحمت الہی سے
 مایوس نہ ہو۔"

یہاں سرفین سے مراد سخت درجہ کے گنہگار اور معصیت شعار انسان ہیں۔ کیونکہ آیت کا شان نزول نیز آگے چل کر ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً کہنا اس کی پوری طرح تشریح کر دیتا ہے۔ اسراف کی تعریف صرف الی شئ ذیما ینبغی نہ اشد اعلیٰ ما ینبغی اور تجاؤ نہ الحد فی کل شئیں راعب ہے۔

یعنی کسی چیز کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ہر شے کا اپنی حد سے تجاوز کر جانا۔

اس سے بڑھ کر گناہ کی تعریف کیا ہو سکتی تھی کہ وہ قوتوں اور خواہشوں کے بے اعتدالانہ خرچ کا نام ہے۔

اسراف کے علاوہ اصطلاح قرآنی میں ایک لفظ تیزی بھی ہے۔ جیسا کہ

فرمایا۔ ان المبذرين کا فدا اخوان الشیاطین۔ بے موقع اور بے ضرورت مال و دولت کو ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، لیکن تیزی اور اسراف میں ایک باریک فرق یہ ہے۔ کسی شے کے خرچ کرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض چیزیں خرچ تو کی جاتی ہیں ان کے ٹھیک ٹھیک مصرف میں۔ لیکن تعداد صرف ضرورت اور حد معینہ سے زائد ہوتی ہے۔ اور طریق صرف صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مجرم پر اس کے تصور سے زیادہ غضبناک ہونا اور مناسب سزا دینے کی جگہ مار پیٹ سے کام لینا۔ بے شک ایک مجرم کو اس کے جرم کی پاداش منی جاسکتی ہے۔ اور اسی لحاظ سے آپ کے غصہ کا خرچ صحیح مصرف میں ہوا۔ لیکن جس مقدار اور جس صورت میں غصے کو آپ خرچ کر رہے ہیں یہ اس کے حدود اور اس کی ضرورت سے زیادہ ہے اور اسی کا نام اسراف ہے۔ برخلاف تہذیر کے کہ اس کی تعریف صرف الشیخی فیما بینہم بیان کی گئی ہے۔ یعنی کسی چیز کو اس کے مصرف کے علاوہ دوسری جگہ خرچ کرنا مثلاً دولت نفس کے ضروری آرام و آسائش اعزاء و اقربا کی اعانت اور اعمالِ حسنة میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ مگر آپ اسے محض اپنی جاہ و نمائش دنیوی عزت اور حکام کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے یا سلسلے مختلف مٹانا شروع کر دیں تو صرف قرآن کریم اس کو تہذیب سے تعبیر کرے گا۔ اور چونکہ اس میں نقصان اسراف سے شدیدتر ہے۔ اس لیے وعید بھی سخت وارد ہوئی ہے۔ مصرف کے لیے صرف ان الله لا یحب المفسرین خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ فرمایا اور تہذیر کے مترجمین کو کا فدا اخوان الشیاطین کہہ کر شیطان کے اخوان و اقارب میں شمار کیا گیا۔ اسراف اور تہذیر کا یہ فرق خود قرآن کریم سے مانو ہے۔ تفسیر بالا اے نہیں ہے۔ یہ دونوں لفظ جہاں جہاں بولے گئے

ہیں اگر ان کا استقصا کر کیا جائے تو خود بخود یہ فرق ظاہر ہو جائے گا۔ مثلاً کھلوا
واشربوا ولا تسرفوا ان اللہ لا یحب المفسرفین ” کھایا اور پیو مگر اسراف
نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

بھوک اور پیاس میں غذا اور پانی کا صرف ایک بالکل صحیح مصرف کا خرچ ہے
اور انشیا رکابے موقع خرچ کرنا نہیں ہے۔ غذا کھانے ہی کے لیے ہے اور پانی پینے
ہی کے لیے لیکن اگر مدغواہش اور ضرورت سے زیادہ کھایا جائے تو یہ اسراف
ہو جائے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اسراف مت کرو۔ لیکن ایک دوسرے موقع میں
صورت خرچ اشیاء اس سے مختلف تھی۔

وَأَتَى ذِي الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذُرُوا مَالَكُمْ
”اور اقارب کا حق ان کو دو، نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت
کو بے جا مٹانے مت کرو۔“

یہاں چونکہ مقصود یہ تھا کہ دولت کا مصرف صحیح اعزاء و اقارب وغیرہ کے
حقوق ادا کرنا ہے۔ پس دوسرے کاموں میں اس کو بے موقع خرچ مت کرو۔ اس
لیے اسراف نہیں کہا بلکہ تبذیر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

مرجوع الی المذکور

حاصل سخن یہ ہے کہ گنہ و عصیت، فسق، جرم اور ہر وہ شے جس کا شمار براہین
اور بدیلوں میں ہے۔ فی الحقیقت بے اعتنائی اور افراط و تفریط ہی کا نام ہے۔ اس
کے مقابلہ میں نیکی اور خیر کو صرف ایک ہی لفظ عدل سے تعبیر کیجیے کہ ہر وہ شے جس
میں عدل پایا جائے یقیناً نیکی اور عمل خیر ہے۔ قرآن ہر جگہ ہر طرح کے محاسن و فضائل
کو ایسے جامع اور مانع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں صراط المستقیم توازن
قسط، میزان الموازن، تناسل، استقیم اور عدم تطففت اور اسی طرح کے بیسیوں الفاظ

اسی ایک مقام عدل سے عبارت ہیں اور تعلیم میں لا تعدد و زیادتی مت کرو اور اعدلوا عدل کرو کے اصول کی دعوت دیتا ہے۔ اور اسی راہ عدل کو اقرب الی التقویٰ بتلاتا ہے۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ ہر شے میں خواہ وہ اس کی عبادت اور بندگی اور خواہ اس کی راہ میں خیرات اور بخشش ہی کیوں نہ ہو یہ ہے۔

ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ ۳۲:۱۷

”اور اپنا ہاتھ تو اس قدر سکڑو کہ گویا گردن میں بندھ گیا ہے۔ اور نہ بالکل پھیلا ہی دو۔ ورنہ تم خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ گے اور لوگ تم کو مامت کریں گے۔“ ہر کام کے لیے اس آیت میں اعتدال کی ایک جامع مثال بیان کر دی گئی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مقصود قیام عدل ہے پس جیسا کہ ہم نے ابتدا میں اس طرف اشارہ کیا تھا جس جماعت کا فرض دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو گا وہ دنیا میں ایک ایسی طاقت ہوگی جو صرف نیکی ہی کی خاطر دنیا میں بھیجی گئی ہے اور چونکہ نیکی عبارت ہے عدل سے اور بدی اس کے عدم سے اس لیے فی الحقیقت وہ عدل کو قائم رکھنے والی اور ہر افراط اور تفریط کو کہ بدی اور گناہ ہے روکنے والی جماعت ہوگی۔

اب عدل کی حقیقت پر غور کیجیے تو وہ فی الحقیقت ہر شے کے واسطے اور درمیان حالت کا نام ہے کسی ایک طرف جھک پڑے تو یہ افراط اور تفریط ہے لیکن ٹھیک ٹھیک درمیان میں اس طرح کھڑے رہیے کہ بال برابر جگہ بھی کسی طرف زیادہ نہ بچی ہو تو اس کا نام اعتدال ہوگا۔ قرآن مجید نے اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔

وزنوا بالقسطاس المستقیم ذلک خیر و احسن تا ویلا ۱۷-۳۰
 ”جب کسی چیز کو تولو تو ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھو تاکہ وزن میں دھوکا نہ ہو
 یہ طریق خیر اور نیک انجام ہے“

دوسری جگہ ایک سورت اس جملہ سے شروع کی ہے :-
 ویل للمطففین ”ناپ تول میں کم کر دینے والوں کے لیے بڑی تباہی
 ہے۔“

عدل کے لیے سب سے زیادہ مشاہدہ میں آنے والی اور عام فہم مثال
 ترازو کی ہوتی کہ اس کے تمام اعمال کی صحت کا دار و مدار محض اس کے اوپر کی
 سوئی پر ہے۔ جب تک وہ ٹھیک ٹھیک اپنے وسط میں قائم نہ ہو جائے
 وزن کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ جوں ہی دونوں پلوں کا وزن مساوی ہوگا
 معاً سوئی بھی وسط میں آکر ٹھہر جائے گی۔

اسی لیے قرآن نے اکثر مقامات میں ترازو کی مثال سے کام لیا ہے اور
 قیامت کے دن بھی انسانی اعمال کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہوگا۔

فاما من ثقلت موازنینہ فہو فی عیشۃ مراضیۃ وامامن
 خفت موازنینہ فامہ ہا ویتہ - یہی سبب ہے کہ وسط کو عدل کے
 معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اور فی الحقیقت ذلک اللہ جعلنا کما متہ وسطا
 میں بھی وسط سے مراد عدل ہی ہے۔

جس جماعت کا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اس سے بڑھ
 کہ اور کون سی جماعت عند اللہ اور عند الناس عادل ہو سکتی ہے۔ پس خدائے
 تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو تمام دنیا کے لیے ایک عدل قائم کرنے والی امت
 بنایا کہ دنیا کے لیے تم ایک گواہ عادل کی حیثیت سے شہادت دے سکو۔ خود

قرآن مجید بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ قال اوسطہم اور وہاں بلا اختلاف اوسطہم سے مراد عدلہم ہی ہے۔ امام رازی نے بڑا ہی تقال ایک حدیث بھی درج کی ہے کہ آنحضرت نے خود اس آیت کی تفسیر یوں فرمائی :-

امۃ وسطا ای عدلا اس کے علاوہ مشہور حدیث خیر الامم اور صہا میں بھی اوسط یعنی عدل استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی بہتر کام وہ ہیں جو ان میں مطابق عدل ہوں۔ آنحضرت کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اوسط قریش نسباً اور یہاں بھی ظاہر ہے کہ اوسط عدل ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اسی بنا پر اس آیت سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔ کہ جب امت کی عدالت نص سے ثابت ہو گئی تو اس کا اجماع یتیناً مگر ایڑی نساد سے محفوظ ہوگا۔

پہلی اور دوسری آیت میں تطبیق

پہلی اور دوسری دونوں آیتوں میں خدا نے تعالیٰ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نص کا ذکر کیا ہے لیکن آیت میں بظاہر الفاظ تمام امت کے لیے نہیں بلکہ امت میں سے ایک جماعت خاص کے لیے اس کا فرض ہونا معلوم ہوتا ہے :-

ولتکن مستکرامۃ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف
ان سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا علم دے، لیکن دوسری آیت میں کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں ہے تمام امت کا امتیاز ملتی اس فرض کو قرار دیا ہے۔

کنتم خیرا ممتا اخرجت للناس تامرمت بالمعروف الخ تم سب میں بہتر امت ہو اس لیے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو۔“

دونوں آیتیں ایک ہی سورۃ اور ایک ہی رکوع میں ہیں۔ پھر دونوں میں اختلاف - پہلی میں یہ فرض محدود اور مخصوص اور دوسری میں عام ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے جن فرائض کا ذکر کیا ہے ان میں سے ہر فرض اپنی تکمیل کے لیے علم کا محتاج ہے۔ دعوت الی الخیر کے لیے ضرور ہے کہ اعمال خیر کا علم ہو۔

امر بالمعروف کیونکر انجام پاسکے گا جبکہ وہ کام معلوم نہ ہوں گے جن پر معروف کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

نہی عن المنکر تو اور زیادہ علم و فضل اور درس و تدریس کا محتاج ہے کیونکہ منکرات میں تمام محرمات و مکروہات فقہیہ داخل ہیں اور جب تک ان کا علم نہ ہو کیونکر اسے روکا جاسکتا ہے۔

اسی تفسیر کی بنا پر فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اس آیت ولتکن منکم "من" تبعیض کے لیے آیا ہے۔ اس سے صرف ایک گروہ محدود علماء مراد ہے اور یہ تینوں باتیں صرف انھیں کے فرائض میں داخل ہیں۔

علماء نے اس فرض عام کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا۔

لیکن درحقیقت یہ خیال عملاً اور اعتقاداً ایک ایسی خطرناک غلطی ہے جس کو نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کروں اس تیرہ سو برس میں اسلام کو ان تمام غلط فہمیوں سے رتبہ پڑا جو اس سے پہلے اہم سابقہ کو پیش آچکی ہیں۔ لیکن کسی سخت سے سخت تحریف نے بھی مسلمانوں کو ایسا لاعلاج نقصان نہیں پہنچایا جیسا اس غلطی سے پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ اسلام کی وہ دعوت الہی

جو ایک عالمگیر اصلاح اور بین المللی جامعہ کے قیام کے لیے آئی تھی اسی غلط فہمی سے زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکی۔ خلافتِ دنیا بتِ الہی کا وہ شرف جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے بحیثیتِ ملی وہ تمام عالم میں خدا کا مقدس دستِ عمل تھے بد بختانہ اسی غلط فہمی سے خاک میں ملا۔ رؤسائے روحانی اور پیشوایانِ مذہب نے جو شرکانہ اختیارات اپنے لیے مخصوص کر لیے تھے جن کی غلامی سے دنیا کو نجات دلانا اس دینِ الہی کا اصلی مشن تھا اس کی بیڑیاں پھر اسی غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑیں اور ایسی پڑیں کہ اب تک نہ نکل سکیں چالیس کروڑ فزندگانِ الہی جن کو اپنے اعمالِ حسنہ سے دنیا میں خدا کی تقدیس کا تختِ جلال بننا تھا آج اپنی بد اعمالیوں سے تمام قومی جرائم اور ملی معاصی میں گرفتار ہیں اور قہرِ الہی کو مدت سے دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہ ہی معاصی ہیں جن کی پاداش میں اقوامِ گزشتہ سے خدا نے اپنا رشتہ توڑا تھا۔ جن کی وجہ سے داؤد کے بنائے ہوئے ہیکل سے انھوں نے رخصتِ الہی نے اسمعیلؑ کی چینی ہوئی دیواروں کو اپنا گھر بنایا تھا اور پھر جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو اپنی نیابت سے معزول کر کے مسلمانوں کو اس پر سرفراز کیا تھا۔

ولقد اهلكت القرون من قبلکم لما ظلموا رجائکم منہم
 بالبینات فما کانوا الیوم منوا کذلک یحزنی القوم المجرمین ثم
 جعلناکم خلافت فی الارض من بعدہم لنتنظر کیف تعملون ۱۵:۳۵
 ”اور تم سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں کہ جب انھوں نے ظلم و معاصی پر
 کمر باندھی تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے
 مگر انھیں ایمان نصیب نہیں ہوا۔ جو رسول کو ہم ایسی ہی مٹا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان
 کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تم کو دنیا کی بادشاہت دے کر ان کا جانشین بنایا

تاکہ دیکھیں کہ کیسے عمل کرتے ہو۔ مگر یہ بد بختی بھی صرف اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔
 لیکن یہ سب کچھ کیونکہ ہوا۔ اس طرح کہ اعتقاد ہی سے عمل وجود پذیر ہوتا ہے
 اس غلط فہمی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ امر بالمعروف جو دراصل ہر فرد اسلامی کا فرض تھا
 اور صحابہ کرام کی زندگی اس کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے۔ وہ روز بروز
 ایک محدود دائرہ میں سمٹنا گیا اور سمٹتے سمٹتے ایک غیر محسوس نقطہ بن کر رہ گیا
 اب اس کے وجود میں بھی شک ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت رؤسائے
 مذہبی کا معبودانہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق اس اصل اصول
 کو تجویز کیا تھا کہ امر بالمعروف کی خدمت کو اس طرح عام اور ہر فرد ملت پر
 پھیلا دیا جائے کہ پھر کسی مخصوص کو اس ذریعہ سے اقتدار حاصل کرنے کا موقع
 نہ ملے۔ اور ہندوؤں کے برہمنوں اور عیسائیوں کے رومن کیتھولک فادروں
 کی طرح مذہبی دعوت و اصلاح کو کوئی جماعت اپنی اقلیم حکمرانی نہ بنائے کہ
 بفعل مایشاء دیکھ کہ ماہرین۔ لیکن اب صدیوں سے دیکھتے تو مسلمان
 جن بیڑیوں کو کاسٹے آئے تھے ان سے خود ان کے پاؤں بوجھل ہو رہے ہیں
 اس فرض الہی کو علماء نے اپنا موروثی حق بنا لیا ہے۔ جس میں اور کسی فرد کو دخل
 دینے کی اجازت نہیں ہے۔ شیطان اپنی قدیمی عادت کی طرح جب ضرورت
 دیکھتا ہے ان کو اپنے اعمال ابلیسیانہ کے لیے آلہ کار بنا لیتا ہے۔ اور امر بالمعروف
 و نہی عن المنکر کی جگہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض ان کے
 ہاتھوں میں انجام پاتے ہیں۔ باقی تمام قوم اپنے اس فرض کی طرف سے غافل و
 بے خبر ہے اور جہل مذہبی کے سبب سے علماء کے اس غصب حقوق عامہ پر
 قانع ہو گئی ہے۔ خدا کی حکومت کوئی بھی اپنے اوپر محسوس نہیں کرتے تنگیوں

کی طرف سے سب کی آنکھیں بند ہیں اور برائیتوں پر سے ہر شخص اس طرح گزر جاتا ہے گویا اس کو کان سلنے کے لیے اور آنکھیں دیکھنے کے لیے ملی ہی نہیں۔
فاغھا لا تعی الا بصار و لکن تعی القلوب التی فی الصدور۔ ۲۲:۶۴

دونوں آیتوں کا غٹھا ایک ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کا غٹھا ایک ہے۔ اور دونوں اس فرض کو بغیر کسی تخصیص و تحدید کے ہر قائل کلمہ توحید کا فرض قرار دیتی ہیں۔ البتہ پہلی آیت میں ولکن منکر کا لفظ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ منکر یہاں تبعیض کے لیے ہے۔

یعنی تم میں سے بعض لوگوں کی جماعت اس فرض کو اپنے ذمہ لے لے۔ لیکن چونکہ آگے چل کر دوسری آیت نے اس فرض میں تمام امت کو شامل کر لیا ہے۔ اس لیے یہاں منکر کو تبعیض کے لیے قرار دینا ہی غلط ہے۔ بلکہ وہ یقیناً تو صیح و یقین کے لیے آیا ہے۔ جیسا ہر زبان کے محاورہ میں عموماً بولا کرتے ہیں مثلاً عربی میں کہیں گے ”للامیر من علما نہ عسکر و لقلان من اولاد کا جند“ یعنی امیر کے لڑکوں سے فوج کے سپاہی ہیں اور فلان شخص کی اولاد سے لشکر مرتب ہو رہا ہے۔

تو اس سے امیر کے تمام لڑکے مراد ہوں گے نہ کہ بعض۔ خود قرآن میں ایک موقع پر فرمایا ہے کہ فاجتنبوا الرجس من الاوثان ۳۱:۲۲۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بتوں کے علاوہ اور کسی شے کی ناپاکی سے پرہیز نہ کیا جائے۔ غرضیکہ یہاں من ”افادہ“ معنی تبیین کرتا ہے نہ کہ تبعیض۔ امام رازی نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے اس پر کافی بحث کی ہے۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع

الیہ۔ جلد ۲: ۲۲۸

لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم قرآن شریف کی ایک اور آیت کو اس مضمون کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ اگر امام رازی نے اس آیت کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو ان کو متعدد ذرا و توجہات کے لاصاصل نقل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ سورۃ حج کے پانچویں رکوع میں خدا تعالیٰ نے کافروں کے ان مظالم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن سے آغاز اسلام کے مسلمانوں کو سامنا ہوا تھا۔ پھر دفاع و حفظ نفس کے لیے قتال کی اجازت دی ہے اور اس کے بعد کہا ہے۔

الذین ان مکناہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف وھو اعن المنکر واللہ عاقبہ الامور۔

”اگر ہم ان مظلوم مسلمانوں کو حکومت اور خلافت دے کر زمین میں قائم کر دیں تو وہ نہایت اچھے کام انجام دیں گے۔ یعنی نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور سب کا انجام کا اللہ ہی کے ہاتھ ہے“

یہ آیت اس بارہ میں بالکل صاف اور فیصلہ کن ہے۔ خدا نے تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیاب کرنے کی عہدت یہ بیان کی ہے کہ وہ زمین پر حکمران ہونے کے بعد اچھے اور نیک کاموں کو انجام دیں گے۔ پھر ان کاموں کی بالترتیب تشریح کی ہے اور حب کو مسلسل عطف کے ساتھ بیان کیا ہے جو معطوف اور معطوف علیہ میں تسویہ ثابت کرتا ہے۔ پہلے نماز کا ذکر کیا۔ پھر زکوٰۃ کا اور بعد دونوں عمل ہر جگہ قرآن میں ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام آیا ہے۔ اور اسی سلسلہ اعمال میں جس میں نماز اور زکوٰۃ ہر لمحہ وجوب و فرض بیان کیے جاتے ہیں اس سے ثابت ہو گیا کہ:-

۱۔ مسلمانوں کو جو نصرت و فتح اور دنیا میں کامیابی عطا فرمائی اس کی علت یہ تھی کہ تاکہ وہ اعمالِ حسنہ انجام دیں۔

۲۔ وہ اعمالِ حسنہ علی الخصوص قیامِ نماز، ادا کئے زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہیں۔

۳۔ نماز اور زکوٰۃ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔

————— ﴿ہیڑہ﴾ —————

امر بالمعروف

عمل و اعتقاد :-

گوئیہ تحقیق ہو چکا کہ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنے ہر سر و پر فرض کر دیا ہے۔ لیکن اصل بحث ابھی باقی ہے۔ ایسی تعلیم کو اصولاً اور اعتقاداً کون نہیں مانتا۔ لیکن اخلاق و مذہب کی ہر تعلیم میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں جو اصول قابل عمل نہ ہو وہ کاغذ کے صفحوں پر لکنا ہی دلفریب ہو مگر انسانی مصائب کے لیے کیا مفید ہو سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا اس اصول پر عمل بھی کر سکتی ہے یا نہیں۔

اسلام یکسر عمل ہے۔ مذہبی تاریخ میں جو انقلابات ذہنی اصول سے عمل کے مخالفت ہوئے ہیں۔ اور جن کی ابتدائی حالات کا مکمل نمونہ گوتم بدھ اور آئینہ آخری صورت مسیحی تحریک عظمیٰ۔ اسلام اس کے انقلاب آخری کا نام ہے جس کے بعد مذہب ایک خالص علی قانون کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور وہ تمام چیزیں نکل گئیں جو اس کی عملی طاقت کو مضرت پہنچاتی تھیں۔ پس اگر یہ سچ ہے کہ امر بالمعروف

ایک اسلامی اصول ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ وہ محض ایک ذہنی زندگی رکھنے والا اصول ہی نہیں بلکہ انسانی عملی زندگی میں تسبیلی پیدا کرنے والا قانون ہے۔

حب و بغض، عفو و انتقام :-

سب سے بڑی مشکل جو اس اصول کو عملی راہ میں پیش آتی ہے وہ اخلاقی تعلیمات کی دورنگی ہے۔ ایک طرف عفو و درگزر اور محبت و عاجزی کی تعلیم ہے دوسری طرف نیکی و بدی کے احتساب کی سختی اور انتقام و عقوبت ہے۔ خود قرآن کریم کی تعلیمات میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک طرف عفو و نرمی اور حکمت و موعظت کا حکم ہے۔ دوسری طرف سختی و انتقام اور تشدد و جبر کے احکام پر زور دیا گیا ہے۔ یورپ کے مرنے والے جب تعصب و جہل کی تاریکی میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس اختلاف تعلیم کی نشہ میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر پریشان ہو کر اس اختلاف کو ملکی اور مدنی زندگی کے اختلاف حالت کا نتیجہ بتاتے ہیں کہ جب تک اسلام بے بسی اور محتاجی کی حالت میں تھا، نرمی اور عفو و درگزر کی تعلیم سے زندگی کا ہمانہ ڈھونڈھتا تھا۔ لیکن مدینہ میں آکر جب تنواری ماحول آگئی تو پھر حکومت اور طاقت کی حالت میں عاجزی اور مسکینیت کی ضرورت نہ تھی لیکن واللہ لیصلہ اھم لکھا ذبون۔

عفو و انتقام کا اصل اصول :-

اس بحث کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اسلام نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو جن اصول پر قائم کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے :-
فقہاء کا ایک عمدہ اصول ہے کہ اصل ہر شے کی اباحت ہے تا آنکہ کوئی

سبب حرمت پیدا نہ ہو۔ انگور کا عرق فی نفسہ ایک مفید اور عمدہ شے ہے لیکن جب اس میں نشہ پیدا کر دیا جائے اور نشہ کی وجہ سے انسان کے دماغ اور اخلاق کو نقصان دے اور اس نقصان کی وجہ سے امن عامہ میں خلل اور سوسائٹی کا حرج ہو تو وہ پھر قطعی حرام ہے۔

بالکل اسی طرح اخلاق میں بھی اصل عمل محبت ہے تا آنکہ کوئی سبب لاحق ہو کر بغض سے تبدیل نہ کر دے۔ یعنی دنیا میں ہر شے محبت کے زیر قانون ہے اور کوئی نہیں ہے جو محبت و پیادہ کا مستحق نہ ہو۔ لیکن اس محبت کے اوپر بھی ایک قانون عام کی حکومت ہے۔ یعنی نفع رسانی اور حقوق العباد کی نگہداشت پس اگر کوئی علت ایسی پیدا ہو جائے جس کے سبب سے محبت کی صورت اپنی محبوبیت کو مسخ کر دے تو پھر ہر شے کو اپنی نظروں میں سبغوض بنا لو اور بس فلاح محبت کی راہ میں محبت کا جوش رکھتے تھے۔ محبت ہی کی خاطر بغض کی راہ میں بغض کا جوش ظاہر کر دو۔

خود کو، قانون دنیا میں کیا چاہتا ہے۔ محبت یعنی امن کو قائم کرنا۔ لیکن محبت کی خاطر عداوت اور امن کی خاطر بد امنی اس کو بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اس کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو جھلکات سے نجات دے۔ لیکن زندگی بچھنے کے لیے اسے موت ہی کے حربہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ انسانوں کو بھانسی پر چڑھا کر مارتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ تاکہ انسان گلا گھونٹ کر نہ مارے جائیں۔

پارلیمنٹ اور جمہوریت امن اور آزادی مانگتی ہے۔ مگر امن کی خاطر اسے شخصی حکومت میں بد امنی پیدا کرنی پڑتی ہے اور آئندہ قتل روک دینے کے لیے بہتوں کو قتل کرنا پڑتا ہے۔

قرآن نے حب و بغض اور نرمی و سختی کے اصول کو اسی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اس کی عام تعلیم یہ ہے :-

خذ العفو وأمر بالمعروف وأعرض عن الجاهلین وأما یزغناک من الشیطان نزع فاستعذ باللہ انہ سمیع علیم۔

”خداؤں سے درگزر، اچھی باتوں کا حکم دے اور جاہلوں سے نہ رکش ہو جا۔ اور اگر اسے پیغمبر تیرے دل میں انتقام اور بدلہ لینے کا دلولہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگ۔ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

ایک دوسرے موقع پر احسان عام اور عاجزی و فروتنی کو اس پیرایہ میں نہرمایا :-

ولا تمش فی الارض مرحاً انک لسن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا کل ذالک کان سیئہ عند ربک مکروہاً ۴۱:۴۷
سورۃ فرقان میں اپنے نیک بندوں اور سچے مومنوں کی جہاں خصلتیں گنتی ہیں وہاں پہلا وصف یہ لکھا :-

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ہونا واذا خاطبہم الجاہلون قالوا سلاماً۔ ۲۵: ۶۵

اور رحم کرنے والے خدا کے رحم طینت بندے وہ ہیں جو زمین پر نہایت فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل ان سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔

سورۃ شوریٰ میں ایک ایسے ہی موقع پر مومن کا سب سے بڑا وصف یہ قرار دیا ہے کہ :-

اذا ما غضبوا ہم ل یخضرون ۳۱: ۳۔ اور جب انکو غصہ آجاتا ہے

تو خطائوں سے درگزر کرتے ہیں۔“

قرآن میں ”عزم امور“ ایک انتہائی وصف ہے جو انبیائے جلیل القدر کی مدح میں آیا ہے۔ لیکن عفو اور صبر کرنے والے کے لیے بھی اسی کو استعمال کیا۔

وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنَ عِزِّ الْأُمُورِ ۚ۲۲:۴۲ اور جو صبر کر لے اور خطائوں کو بخش دے تو بیشک یہ بڑی بہت کے کام ہیں! احسان عام کی ان تعلیمات کا استقصار کیا جائے تو اس طرح کی بیسیوں آیتیں اور روایں آئیں گی۔

یہ تعلیم تو عام اور گویا اصل اخلاقی کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن جب غماز سے حالات متغیر ہو جائیں اور عفو و درگزر کی جو علت تھی یعنی نفع خلائق اور عدم مضرت رسانی، عفو و درگزر سے خود یہ مفقود ہونے لگے تو اس حالت میں پھر شرائط عدل و وسطیت نے انتقام اور بدلے کی سختی کو جائز کر دیا۔

جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا۔ ”برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے کرو“ آگے چل کر اس کو صاف کر دیا۔

وَلَمَن انتقم بعد ظمہ فَاُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّنْ سَبِيلٍ اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِیْنَ یُظْلَمُونَ النَّاسِ وَیُبْغُونَ عَلَى الْاَرْضِ بَعْدَ الْحَقِّ - ۴۲: ۳۹۔ ”اگر کسی پر ظلم ہوا ہو اور وہ اس کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگ معذور ہیں۔ ان پر کوئی الزام نہیں۔ جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ بغیر کسی حق کے زیادتی کے ساتھ سپیش آتے ہیں۔“

دوسری مثال اس سے زیادہ واضح ہے۔

عام حکم کفار و منافقین کے ساتھ نرمی و رافت عفو، درگزر اور بطریق

احسن نصیحت و موعظت کا ہے۔

ادخ الی سبیل ربک بالْحکْمۃ وَالنَّوْعُطۃ الْحَسَنۃ وَجَادِلْهُمْ

باتی ہی احسن - ۱۶ : ۱۲

”خدا کی راہ کی طرف حکمت و وعظ کے ساتھ بلاؤ اور اگر بحث بھی کرو تو وہ اس طرح کہ وہ پسندیدہ طریقہ ہو۔“

دوسری جگہ مخصوص طور پر یہود و نصاریٰ کی نسبت کہا :-

وَلَا تَجَادِلُوا اَهْلَ الْکِتَابِ الْاَبَالَتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۚ ۲۹ : ۲۵ - اہل

کتاب کے ساتھ بحث نہ کرو، مگر بطریق پسندیدہ۔“

لیکن پھر دوسرے موقعوں پر جہاد فی سبیل اللہ کو ایک منرض دین قرار دیا۔ اور سورہ توٰی کی سورتیں اس کے احکام کی نسبت نازل فرمائیں۔

وَقَاتِلُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَعَلَّکُمْ لَکُمْ ۱۲ : ۱۸۰ - جو لوگ

تم سے لڑیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو۔“

اسی آیت کے بعد فرمایا۔

فَاَقْتُلُوا هُمۡ حِیۡثُ لَقِیْتُمُوہُمۡ وَاَخْرِجُوہُمۡ مِّنۡ حِیۡثُ خَرَجُوۡا ۚ ۲ : ۱۸۸

”ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم بھی

انھیں نکال باہر کرو۔“

پہلے عام طور پر نرمی اور آشتی کا حکم دیا تھا لیکن قتل پر بھی بس نہ

کر کے ایسے شدید طریقہ سے سختی پر زور دیا۔ حِیۡثُ قَالَ قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ

مِلُونَا مِنَ الْکُفَّارِ وَاَلْبِیۡدِ وَاَفِیۡکُمۡ غُلَظَۃٌ ۔

”اپنے اس پاس کے کافروں سے لڑو۔ چاہیے کہ وہ تم میں

سختی پائیں۔“

دونوں تعلیموں میں کس درجہ تباہی و تباہی ہے۔ مگر دراصل دونوں کا فساد ایک ہی ہے۔ پہلا حکم احسانِ عام، محبتِ عمومی اور اصل اخلاق پر مبنی تھا۔ لیکن جب عوارض و لواحق سے حالات بدل گئے تو جس طرح پہلے انسانوں کی راحت اور جلبِ نفع کے لیے نرمی کا حکم دیا تھا اسی طرح اور اسی مقصد سے یہاں سختی اور قتل کا حکم دیا اور اس کی علت کو کھول کر بیان کر دیا کہ :-

”الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“

”فساد و خونریزی سے بڑھ کر برائی ہے“

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ - ۱۸۹:۲

”ان کو قتل کرو، یہاں تک کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے“

جس طرح قانونِ قتل کی برائی کو روکنے کے لیے خود قتل کی برائی کو مجبوراً اختیار کرتا ہے اسی طرح قرآن نے فتنہ و فساد سے ارضِ الہی کو پاک کرنے کے لیے تلوار سے مدد لینے تک کی اجازت دے دی ہے۔ بے شک نرمی اور نرم رفتار ہی کو خداوندِ عالم دوست رکھتا ہے۔ لیکن سخت گیروں اور ظالموں کو سختی سے باز رکھنے کے لیے جب تک سختی نہ کی جائے نرمی قائم نہیں ہو سکتی۔ فتنہ و فساد اسے پسند نہیں۔ مگر فتنہ و فساد کو روکنے ہی کے لیے اسے فتنہ سے علاج بالمثل کرنا پڑتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ لِبَعْضٍ مِّنَ صَوَامِعٍ وَبِيعٍ وَصَلَوَاتٍ وَمَسَاجِدٍ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۚ ۲۲:۲۱

”اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹاتا رہتا تو تمام صومعے اور گرجے اور تمام عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کی منہدم ہو گئی ہوتیں“

یعنی مقصدِ الہی مشقت و احسان عام ہے۔ لیکن جب ایک گروہ اس کی زمین کو فتنہ و فساد سے آلودہ کرتا ہے۔ بغیر کسی جرم کے محض عبادتِ الہی کی وجہ سے اس کے نیک بندوں پر ظلم و سختی کرتا ہے۔ ان کو گھروں سے نکالتا ہے، اللہ کی عبادت گاہ میں جانے سے روکتا ہے پھر جب وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر وطن سے بے وطن ہو کر ایک دوسرے شہر میں پناہ لیتے ہیں تو وہاں بھی ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ تو ان حالتوں میں مجبور ہو کر پیغمبرِ کوفتہ روکنے، مظلوموں کو بچانے، شعائرِ الہی کی حفاظت اور حرمت کو قائم رکھنے اور رافت و رحمت سے دنیا کی محرومی کو مٹانے کے لیے سختی سے کام لینا پڑتا ہے اور تلوار کو کاٹنے کے لیے تلوار بلند کی جاتی ہے۔ وکذلک جعلنا کما دسطا۔

اس موقع پر پچھلے نمبر کے اس ٹکڑے پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے جس میں ”امتِ دسطا“ پر بحث کی گئی ہے۔ خدائے تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنی خلافت و نیابت بخشی تھی۔ پس ضرور تھا کہ وہ بھی صفاتِ الہی سے متصف اور مستخلق باخلاق الہی ہوں جسدا رحیم و محبت کر لے والہ ہے۔ پس حکم دیا گیا کہ الرحمن اعلیٰ الارض یرحمکم من فی السماء زمین پر رحم کرو تاکہ وہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے۔ لیکن رحیم ہونے کے ساتھ وہ عادل بھی ہے۔ پس رحم و محبت میں بھی عدل و وسط کا ہونا ناگزیر تھا۔ اس بنا پر تعلیم دی گئی کہ جب افراط و تفریط حد سے بڑھ جائے تو افراط کو روکنے کے لیے تم بھی افراط کرو۔ صفر بڑھ گیا ہے تو تم بھی بہت زیادہ ترشی کھلا دو۔ تم پر تلوار اٹھائی گئی ہے تو اسے تلوار ہی سے کاٹو تم ذلیل کیے گئے ہو تو تم بھی ذلیل ہی کرو۔ تاکہ تسویہ و اعتدال پیدا ہو۔

یہ سب کچھ عین رحم و محبت ہے۔ نہ کہ سختی و جبر۔ ڈاکٹر مریض کے عزیز سے کم مریض پر مہربان نہیں۔ اس کے تلوے میں چیمہ کر چیمہ پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس چھین کے دور کرنے کے لیے نشتر کی نوک کی چھین ہی سے اسے کام لینا پڑے گا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب
والمیزان ليقوم الناس بالقسط وانزلنا الحديد فيه
باس شديد ومنافع للناس۔

”ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ مبعوث کیا اور ان کے ساتھ کتاب و ترازو بھیجی۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں اور نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی شکل میں سخت خطرناک بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سی منفعتیں بھی انسانوں کے لیے اپنے اندر لکھتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے پوری تشریح کے ساتھ نظام عالم کے قوانین اساسی کو بیان کر دیا ہے۔ خدا ہدایت و اصلاح کے لیے انبیاء کو بھیجتا ہے اور ان کو میزان قیام عدل کی ناقدانہ نوت دیتا ہے۔ تاکہ دنیا میں اللہ کے عدل کو قائم کر دیں لیکن چونکہ اس کے لیے اکثر اوقات ضرورت عقوبت کی ضرورت تھی اس لیے ان کو عمل قائم کرنے کے لیے جنگ و قتال کی بھی اجازت دی اور لوہا پیدا کیا جو طرح طرح کے ہتھیاروں کے اشکال اختیار کرتا ہے۔ پس وہ مضر بھی ہے اور مفید بھی۔“

تشبه باللہ و تخلق باخلاق اللہ

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی صفات الہیہ میں سے ایک

صفت ہے۔ اسلام انسان کے آگے ایک ارتقائے روحانی کی راہ کھولتا ہے۔ جو گو عبدیت کے مقام تذلل و تکثر سے شروع ہوتی ہے۔ مگر اس کا انتہائی نقطہ تشبہ باللہ یعنی خدا کی صفات سے مشابہت پیدا کرنے کا مقام ہے۔ اور اسی طرف اس مشہور حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ حَتَّىٰ كَأَنَّكُمْ أَهْلُهَا اپنے اند پیدا کرو۔ پس ضرور تھا کہ جس ملت کو خدا نے دنیا میں اپنی خلافت و نیابت بخشی تھی۔ وہ بھی اس صفتِ الہی سے متصف ہوتی۔ خدا طاعتِ عبادت سے یعنی ہر ایسے کام سے جو تو اُسے فطریہ کا صحیح استعمال ہو۔ خوش ہوتا ہے۔ پس ایک انسان مومن کو بھی خوش ہونا چاہیئے۔ خدا کفر و ضلالت اور بد اعمالی سے یعنی ان تمام کاموں سے جو تو اُسے فطریہ کا اسراف و تبذیر ہونا خوش ہوتا ہے۔ اور اپنی نارضا مندی کا اظہار کرتا ہے۔ پس مومن و مسلم کو بھی ناخوش ہونا چاہیئے۔ اور اپنی نارضا مندی کا اعلان کرنا چاہیئے ہم نے پہلے مقالہ (منبر) میں اسراف و تبذیر کی حقیقت سے بحث کی تھی۔ خدا عادل ہے اور رحم و محبت، نرمی و کرم میں بھی اسراف و تبذیر پسند نہیں کرتا۔ اگر بائبل کا ابن العبد رحم محض کا مجسمہ ہے اور حدل کی ترانوہ کو ماتم میں لینا نہیں چاہتا تو نہ لے مگر چھوٹے بغیر تو اسے بھی چارہ نہیں، تمام انسانی جرائم و معاصی کو شانِ محبت کے پوش میں معاف کر دینا چاہا۔ لیکن پھر بھی بدی کو قابلِ عقوبت ثابت کرنے کے تمام ابنِ آدم کو نہ سہی مگر اپنے عزیز بیٹے کو تو تین دن تک لعنت میں گرفتار رکھ کر خونی مجرموں کی طرح مولیٰ پر چڑھانا ہی پڑا۔

یہ ناگزیر ہے کہ دنیا کے لیے محبت کی صورت مومن ہی ہو مگر افسوس

کہ سود مند نہیں۔ عدل کی پیشانی پر اگرچہ خوش نمائی کی بندی کی جگہ سختی و خشونت کی لکیریں ہیں۔ لیکن دنیا کا تمام نظام صرف اسی کے دم سے ہے۔ پس خدائے تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بھی اپنی صفات کی دعوت دی۔ اور اپنی شان عدل کی طرح اسے بھی امتہ وسطا قرار دیا تاکہ وہ اس کی زمین پر ایک عادلانہ خلافت اور اس کی طرح کسی جذبہ میں نہ تو اسرار کرے۔ یعنی رحم کے موقع پر رحم کو اور سختی کے موقع پر سختی کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور نہ تبذیر کا طریقہ اختیار کرے۔ یعنی رحم کی جگہ قہر اور قہر کی جگہ رحم۔

مقامِ محبتِ الہی - محبہم و محبوبہ

یہی راز ہے کہ خدا نے تمام اقوام کو اپنے اپنے دور میں اپنی خلافت بخشی اور ہر صالح جماعت کو اس ورثہ الہی کا حقدار بنایا۔ ان الارض پر تھا عبادی الصالحون۔ مگر کسی کو اپنی محبوبیت اور معشوقیت کا درجہ عطا نہیں فرمایا۔ حضرت داؤد علی نبینا وعلیہ السلام کی نسبت ضرور کہا کہ یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض ۳: ۵۷۔ ”اے داؤد ہم نے زمین پر تم کو اپنی خلافت بخشی۔ بنی اسرائیل بھی مدتوں اس پر سرفراز رہے۔ لیکن ان کی نسبت یہ کہیں نہیں کہا کہ خدا کے دوست اور محبوب بنائے گئے۔ اس امت مرحومہ پر مزید خصوصیت تھی کہ سوف یا قی اللہ بقوم محبہم و محبوبہ ۵: ۵۹۔

”عنقریب اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کرے گا۔ جن کو وہ اپنا محبوب بنا لے گا اور وہ خدا کو محبوب رکھیں گے۔“ لیکن اس جماعت کی یہ علامت بتائی

گئی کہ اذلة على المؤمنين اعزة على الكافرين يجاهدون
في سبيل الله ولا يخافون لومة لائم ۷:۵۔

"مومنوں کے ساتھ نرم مگر کافروں کے ساتھ سخت، اللہ کی راہ میں اپنی
جانیں لڑا دیں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف
نہ کھائیں گے۔" یہ مختصر آیت اس مشکل کا پورا حل ہے۔ مومن محبوبِ الہی
ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ سے بڑھ کر اور کون سی شے حاصل ہو سکتی ہے؟
لیکن خدا نے اپنی محبت کے ساتھ صرف مقابل کی محبت کا بھی ذکر کیا کہ
میں انھیں چاہتا ہوں اور وہ مجھے چاہتے ہیں۔ یحبہم ویحبونہ۔

محبت کی شرط اولیں فنا فی المحبوب ہے۔

اس لیے مومن مخلص بھی وہی ہے جو اپنی تمام خواہشوں اور قوتوں کو
مہول کر صرف خدا کی مرضی و ارادہ پر اپنے تئیں چھوڑ دے۔ خدا کی مرضی
اس کی مرضی اور حسد کی خوشی اس کی خوشی ہو۔ یہی معنی خلافتِ الہی کے
ہیں کہ وہ دنیا میں اللہ کی صفاتِ کاملہ کا مظہر ہے اور اس لیے اس کا
جانشین المحب فی اللہ والبعض فی اللہ پس جب مقامِ ایمان محبت
الہی ہے اور محبت بغیر حصولِ فنا فی المحبوب محال ہے۔ یہیں سے امر بالمعروف
و نہی عن المنکر کا فرض بے نقاب ہو جاتا ہے۔ مومن کی یہ تعریف
ہے کہ اس کی نہ کسی کے ساتھ دوستی اور نہ دشمنی۔ نہ کسی کی مدح کرے
اور نہ مذمت بلکہ وہ دستِ الہی میں ایک بے جان آلہ بن کر اپنی محبت و
دشمنی کو راہِ محبوب کے لیے وقف کر دے۔ جو خدا کے دوست ہیں وہ
اس کے دوست ہوں اور جو اس کے دشمن ہیں وہ اس کے دشمن اسی

۷۰۰

کی راہ میں دوستی اسی کی راہ میں دشمنی -

الحب فی اللہ البغض فی اللہ -

خدا نیکی اور اعمالِ حسنہ سے خوش ہوتا ہے۔ پس یہ بھی جہاں کہیں
نیکی کو دیکھے اپنا سر جھکا دے۔ وہ بدی اور بد اعمالی پر غضب ناک ہوتا
ہے۔ لا یرضی اعداءہ الکفر۔ پس اس کو بھی جہاں کہیں بدی نظر
آئے صفاتِ الہی کی چادر اوڑھ کر تہِ محبت بن جائے۔ اذلتہ علی المؤمنین
اعزۃ علی الکافرین۔ نیکی کے سامنے جس قدر عاجز اتنا ہی بدی کے
آگے مغرور اور سخت ہو۔



jabir.abbas@yahoo.com